انبیاء علیہم السلام کے بعد دنیا کے مقدس ترین انسانوں کی سرگزشت حیات
سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم
تابعین کرامؒ
دار الاشاعت کراچی

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (القرآن)

اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے

انبیاء کرام کے بعد دنیا کے مقدس ترین انسانوں کی سرگزشت حیات

تابعین کرامؒ

جلد ہفتم

حصہ سیزدہم (13)

۹۶ مشہور اکابرین، تابعینؒ کے مفصل سوانح زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا بیان

تحریر و ترتیب

الحاج مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

سابق رفیق دار المصنفین

مقدمہ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانیؒ

دار الاشاعت

اردو بازار ایم اے جناح روڈ

کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی

طباعت : ۲۰۰۳ء علمی گرافکس کراچی

ضخامت : 470 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

……… ملنے کے پتے ………

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
ادارہ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ B-437 دیوبند روڈ لسبیلہ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد

مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

Islamic Books Centre
119-121, Halli Well Road
Bolton BL 3NE, U.K.

Azhar Academy Ltd.
At Continental (London) Ltd.
Cooks Road, London E15 2PW

فہرست

اسمائے تابعینؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از

جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ

صدر نشین دار المصنفین

اسلام بنی نوع انسان کے واسطے ایک قانون حیات لایا تھا، جس میں علم و عمل، دونوں شامل تھے۔ علم کی معراج معرفت ربانی تھی۔ عمل کا اعلیٰ پایہ صدق و عدل کی تکمیل تمت کلمت ربک صدقا و عدلا۔ اس حیات طیبہ کا کامل نمونہ ذات اقدس تھی لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ حیات انسانی کے جتنے اعلیٰ شعبے ہو سکتے ہیں ان سب کے کامل سبق آموز نمونے حیات مبارکہ میں موجود تھے۔

آپ کے نمونے کی پیروی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس امانت حیات کے امین ہوئے بقدرِ قوت واستعداد ان [illegible] پایہ مظہر اتم [illegible] تھے۔

صحابہ کرامؓ سے یہ امانت تابعین والا مقام کو پہنچی یہی وہ امانت تھی جس کے تحمل سے زمین و آسمان گھبرا اٹھے تھے۔ ان بزرگوں نے جس عزم اور ہمت واستقامت سے حق امانت ادا کیا وہ تاریخ انسانی کا ایک روشن اور حیات آفریں باب ہے بالآخر حق امانت ادا کر کے تبع تابعین کے سپرد فرما گئے انسانی بہترین خدمتوں میں سے ایک خدمت بزرگان موصوف کے صحیح اور مستند حالات کی اشاعت ہے۔

دار المصنفین کو جزائے خیر ہو کہ اس سے پہلے سیرۃ مبارک اور صحابہ کرامؓ کے حالات میں متعدد جلدیں شائع کر چکا ہے اب نوبت حالات تابعینؒ کی ہے اسی سلسلے میں رفیق دار المصنفین مولوی معین الدین احمد صاحب نے یہ جلد تالیف کر کے مسلمانوں پر خصوصاً اور سارے انسانوں پر عموماً لطف و کرم فرمایا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیرا۔

اس کتاب کو پڑھ کر اور مختلف مقامات کو بار بار دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حق محنت دسعی ادا کیا گیا ہے مستند اور معتمد ماخذوں سے حالات لے کر صاف دلنشین پیرائے میں قلمبند کیے ہیں۔ ۱۹۶ اکابر تابعین کے حالات ہیں۔ ظاہر ہے کہ کل کے مقابلے میں یہ ایک جز ہے۔ تاہم جز اعظم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک جلد اور شائع ہوگی جس میں بقیہ اکابر کے حالات ہوں گے زیادہ نمایاں امام اعظم کا عدم ذکر ہے جو امید ہے کہ اپنے موقع سے ہوگا، کوتاہی ہوگی اگر ایک اہم امر کی جانب توجہ مبذول نہ کروں وہ یہ کہ ہر بیان اور ذکر کا ایک پیرایہ اور اسلوب ہے شایستہ پیرایہ اور بلیغ اسلوب۔ اس کا لحاظ تالیف وتصنیف کی تہذیب وشایستگی ہے اکابر مذہب کا ذکر صدیوں سے ایک خاص اسلوب سے ہوتا ہی آیا ہے جو شائستگی اور ادب کا نمونہ ہے اس کا ترک نگاہ اور قلب دونوں کو زحمت رسان ہے اس سے بھی زیادہ نظر کو بلند کیجئے مذہب حق کا فیض تاثر وتقدس سے وابستہ ہے یعنی قلب مذہب حق کے تقدس سے اس وقت فیض یاب ہوگا کہ شان تقدس آشنائی اپنے اندر پیدا کرے۔

تا نہ گردی آشنا از پردہ رمزے نشنوی   گوش نامحرم نہ باشد جائے پیغام سروش

تقدس سے لگاؤ اس وقت ہوگا کہ ادب وعظمت کا اہتمام ہو یہ اہتمام چاہتا ہے کہ اکابر مذہب کا ذکر بھی عظمت وادب کے اہتمام واظہار کے ساتھ ہو۔

کم سے کم میں نے یہ امر محسوس کیا ہے کہ بزرگان دین کے ذکر وبیان کا جو اسلوب سلف صالحین نے قائم کیا ہے جب دوران بیان میں اس کا لحاظ نہ رہے تو بعینہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظر کو ایک دھکا لگا اور بلندی سے پستی پر آرہی تقدس بیان کا جو اثر دل پر ہورہا تھا اس کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔

خلاصہ اکابر تابعینؒ کے ناموں کے ساتھ مقررہ اسلوب کے مطابق امام وغیرہ الفاظ کا عدم استعمال اسلوب ادب کے خلاف محسوس ہوتا ہے[1]۔

حبیب الرحمان

۲۷/ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ ------ حبیب گنج

---

[1] اعتذار از مؤلف حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے لفظ امام وغیرہ اگرچہ میں نے جا بجا کتاب میں لکھا ہے مگر اس کا ترک بھی ہوا ہے اس عدم التزام کے سبب میں ان بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہوں ان شاء اللہ طبع ثانی میں اس کا پورا لحاظ رہے گا۔ (معین الدین احمد)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

دِیباچہ

ایمانی قوت دینی حمیت مذہبی واخلاقی روح اور علمی وعملی خدمتوں کے اعتبار سے اسلام کے خیر القرون کے بہ ترتیب تین زرین دور یا تین طبقے ہیں صحابہؓ ،تابعینؒ اور تبع تابعینؒ ان ہی تین دوروں میں مسلمان دینی اور دنیوی سعادت وفلاح کی معراج کمال کو پہنچے اس کے بعد جو ترقیاں ہوئیں وہ صرف ایوان تمدن کے نقش ونگار ہیں۔

ان تینوں طبقوں میں سے دوسرا طبقہ یعنی تابعینؒ جو اس کتاب کا موضوع ہے اس حیثیت سے نہایت اہم ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی جو دین کا اصل سرچشمہ تھے اور تبع تابعین کی جس میں تمام بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے درمیانی کڑی ہے اسی نے صحابہ کی علمی اور اخلاقی برکتوں کو سارے عالم میں پھیلایا۔

کلام اللہ اور احادیث نبویؐ دونوں ان کے فضائل پر شاہد ہیں کلام اللہ میں ان کے فضائل وامتیازات یہ بتائے گئے ہیں اور مہاجرین وانصار کے ساتھ انہیں بھی رضوان الٰہی کی دولت سے سرفراز کیا گیا ہے:

" وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ "۔

" اور مہاجرین وانصار میں سے جن لوگوں نے ،قبول اسلام میں سبقت کی اور جن لوگوں نے خوشدلی کے ساتھ ان کا اتباع کیا خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش ہیں اور خدا نے ان کے لئے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں "۔

ظاہر ہے کہ اس آیت پاک کا مصداق تابعین کرام ہی ہیں کہ وہی عمل میں مہاجرین وانصار کے تابع اور زمانہ کے لحاظ سے ان کے بعد تھے اور اسی لیے عرف عام میں ان کا لقب تابعی رکھا گیا ہے۔

احادیث میں اس سے زیادہ صریح اور واضح الفاظ میں ان کا تعارف ہے اور ان کو خیر کے لقب سے سرفراز فرمایا گیا ہے:

"خیر امتی القرن الذین یلو نی، ثم الذین یلو نھم ثم الذین یلو نھم"۔

"میری امت میں اس زمانہ کے لوگ بہتر ہیں جو مجھ سے ملا ہوا ہے (صحابہؓ)۔ پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں (تابعین)۔ پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں (تبع تابعین)۔

(مسلم کتاب الفضائل)

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

"خیر الناس قرنی ثم الذین یلو نھم ثم الذین یلو نھم"۔ الخ (ایضا)

"سب سے بہتر لوگ میرے زمانہ کے ہیں (صحابہ کرام) پھر وہ جو ان سے متصل ہیں۔ (تابعین) پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں (تبع تابعین)"۔

یہ تینوں اپنے اپنے زمانہ کے لئے باعث خیر و برکت تھے اسلام کو ان ہی کی خیر و برکت سے روحانی اور مادی فتوحات حاصل ہوتی تھیں۔

"عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال یاتی علی الناس یغزو فئام من الناس فیقال لھم فیکم من رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فیقولون نعم فیفتح لھم ثم یغزو فئام من الناس فیقال لھم فیکم من رای من صحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقو لون نعم فیفتح"۔ (مسلم کتاب الفضائل)

"نبی ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ایک جماعت جہاد کرے گی اس سے پوچھا جائے گا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو؟ وہ لوگ کہیں گے ہاں (انکی برکت سے) ان کے لئے فتح دی جائے گی پھر ایک جماعت جہاد کرے گی، ان سے پوچھا جائے گا کہ تم میں کوئی ہے جس نے اس شخص کو دیکھا ہو جو رسول اللہ کے ساتھ رہا ہو تو وہ کہیں گے ہاں تو (ان کی برکت سے) فتح دی جائے گی"۔

(مسلم کتاب الفضائل)

یہ مقدس جماعت علم و عمل میں صحابہ رسول ﷺ کا عکس و پرتو تھی، اس نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ کی علمی اور اخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا۔ عہد رسالت کے بعد اور شخصی حکومت کے اثر سے اسلامی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح کی اور اگر اصلاح نہ کرسکی تو ان خرابیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مصفا سرچشمہ کو باہر کے گرد و غبار اور کدورت سے اپنی کوششوں سے محفوظ رکھا۔ مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کی نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ اسلامی سلطنت کی حدود کو وسیع کیا۔ اسلام کو پھیلایا۔ غرض ان تمام برکتوں کا جن کا عہد صحابہ میں آغاز ہوا تھا تکمیل تک پہنچایا اور جو پوری ہو چکی تھیں ان کی حفاظت کی۔

امام زہری، مکحول، شامی ابراہیم نخعی، قاضی شریح، عکرمہ، سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے علم کا پایہ سنبھالا۔ محمد بن سیرین، سعید بن مسیب، محمد بن جبیر، امام زین العابدین وغیرہم نے (خدا ان سے راضی ہو) اخلاق کا درس تازہ کیا۔ حسن بصری، اویس قرنی اور عامر بن عبداللہ رضوان اللہ علیہم نے عشق و محبت کی آگ سوزاں رکھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے خلافت راشدہ کے نمونہ کو زندہ کیا۔ غرض تابعین کرام نے علم و عمل کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے لئے بہترین اسوہ چھوڑا۔ علم اور اخلاق وغیرہ کی یہ تقسیم محض اعتباری اور وصف غالب کی بنا پر ہے۔ ورنہ علم و اخلاق کے سارے محاسن کم و بیش ان تمام بزرگوں میں مشترک تھے۔

ان سب کا مشترک اور اہم کارنامہ دینی علوم کی جس پر مذہب اسلام کا دارومدار ہے، حفاظت و اشاعت اور قرآن و حدیث سے متفرع علوم کی تاسیس ہے۔ اگر ان بزرگوں نے جانکاہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھا کر اس خزانہ کو محفوظ نہ کیا ہوتا تو اس کا بڑا حصہ برباد ہو جاتا (اس کے حالات اصل کتاب میں آئیں گے)۔ تبع تابعین کے دور کے تمام بڑے بڑے آئمہ جن کے فیض سے آج مذہبی علوم زندہ ہیں، سب تابعینؒ ہی کے حلقۂ درس کے فیض یافتہ تھے۔

یوں تو تابعی ہر وہ شخص ہے، جس نے کسی صحابی کی صحبت اٹھائی ہو یا اُسے دیکھا ہو۔ لیکن جس طرح ہر صحابی صحابیت کا مکمل نمونہ نہیں اور اس کی تکمیل کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اسی طرح ہر تابعی بھی حقیقی تابعی نہیں۔ صحابہ میں ابوبکر صدیقؓ بھی تھے اور ابوسفیانؓ بھی۔ یہی فرق مراتب خدمات اور کارناموں کے اعتبار سے تابعین میں بھی ہے۔ تابعین میں امام زین العابدینؒ بھی ہیں اور یزید بن معاویہ بھی۔ لیکن شتان بینھما اس لحاظ سے ان بے شمار تابعین کو اس کتاب سے خارج کردیا گیا ہے جن کی زندگی میں ہمارے لئے کوئی نمونہ عمل نہیں کہ ع

'' محفل خاص ہے یہ رہ گزر عام نہیں ''

ان کے علاوہ تابعین میں بڑے بڑے فاتحین اور کشور کشا بھی ہیں، جن کی تلواروں نے مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیئے۔ کچھ سلاطین و فرمانروا بھی ہیں جن کی تمدن نوازی نے اسلامی حکومت کو تمدن کا تماشا گاہ بنا دیا۔ ان سب کی اچھی کوششیں امت مرحومہ کے شکریہ کی مستحق ہیں۔ لیکن اس کتاب کا مقصد ان ہی برگزیدہ نفوس کے حالات پیش کرنا ہے، جنہوں نے مسلمانوں کے لئے کوئی اخلاقی یا مذہبی نمونہ چھوڑا ہے اور جن کے اخلاقی نمونوں سے اسلام کی روح زندہ اور جن کی علمی کوششوں سے اسلامی علوم و فنون کی عمارت قائم ہے۔ اس لئے فاتحوں اور کشور کشاؤں اور بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو بھی اس زمرہ سے علیحدہ رکھا گیا ہے کہ ان کی تو کسی زمانہ میں کمی نہیں۔ عبدالملک، ولید، سلیمان اور قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، مسلمہ، مہلب بن ابی صفرہ تو ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن حسن بصریؒ، اویس قرنیؒ، سعید بن مسیبؒ، ابن شہاب زہریؒ اور محمد بن سیرینؒ کے پیدا ہونے کے لئے صدیاں درکار ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب   لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع   عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن

نفس کتاب کے متعلق گزارش ہے کہ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں اکابر تابعین کرام کے علمی اخلاقی اور مذہبی کارناموں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس عہد کی پوری علمی و اخلاقی تاریخ سامنے آجائے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ سیر الصحابہ کے چھٹے حصہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حالات کے سلسلہ میں ضمناً حضرت محمد بن حنفیہ کے کچھ حالات بھی آگئے تھے۔ اب تابعین کے سلسلہ میں ان کے مستقل حالات لکھنے کا اتفاق پیش آیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مواقعات میں کم اور ''نقطہ نظر'' اور نتائج میں زیادہ فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیر الصحابہ لکھتے وقت حضرت محمد بن حنفیہؒ کے حالات کے بعض ماخذ میرے پیش نظر نہ تھے۔ جدید ماخذوں کو دیکھنے کے بعد بہت سے ایسے حالات معلوم ہوئے، جن سے نقطہ نظر میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس لئے آخری تحقیق تابعین کے حالات ہیں۔ ان شاءاللہ اگر سیر الصحابہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

کتاب میں بعض کتابت و طباعت کی معمولی غلطیاں رہ گئی ہیں، جن سے کوئی کتاب مستثنیٰ نہیں اور بعض ایسی غلطیاں ہیں جنہیں جان بوجھ کر ناگزیر اسباب کی بنا پر گوارا کرنا پڑا۔ مثلاً حضرت

عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کے حالات میں صفحات کے شمار کے ہندسوں کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا [۱]۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دارالمصنفین سے چونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مستقل سیرت شائع ہو چکی ہے اس لئے ان کے حالات شامل کرنے کا ارادہ نہ تھا، لیکن پھر دوران طباعت میں خیال بدل گیا اس وقت ترتیب کے لحاظ سے کتاب کی طباعت ان کے نام تک پہنچ چکی تھی، اس لئے ان کے حالات کے صفحات کا تخمینہ کرکے دو جز چھوڑ کر کتاب کی طباعت جاری رہی لیکن حالات اندازہ سے تقریباً دو چند ہو گئے۔ اس لئے صفحات کے نمبروں کا تسلسل قائم نہ رہ سکا اور ان کو ملانے کے لئے کچھ ہندسے مکرر ہو گئے۔ لیکن اس سے نفس صفحات کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا، وہ ویسے ہی مرتب ہیں، صرف کچھ نمبر مکرر ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں حروف "ع" کے ناموں کی ہجائی ترتیب میں کچھ خفیف سا فرق ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ فروگزاشتوں کی تصحیح کے لئے آخر میں استدراک لگا دیا گیا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تابعین کی سیرت کی تکمیل کے بعد کاتب سطور کو اکابر تبع تابعین کی سیرت نگاری کی سعادت بھی عطا فرمائے کہ اس کے ناچیز ہاتھوں سے سیر الصحابہ سے لے کر تابعین کی سیرت تک کا سلسلۃ الذہب پورا ہو جائے اور ان نفوسِ قدسیہ کے طفیل میں اوراق کو مؤلف کے لئے پروانۂ مغفرت بنا دے۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

فقیر معین الدین احمد ندوی
دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۸۔ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ
مطابق ۲۴۔ نومبر ۱۹۳۷ء

---

[۱] اس ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) ابراہیم بن یزید تیمیؒ

نام ونسب : ابراہیم نام ہے۔ ابواسماء کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : ابراہیم بن یزید بن شریک بن تیم الرباب تیمی۔ ابراہیم کوفہ کے عابد وزاہد تابعین میں تھے۔

فضل وکمال : فضل وکمال کے لحاظ سے کوئی ممتاز شخصیت نہ رکھتے تھے۔ تاہم کوفہ کے علمائے باعمل میں شمار تھا[1]۔

حدیث : حافظ ذہبی انہیں حفاظ میں شمار کرتے ہیں۔ حدیث میں انہوں نے انس بن مالکؓ، حارث بن سوید عمرو بن میمون اور اپنے والد یزید سے استفادہ کیا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کی ہے لیکن یہ روایت مرسل ہیں۔ بیان بن بشیر، حکم بن عتبہ، زبید بن حارث، مسلم البطین اور یونس بن عبید وغیرہ ان کے زمرہ تلامذہ میں ہیں[2]۔

زہد وعبادت : ان کا امتیازی وصف زہد وتقوی ہے۔ ان کے والد یزید بن شریک بڑے عابد وزاہد تابعی تھے۔ انہوں نے بڑی دولت پیدا کی لیکن دنیا سے کبھی آلودہ نہ ہوئے۔ ان کے لباس تک پر ان کی ثروت کا اثر ظاہر نہ تھا۔ ایک مرتبہ ابراہیم نے ان کے جسم پر روئی کا معمولی کرتہ جس کی آستینیں ہتھیلیوں تک لٹکی تھیں دیکھ کر کہا، ابا کوئی قرینہ کا لباس کیوں نہیں پہن لیتے؟ جواب دیا۔ بیٹا جب میں بصرہ میں آیا اس وقت ہزاروں پیدا کئے لیکن اس سے میری خوشی اور مسرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اور نہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو پاک لقمہ میں کھاتا ہوں وہ اس شخص کے منہ میں جائے جو مجھے سب سے زیادہ مبغوض ہو کیونکہ میں نے ابودرداءؓ سے سنا ہے کہ قیامت میں ایک درہم رکھنے والے سے زیادہ دو درہم رکھنے والے سے حساب ہوگا[3]۔

ایسے زاہد باپ کی تعلیم وتربیت نے ابراہیمؒ کو ابتداء ہی سے دنیا سے بے نیاز اور زہد وعبادت کی جانب مائل کر دیا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین عباد میں ہوئے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے عابد وزاہد تھے اور فاقہ کشی پر ان کو بڑی قدرت تھی[4]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۳ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۶

۳؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۰۰ ۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۶

عبادت میں اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ کبھی قضا نہ ہوتی تھی اور اس سے غفلت کرنے والے کو گویا گزرا سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ جسے تکبیر اولیٰ میں تساہل کرتے دیکھو اس سے ہاتھ دھو ڈالو[۱]۔

نماز میں کیف واستغراق کا یہ عالم تھا کہ سجدہ کی حالت میں چڑیاں پیٹھ پر اڑ اڑ کے بیٹھتی تھیں اور چونچیں مارتی تھیں[۲]۔ دو دو مہینے مسلسل روزے رکھتے تھے[۳] اور محض ایک انگور روزانہ پر پورا ہفتہ گذار دیتے تھے[۴]۔ لیکن اس زہد وعبادت پر بھی اپنے اعمال کو قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب اپنے قول وعمل میں موازنہ کرتا ہوں تو جھوٹا بننے سے خوف معلوم ہوتا ہے[۵]۔

ایثار کا بے مثل نمونہ اور شہادت　ایثار اور قربانی کا مجسم پیکر تھے۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ دوسروں کے لئے جان تک دینے میں دریغ نہ کیا۔ انہوں نے ایثار قربانی کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ حجاج ثقفی ابراہیم نخعی کا جو بڑے ممتاز عالم تابعی ہیں۔ سخت دشمن تھا اور ان کے درپے آزار رہا کرتا تھا۔ لیکن دست رس حاصل نہ ہوسکا۔ اس کے آدمی ہمیشہ ان کی تلاش میں رہتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ ابراہیم نخعی کو تلاش کر رہے تھے۔ ابراہیم تیمی کو دونوں کی مخالفت کا علم تھا۔ اس علم کے باوجود انہوں نے ان کے بچانے کے لئے کہہ دیا کہ "ابراہیم میں ہوں" تلاش کرتے والے آدمی ابراہیم نخعی کو پہچانتے نہ تھے۔ اس لئے ان کے اقرار پر انہی کو پکڑ لے گئے۔ حجاج نے زنجیروں میں جکڑوا کے دیماس کے قید خانہ میں جس کو اس نے سنگین مجرموں کے لئے خاص طور سے بنوایا تھا ڈلوادیا۔ یہ قید خانہ کیا تھا، موت کا گھر تھا۔ اس میں سردی اور گرمی پانی اور دھوپ سے بچنے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ اس پرمحن قید نے چند ہی دنوں میں ابراہیم کا رنگ وروپ ایسا بدل دیا کہ ان کی ماں تک ان کو نہ پہچان سکیں، لیکن وہ نہایت صبر واستقلال کے ساتھ ان مصائب کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور ان کو جھیلتے جھیلتے بالآخر انتقال کر گئے۔

ان کی شب وفات کو حجاج نے خواب میں دیکھا کہ آج شہر میں ایک جنتی مر گیا ہے۔ صبح کو اس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابراہیم نے قید خانہ میں انتقال کیا۔ یہ سن کر اس جفا شعار نے کہا خواب شیطانی وسوسہ معلوم ہوتا ہے اور ابراہیم کی لاش گھور پر پھنکوادی[۶]۔

---

[۱] طبقات کبریٰ شعرانی۔ ص ۳۶　[۲] ایضاً　[۳] ایضاً　[۴] ایضاً　[۵] طبقات کبریٰ۔ ص ۳۶

[۶] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۹

بعض اقوال: ابراہیم کے بعض اقوال نہایت حکیمانہ ہیں۔ فرماتے تھے کہ انسان کے لئے علم کے نتائج میں سے خشیت الٰہی اور جہل کے نتائج میں سے اپنے عمل پر غرور کافی ہے اور طمعیں انسان کو بدکرداریوں پر آمادہ کرتی ہیں[۱]۔

(۲) ابراہیم بن یزید النخعیؒ

نام ونسب: ابراہیم نام ہے۔ ابوعمران کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے: ابراہیم بن یزید بن اسود بن عمرو بن حارثہ ابن سعد بن مالک بن نخع نخعی نخع قبیلہ مذحج کی ایک شاخ تھا اور کوفہ میں آباد تھا۔

فضل وکمال: فضل وکمال کے لحاظ سے ابراہیم نخعی کوفہ کے ممتاز ترین تابعین میں تھے۔ ان کا گھرانا علم وعمل کا گہوارہ تھا۔ ان کے چچا علقمہ اور ماموں اسود دونوں کوفہ کے ممتاز محدثین میں تھے۔ ابراہیمؒ نے انہی کے دامن میں پرورش پائی۔ علقمہ کا حلقہ درس اتنا وسیع تھا کہ محمد بن سیرین جیسے اکابر ان میں شریک ہوتے تھے۔ ابراہیم بھی اسی حلقہ کے فیض یافتہ تھے[۲]۔ اس کے علاوہ علقمہ اور اسود کے سلسلہ سے ابراہیم کو اس عہد کی بڑی بڑی ممتاز ہستیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ چنانچہ بچپن میں وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آتے جاتے تھے۔

ابومعشر کا بیان ہے کہ ابراہیمؒ رسول اللہ ﷺ کی بعض ازواج (حضرت عائشہؓ) کے پاس آتے جاتے تھے۔ ایوب نے اعتراض کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بچپن میں بلوغ کے پہلے اپنے چچا اور ماموں علقمہ اور اسود کے ساتھ حج کو جاتے تھے اور ان لوگوں کو اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے عقیدت وارادت اور ان کی مجلسوں میں ان صاحبوں کی آمد ورفت تھی[۳]۔ گو حضرت عائشہؓ سے ابراہیمؒ کا سماع ثابت نہیں ہے لیکن ان کی جیسی برگزیدہ ہستیوں کی مجلس میں شریک ہوجانا ہی حصول برکت وسعادت کے لیے کافی تھا۔

ان بزرگوں کے فیض صحبت نے ابراہیمؒ کا دامن دولت علم سے مالا مال کردیا تھا اور وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے تھے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق جلالت اور فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے۔ ابوزرعہ نخعی کہتے ہیں کہ وہ اعلام اہل اسلام میں ایک علم تھے[۴]۔ ان کو حدیث وفقہ دونوں علوم میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔

---

[۱] طبقات کبریٰ شعرانی۔ ص ۳۶ [۲] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۰ [۳] ایضاً [۴] تہذیب الاسماء ق اول۔ جلد اول۔ ص ۱۰۴

حدیث : حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے۔ حافظ ذہبی ان کو دوسرے طبقہ کے حفاظ میں شمار کرتے ہیں۔ حدیث میں انہوں نے اپنے دونوں ماموں اسود اور عبد الرحمٰن بن یزید اور مسروق علقمہ، ابو معمر، ہمام، ابن حارث، قاضی شریح اور سہم بن منجاب وغیرہ سے استفادہ کیا تھا اور اعمش، منصور، ابن عون، زبید الیمامی، حماد بن سلیمان اور مغیرہ بن مقسم ضبی وغیرہ ان کے زمرہ تلامذہ میں تھے[1]۔

حدیث میں ان کی معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ اعمش کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم کے سامنے کوئی حدیث بیان کی تو انہوں نے اس حدیث کے بارہ میں میری معلومات میں اور اضافہ کر دیا[2]۔ ابن معین ان کی مرسل حدیثوں کو امام شعبی کی مرسل روایت سے زیادہ پسند کرتے تھے[3]۔

روایت بالمعنیٰ:

روایت حدیث میں الفاظ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے اور بالمعنیٰ روایت کافی سمجھتے تھے[4]۔

انتساب رسول ﷺ میں احتیاط:

لیکن اسی کے ساتھ وہ روایت کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منسوب کرنے میں بڑے محتاط تھے اور مرفوع روایات کے حفظ کے باوجود انہیں روایت نہ کرتے تھے۔ ابو ہاشم کا بیان ہے کہ میں نے ابراہیم سے پوچھا آپ کو رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے، جس کو آپ بیان کریں؟ جواب دیا کیوں نہیں! لیکن عمرؓ عبد اللہؓ علقمہ اور اسود سے روایت کرنا اپنے لئے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے[5]۔

فقہ : فقہ ابراہیم کا خاص فن فقہ تھا۔ اس فن کے وہ امام تھے۔ ان کے فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے[6]۔ حافظ ذہبی انہیں فقیہ عراق اور امام نووی فقیہ کوفہ لکھتے ہیں۔ امام شعبی نے ان کی وفات کے وقت کہا کہ ابراہیم نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور اپنے سے بڑا فقیہ نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا حسن بصری اور ابن سیرین بھی نہیں؟ شعبی نے جواب دیا۔ نہ صرف حسن بصری اور ابن سیرین بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام میں کوئی بھی نہیں[7]۔ بڑے بڑے علماء فقہی مسائل کے سائلین کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے۔ سعید بن جبیر کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے کے لئے آتا تو اس سے کہتے ابراہیم کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو[8]۔ ابو وائل کے پاس جب کوئی مستفتی جاتا تو اس کو ابراہیم کے پاس بھیج دیتے کہ وہ جو جواب دیں مجھے بتانا[9]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۷ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۹ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۷
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹ ۵؎ ایضاً ۶؎ تہذیب الاسماء۔ ق اول۔ جلد اول۔ ص ۱۰۴ ۷؎ تہذیب الاسماء۔ ق اول۔ جلد اول۔ ص ۱۰۳ ۸؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۹ ۹؎ ایضاً۔ ص ۱۹۰

اظہار علم سے احتراز:

ان کمالات کے باوجود وہ علم کا اظہار کرنا اچھا نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ بغیر سوال کیے ہوئے کبھی خود سے کوئی علمی تذکرہ نہ کرتے تھے[1] اور سوالات سے بھی گھبراتے تھے۔ زبید کا بیان ہے کہ جب کبھی میں نے ابراہیمؒ سے کسی چیز کے متعلق کچھ پوچھا تو ان میں ناگواری کے آثار نظر آئے[2]۔

ذمّہ داری کا احساس اور احتیاط:

اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ علم کی بڑی ذمّہ داری محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ ایک زمانہ وہ تھا، جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھا ہے۔ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں علم کے متعلق ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالوں۔ جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی بُرا زمانہ ہے[3]۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جب وہ مجمعوں میں ہوتے تھے تو اپنی بہترین احادیث بھی نہ بیان کرتے تھے۔

اس ذمہ داری اور احتیاط کی وجہ سے مسائل کے جوابات میں بڑے محتاط تھے۔ اعمش کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابراہیم سے کہا کہ میں چند مسائل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا "میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ میں کسی شے کے متعلق کہوں کہ وہ اس طرح ہے اور وہ اس کے خلاف ہو"[4]۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ شہرت اور ریا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ جو شخص علم کا ایک کلمہ بھی اس نیت سے منہ سے نکالتا ہے کہ اس سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے تو وہ اس کے وسیلہ سے سیدھا جہنم میں گرتا ہے نہ کہ جس کی شروع سے آخر تک یہی نیت ہو[5]۔

استفادہ کے مخصوص اوقات:

لیکن اس احتیاط کے باوجود انھوں نے اپنی ذات سے استفادہ کا دروازہ بند نہیں کر دیا تھا۔ وہ مسائل بتاتے تھے اور اس کے لئے خاص اوقات مقرر تھے۔ جن میں ہر شخص مسائل پوچھ سکتا تھا اور آپ اس کے جواب دیتے تھے۔ حسن بن عبید اللہ کا بیان ہے کہ میں نے ابراہیم سے کہا کہ آپ ہم لوگوں سے حدیث نہ بیان کریں گے۔ جواب دیا کیا تم چاہتے ہو کہ میں فلاں شخص کی طرح ہو جاؤں۔ اگر تم کو اس کی خواہش ہے تو قبیلہ کی مسجد میں آیا کرو وہاں جب کوئی شخص کچھ پوچھے گا تو تم بھی جواب سن لو گے[6]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۴ [2] طبقات ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۹ [3] طبقات کبریٰ امام شعرانی۔ جلد اول۔ ص ۳۶۔
[4] ایضاً [6] ابن سعد۔ جلد ۶ ص ۱۹۰

تحریر پر حفظ کو ترجیح :

بعض قدماء اسلاف کی طرح ابراہیم کو علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ پر اعتماد تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے نہ تھے۔ فضیل کا بیان ہے کہ میں نے ابراہیم سے کہا کہ میں نے مسائل کو کتاب میں جمع کیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس کو مجھ سے چھین لیا۔ انہوں نے کہا کہ جب انسان لکھ لیتا ہے تو اس پر اس کو اعتماد ہو جاتا ہے اور جب انسان علم کی جستجو کرتا ہے تو خدا اس کو بقدر کفایت علم عطا فرماتا ہے[1]۔

فضائل اخلاق :

اس علم کے ساتھ وہ عمل اور فضائل اخلاق کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔

عبادت وریاضت :

نہایت عابد وزاہد اور متورع تھے۔ راتوں کی تنہائی میں لوگوں کی آنکھوں سے چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ طلحہ کا بیان ہے کہ جب لوگ سو جاتے تھے اس وقت ابراہیم ایک عمدہ حلہ پہن کر خوشبو لگا کر مسجد چلے جاتے تھے، صبح تک وہیں رہتے، صبح کو حلہ اتار کر پھر معمولی لباس پہن لیتے تھے[2]۔ عبادت کے اثر سے بالکل چور اور خستہ ہو جاتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے کہ ابراہیم اکثر نماز پڑھ کر ہمارے یہاں آتے تھے۔ دن چڑھے تک یہ حال رہتا تھا کہ بیمار معلوم ہوتے تھے[3]۔ ایک دن ناغہ دے کر پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے تھے[4]۔

صحت عقیدہ : عقیدہ میں سلف کے عقائد سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ارجاء کا عقیدہ رکھنے والوں کے جو کوئی اہم شے نہیں ہے بعض تابعین بھی اس عقیدہ کے تھے سخت خلاف تھے۔ فرماتے تھے ارجاء بدعت ہے تم لوگ ہمیشہ اس سے بچتے رہو۔ مرجیہ کے پاس نہ بیٹھو۔ ان کے پاس آنے والوں میں جس کے خیالات میں ارجاء کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ان کو آنے سے منع کر دیتے[5]۔

انتہائی احتیاط : صلحاء اور خیار اُمت سے طلب دعا کی ممانعت نہیں ہے اور اس پر صحابہ و تابعین کا عمل بھی رہا ہے، لیکن چونکہ اس سے بعض بدعات کا دروازہ کھلتا ہے اور عوام کے عقیدوں میں اس سے ضعف پیدا ہوتا ہے اسلئے اسے بھی پسند نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے درخواست کی کہ ابو عمران دعا کیجئے کہ خدا مجھے شفا عطا فرمائے۔ ان کو یہ درخوست گراں گزری اور اس شخص سے کہا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حذیفہ ــــ

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۹　۲؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۳۔　۳؎ ایضاً۔ ص ۱۹۵۔　۴؎ ایضاً۔ ص ۱۹۲
۵؎ ایضاً۔ ص ۱۹۰، ۱۹۱

مغفرت کی دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دعا کے بجائے کہا کہ خدا تمہاری مغفرت نہ فرمائے۔ یہ سن کر وہ شخص الگ ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حذیفہ نے اس کو بلا کر دعا کی کہ خدا تم کو حذیفہؓ کی جگہ داخل کردے۔ اس دعا کے بعد اس شخص کو بلا کر پوچھا کہ اب تم راضی ہو، تم میں سے بعض اشخاص ایک شخص کے پاس اس عقیدہ کے ساتھ جاتے ہیں کہ اس نے تمام مراتب حاصل کر لئے ہیں اور وہ کوئی بلند ہستی بن گیا ہے۔ یہ واقعہ سنا کر ابراہیم نے سنت کا تذکرہ کر کے اس کی پابندی کی تلقین کی اور بدعتوں کا ذکر کر کے ان سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا[1]۔

مسامحت:

لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں میں سخت گیر نہ تھے اور ان میں سختی ناپسند کرتے تھے۔ ایک دن آپ کے یہاں دو آدمی آئے، ان میں سے ایک کا بند کھلا ہوا تھا اور دوسرے کے بال گندھے ہوئے تھے۔ فرقد سنجی نے ابراہیم سے کہا کہ ابو عمران اس شخص کو بند کھولنے اور اس شخص کو بال گوندھنے سے منع نہیں کرتے۔ ابراہیم نے کہا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں بنی اسد کی سنگدلی پیدا ہوگئی ہے یا بنی تمیم کی سختی۔ ان میں سے ایک شخص کو گرمی معلوم ہو رہی تھی اس نے بند کھول دیا اور دوسرا شخص نماز کے وقت بال کھول دیتا ہے[2]۔

اختلاف صحابہ میں سکوت:

صحابہ کرام کے اختلافات پر تنقید اظہار رائے اور فریقین میں سے کسی کی جانب داری ناپسند کرتے تھے اور ان مسائل میں سکوت سے کام لیتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے اختلاف کے بارہ میں سوال کیا۔ انہوں نے کہا نہ میں سبائی ہوں نہ مرجی۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک اور شخص نے ان سے کہا مجھے ابوبکرؓ و عمرؓ کے مقابلہ میں علیؓ سے زیادہ محبت ہے۔ انہوں نے کہا اگر علیؓ تمہارا یہ خیال سنتے تو تم کو سزا دیتے۔ اگر تم کو اس قسم کی باتیں کرنی ہیں تو میرے پاس نہ بیٹھا کرو۔ فرماتے تھے مجھ کو عثمانؓ کے مقابلہ میں علیؓ سے زیادہ محبت ہے لیکن میں آسمان سے منہ کے بل گرنا پسند کرتا ہوں اور یہ گوارا نہیں ہے کہ عثمانؓ کے ساتھ کسی قسم کا سوئے ظن رکھوں[3]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶ ص ۱۹۳　[2] ایضاً ص ۱۹۳　[3] ابن سعد۔ جلد ۶ ص ۱۹۲

تواضع وخاکساری :

ابراہیم باین جلالتِ شان نہایت خاموش، عزلت نشین، بے تکلف اور سادہ مزاج تھے۔ تواضع اور خاکساری کا یہ حال تھا کہ ٹیک لگا کر بیٹھنے تک کا امتیاز بھی گوارا نہ تھا[۱]۔ کبھی کبھی حصول اجر کے لئے دوسروں کا بوجھ تک اُٹھا لیتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے کہ میں نے بسا اوقات ابراہیم کو بوجھ اُٹھائے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ میں حصول اجر کے لئے ایسا کرتا ہوں[۲]۔

ہیبت : لیکن اس خاکساری کے باوجود لوگوں کے دلوں پر ان کی ہیبت چھائی رہتی تھی مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حکام اور امراء کی طرح ابراہیم سے ڈرتے تھے[۳]۔

سلاطین اور امراء سے تعلقات :

سلاطین اور امراء کے ساتھ ابراہیم کے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں میں باہم ہدایا وتحائف کا تبادل ہوا کرتا تھا۔ اکثر ممتاز امراء ان کی خدمت کیا کرتے تھے[۴]۔ یہ اس کو قبول کرنے میں مضائقہ نہ سمجھتے تھے اور اسے بُرا سمجھتے تھے کہ خدا کسی کی کوئی شے عطا فرمائے اور وہ اس سے انکار کرے[۵]۔ لیکن وہ ہدایا لینے کے ساتھ ان کا بدلہ بھی کرتے تھے[۶]۔

ظالم امراء کی مخالفت :

البتہ ظالم اور جفاکار امراء کے سخت خلاف رہتے تھے۔ اسی لئے ان میں اور حجاج میں کبھی نہ بنتی تھی۔ وہ آپ کا سخت دشمن تھا۔ ابراہیم اسے بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس پر لعنت بھیجنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے تھے[۷]۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حجاج اور اس کے جیسے دوسرے ظالموں پر لعنت بھیجنے کے بارہ میں سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا خدا خود قرآن میں فرماتا ہے۔ حجاج کی موت پر اس قدر مسرور ہوئے کہ سجدہ میں گر پڑے اور آنکھوں سے اشک مسرت رواں ہو گئے[۸]۔

وفات : حجاج کی موت کے چند مہینے بعد بیمار پڑے مرض نہایت مضطرب و بے قرار تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا فرمایا۔ اس سے زیادہ خطرہ کا وقت کون ہوگا کہ خدا کا قاصد جنت یا دوزخ کا پیام لے کر آئے گا میں اس پیام کے مقابلہ میں قیامت تک موجودہ صورت کا قائم رہنا پسند کرتا ہوں[۹]۔ اسی علالت میں آغاز ۹۶ھ میں انتقال کیا۔ باختلاف روایت انتقال کے وقت انچاس یا پچاس یا اس سے کچھ اوپر عمر تھی[۱۰]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۷ و تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۴ ۲؎ ایضاً ۱۹۳ ۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۴ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۳ ۵؎ ایضاً۔ ص ۱۹۴ ۶؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۴
۷؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۵ ۸؎ ایضاً ۹؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۱۴ ۱۰؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۹

حلیہ ولباس: ابراہیم نہایت خوش لباس تھے۔ رنگین اور بیش قیمت پوشاک پہنتے تھے۔ زعفرانی اور سرخ رنگ کا لباس استعمال کرنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ جاڑوں کے لباس میں سمور کی سنجاف لگی ہوتی تھی۔ سمور کی ٹوپی پہنتے تھے۔ عمامہ بھی باندھتے تھے۔ لوہے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ اس کا نقش ذباب الله ونحن لہ تھا[1]۔ امام شعرانی کا بیان ہے کہ اپنے کو چھپانے کے لئے رنگین کپڑے پہنتے تھے تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ قراء کی جماعت سے ہیں یا دنیاداروں کی[2]۔

حکیمانہ اقوال: آپ کے بعض اقوال نہایت حکیمانہ اور پُر موعظت ہیں۔ فرماتے تھے کہ

(۱) انسان چالیس سال تک جس سیرت پر قائم رہے پھر وہ نہیں بدل سکتی۔

(۲) ایمان کے بعد آدمی کو سب سے بڑی دولت تکلیفوں پر صبر کی عطا کی گئی ہے۔ اسی لئے بیماری کا حال بیان کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جب مریض سے اس کی حالت پوچھی جائے تو اس کو چاہئے کہ پہلے اچھا کہے، اس کے بعد اصل حالت بیان کرے کہ شکوۂ غم بھی شان صبر کے خلاف ہے[3]۔

(۳) انسان کے لئے یہ معصیت کافی ہے کہ لوگ دنیا یا دین کے معاملہ میں اس پر انگشت نمائی کریں[4]۔

(۳) احنف بن قیسؓ

نام ونسب: ضحاک نام ہے۔ ابو بحر کنیت۔ عرفی نام احنف ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ احنف کے پیروں میں خلقی کجی تھی عربی میں اس کو حنف کہتے ہیں۔ اس لئے وہ احنف مشہور ہوگئے۔ نسب نامہ یہ ہے، احنف ابن قیس بن معاویہ بن حصین بن حفص بن عبادہ بن نزال بن مرہ بن عبید بن مقاعس بن عمرو بن کعب بن سعد بن زید مناۃ بن تمیم کے سرداروں میں تھے۔

عہدِ رسالت: احنف عہد رسالت میں موجود تھے۔ ابن عماد حنبلی کے مطابق وہ اسی عہد میں مشرف باسلام ہوئے اور ان کا قبیلہ انہی کی تحریک پر اسلام لایا[5]۔ لیکن اور تمام ارباب طبقات ورجال کا بیان اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے ان کے حالات تابعین ہی کے زمرہ میں لکھے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر بھی جنہوں نے احتیاطاً ان کے حالات صحابہ کے زمرہ میں اس لئے لکھ دیئے ہیں

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۶۔ ۱۹۷ تذکرہ ابراہیم نخعی ۲؎ طبقات امام شعرانی۔ جلد اول۔ ص ۳۶ ۳؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔

۴؎ طبقات امام شعرانی۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۶ ۵؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۷۸

کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا تھا، مگر شرف دیدار سے محروم رہے۔ تابعین ہی میں شمار کرتے ہیں[1]۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا مگر اسلام نہیں لائے[2]۔

جس روایت سے ان کے اسلام کا نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو قبیلہ بنی سعد (احنف کا قبیلہ) میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا، انہوں نے جاکر اسلام پیش کیا۔ احنف بھی موجود تھے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات سن کر کہا کہ یہ شخص بھلائی کی طرف بلاتا ہے اور اچھی تعلیم سناتا ہے۔ مبلغ صحابی نے جاکر یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا آپ نے سن کر دعا فرمائی کہ خدایا احنف کی مغفرت فرما[3]۔

لیکن اولاً اس روایت کی صحت محل نظر ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو اس میں اسلام کی کوئی تصریح نہیں، اس سے صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق شناس تھے۔ اور ان کے دل میں قبول حق کا مادہ موجود تھا۔

آنحضرت ﷺ کی دعا قبول اسلام کا ثبوت نہیں۔ آپ نے یہ دعا ان کی حق شناسی پر فرمائی تھی، اور اگر بالفرض اسلام بھی مان لیا جائے تو آنحضرت ﷺ کو دیکھنا، آپ سے ملنا، آپ کی صحبت اٹھانا تو قطعی ثابت نہیں، جو صحابیت کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان کا یہ شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام سے پہلے بھی حق شناس تھے، اور ان کو آنحضرت ﷺ اور اسلام سے کوئی عناد نہ تھا۔

اسلام : قیاس یہ ہے کہ وہ شیخین کے زمانے میں کسی وقت اسلام سے مشرف ہوئے۔

عہد فاروقی :

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدینہ آئے۔ حضرت عمرؓ کو قبیلہ بنی تمیم کے ساتھ سوء ظن تھا، اس لئے آپ اکثر اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ احنف کی موجودگی میں بنی تمیم کا کچھ تذکرہ آیا، آپ نے حسب معمول اس کی مذمت کی۔ احنف مذمت سن کر کھڑے ہوگئے اور عرض کی مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہو۔ آپ نے اجازت دی۔ احنف نے کہا آپ نے بلا استثنا پورے قبیلہ بنی تمیم کی برائی کی، حالانکہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہیں۔ ان میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے سچی بات سن کر فرمایا، تم نے سچ کہا اور ذکر خیر سے گذشتہ مذمت کی تلافی فرمائی۔ احنف کے بعد اسی قبیلہ کے ایک اور آدمی حتات نے کچھ کہنا چاہا، مگر حضرت عمرؓ نے روک دیا کہ تم بیٹھ جاؤ تمہاری جانب سے تمہارے سردار فرض ادا کرچکے۔

---

[1] استیعاب۔ جلد اول۔ ص ۵۵ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ۱۹۱ [3] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۶

حضرت عمرؓ کی صحبت :

اگر چہ حضرت عمرؓ نے احنف کی اصولی بات کی وجہ سے اس کا اعتراف کر لیا تھا لیکن ان کے قبیلہ کے ساتھ ان کو سوءِ ظن تھا۔ اس لئے بہ تقاضائے احتیاط احنف کی سیرت کا اندزہ لگانے کے لئے ان کو ایک سال تک اپنے ساتھ مدینہ میں رکھا اور تجربہ کے بعد ان سے کہا کہ میں نے ایک سال تک تمہارا تجربہ کیا، مجھ کو تم میں بھلائی کے سوا اور کوئی قابل اعتراض شے نظر نہ آئی۔ تمہارا ظاہر اچھا ہے امید ہے کہ باطن بھی اچھا ہوگا، میں نے یہ اس لئے کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو ڈرایا تھا کہ اس اُمت کی ہلاکت باخبر منافقین کے ہاتھوں ہوگی۔

ابوموسیٰ اشعریؓ والی بصرہ کو احنف کے بارہ میں حضرت عمرؓ کی ہدایت :

اس تجربہ کے بعد حضرت عمرؓ کو جب ان پر کامل اعتماد ہو گیا تو انہیں ان کے وطن بصرہ واپس کر دیا اور ابوموسیٰ اشعریؓ والی بصرہ کو ہدایت کر دی کہ ان کو اپنے ساتھ رکھنا، ان سے مشورہ لینا اور ان کے مشوروں اور ہدایتوں پر عمل کرنا[1]۔ احنف اہل بصرہ کے سردار تھے۔ حضرت عمرؓ کے اس حکم کے بعد سے احنف کے مراتب روز بروز بلند ہونے لگے[2]۔

فارس کی مہم میں شرکت :

اس وقت ایران پر فوج کشی ہو چکی تھی بصرہ واپس جانے کے بعد احنف اس میں شریک ہوئے چنانچہ ۱۷ھ میں فارس کی مہم میں نظر آتے ہیں[3]۔

اہل بصرہ کی نمائندگی :

احنف بڑے عاقل و مدبر تھے۔ اس لئے قومی و ملکی مہمات میں ان کا نام سر فہرست ہوتا تھا اور اکثر قوم کی نمائندگی کی خدمت ان کے سپرد ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں وہ بصرہ کے وفد میں مدینہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے وفد سے اہل بصرہ کی شکایتیں اور ضرورتیں پوچھیں۔ احنف نے جو ضروریات تھیں وہ پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تقریر بہت پسند کی اور خاندان کسریٰ کی بعض مفتوحہ جاگیریں انہیں عطا کیں اور والی بصرہ کو لکھ بھیجا کہ وہ انتظامی امور میں احنف سے صلاح و مشورہ کیا کریں اور ان پر عمل کیا کریں[4]۔ پھر اہواز کی فتح کے بعد مشہور ایرانی افسر ہرمزان کو جس نے خوزستان کی مہم میں سپر ڈال دی تھی لے کر مدینہ آئے[5]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۶ [2] اسد الغابہ۔ جلد اول۔ ص ۵۵ [3] ابن اثیر۔ جلد ۲۔ ص ۴۴۰
[4] ایضاً۔ جلد۔ ص ۲۲۴۔ ۲۲۵ [5] ابن اثیر۔ ص ۴۳۹۔ ۴۴۰

ایران پر عام فوج کشی کا مشورہ :

اس وقت عراق فتح ہو چکا تھا، لیکن ایران پر عام فوج کشی نہ ہوئی تھی اور مفتوحہ علاقے بار بار باغی ہو جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں مجاہدین کا وفد مدینہ آیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ ایرانی بار بار باغی کیوں ہو جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے مسلمان انہیں ستاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس کی تردید کی، لیکن کوئی حضرت عمرؓ کے سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔

احنف کا دماغ نہایت نکتہ رس تھا۔ یہ اصل تہ تک پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر المومنین نے مسلمانوں کو ایران کے اندرون ملک فوج کشی سے روک دیا ہے اور سلطنت کا وارث تاج و تخت ملک میں موجود ہے۔ جب تک وہ باقی رہے گا، ایرانی اس کے سہارے پر برابر بغاوت کرتے رہیں گے، کیونکہ ایک ملک میں دو حکومتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایران کا بادشاہ ایرانیوں کو اُبھارتا رہتا ہے، اس لئے جب تک ہم لوگ ایران کے اندر فوج کشی کر کے اس کو ختم نہ کر دیں گے اس وقت تک ایرانیوں کی یہی روش رہے گی۔ جب وہ لوگ اپنی حکومت سے بالکل مایوس ہو جائیں گے، اس وقت خاموش ہوں گے۔

حضرت عمرؓ نے ان کی تقریر کو سن کر فرمایا تم سچ کہتے ہو اور ان کے مشورہ کے مطابق ایران پر عام فوج کشی کے انتظامات شروع کر دیئے اور ہر ہر صوبے پر علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں[1]۔

یزدگرد کا استیصال :

چونکہ یزدگرد کے استیصال کا مشورہ احنف ہی نے دیا تھا اور وہ اپنے دل دماغ کے لحاظ سے اس مہم کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ اس لئے خراسان کی مہم جہاں یزدگرد پناہ گزیں تھا، حضرت عمرؓ نے انہی کے سپرد کی۔ یہ ۲۲ھ میں خراسان کی طرف بڑھے اور طبسین ہو کر ہرات پہنچے اور اس کو فتح کر کے مرو شاہجہاں کا جہاں یزدگرد مقیم تھا رخ کیا۔

وہ ان کی پیش قدمی کی خبر سن کر مروالروز چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر خاقان چین اور دوسرے سرحدی حکمرانوں کو مدد کے لئے خطوط لکھے یزدگرد کے مروالروز جانے کے بعد احنف مرو شاہجہاں میں حارثہ بن نعمان باہلی کو چھوڑ کر مرو کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ دیکھ کر یزدگرد یہاں سے بھی بھاگا اور بلخ پہنچا اس دوران میں کوفہ سے تازہ دم امدادی فوجیں آ گئیں، احنف نے انہیں لے کر بلخ پر حملہ کر دیا۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۳۳۹۔ ۳۴۰

یزدگرد شکست کھا کر دریا پار خاقان کے حدود حکومت میں چلا گیا۔ اس کے بعد احنف نے خراسان کے تمام علاقوں میں فوجیں پھیلا دیں خراسانی انہیں نہ روک سکے اور نیشاپور سے طخارستان تک کا پورا علاقہ صلحاً فتح ہو گیا اور احنف نے مروالروز واپس ہو کر حضرت عمرؓ کو فتح کا مژدہ لکھا۔ آپ فتوحات کا دائرہ ایران سے آگے نہیں بڑھانا چاہتے تھے، اس لئے دریا پار پیش قدمی کرنے سے روک دیا۔

یزدگرد کے حدود چین میں داخل ہونے کے بعد خاقان چین نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کی مدد کے لئے خراسان پہنچا اور سیدھا بلخ کی طرف بڑھا بلخ کی اسلامی فوجیں احنف کے ساتھ مروالروز واپس جا چکی تھیں، اس لئے یزدگرد اور خاقان دونوں بلخ ہوتے ہوئے مرو کی طرف بڑھے۔ یزدگرد شاہجہاں جہاں اس کا خزانہ تھا چلا گیا، احنف اور یزدگرد کا مقابلہ ہوا، احنف نے پہاڑ کے دامن میں صف آرائی کی۔ فریقین میں عرصے تک صبح شام معمولی جھڑپ ہوتی رہی۔

ایک دن احنف خود میدان میں نکلے، خاقان کی فوج سے ایک بہادر ترک طبل اور دمامہ بجاتا ہوا مقابل میں آیا۔ احنف نے اس کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد دو اور بہادر یکے بعد دیگرے مقابلہ میں آئے مگر دونوں احنف کی تلوار کا لقمہ بنے۔ اس کے بعد ترکوں کا پورا لشکر آگے بڑھا، خاقان کی نظر لاشوں پر پڑی اس نے فال بدلی، یزدگرد کی حمایت میں اس کا کوئی خاص فائدہ نہ تھا اور مسلمانوں کو زیر کرنا بھی آسان نہ تھا، اس لئے اس نے کہا ہم کو یہاں آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں، ہمارے بہت سے نامور بہادر قتل ہو چکے ہیں، ہم کو ان لوگوں سے لڑنے میں کوئی فائدہ نہیں نظر آتا اور فوج کو کوچ کا حکم دیدیا۔

اس وقت یزدگرد مروشاہجہاں میں تھا۔ اس کو خاقان کی واپسی کی خبر ملی تو اس کی ہمت چھوٹ گئی اور اس نے خزانہ لے کر ترکستان نکل جانا چاہا ایرانیوں نے اس کو اس ارادہ سے روکا اور کہا کہ ترکوں کا کوئی دین و مذہب نہیں ہے اور نہ ان کے عہد و پیمان کا ہمیں کوئی تجربہ ہے۔ مسلمان بہرحال مذہب اور عہد کے پابند ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو ملک ہی چھوڑنا ہے تو مسلمانوں سے صلح کر لیجئے۔ لیکن یزدگرد نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ ایرانیوں نے جب دیکھا کہ ان کے ملک کی دولت دوسرے ملک میں نکلی جا رہی ہے تو لڑ کر یزدگرد سے کل خزانہ چھین لیا اور وہ شکست کھا کر ترکستان چلا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ تک خاقان کے پاس مقیم رہا۔

یزدگرد کے ترکستان چلے جانے کے بعد ایرانیوں کا آخری سہارا بھی جاتا رہا اور انہوں نے مایوس ہو کر احنف سے صلح کر لی اور یزدگرد کا کل خزانہ ان کے حوالہ کر دیا۔ احنف نے ان کے ساتھ ایسا شریفانہ برتاؤ کیا کہ انہیں اس کا افسوس ہوا کہ وہ اب تک مسلمانوں کی حکومت سے کیوں محروم ہے۔

ایک پُر اثر تقریب :

اس مصالحت کے بعد احنف نے حضرت عمرؓ کو فتح کی اطلاع بھجوائی اور مسلمانوں کو جمع کر کے ایک پُر اثر تقریر کی، جو اپنی اثر پذیری کے اعتبار سے آج بھی مسلمانوں کے لئے درس بصیرت ہو سکتی ہے تقریر یہ تھی :

''مسلمانو! آج جو مجوسیوں کی حکومت برباد ہو گئی اور اب ان کے قبضہ میں ان کے ملک کا ایک چپہ بھی باقی نہیں رہا کہ وہ مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکیں۔ خدا نے اب تم کو ان کی زمین، ان کے ملک اور ان کے اہل ملک کا وارث بنایا ہے، تا کہ تمہارا امتحان لے۔ اگر تم بدل گئے تو خدا بھی تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا۔ مجھے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے ان کی بربادی کا خوف ہے''[1]۔

عہد عثمانی : حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب ایران میں بغاوت ہوئی اور خراسان مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اس وقت احنف ہی نے فوج کشی کر کے دوبارہ اس پر قبضہ کیا[2]۔

خانہ جنگی سے اجتناب اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں پر بیعت :

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا اور اس وقت احنف نے اپنی تلوار میان میں کر لی۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ میں اختلاف شروع ہوئے اس وقت احنف نے جو مکہ میں تھے حضرت عائشہؓ طلحہؓ اور زبیرؓ سے مل کر اصل حقیقت کا اندازہ کر کے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی[3]۔ لیکن جنگ میں کسی جانب سے حصہ نہ لیا[4]۔ حضرت عائشہؓ نے بھی انہیں اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی، لیکن اس وقت وہ بیعت کر چکے تھے۔

جنگ صفین میں شرکت :

البتہ جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں جنگ چھڑی اس وقت ان کی حق شناس تلوار میان میں نہ رہ سکی اور انہوں نے حضرت علیؓ کی حمایت میں نہایت پرجوش حصہ لیا اور اہل بصرہ کو ان کی امداد و اعانت پر آمادہ کیا[5]۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۲۶۔۲۹ ملخصاً [2] ایضاً۔ ص ۹۶۔۹۹ [3] ابن اثیر۔ جلد ۲۔ ص ۱۹۵
[4] اخبار الطوال۔ ص ۱۵۷ [5] ایضاً۔ ص ۱۶۵

جنگ صفین کے التواء پر جب تحکیم کا مسئلہ پیش ہوا اور حضرت علیؓ کی جانب سے ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام لیا گیا اس وقت احنف نے سخت مخالفت کی اور کہا آپ کو عرب کے مدبر اعظم سے سابقہ پڑا ہے، ابو موسیٰ کا مجھ کو خوب تجربہ ہے وہ اس اہم کام کے اہل نہیں ہیں۔ اس کے لئے نہایت چالاک اور عاقل شخص کی ضرورت ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ مجھے حکم بنائیے اور اگر اس کے لئے صحابی ہونا ضروری ہے تو آپ کسی اور صحابی کو منتخب کیجئے اور مجھ کو اس کا مشیر بنائیے۔

لیکن عراقی قوم کا فیصلہ ابو موسیٰؓ کے حق میں تھا اس لئے حضرت علیؓ احنف کے خیر خواہانہ اور زرین مشورہ پر عمل پیرا نہ ہو سکے[1]۔ جنگِ صفین کے بعد خوارج پر فوج کشی میں بھی حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور کئی ہزار اہلِ بصرہ آپ کی مدد کے لئے گئے[2]۔

امیر معاویہؓ کی اطاعت اور آزادیٔ رائے:

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ کی خلافت تسلیم کر لی، لیکن اس وقت بھی انہوں نے آزادی اور حق گوئی کا جوہر قائم رکھا اور امیر معاویہؓ کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے نزدیک ان کا جو فعل درست نہیں ہوتا تھا اس پر نہایت جرأت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے جب یزید کی ولیعہدی کے لئے تمام ممالک محروسہ سے وفود طلب کیے تو احنف بھی بصرہ کے وفد کے ساتھ آئے۔ امیر معاویہؓ نے ان سے بھی یزید کی ولیعہدی کے بارہ میں پوچھا۔

انہوں نے کہا امیر المومنین آپ یزید کے شبانہ یوم کے مشاغل، اس کے ظاہر اور مخفی حالات، اس کے آنے جانے کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر اس واقفیت کے بعد بھی آپ اس کو خدا اور اُمت محمدی کے لئے بہتر سمجھتے ہیں تو اس میں مشورہ کی ضرورت نہیں۔ اور اگر بہتر نہیں سمجھتے تو ایسی حالت میں کہ آپ کو عنقریب آخرت کا سفر پیش آنے والا ہے، یزید کو دنیا کا توشہ نہ دیجئے۔ ورنہ یوں ہمارا فرض ہے کہ آپ جو کچھ فرمائیں ہم اُس کو بجا لائیں[3]۔

امیر معاویہؓ پر ان کا اثر:

لیکن ان کی حق پرستی اور صاف گوئی کے باوجود امیر معاویہ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے، اور بڑے بڑے عمال کو ان کے اشارہ پر معزول کر دیتے تھے۔ عبید اللہ بن زیاد امیر معاویہ کے نہایت معتمد علیہ اور ان عمال میں تھا، جنہوں نے اُموی حکومت کی بنیاد مستحکم کی تھی۔ اس کا طرزِ عمل احنف کے ساتھ

---

[1] اخبار الطوال، ص ۲۰۶ [2] ابن اثیر، جلد ۳، ص ۲۸۲ [3] ایضاً، ۴۲۱

پسندیدہ نہ تھا۔ ۵۹ھ میں عبیداللہ چند عمائد کوفہ کے ساتھ جس میں احنف بھی تھے، امیر معاویہ کے پاس شام آیا۔ امیر معاویہ حسب معمول احنف کے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آئے اور انہیں اپنے ساتھ تخت شاہی پر بٹھایا۔ عمائد بصرہ نے عبیداللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے امیر معاویہ کے سامنے اس کی بڑی تعریفیں کیں۔ احنف کی رائے ان سب کے خلاف تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہے۔

امیر معاویہ نے پوچھا! ابو بحر تم کیوں نہیں بولتے۔ انہوں نے جواب دیا، اگر میں بولوں گا تو قوم کی مخالفت ہوگی۔ ان کا خیال سن کر امیر معاویہ نے اسی وقت عبیداللہ کو معزول کر دیا اور اہل بصرہ سے کہا تم لوگ جس والی کو پسند کرتے ہو، اس کو پیش کرو، ان لوگوں نے امیر معاویہ کی خوشامد میں اموی خاندان اور شامیوں میں سے انتخاب کیا۔ احنف اس وقت بھی خاموش رہے اور کسی کو پیش نہیں کیا۔ امیر معاویہ نے پیش کرنے والوں سے پوچھا تم نے کسے منتخب کیا، چونکہ ان میں سے ہر شخص کا انتخاب جداگانہ تھا اس لئے کسی ایک شخص پر اتفاق نہ ہو سکا۔ احنف بالکل خاموش تھے۔ امیر معاویہؓ نے ان سے کہا تم کیوں نہیں بولتے۔

یہ منتخب کرنے والوں کا رنگ دیکھ چکے تھے، اس لئے انہوں نے کہا اگر آپ کو اپنے خاندان والوں میں سے کسی کو والی بنانا ہے تو ایسی صورت میں ہم عبیداللہ ہی کو ترجیح دیں گے اور اگر کسی تیسرے شخص کو بنانا ہو، اس میں جو آپ کی رائے ہو۔ ان کا منشا سن کر معاویہ نے عبیداللہ ہی کو برقرار رکھا اور اس کو احنف کے نظر انداز کرنے پر ملامت اور آئندہ ان کے ساتھ حسن عمل کی تاکید کی [1]۔

یزید کی خلافت :

امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد احنف نے یزید کی خلافت تسلیم کر لی۔ حضرت امام حسینؓ جب یزید کے مقابلہ کے لئے اٹھے تو احنف کو بھی امداد کے لئے خط لکھا [2]۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا اور یزید کی بیعت پر قائم رہے۔

ابن زبیرؓ کی حمایت :

یزید کی موت کے بعد جب اموی حکومت میں انقلاب برپا ہوا اور عراق سے اموی حکومت اٹھ گئی، اس وقت بصریوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کے قبیلہ بنی تمیم اور بعض دوسرے قبائل میں کچھ ہنگامہ آرائیاں ہوئیں، پھر جب عراق عبداللہ بن زبیرؓ کے قبضہ میں آگیا، اس وقت احنف ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کے زمانہ میں بھی احنف کا قدیم اعزاز و وقار قائم رہا۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۴۳۱ [2] اخبار الطوال۔ ص ۲۴۶

ابن زبیرؓ کے حکام ان سے صلاح و مشورہ کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ جب عراق میں خوارج کا زور بڑھا اور اس کا اثر بصرہ تک پہنچا، اس وقت احنف ہی کی تحریک سے مشہور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ خوارج کے مقابلہ پر مامور کیے گئے[1]۔

عبداللہ بن زبیرؓ کے دور خلافت میں مختار ثقفی نے جب عراق پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اس وقت احنف نے ابن زبیرؓ کی حمایت میں مختار کے داعی مثنیٰ کو عراق سے نکالا[2]۔ لیکن رفتہ رفتہ جب عراق میں مختار کا اثر نفوذ کرنے لگا، اس وقت احنف نے ابن زبیر کے بھائی مصعب کے ساتھ مل کر مختار کے آدمیوں کا مقابلہ کیا[3]۔

اسی زمانہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کے اصل حریف عبدالملک اُموی نے احنف کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، لیکن گزشتہ تجربات کے بعد سے یہ اُمویوں کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے نہایت سخت جواب دیا کہ ابن زرقاء مجھے شامیوں کی دوستی کی دعوت دیتا ہے، خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ میرے اور اس کے درمیان آگ کا پتھر حائل ہو جاتا کہ نہ اُس کے آدمی اِدھر آسکتے اور نہ میرے آدمی اُدھر جاسکتے[4]۔

وفات : عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی مصعب والی کوفہ کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ احنف ان سے ملنے کے لئے کوفہ گئے، یہیں انتقال ہو گیا[5]۔ ابن عماد حنبلی کے مطابق یہ ۷۲ھ تھا[6]۔

فضل و کمال : علمی اعتبار سے احنف کوئی قابل ذکر شخصیت نہ رکھتے تھے، تاہم اکابر صحابہ کی صحبت اُٹھائی تھی، اس لئے علم سے تہی دامن نہ تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن سعدؓ اور حضرت ابوذرؓ جیسے اجل صحابہ سے انہوں نے سماع حدیث کیا تھا اور ان سے ان کی روایت موجود ہیں۔ خود ان سے استفادہ کرنے والوں میں حسن بصری، ابوالعلاء بن شخیر اور طلق بن حبیب وغیرہ لائق ذکر ہیں[7]۔

عقل و دانش : ان کی فضیلت کا میدان مسند علم کے بجائے خارزار سیاست تھا۔ وہ اپنے عہد کے بڑے عاقل مدبر حلیم تھے[8]۔ ان کے بارہ میں لوگوں کی رائے تھی کہ کسی قوم میں احنف سے بہتر شریف نہیں دیکھا گیا[9]۔ جب ان کی وفات ہوئی تو مصعب نے کہا آج سے حزم اور رائے کا خاتمہ ہو گیا[10]۔

---

۱ اخبار الطوال۔ ص ۲۸۱ ۲ ابن اثیر۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۳ ۳ اخبار الطوال۔ ص ۲۱۲ ۴ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۸ ۵ ایضاً۔ ص ۶۹ ۶ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ۷۸ ۷ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۹۱
۸ استیعاب۔ جلد۔ ص ۵۵ ۹ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ۶۷ ۱۰ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۹۱

عبادت وریاضت :

عام طور سے غیر معمولی عقل ودانش اور تدبر کے ساتھ زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کا اجتماع کم ہوتا ہے، لیکن احنف جس درجہ کے مدبر تھے اسی درجہ کا ان میں زہد وتقویٰ تھا۔ ان کی عبادت کا خاص وقت پردۂ شب تھا۔ جب دنیا خواب شیریں کے مزے لیتی تھی، اس وقت وہ اپنے رب کے حضور میں اظہار عبودیت کرتے تھے، اسی وقت وہ اپنے اعمال کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ ابومنصور کا بیان ہے کہ احنف کی نماز کا وقت عموماً رات کو ہوتا تھا۔ وہ چراغ جلا کر اس کی لو پر انگلی رکھتے اور نفس سے خطاب کر کے کہتے "تجھ کو فلاں فلاں دن فلاں فلاں کام کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا"[1]۔

ضعف پیری میں جب کہ قوی روزے کے متحمل نہ رہ گئے تھے، ان کے ایک ملنے والے یزید نے کہا کہ اب آپ کے قویٰ بہت ضعیف ہو گئے ہیں، روزے آپ کو اور زیادہ کمزور کر دیں گے۔ جواب دیا، میں اس کو ایک بہت لمبے سفر کے لئے تیار کرتا ہوں[2]۔

قرآن : قرآن کی تلاوت سے خاص شغف تھا۔ جب تنہائی ہوتی فوراً قرآن لے کر بیٹھ جاتے[3]۔ ان عبادتوں پر بھی پورا اعتماد نہ تھا۔ خدا سے عرض کیا کرتے تھے، خدایا اگر تو میری مغفرت کر دے تو یہ تیری رحمت ہے اور اگر سزا دے تو میں اس کا مستحق ہوں[4]۔

طہارت میں غلو :

طہارت میں اتنا غلو تھا کہ سخت موسم میں بھی تیمم نہ کرتے تھے اور برف آلود پانی کی ٹھنڈک برداشت کر لیتے تھے۔ خراسان کی مہم کے زمانہ میں ایک شب کو نہانے کی حاجت ہو گئی، سردی کا موسم تھا وہ بھی خراسان کی سردی، رات بھی ٹھنڈی تھی۔ احنف نے کسی خادم اور سپاہی تک کو نہ جگایا اور اسی وقت تن تنہا پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں، ان کو روندتے ہوئے آگے بڑھے، کانٹوں کی خراش سے دونوں پاؤں لہولہان ہو گئے، بالآخر ایک برف کی تہ تک پہنچے اور اس کو توڑ کر برف آلود پانی سے غسل کیا[5]۔

حق گوئی : نہایت حق گو اور حق پرست تھے۔ سلاطین اور امراء کے سامنے بھی ان کی زبان اظہار حق میں باک نہ کرتی تھی۔ یزید کی ولیعہدی کے مسئلہ میں اظہار رائے کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔ ایک اور

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ۶۷ ۲؎ ایضاً۔ ۶۸ ۳؎ ایضاً۔ ۶۷ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۹
۵؎ ایضاً۔ ۷۰

کسی موقع پر اسی قبیل کا کوئی اختلافی مسئلہ پیش آیا تھا اور لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے تھے، لیکن احنف خاموش تھے۔ امیر معاویہؓ نے ان سے کہا ابو بحر تم بھی کچھ بولو۔ انہوں نے کہا، کیا بولوں اگر جھوٹ بولتا ہوں تو خدا کا خوف ہے اور اگر سچ بولتا ہوں تو تم لوگوں کا ڈر ہے[۱]۔

حلم : ضبط و تحمل ان کا خاص وصف تھا۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بہ کثرت ہیں ان کا حلم ضرب المثل تھا[۲]۔ لیکن خود ہمیشہ انکساراً کہتے تھے کہ میں حقیقتہً حلیم نہیں ہوں بلکہ اپنے کو حلیم دکھانا چاہتا ہوں[۳]۔

بعض اصول : احنف کے بعض اصول ایسے تھے کہ وہ ہر شخص کے لئے لائق عمل ہیں۔ فرماتے تھے کہ میں تین کاموں کے کرنے میں زیادہ جلدی کرتا ہوں۔ نماز پڑھنے میں، جب اس کا وقت آجائے۔ جنازہ دفن کرنے میں اور لڑکی کی شادی کرنے میں، جب اس کی نسبت ہو جائے[۴]۔

اجمال تبصرہ : ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ سادات تابعین میں تھے۔ ان کا حلم مثالاً پیش کیا جاتا تھا۔ حسن بصری فرماتے تھے کہ میں نے کسی قوم کے شریف کو احنف سے افضل نہیں پایا۔ انہوں نے متعدد خلفاء کا عہد پایا تھا[۵]۔

ان میں سے کسی خلیفہ نے ایک شخص سے ان کے اوصاف پوچھے، اس نے کہا اگر آپ ایک وصف سننا چاہتے ہوں تو ایک بتاؤں، اگر دو چاہتے ہوں تو دو بتاؤں، اگر تین چاہتے ہوں تو تین بتاؤں۔ خلیفہ نے کہا دو بتاؤ۔ اس شخص نے کہا وہ بھلائی کرتے تھے اور بھلائی کو پسند کرتے تھے اور شر سے بچتے تھے اور اس سے بغض رکھتے تھے۔ خلیفہ نے کہا اچھا تین اوصاف بتاؤ اس شخص نے کہا کسی پر بیجا زیادتی اور ظلم نہیں کرتے تھے اور کسی کو اس کے حق سے نہیں روکتے تھے۔ خلیفہ نے کہا ایک وصف بیان کرو اس شخص نے کہا کہ وہ اپنے نفس کے سب سے بڑے حکمران تھے[۶]۔

(۴) اسمٰعیل بن ابی خالد احمسیؒ

نام و نسب : اسمٰعیل نام ہے۔ ابو عبداللہ کنیت۔ قبیلہ بجیلہ کی شاخ بنی احمس کے غلام تھے۔ اسی نسبت سے احمسی کہلاتے ہیں۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق چھ صحابہ کو دیکھا تھا۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۷ ۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ا۔ ص ۹۱ ۳ ابن سعد۔ جلد ۔ ق اول۔ ص ۶۷
۴ ایضاً۔ ص ۱۶۵ ۵ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۷۸ ۶ ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۰

انس بن مالک، ابن ابی اوفی، ابو کاہل، ابو جحیفہ، عمرو بن حریث اور طارق بن شہاب[1]۔ اور ابو نعیم کی روایت کے مطابق بارہ کو[2]۔

فضل وکمال : فضل وکمال کے اعتبار سے کبار تابعین میں تھے۔ عامر کہتے تھے، انہوں نے علم کو پی لیا ہے[3]۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[4]۔

حدیث : حدیث میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ حجت تھے، متقن تھے، مکثر تھے اور عالم تھے[5]۔ تمام بڑے بڑے علماء ان کے حفظ حدیث کے معترف تھے۔ سفیان ثوریؒ کہتے تھے کہ حفاظ ہمارے نزدیک چار ہیں۔ عبدالملک بن ابی سلیمان، اسمٰعیل بن ابی خالد، عاصم الاحول اور یحییٰ ابن سعد انصاری[6]۔ امام شعبی کے تمام ساتھیوں میں ابو حاتم ان پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے[7]۔ اپنی صداقت کی وجہ سے میزان کہے جاتے تھے[8]۔

صحابہ میں انہوں نے اپنے والد ابو خالدؓ اور ابو جحیفہؓ، عبداللہ بنؓ ابی اوفی، عمرو بن حریث اور ابو کاہلؓ سے سماع کیا تھا اور غیر صحابہ میں زید بن وہب، محمد بن سعد، ابی بکر بن عمارہ، قیس بن ابی حازم، اشبیل بن عوف، حارث بن شبیل، طارق بن شہاب اور شعبی وغیرہ سے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شعبہ دونوں سفیان، زائدہ، ابن مبارک، ہشیم، یزید بن ہارون اور یحییٰ القطان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[9]۔

ابن مدائنی کے مطابق ان کے مرویات کی تعداد تین سو ہے[10]۔ اور عجلی کے بیان کے مطابق پانچ سو کے قریب[11]۔

عمل کا درجہ : علم کے ساتھ عمل کے لباس سے بھی آراستہ تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ باعمل علماء میں تھے[12]۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ شیخ صالح تھے[13]۔

کسب حلال : علمائے اسلام کا یہ خاص امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے علم کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اسمٰعیل بھی انہی علماء میں تھے اور آٹا پیسنے کی چکی چلا کر رزق پیدا کرتے تھے[14]۔

وفات : ۱۴۶ھ میں وفات پائی[15]۔

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۹۲ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۶۰ ۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۱۲۱
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۴۰ ۵، ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۹۱ ۷۔ تہذیب الاسماء۔ ص ۱۲۱
۸، ۹۔ ابن سعد۔ جلد ۲۴۰ ۱۰۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۱۲۱ ۱۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۹۲
۱۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۲۸ ۱۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۹۳ ۱۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۸
۱۵۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۴۰

(۵) اسود بن یزیدؒ

نام ونسب : اسود نام ہے۔ ابوعمر کنیت۔ والد کا نام یزید تھا۔ نسب نامہ یہ ہے : اسود بن یزید بن قیس بن عبداللہ بن مالک بن علقمہ بن سلامان بن کہیل بن بکر بن عوف بن نخع نخعی۔

فضل وکمال : فضل وکمال اور زہد وعبادت کے لحاظ سے اسود کوفہ کے ممتاز ترین علماء میں تھے۔ حافظ ذہبی انہیں زاہد وعابد اور کوفہ کا عالم لکھتے تھے[1]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[2]۔

حدیث : حدیث کے ممتاز حفاظ میں تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حذیفہؓ، ابومحذورہؓ اور موسیٰؓ جیسے اکابر کی صحبت اور ان سے استفادہ کا موقع ملا تھا[3]۔ حضرت عمرؓ اور عائشہؓ کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ زیادہ تعلقات تھے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ زیادہ رہتے تھے[4]۔ حضرت عائشہ سے عقیدت مندانہ تعلقات تھے[5]۔ مذکورہ بالا تمام بزرگوں سے انہوں نے روایتیں کی ہیں۔

تلامذہ : ان کی ذات سے ان کا پورا گھرانا دولت علم سے مالا مال ہو گیا تھا۔ ان کے بھانجے ابراہیم نخعی، بھائی عبدالرحمٰن اور چچیرے بھائی علقمہ جو آسمان علم کے روشن ستارے تھے، ان ہی کے فیض یافتہ تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں عمارہ بن عمیر، ابواسحٰق سبیعی، ابوبردہ بن ابوموسیٰ، محارب بن دثار اور اشعث بن ابی الشعثاء وغیرہ نے ان سے سماع حدیث کیا تھا[6]۔

فقہ : فقہ میں بھی درک حاصل تھا۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ فقیہ تھے[7]۔ حافظ ذہبی اور ابن حجر وغیرہ سب آپ کے تفقہ کے معترف ہیں۔

عبادت وریاضت :

علم سے بڑھ کر آپ کا عمل یعنی زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت تھی۔ تابعین کی جماعت میں آٹھ بزرگ زہد وعبادت میں زیادہ ممتاز اور مشہور تھے۔ ان میں ایک نام اسود کا ہے[8]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ عبادت میں وہ بڑے درجہ پر تھے[9]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۴۳ ۲؎ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق اول۔ ص ۱۲۲ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۳۴۲
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۴۸ ۵؎ ایضاً ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۳۴۲ ۷؎ ایضاً
۸؎ ابن عساکر۔ جلد ۳۔ ص ۱۰۰۸ ۹؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۴

نماز : نماز مشغلہ زندگی تھا۔ سات سو نوافل روزانہ پڑھتے تھے[۱]۔ نماز ہمیشہ اول وقت ادا کرتے تھے۔ اس میں اس قدر اہتمام تھا کہ کسی کام اور کسی حالت میں بھی ہوتے، نماز کا وقت آتے ہی کام چھوڑ کر فوراً نماز ادا کرتے۔ ان کے سفر کے ہمراہیوں کا بیان ہے کہ سفر کی حالت میں بھی خواہ کیسے ہی دشوار گزار راستے سے جارہے ہوں، نماز کا وقت آنے کے ساتھ سواری روک کر نماز پڑھتے، تب آگے بڑھتے[۲]۔

روزے : روزوں سے بھی یہی شغف وانہماک تھا۔ قریب قریب ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ ایسے سخت موسم میں بھی روزہ نہ چھوٹتا، جب سرخ اونٹ جیسا قوی اور گرمی برداشت کرنے والا جانور گرمی کی شدت سے بے حال ہوجاتا ہے۔ سفر میں روزوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض اوقات سفر کی تکالیف اور پیاس کی شدت سے رنگ بدل جاتا تھا اور زبان سوکھ کر کانٹا ہوجاتی تھی، لیکن روزہ نہیں چھوٹتا تھا۔ اس عبادت شاقہ کی وجہ سے آنکھ جاتی رہی تھی۔ اگر لوگ کہتے کہ جسم کو اتنی تکلیف نہیں دیجئے تو جواب دیتے تکلیف نہیں بلکہ راحت پہنچانا چاہتا ہوں[۳]۔

حج : حج کے ذوق کا یہی حال تھا۔ حجوں کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا شاید کوئی سال حج سے ناغہ نہیں ہوا۔ باختلاف روایت آپ کے حجوں اور عمروں کی مجموعی تعداد ستر سے اسی تک ہے۔ کبھی کبھی ولولہ شوق میں کوفہ ہی سے احرام باندھ کر "لبیک غفار الذنوب اور لبیک وحنانیک" کی صدا لگاتے ہوئے روانہ ہوتے تھے لیکن یہ دائمی عمل نہ تھا، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات میں احرام باندھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ مکہ میں عموماً شب کے وقت داخل ہوتے تھے۔ آپ کو طواف کوئے محبوب سے ایسا والہانہ شغف تھا، اور اس بارہ میں اس قدر متشدد تھے کہ جو شخص حج کی استطاعت رکھتے ہوئے حج نہیں کرتا تھا، اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھتے تھے[۴]۔

تلاوت قرآن : قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ معمول تھا۔ رمضان کے مہینہ میں قرآن کا ورد بہت بڑھ جاتا تھا۔ مغرب عشاء کے درمیان سوتے رہتے تھے۔ اس کے بعد اٹھ کر ساری رات قرآن پڑھتے تھے اور دو راتوں میں قرآن ختم کردیتے تھے[۵]۔

اختلاف مسلک اور اتحاد روابط :

آج ادنیٰ سے اختلاف مسلک پر ہر قسم کے معاشری اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان بزرگوں کا یہ اسوہ لائق تقلید ہے کہ اختلاف مسلک کے باوجود ان میں باہم روابط قائم رہتے تھے،

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۳ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۶ ص ۴۷ ۳۔ ایضاً۔ ص ۴۸
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۴۷۔ ۴۸ ۵۔ ایضاً

اسود حضرت عمرؓ کی خدمت میں زیادہ رہنے کی وجہ سے ان کے تبع تھے اور علقمہ عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب میں تھے لیکن جب دونوں میں ملاقات ہوتی تھی تو ادنی اختلاف بھی نہ ہوتا تھا[1]۔

وفات : ۷۵ھ میں وفات پائی معمولات کی پابندی میں یہ اہتمام تھا کہ مرض الموت میں بھی تلاوت قرآن میں فرق نہ آیا چنانچہ اس وقت بھی جب جنبش کرنے کی سلت باقی نہ تھی اپنے بھانجے ابراہیم نخعی کا سہارا لے کر قرآن پڑھتے تھے دم آخر ہدایت کی کہ مجھے کلمہ طیبہ کی تلقین کرنا تاکہ میری زبان سے آخری کلمہ لاالٰہ الا اللہ نکلے[2]۔

حلیہ اور لباس : آخر عمر میں بال سفید ہو گئے تھے سر اور داڑھی دونوں میں زرد خضاب کرتے تھے اونچی ٹوپی پہنتے تھے سیاہ رنگ کا عمامہ باندھتے تھے۔ اس کا شملہ پیچھے پڑا رہتا تھا[3]۔

(۶) اعمش (سلیمان بن مہرانؒ)

نام و نسب : سلیمان نام ہے۔ ابو محمد کنیت۔ اعمش کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام مہران تھا، مہران عجمی النسل تھے۔ ان کا آبائی وطن طبرستان تھا۔ یک روایت یہ ہے کہ مہران دیلم کے کسی معرکہ میں گرفتار ہوئے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ اعمش کو کوفہ کے بنی کاہل کے ایک شخص نے خریدا تھا اور خرید کر آزاد کر دیا۔ بہر حال اتنا مسلم ہے کہ اعمش ابتدا میں غلام تھے، اور اس غلامی کی نسبت سے وہ کاہلی اور اسدی کہلاتے ہیں۔

پیدائش : اعمش حضرت حسینؓ کی شہادت کے دن یعنی عاشورہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے[4]۔

فضل و کمال :

اگرچہ اعمش کا آغاز غلامی سے ہوا لیکن ان میں تحصیل علم کی فطری استعداد تھی۔ خوش قسمتی سے مرکز علم کوفہ میں ان کی نشو و نما ہوئی، اس لیے آگے چل کر وہ کوفہ کی مسند علم و افتا کی زینت بنے ان کے علمی کمالات پر تمام ارباب سیر و طبقات کا اتفاق ہے، ابن حجر اور حافظ ذہبی ان کو عابد مرتاض الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں[5]۔ عیسیٰ بن یونس کہتے تھے کہ ہم نے اور ہمارے قبل والے قرن کے لوگوں نے اعمش کا مثل نہیں دیکھا[6]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۴۸ ۲؎ ایضاً۔ ص ۵۰ ۳؎ ایضاً۔ ۵۹

۴؎ طبقات ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۲۹ ۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸ و تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۳

۶؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۸

ان کو جملہ مذہبی علوم میں یکساں دستگاہ حاصل تھی، ابن عیینہ کا بیان ہے کہ اعمش کتاب اللہ کے بڑے قاری احادیث کے بڑے حافظ اور علم فرائض کے ماہر تھے[۱]۔

قرآن کے ساتھ ان کو خاص ذوق تھا، اور علوم قرآنی میں وہ راس العلم شمار کیے جاتے تھے[۲]۔ ہشیم کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ میں اعمش سے بڑا قرآن کا قاری نہیں دیکھا[۳]۔ قرآن کا مستقل درس دیتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں کبرسنی کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، لیکن شعبان میں تھوڑا قرآن ضرور سناتے تھے۔ قرأت میں وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پیرو تھے۔ ان کی قرأت اتنی مستند تھی کہ لوگ اس کے مطابق اپنے قرآن درست کرتے تھے[۴]۔

حدیث: حدیث رسول میں اُن کے معلومات کا دائرہ نہایت وسیع تھا حافظ ذہبی انہیں شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ ابن مدائنی کا بیان ہے کہ محمد ﷺ کی اُمت میں چھ آدمیوں نے علم (حدیث) کو محفوظ کیا مکہ میں ابن دینار، مدینہ میں زہری، کوفہ میں ابواسحٰق سبیعی اور اعمش اور بصرہ میں قتادہ اور یحییٰ بن کثیر نے[۵]۔ ابوبکر عیاش کا بیان ہے کہ ہم لوگ اعمش کو سید المحدثین کہتے تھے[۶]۔

ان کی مرویات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ابن مدائنی کے بیان کے مطابق انکی تعداد تیرہ سو ہے[۷]۔ اور بعض دوسری روایات کے مطابق چار ہزار۔ محدث زہری اہل عراق کے علم کے قائل نہ تھے۔ اسحٰق بن راشد نے ایک مرتبہ اُن سے کہا کہ کوفہ میں اسد کا ایک غلام ہے، جس کو چار ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ زہری نے تعجب سے پوچھا چار ہزار، اسحٰق نے کہا ہاں چار ہزار، اگر آپ کہیں تو میں اس کا کچھ حصہ لاکر آپ کے سامنے پیش کردوں۔

چنانچہ انہوں نے اعمش کی مرویات کا کچھ حصہ ان کے سامنے پیش کیا۔ زہری اس کو پڑھتے جاتے تھے، اور حیرت سے ان کا رنگ بدلتا جاتا تھا مجموعہ ختم کرنے کے بعد بولے خدا کی قسم اسے علم کہتے ہیں مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ کسی کے پاس اتنا علم محفوظ ہوگا[۸]۔ شعبہ کہتے تھے کہ حدیث میں مجھ کو جو تشفی اعمش سے ہوئی وہ کسی سے نہیں ہوئی[۹]۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کی احادیث خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظہ میں زیادہ محفوظ تھیں۔ قاسم بن عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ کوفہ میں اعمش سے زیادہ عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث کا جاننے والا نہیں ہے[۱۰]۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول ص ۱۳۸ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۳ ۳۔ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۶
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۲۸ ۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۳ ۶۔ خطیب بغدادی۔ جلد ۹۔ ص ۱۱
۷۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۱ ۸۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۹ ۹۔ تاریخ خطیب جلد ۹۔ ص ۱۰
۱۰۔ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۱۰

مرویات کا پایہ :

ان کی مرویات کیفیت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجہ کی تھیں چنانچہ وہ اپنی صداقت اور روایتوں کے معیار کی بلندی کے اعتبار سے مصحف کہے جاتے تھے[1]۔ ابن عمار کہتے تھے کہ محدثین میں اعمش سے زیادہ اثبت کوئی نہیں[2]۔ جریر ان کی روایات کو دیبائے خسروانی کہتے تھے[3]۔

احتیاط : اس علم کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑے محتاط تھے، اور زیادہ حدیث بیان کرنا اچھا نہ سمجھتے تھے، لوگوں سے کہتے تھے کہ جب تم لوگ (حدیث سننے کے لئے) کسی کے پاس جاتے ہو تو اُس کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہو۔ خدا کی قسم یہ لوگ اشر الناس ہیں۔

شیوخ وتلامذہ :

حدیث میں انہوں نے زیادہ تر عبداللہ بن مسعودؓ ان کے بعد انس بن مالکؓ، عبداللہ ابن ابی اوفی، زید بن وہب، ابو وائل، ابو عمر شیبانی، قیس بن ابی حازم، اسمٰعیل بن رجاء، ابو صخرہ، جامع بن شداد، ابوذبیان بن جندب، امام شعبی، ابراہیم نخعی اور مجاہد بن جبیر وغیرہ سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے تلامذہ میں حکم بن عتیبہ، زبید الیامی، ابو اسحٰق سبیعی، سلیمان تیمی، سہیل بن ابو صالح، محمد بن واسع، شعبہ، ابراہیم بن طہمان اور جریر بن حازم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محدثین کے مراتب پر نظر :

حدیث میں ان کے کمال کی ایک سند یہ بھی ہے کہ وہ اس عہد کے بڑے بڑے محدثین کے علم پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اور ان کے نزدیک سب کا ایک خاص درجہ متعین تھا، ابو بکر بن عیاش کا بیان ہے کہ ہم لوگ اور محدثین کے پاس سے ہو کر آخر میں اعمش کے پاس جاتے تھے، وہ ہم سے سوال کرتے کس کے پاس سے آئے ہو؟ ہم بتاتے کہ فلاں شخص کے پاس سے نام سن کر وہ کہتے وہ پھٹا ہوا طبل ہے۔ پھر پوچھتے، ان کے بعد کہاں گئے۔ ہم لوگ بتاتے فلاں کے پاس۔ وہ کہتے وہ اُڑنے والے طائر ہیں۔ پھر پوچھتے، ان کے بعد ہم لوگ نام بتاتے وہ فرماتے وہ دف ہیں[4]۔

فقہ وفرائض : فقہ وفرائض میں بھی پورا درک رکھتے تھے، فقہاء ان کو اپنا سردار کہتے تھے[5]۔ فرائض میں خصوصیت کے ساتھ بڑی مہارت رکھتے تھے، ابن عیینہ کا بیان ہے کہ وہ فرائض کے بڑے عالم تھے۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۳ ۳؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۱۰
۴؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۱۱ ۵؎ ایضاً۔ ص ۸

ان سے پہلے ابراہیم فرائض کے عالم مانے جاتے تھے اور لوگ اس فن میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے ان کی وفات کے بعد اعمش کی ذات مرجوعہ بن گئی تھی [۱]۔

عبادو ریاضت :

علم کے ساتھ وہ عمل میں بھی یہی درجہ رکھتے تھے۔ یحییٰ قطان کا بیان ہے کہ وہ عابد وزاہد تھے [۲]۔ یحییٰ بن سعید انہیں عبادوقت میں شمار کرتے تھے۔ خریبی کا بیان ہے کہ اعمش نے اپنے بعد کسی کو اپنے سے بڑا عبادت گذار نہیں چھوڑا [۳]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علم نافع اور عمل صالح دونوں کے سردار تھے [۴]۔ نماز باجماعت میں یہ اہتمام تھا کہ ستر ۷۰ سال تک تکبیر اولیٰ تک قضا نہیں ہوئی [۵]۔

امراء سے استغناء اور بے نیازی :

اعمش خاصان خدا اور صلحائے امت کی طرح دولت دنیا سے بالکل تہی دامن تھے معیشت کی طرف سے بھی اُن کو پورا اطمینان نہ تھا، لیکن اس فقر و احتیاج کے باوجود امراء اور ارباب دول سے نہ صرف بے نیاز تھے بلکہ ان کو نہایت حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے عیسیٰ بن یونس کا بیان ہے کہ اعمش کے فقر و احتیاج کے باوجود میں نے ان سے زیادہ امراء اور سلاطین کو کسی کی نگاہ میں حقیر نہیں پایا [۶]۔ امام شعرانی لکھتے ہیں کہ اعمش کو روٹی تک میسر نہ تھی، لیکن ان کی مجلس میں اغنیا اور سلاطین سب سے بڑے فقیر معلوم ہوتے تھے [۷]۔

ان کی جرأت کا ایک واقعہ :

امراء کے مقابلہ میں ان کی جرأت و بے باکی کا یہ واقعہ لائق ذکر ہے۔ خلیفہ ہشام نے ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ عثمانؓ کے فضائل اور علیؓ کی برائیاں میرے لئے قلمبند کر دیجئے۔ انہوں نے شاہی قاصد کے سامنے اس خط کو بکری کو کھلا دیا اور قاصد سے کہا یہ تمہاری تحریر کا جواب ہے۔ جب قاصد نے جواب کے لئے زیادہ اصرار کیا تو یہ جواب لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ! امابعد، اگر عثمانؓ کی ذات میں ساری دنیا کے انسانوں کی خوبیاں جمع ہوں تو بھی اس سے تمہاری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اور اگر علیؓ کی ذات میں دنیا بھر کی برائیاں جمع ہوں تو اُس سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، تم کو صرف اپنے نفس کی خبر رکھنی چاہیے [۸]۔

۱۔ تاریخ خطیب جلد ۹۔ ص ۹ ۲۔ ایضاً۔ ص ۸ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۴
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸ ۵۔ تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۸ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۴
۷۔ طبقات کبریٰ امام شعرانی۔ جلد اول۔ ص ۳۸ ۸۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۱

فیاضی: طبعاً بڑے فیاض تھے، ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب اعمش کے پاس جاتے تھے، تو ہم کو کچھ نہ کچھ کھلاتے تھے[1]۔

نفس کی تحقیر:

ان ظاہری و باطنی کمالات کے باوجود وہ اپنی ذات کو بالکل حقیر اور ہیچ سمجھتے تھے چنانچہ وصیت کی تھی کہ جب میں مر جاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ دی جائے۔ اور مجھ کو میرے رب کے پاس لے جا کر لحد میں پھینک دیا جائے میں اس سے بھی فروتر اور حقیر ہوں کہ لوگ میرے جنازہ میں شرکت کریں[2]۔

وفات: باختلاف روایت ۱۴۷ھ یا ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔

(۷) خیر التابعین حضرت اویسؒ بن عامر قرنیؒ

نام و نسب: سرخیل تابعین حضرت اویس قرنی وطناً یمنی اور نسباً قبیلہ مراد سے تھے ان کو بارگاہ رسالت سے غائبانہ خیر التابعین کا لقب ملا تھا نسب نامہ یہ ہے اویس بن جزء بن مالک ابن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن ردو مان بن ناجیہ بن مراد بن مالک بن اودمرادی حرحجی۔

حضرت اویس ان برگزیدہ وارفتگان محبت میں تھے جن کی تخلیق ہی عشق و محبت کے خمیر سے ہوئی تھی۔ وہ نادیدہ جمال نبوی کے پروانوں میں تھے کہ۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کین دولت از گفتار خیزد

انہوں نے اپنی ہستی کو راہ خدا میں ایسا گم کر دیا تھا کہ ظاہر بین نگاہوں میں ان کی شخصیت ہی مشکوک ہو گئی۔ اگرچہ اویس عہد رسالت میں موجود تھے لیکن لقائے ظاہری سے محروم رہے۔ مگر عالم باطن کے اقوانین اس دنیائے آب وگل کے قوانین سے ماوراء ہیں۔

وہاں قرب و بعد منزل کا کوئی سوال نہیں چشم حقیقت نگر لاکھ حجابوں پر بھی محروم تماشا نہیں رہتی۔ ربط باطن بعد مسافت میں بھی قرب محسوس کرتا ہے۔ خود اس دنیائے آب وگل میں بھی ظاہری بعد اور دوری ایک بے حقیقت شے ہے۔ اصل شے قوتِ تاثیر اور جذب و کشش ہے۔

آفتاب کروڑوں منزلوں کی مسافت کے باوجود عالم کے ذرے ذرے کو منور کرتا ہے۔ قطراتِ شبنم اڑ کر آفتاب کی حرارت میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ موسم گل کی نکہت منزلوں تک کوہ و وادی کو

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۹۔ ص ۱۱ [2] طبقات کبریٰ امام شعرانی۔ جلد اول۔ ص ۳۸

معطر کر دیتی ہے اس لئے اویس بھی بعد مسافت کے باوجود آفتاب نبوت کی کرنوں سے مستنیر اور بہار مدینہ کی نکہت باریوں سے مست و بیخود تھے۔ اگر چہ وہ یمن میں تھے لیکن ان کی محبت کی لہریں حجاز تک رواں دواں تھیں۔

حضرت عمرؓ سے غائبانہ تعارف اور ملاقات :

یہ محض شاعری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اس نادیدہ وارفتہ محبت کی ایک علامت بتادی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ "خیر التابعین قبیلہ مراد کا ایک شخص ہے، اس کا نام اویس ہے۔ وہ تمہارے پاس یمن کی امداد میں آئے گا۔ اس کے جسم پر برص کے داغ ہیں، سب مٹ چکے ہیں، صرف ایک درہم کے برابر باقی ہے۔ اس کی ماں بھی ہے، جس کی وہ خدمت کرتا ہے۔ جب وہ خدا کی قسم کھاتا ہے تو اس کو پوری کرتا ہے۔ اگر تم اس کی دعائے مغفرت حاصل کر سکو تو حاصل کرنا"۔

اس کے بعد سے حضرت عمرؓ برابر اویسؓ کی تلاش میں رہے۔ چنانچہ آپ کے عہد خلافت میں جب یمن سے فوجی مدد آئی تو آپ تلاش کرتے کرتے اویس کے پاس پہنچے اور پوچھا تم ہی اویس بن عامر ہو، انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عمرؓ نے سوال کیا تمہاری ماں زندہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا، ہاں۔

ان علامات کو معلوم کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ان سے کہا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمہارے پاس اہل یمن کی مدد کے ساتھ قبیلہ مراد اور قرن کا ایک شخص اویس بن عامر آئے گا جس کے جسم پر برص ہوگا، لیکن ایک درہم کے برابر کے سوا سب مٹ چکا ہوگا۔ اس کے ایک ماں ہوگی جس کے ساتھ وہ نیکی کرتا ہوگا۔ جب وہ خدا کی قسم کھاتا ہے تو اس کو پوری کرتا ہے۔ اگر تم اس کی دعائے مغفرت لے سکنا تو لینا۔ اس لئے آپ میرے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

یہ سن کر اویسؓ نے حضرت عمرؓ کے لئے دعا کی۔ پھر آپ نے ان سے پوچھا اب کہاں کا قصد ہے۔ انہوں نے کہا کوفہ کا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں آپ کے متعلق وہاں عامل کے پاس ہدایت لکھے دیتا ہوں۔ اویس نے کہا اس کی ضرورت نہیں، مجھے عوام کے زمرہ میں رہنا زیادہ پسند ہے۔

اس واقعہ کے دوسرے سال کوفہ کا ایک معزز شخص حج کے لئے آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے اویس کا حال پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ نہایت تنگدستی میں ہیں۔ ایک بوسیدہ جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے اویس کے متعلق آنحضرت ﷺ کا ارشاد بیان کیا۔ چنانچہ یہ شخص بھی واپس

جا کر اویس سے دعائے مغفرت کا طالب ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ابھی تازہ تازہ ایک مقدس سفر سے آرہے ہو، اس لئے تم میرے لئے دعا کرو۔ پھر پوچھا تم عمرؓ سے ملے تھے۔ اس نے کہا ہاں، اس گفتگو کے بعد اویس نے اس شخص کے لئے دعائے مغفرت کی [1]۔

ہرم بن حیان اور اویس کی پراثر ملاقات کے حالات :

اویس اپنے کو دنیا سے چھپانے کے لئے نہایت خستہ حال رہتے تھے۔ اکثر بدن تک ڈھانپنے کے لئے پورا کپڑا تک نہ ہوتا تھا۔ لوگ ننگا بدن دیکھ کر کپڑا اوڑھا دیتے۔ ان کی ظاہری حالت پر بے بصر عوام ان کا مذاق اڑاتے اور انہیں پریشان کرتے [2]۔

لیکن اہل نظر کی نگاہوں سے وہ نہ چھپ سکے۔ ان کی شمیم رُوحانیت اہل دل لوگوں کو دور دور سے کھینچ بلاتی تھی۔ ایک صاحب دل تابعی ہرم بن حیان اور اویس کی ملاقات کے پُر تاثیر واقعات خود ہرم بن حیان کی زبان سے سننے کے قابل ہیں۔

ان کا بیان ہے کہ میں اویس قرنی کی زیارت کی تمنا میں کوفہ گیا اور تلاش کرتے کرتے فرات کے کنارہ پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص تنہا بیٹھا نصف النہار کے وقت وضو کر رہا ہے اور کپڑے دھو رہا ہے۔ میں اویسؓ کے اوصاف سن چکا تھا۔ اس لئے فوراً پہچان گیا۔ وہ فربہ اندام تھے، رنگ گندم گوں تھا۔ بدن پر بال زیادہ تھے۔ سر منڈا ہوا تھا، داڑھی گھنی تھی۔ بدن پر ایک صوف کا ازار اور ایک صوف کی چادر تھی۔ چہرہ بہت بڑا اور مہیب تھا، قریب پہنچ کر میں نے سلام کیا۔ اویس نے جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر کہا خدا تم کو زندہ رکھے۔ میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مصافحہ کرنے سے انکار کیا اور پھر کہا خدا تم کو زندہ رکھے۔ میں نے کہا، اویس تم پر خدا رحمت نازل کرے، اور تمہاری مغفرت فرمائے، تمہارا کیا حال ہے۔ غایت محبت میں ان کی ظاہری حالت پر میرے آنسو نکل آئے۔

مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رونے لگے اور مجھ سے فرمایا، ہرم بن حیان خدا تم پر رحم کرے، میرے بھائی تم کیسے ہو، تم کو میرا پتہ کس نے بتایا۔ میں نے کہا خدا نے۔ اس جواب پر انہوں نے فرمایا، "لا الٰہ الا اللّٰہ سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا حین سمانی"۔

ہرم بن حیان کہتے ہیں کہ اس سے پہلے نہ کبھی میں نے ان کو دیکھا تھا، نہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ اس لئے میں نے ان سے پوچھا، آپ نے میرا اور میرے باپ کا نام کیسے جان لیا۔

---

[1] یہ تمام واقعات مسلم کتاب الفضائل باب فضائل اویس قرنی سے ماخوذ ہیں [2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۱۲۔۱۱۳

خدا کی قسم آج سے پہلے کبھی میں نے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ فرمایا علیم خبیر نے مجھے بتایا۔

جب تمہارے نفس نے میرے نفس سے باتیں کیں، اسی وقت میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا۔ زندہ اور چلتے پھرتے لوگوں کی طرح روحوں کی بھی جان ہوتی ہے۔ مومنین خواہ کبھی آپس میں نہ ملے ہوں اور ان میں کوئی تعارف نہ ہو اور نہ ان کو ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہو، پھر بھی سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور خدا کی روح کے وسیلہ سے باتیں کرتے ہیں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں۔

میں نے درخواست کی کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث سنایئے کہ میں آپ کی زبان سے سن کر اس کو یاد کرلوں۔ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو پایا اور نہ آپ کی صحبت سے بہرہ ور ہوا، البتہ آپ کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے اور تم لوگوں کی طرح مجھے بھی آپ کی حدیثیں پہنچی ہیں، لیکن میں اپنے لئے یہ دروازہ کھولنا نہیں چاہتا کہ محدث قاضی یا مفتی بنوں۔ ہرم بن حیان مجھے خود اپنے نفس کے بہت سے کام ہیں۔

یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا کہ پھر قرآن ہی کی کچھ آیات سنا دیجئے۔ مجھے آپ کی زبان سے قرآن سننے کی خواہش ہے۔ میں خدا کے لئے آپ کو محبوب رکھتا ہوں میرے لئے دعا فرمایئے اور کچھ وصیتیں کیجئے تاکہ میں ان کو ہمیشہ یاد رکھوں۔

میری درخواست سن کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور " **اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم** " پڑھ کر چیخ مار کر رونے لگے، اور فرمایا میرے رب کا ذکر بلند ہے سب سے زیادہ حق اس کا قول ہے۔ سب سے زیادہ سچی بات اس کی بات ہے، سب سے زیادہ اچھا کلام اس کا کلام ہے۔ یہ کلمات فرما کر " **ما خلقنا السموات والارض** " سے " **ھو العزیز الرحیم** " تک تلاوت کر کے چیخ مار کر ایسے خاموش ہوئے کہ میں سمجھا بے ہوش ہو گئے۔ پھر مجھ سے فرمایا،

ہرم بن حیان تمہارے باپ مر چکے، عنقریب تم کو بھی مرنا ہے۔ ابو حیان مر چکے، ان کے لئے یا جنت ہے یا دوزخ، ابن حیان آدم مر گئے حوا مر گئیں۔ ابن حیان نوح اور ابراہیم خلیل الرحمٰن مر گئے ابن حیان موسیٰ نجی الرحمان مر گئے۔ ابن حیان داؤد خلیفہ الرحمان مر گئے۔ ابن حیان محمد رسول الرحمان مر گئے۔ ابن حیان ابو بکرؓ خلیفۃ المسلمین مر گئے، ابن حیان میرے بھائی عمرؓ بن الخطاب مر گئے۔

یہ کہہ کر وعمراہ کا نعرہ لگایا، اور ان کے لئے رحمت کی دعا کی۔ عمر فاروقؓ اس وقت تک زندہ تھے اور ان کی خلافت کا آخری زمانہ تھا، اس لئے میں نے کہا خدا آپ پر رحم کرے عمرؓ بن الخطاب تو زندہ ہیں۔

فرمایا، ہاں جو کچھ میں نے کہا ہے اگر تم اس کو پوری طرح سمجھ لو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا تمہارا شمار مردوں ہی میں ہے، ہونے والی بات ہو چکی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا اور چند مختصر دعائیں پڑھ کر کہا، ہرم بن حیان کتاب اللہ، صلحائے اُمت کی ملاقات اور نبی ﷺ پر درود وسلام میری وصیت ہے۔ میں نے اپنی خبر موت دی اور تمہاری خبر موت دی، آیندہ ہمیشہ موت کو یاد رکھنا، اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے غافل نہ ہونا، واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرانا اور اپنے ہم مذہبوں کو نصیحت کرنا، اور اپنے نفس کے لئے کوشش کرنا۔ خبردار جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تمہارا دین چھوٹ جائے اور قیامت میں تم کو آتش دوزخ کا سامنا ہو۔ پھر فرمایا،

خدایا اس شخص کا گمان ہے کہ وہ تیرے لئے مجھ سے محبت کرتا ہے، اور تیرے لئے مجھ سے ملاقات کی۔ اس لئے خدایا جنت میں اس کا چہرہ مجھے پہنچوانا اور اپنے گھر دار السلام میں مجھے اس سے ملانا، وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی رہے، اس کو اپنے حفظ وامان میں رکھنا۔ اس کی کھیتی باڑی کو اس کے قبضہ میں رہنے دے۔ اس کو تھوڑی دنیا پر خوش رکھ، اور دنیا سے تو نے جو حصہ اس کو دیا ہے وہ اس کے لئے آسان کر، اور اپنے عطایا اور نعمتوں پر اس کو شاکر بنا اور اس کو جزائے خیر دے۔

یہ دعائیں دیکر مجھ سے خطاب فرمایا کہ ہرم بن حیان اب میں تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں، اچھا سلام علیک ورحمۃ اللہ۔ اب میں تم کو آج سے نہ دیکھوں، میں شہرت ناپسند کرتا ہوں، اور تنہائی اور عزت کو دوست رکھتا ہوں۔ جب تک میں دنیا میں لوگوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔ انتہائی غم والم میں مبتلا رہوں گا، اس لئے آیندہ نہ تم مجھے پوچھنا اور نہ تلاش کرنا تمہاری یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے گی، لیکن اس کے بعد نہ میں تم کو دیکھوں گا اور نہ تم مجھے دیکھ سکو گے۔ مجھے یاد کرتے رہنا، اور میرے لئے دعائے خیر کرنا، میں بھی انشاء اللہ تم کو یاد اور تمہارے لئے دعائے خیر کرتا رہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ ایک سمت چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ایک ہی ساعت اور ساتھ ہو جائے، لیکن اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئے اور ہم دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

میں حد نظر تک دیکھتا رہا تا آنکہ وہ ایک گلی میں چلے گئے، اس کے بعد میں نے ان کو بہت تلاش کیا، اور لوگوں سے پوچھا لیکن کسی سے کچھ سراغ نہ ملا۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے اور ان کی مغفرت فرمائے اس ملاقات کے بعد سے کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا کہ میں ان کو ایک دو مرتبہ خواب میں نہ دیکھتا ہوں[1]۔

---

[1] یہ تمام حالات مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۶ تا ۴۰۷ سے ماخوذ ہیں۔

شہادت : اویس کو جب تک ظاہر میں دنیا نے نہ پہچانا تھا۔ اس وقت تک وہ اہل دنیا میں نظر آتے تھے، لیکن جب سے ان کی حقیقت آشکارا ہوئی اس وقت سے وہ ایسے روپوش ہوئے کہ پھر کسی نے نہ دیکھا۔ اس کے بعد جنگ صفین میں ان کی شہادت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو راہ خدا میں شہادت کی بڑی تمنا تھی، اور اس کے لئے وہ دعا کرتے تھے۔ خدا نے جنگ صفین میں یہ آرزو پوری کر دی اور حضرت علیؓ کی حمایت میں شہادت پائی [1]۔

علم ظاہر : اگرچہ اویس سرتاج تابعین ہیں، اور ان کی ذات جملہ فضائل وکمالات کی جامع تھی، لیکن اس کے باوجود علمائے ظاہر کے زمرہ میں ان کا کہیں ذکر نہیں، حتی کہ ان سے کوئی روایت تک مروی نہیں ہے، لیکن اس سے یہ قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ علوم ظاہری سے بے گانہ تھے۔ ان کی ذات علم باطن کے ساتھ علم ظاہر کی بھی جامع تھی، اس کی دو وجہیں تھیں۔

سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنی اصلاح نفس، تزکیۂ روح اور مجاہدات وریاضات سے اتنی فرصت نہ تھی کہ علم ظاہر کو مشغلۂ حیات بناتے۔ اور حجرۂ عبادت سے نکل کر مسند علم پر بیٹھتے۔ دوسرے انہیں شہرت اور نمود سے اتنی نفرت تھی کہ قاضی مفتی اور محدث کے لقب سے مشہور ہونا بھی پسند نہ کرتے تھے، جیسا کہ انہوں نے خود ایک موقع پر فرمایا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی احادیث اسی طرح پہنچی ہیں، لیکن میں اپنے اوپر ان کا دروازہ کھول کر محدث قاضی اور مفتی بننا پسند کرتا نہیں کرتا۔ مجھے خود اپنے تزکیۂ نفس کے بہت سے کام ہیں [2]۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ میں شہرت ناپسند کرتا ہوں اور تنہائی اور عزلت کو دوست رکھتا ہوں، اور مسند علم پر بیٹھنے کے بعد نہ وہ شہرت سے بچ سکتے تھے اور نہ ان کی عزلت نشینی قائم رہ سکتی تھی، اس لئے انہوں نے سرے سے اس دروازہ ہی کو بند رکھا۔

علم باطن : آپ کے کمالات کا منبع اور سرچشمہ کاغذ کے اوراق کے بجائے صحیفۂ قلب تھا آپ کی ذات گرامی علوم باطن کا سرچشمہ تھی، اور تابعین میں خواجہ حسن بصری کے بعد آپ ہی کی ذات تصوف کا مرجع ہے۔ اور صوفیائے کرام کے بہت سے سلاسل آپ کی ذات تک منتہی ہوتے ہیں [3]۔

عبادت وریاضت :

آپ نے راہ سلوک میں بڑے بڑے مجاہدات کئے۔ ساری ساری رات پلک سے پلک نہ ملتی تھی۔ معمول تھا کہ ایک شب قیام میں گزارتے تھے، دوسری رکوع میں اور تیسری سجدہ میں [4]۔ اکثر رات کے ساتھ دن بھی عبادت ہی میں گزر جاتا تھا۔

---

[1] اصابہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰ [2] مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۷ [3] انتباہ فی سلاسل اولیاء للہ شاہ ولی اللہ
[4] مسامرہ۔ جلد ۳۔ ص ۱۷۳ و تذکرۃ الاولیاء فریدالدین عطار۔ جلد اول

ربیع بن خثیم کا بیان ہے کہ ایک دن میں اویس سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ فجر کی نماز میں مشغول ہیں، میں اس خیال سے کہ ان کی تسبیح وتہلیل میں حرج نہ ہو، اس سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ظہر کی نماز تک برابر مشغول رہے۔ پھر ظہر سے عصر تک اور عصر سے مغرب تک یہی حال رہا۔

میں نے خیال کیا کہ مغرب کے بعد شاید افطار کے لئے جائیں، لیکن وہ برابر عشاء تک مشغول رہے۔ پھر عشاء سے صبح تک یہی کیفیت رہی دوسرے دن نماز فجر کے بعد کچھ نیند کا غلبہ ہوا، لیکن پھر فوراً متنبہ ہو گئے اور دعا کی کہ خدایا میں سونے والی آنکھ اور نہ بھرنے والے پیٹ سے پناہ مانگتا ہوں۔ یہ حال دیکھ کر میں نے کہا جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس قدر کافی ہے[1]۔

ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ افطار کے لئے کچھ میسر نہ آتا تو کھجور کی گٹھلیاں چن کر بیچتے، اور اس کی قیمت سے قوت لایموت حاصل کرتے۔ اگر خشک خرما مل جاتا تو اس کو افطار کے لئے رکھ لیتے، اگر زیادہ مقدار میں مل جاتا تو گٹھلیاں بیچ کر اس کی قیمت خیرات کر دیتے[2]۔

حلقہ ذکر: کوفہ میں ذکر وشغل کا ایک حلقہ تھا۔ جس میں بہت سے سالکین جمع ہوتے تھے۔ اویس بھی اس حلقہ میں شرکت کرتے تھے۔ اسیر بن جابر کا بیان ہے کہ ہم چند لوگ کوفہ میں ذکر وشغل کے ایک حلقہ میں جمع ہوتے تھے۔ اویس بھی ہمارے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اس حلقہ میں دلوں پر سب سے زیادہ اویس کے ذکر کا اثر پڑتا تھا[3]۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر وشغل نماز اور تلاوت قرآن تھی[4]۔

زہد عن الدنیا:

زہد کا یہ عالم تھا کہ گھربار، لباس اور کھانے پینے وغیرہ جملہ علائق دنیاوی سے ہمیشہ آزاد رہے ایک نہایت بوسیدہ اور شکستہ مکان میں رہتے تھے[5]۔ کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ کبھی اونٹ چرا کر اور کبھی کھجور کی گٹھلیاں بیچ کر قوت لایموت حاصل کرتے تھے[6]۔ حضرت عمرؓ نے سلوک کرنا چاہا مگر انکار کر دیا[7]۔ لباس میں ایک صوف کی چادر اور ایک صوف کا ازار ہوتا تھا[8]۔ اور اکثر وہ بھی میسر نہ آتا تھا۔ لوگ ننگے بدن دیکھ کر چادر دیتے[9]۔ پیٹ کے کھانے اور بدن کے کپڑے کے علاوہ

---

[1] ابن عساکر۔ جلد ۳۔ ص ۱۷۳ [2] تذکرۃ الاولیاء۔ جلد اول۔ ص ۲۲ [3] مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۲
[4] ایضاً۔ ص ۴۰۸ [5] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۱۳ [6] تذکرۃ الاولیاء فرید الدین عطار حالات اویس
[7] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۱۳ [8] مستدرک حاکم۔ جلد ۲۔ ص ۴۰۶ [9] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۱۴

کوئی چیز پاس نہ رکھتے تھے۔ فرمایا میں تجھ سے بھوکے جگر اور ننگے بدن کی معذرت چاہتا ہوں لباس جو میرے جسم پر اور غذا جو میرے پیٹ میں ہے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے[1]۔

آپ کی اس مجذوبانہ شان کی وجہ سے ظاہر میں عوام آپ کو راہ چلتے پریشان کرتے۔

ایک مرتبہ آپ کپڑا نہ میسر ہونے کی وجہ سے حلقہ ذکر سے غیر حاضر ہو گئے۔ آپ کے شریک حلقہ اسیر بن جابر یہ سمجھ کر کہ آپ بیمار ہو گئے ہیں، آپ کے گھر پہنچے اور کہا خدا تم پر رحم کرے تم نے ہمیں چھوڑ کیوں دیا۔ آپ نے جواب دیا میرے پاس چادر نہیں تھی اس لئے میں نہ آ سکا۔ اسیر بن جابر کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے اپنی چادر ان کو دے دی، انہوں نے واپس کر دی۔

میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں چادر لے کر اوڑھ لوں اور میرے ہم قوم مجھے دیکھ لیں تو کہیں گے۔ اس ریاکار کو دیکھو ایک آدمی کے ساتھ لگ گیا، اور دھوکا دے کر اس کی چادر لے لی، لیکن میں نے اصرار کر کے چادر انہیں دے دی اور کہا ہمارے ساتھ چلو دیکھو وہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ چادر اوڑھ کر ہمارے ساتھ ہو لئے۔

جیسے ہی ایک مجمع کے سامنے سے گزرے مجمع نے کہا، ذرا اس ریاکار کو دیکھو ایک شخص کے ساتھ چمٹا رہا اور دھوکا دیکر اس کی چادر لے لی۔ یہ الفاظ سن کر میں نے ان لوگوں سے کہا تم کو شرم نہیں آتی، خدا کی قسم میں نے جب انہیں چادر دینا چاہی تو انہوں نے انکار کر دیا تھا[2]۔

غرض وہ اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے ہر قسم کے تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنتے تھے، اور اس کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور اسی عالم میں مست رہتے۔

شہرت سے اجتناب :

آپ فنا کے اس درجہ پر تھے، جہاں شہرت، نمود اور اہل دنیا سے اختلاط کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے شہرت اور ناموری سے بہت بھاگتے تھے[3]۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ والی کوفہ کے نام خط لکھ کر آپ کا تعارف کرا کے آپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کر دیں مگر آپ نے منظور نہ کیا اور جواب دیا کہ میں زمرہ عوام میں رہنا پسند کرتا ہوں[4]۔ لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے بہت گھبراتے، لیکن آپ کی عزلت پسندی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ آپ کی شمیم روحانیت نے خلق اللہ کو خود اپنی طرف متوجہ کر لیا، اور لوگوں کا رجحان آپ کی طرف بڑھنے لگا۔

---

۱ مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۵   ۲ ایضاً۔ ص ۴۰۴   ۳ ایضاً۔ ۴۰۷

۴ مسلم کتاب الفضائل فضائل اویس قرنی

اسیر بن جابر بیان کرتے ہیں کہ میرے ایک ساتھی مجھے اویس کے پاس لئے گئے۔ وہ دو رکعت نماز تمام کرنے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا آپ لوگوں کا بھی میرے ساتھ عجیب معاملہ ہے، آپ لوگ میرے پیچھے پیچھے کیوں چلتے ہیں۔ میں ایک ضعیف انسان ہوں میری بہت سی ضروریات ہیں، جنہیں میں آپ کی وجہ سے پوری نہیں کرسکتا۔ آپ لوگ ایسا نہ کیجئے، خدا آپ پر رحم کرے، اگر کسی کو مجھ سے کوئی ضرورت ہو تو وہ عشا کے وقت مل لیا کرے۔

اس مجلس میں تین قسم کے لوگ آتے ہیں۔ سمجھدار مومن، بے سمجھ مومن اور منافق۔ ان تینوں کی مثال درخت اور بارش کے سی ہے۔ اگر سرسبز وشاداب اور پھل دار درخت پر پانی برستا ہے تو اس کی تراوٹ وشادابی اور حسن وخوبصورتی میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے، اور اگر شاداب مگر بے پھل والے درخت پر برستا ہے تو اس کے پتوں میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ پھل دینے لگتا ہے اور اگر خشک گھاس اور کمزور شاخ پر برستا ہے تو اسے توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ یہ مثال دے کر یہ آیت پڑھی:

" و نزل من القران ماھو شفاء للناس و رحمة للمؤمنين ولا يزيد الظلمين الا خسارا "[۱]۔

امر بالمعروف:

لیکن اس عزلت پسندی اور تنہا نشینی کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کبھی غافل نہ رہے، اور اس کی ادائے گی میں لوگ ان کے دشمن ہوجاتے تھے۔ ابوالاحوص روایت کرتے ہیں کہ میرے ایک ساتھی کا بیان ہے، کہ قبیلہ مراد کا ایک شخص اویس کے پاس گیا، اور سلام کے بعد پوچھا کہ اویس تمہارا کیا حال ہے۔ فرمایا، الحمدللہ پھر پوچھا زمانہ کا تمہارے ساتھ کیا طرز عمل ہے۔ فرمایا،

" یہ سوال اس شخص سے کرتے ہو جس کو شام کے بعد صبح ملنے کا یقین نہیں اور صبح کو شام کے ملنے کی امید نہیں۔ میرے مرادی بھائی موت نے کسی شخص کے لئے خوشی کا محل باقی نہیں رکھا، مراد بھائی خدا کے عرفان میں مومن کے لئے چاندی سونے کی کوئی قیمت باقی نہیں رکھی۔ مراد بھائی خدا کے کاموں میں مومن کے فرض کی ادائیگی نے ان کا کوئی دوست باقی نہیں چھوڑا ہے۔ خدا کی قسم چونکہ ہم لوگ لوگوں کو اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ہم کو دشمن سمجھ لیا ہے، اور اس میں ان کو فاسق مددگار مل گئے ہیں۔ جو ہم پر تہمتیں رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی قسم ان کا یہ رد یہ مجھ کو حق بات کہنے سے باز نہیں رکھ سکتا"[۲]۔

---

[۱] مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۶ [۲] اصابہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰

شرف جہاد: اگر چہ آپ گمنامی کی خاطر گوشۂ عزلت سے بہت کم قدم نکالتے تھے لیکن جہاد کے شرف کے حصول کے لئے کبھی کبھی وہ گوشۂ عزلت کو چھوڑتے تھے۔ اگر چہ صحیح مسلم میں اس کی تصریح نہیں، لیکن قیاس بلکہ یقین یہ ہے کہ حضرت عمرؓ سے آپ سے یمن کی جس امداد میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یقیناً جنگی سلسلہ میں آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ اصابہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ آذربائیجان کے معرکہ میں شریک تھے[1]۔

ماں کی خدمت: دنیاوی تعلقات میں اویس کے لے دے کر ایک تنہا ماں تھیں۔ ان کی خدمت کو سب سے بڑی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہیں ان کی تنہائی کے خیال سے حج نہیں کیا۔ اور ان ہی کی وجہ سے وہ جمال نبوی کے دیدار سے محروم رہے[2]۔ ان کی وفات کے بعد فریضہ حج ادا کرنے کا موقع ملا۔ لیکن ان کے پاس کیا تھا چند لوگوں نے سامان سفر پیش کیا۔ اس وقت وہ فریضہ حج سے فارغ ہو سکے[3]۔

بعض اقوال: فرماتے تھے خدا کے کاموں میں ایسے رہو گویا تم نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا ہے[4]۔ لوگوں کے لئے غائبانہ دعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں کبھی نمائش اور ریاء پیدا ہو جاتا ہے[5]۔

بعض خاص فضائل:

تابعین میں اویس کے بعض فضائل ایسے ہیں جو مخصوص ان کے طغرائے امتیاز میں اور ان کے علاوہ کسی کے حصہ میں نہیں آئے، آپ کی دستار فضیلت کا سب سے نمایاں طرہ سرکار رسالت کا عطا کردہ، خیر التابعین، کا لقب ہے، عبداللہ ابن ابی اوفی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ میری امت کے ایک شخص کی شفاعت سے بنی تمیم کی بڑی تعداد جنت میں داخل ہوگی، حسن کے نزدیک اس سے مراد اویس قرنی ہیں[6]۔ اگر چہ اس قلیل کی روایت زیادہ لائق اعتبار نہیں، تاہم ان سے اویس کے درجہ کا پتہ چلتا ہے۔

اویس کی شخصیت میں شک کے اسباب:

یہ عجیب حیرت انگیز امر ہے کہ خیر التابعین، کے ان فضائل و مناقب اور اخلاقی و روحانی کمالات کے باوجود بعض ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے ان کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے کہ اویس نام

---

[1] اصابہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰   [2] مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۷   [3] مستدرک حاکم۔ جلد ۳۔ ص ۴۰۵
[4] ایضاً۔ ص ۴۰۵   [5] صفوۃ الصفوہ۔ ص ۲۲۷   [6] اصابہ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۹۔ بحوالہ دلائل بیہقی

ان اوصاف کے کوئی تابعی تھے بھی یا نہیں، مثلاً ابن عدی کا یہ بیان کہ امام مالکؒ ان کے وجود کے منکر تھے یا سمعانی کی یہ روایت کہ ابن حبان کا بیان ہے کہ ہمارے بعض اصحاب ان کے وجود کے وجود کے منکر تھے، یا سمعانی کی یہ روایت کہ ابن حبان کا بیان ہے کہ ہمارے بخاری کے نزدیک ان کے اسناد محل نظر ہیں۔

لیکن دوسرے علماء و محدثین اور کتب احادیث و طبقات کے ان کثیر بیانات کے مقابلہ میں جن کے بعد خیر التابعین کی شخصیت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، ان چند کمزور روایتوں کی کوئی حیثیت نہیں، اس سلسلہ میں چند امور قابل غور ہیں، ایک یہ کہ جن روایات سے اویس قرنی کا وجود مشتبہ معلوم ہوتا ہے ان کی روایتی حیثیت کیا ہے؟ پھر ان کی صحت کی صورت میں ان سے اویس کے عدم وجود کا نتیجہ نکالنا کہاں تک صحیح ہے اور ان کے مقابلہ میں دوسرے علماء اور کتب احادیث وطبقات کی شہادت کیا ہے۔

روایتی حیثیت سے اس قسم کی تمام روایتیں نا قابل اعتماد ہیں، حافظ ابن حجر اور سمعانی نے اگرچہ یہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن ان کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ اس لئے محدثانہ اصول سے وہ ساقط الاعتبار اور نا قابل استناد ہیں۔

لیکن اگر انہیں صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی ان سے اویس قرنی کے نہ ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جن جن لوگوں نے ان کے وجود میں شک ظاہر کیا ہے، یا اس سے انکار کیا ہے وہ صرف اس بنا پر کہ انہوں نے اس عہد میں ان کا ذکر نہیں سنا یا ان کے حالات ان کے علم میں نہیں آئے، لیکن ان میں سے ایک چیز بھی ان کے نہ ہونے کا ثبوت نہیں۔

اصولاً ہر زمانہ میں انہی اشخاص کے حالات کا لوگوں کو علم ہوتا ہے، جو کسی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں عزلت نشین اور خاموش اشخاص سے واقفیت نہیں ہوتی، خود صحابہ کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہر صحابی سے اس عہد کے لوگ واقف تھے یا ان سب کے حالات لکھے گئے عموماً انہی صحابہ کے معلوم ہیں، جنہوں نے کوئی علمی کام کئے یا سلسلۂ روایت میں کہیں ان کا نام آ گیا ہے، بعضوں کا صرف نام ہی معلوم ہے۔ اور کسی حالات کا علم نہیں، ایسی حالت میں گمنام تابعین کا کیا ذکر۔

اس اصول کو پیش نظر رکھنے کے بعد اویس قرنی کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے، جیسا کہ ان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف عملی دنیا سے الگ تھلگ اور گوشہ نشین تھے، بلکہ اپنے اخفاء میں ان کو اتنا اہتمام تھا کہ اہل دنیا کی نگاہوں سے چھپتے پھرتے تھے، اور اس کے انہوں نے محدث اور

مفتی بننا تک گوارا نہ کیا کہ اس صورت میں وہ مرکز توجہ ہو جاتے۔ انہوں نے اپنی زندگی ایسی بنائی تھی کہ بعض خواص کے علاوہ خود ان کے اہل وطن تک ان سے واقف نہ تھے، اور جو لوگ جانتے بھی تھے۔ وہ محض ایک وارفتہ مزاج سودائی کی حیثیت سے۔

ایسی حالت میں اس عہد کے بعض علماء کا ان سے واقف نہ ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں کہ علماء کی واقفیت کے لئے علمی اور عملی امتیاز ضروری تھا۔

لیکن بہر حال ان کی شخصیت چھپنے والی نہ تھی، اس لئے بہت سے خواص پر ان کی حقیقت آشکارا ہوگئی جس کے حالات اوپر گزر چکے ہیں، پھر جب ہم کتب احادیث وطبقات پر نظر ڈالتے ہیں تو صحیح مسلم تک میں ان کے مستقل فضائل ملتے ہیں، بلکہ حدیث کی کتابوں میں ان کے حالات طبقات ورجال سے زیادہ ہیں، حدیث کی حسب ذیل کتابوں میں ان کے حالات ہیں یا کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا ذکر آیا ہے۔

(۱) مسند احمد بن حنبل (۲) صحیح مسلم (۳) دلائل بیہقی (۴) حلیۃ الاولیاء ابونعیم
(۵) مسند ابو یعلی (۶) مسند ابوعونہ (۷) مستدرک، حاکم وغیرہ۔

ان میں سے اکثروں کے حوالے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں دیئے ہیں۔ ممکن ہے ان کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ان کے حالات ہوں۔ طبقات ورجال کی کتابوں میں ان کا ذکر کم ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں عموماً انہی لوگوں کے تفصیلی حالات ہیں، جن کا تعلق علمی یا عملی دنیا سے رہا ہے۔ اس کے باوجود طبقات ابن سعد، اصابہ اسد الغابہ، حلیۃ الاولیاء ابن عساکر، تہذیب، میزان الاعتدال، لسان، المیزان وغیرہ قریب قریب تمام متداول کتابوں میں ان کے حالات موجود ہیں۔ پھر جن علماء نے ان کے وجود کے انکار کی روایتیں نقل کی ہیں، انہیں خود ان پر اعتماد نہیں اور وہ اویس قرنی کی شخصیت کو مانتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر امام مالک کے انکار کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کی (اویس قرنی) شہرت اور ان کے حالات اتنے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کے وجود میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں [۱]۔ ان بیانات کے بعد اویس قرنی کی شخصیت میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا۔ تذکروں میں ان کے حالات بہت ملتے ہیں، لیکن ان میں ہر قسم کی رطب ویابس روایتیں ہیں، اس لئے ہم نے تذکرۃ الاولیاء کے ایک دو بیانوں کے علاوہ انہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔

---

[۱] اصابہ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۸

(۸) ایاس بن معاویہؒ

نام ونسب: ایاس نام ہے۔ ابو واثلہ کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے: ایاس بن معاویہ بن قرہ بن ایاس بن ہلال بن رباب بن عبید بن سواۃ بن ساریہ بن ذبیان بن ثعلبہ بن سلیم بن اوس بن فرینہ مزنی۔

فضل وکمال: ایاس اس عہد کے مشہور قضاۃ میں تھے۔

حدیث: حدیث میں ان کا کوئی قابل ذکر پایہ نہ تھا، تاہم اس سے بالکل تہی دامن بھی نہ تھے۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ احادیث[۱] میں انہوں نے اپنے والد معاویہ، انس بن مالکؓ، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر اور ابی مجلز وغیرہ سے خوشہ چینی کی تھی اور ایوب داؤد بن ابی ہند، حمید الطویل، حماد، شعبان، شعبہ اور معاویہ بن عبدالکریم وغیرہ ان کے تلامذہ میں ہیں[۲]۔

فقہ: فقہ ان کا خاص فن تھا، اس میں وہ امتیازی درجہ رکھتے تھے، عجلی ان کو فقیہ لکھتے ہیں[۳]۔

عہدۂ قضاء:

اپنے فقہی کمال کی وجہ سے وہ اموی دور میں بصرہ کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے، ان کے تقرر کے وقت حضرت حسن بصریؒ ان کے پاس تشریف لے گئے، انہیں دیکھ کر ایاس رونے لگے[۴]۔

فہم وفراست:

ایاس کو فہم وفراست سے غیر معمولی حصہ ملا تھا اور وہ عقل ودانش کا پیکر تھے، ابن سعد لکھتے ہیں۔ کان عاقلا من الرجال فطنا[۵]۔ ابن سیرین کے سامنے جب ان کا ذکر آتا تو کہتے تھے، وہ مجسم فہم ہیں[۶]۔ ان کے عہد کے لوگ کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک بڑا عاقل پیدا ہوتا ہے، اور اس صدی کے عاقل ایاس ہیں[۷]۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ ان کی ذکاوت اور فطانت ضرب المثل تھی، ابو تمام کا ایک شعر ہے[۸]۔

اقدام عمرو فی شجاعة عنتر

فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۵ ۲۔ تہذیب۔ جلد اول ص ۳۹۰ ۳۔ ایضاً۔ ۴۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۵
۵۔ ایضاً۔ ص ۶ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۰ ۷۔ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۰
۸۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۶۰

ذہانت وذکاوت کے بعض واقعات :

قضا میں مہارت بڑی حد تک ذہانت اور ذکاوت پر منحصر ہے اس لئے ایاس اس عہد کے ممتاز ترین قضاۃ میں تھے،اس موقع پر ان کی ذہانت کے بعض واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی مقدمہ کے سلسلہ میں چار عورتیں ان کی عدالت میں آئیں۔انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ ان میں سے ایک حاملہ ہے، ایک دودھ پلاتی ہے، ایک شادی شدہ ہے اور ایک کنواری۔

لوگوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا ان کا قیاس صحیح تھا۔ان سے پوچھا گیا آپ کو اس کا کیسے اندازہ ہوگیا۔انہوں نے کہا حاملہ جس وقت گفتگو کر رہی تھی تو اس کا کپڑا پیٹ سے اُٹھ جاتا تھا، اس سے میں نے جانا کہ وہ حاملہ ہے۔اور دودھ پلانے والی کی چھاتیاں ہلتی تھیں،اس لئے میں نے قیاس کیا کہ وہ دودھ پلاتی ہے۔شادی شدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی تھی، یہ اس کے شادی شدہ ہونے کا ثبوت تھا اور باکرہ آنکھیں نیچی کر کے باتیں کرتی تھیں[1]۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کے پاس کچھ مال امانت رکھوایا تھا۔جب اس نے واپس مانگا تو امانت دار نے انکار کردیا۔مال کے مالک نے ایاس کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ انہوں نے کہا اس وقت لوٹ جاؤ، اس واقعہ کو پوشیدہ رکھنا۔اس شخص کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ تم میرے پاس آئے تھے،دو دن کے بعد پھر آنا۔

اس کو لوٹ کر ایاس نے امانت دار کو بلوایا، اور اس سے کہا کہ میرے پاس بہت سا مال آگیا ہے، میں اس کو تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں،تمہارا گھر محفوظ ہے۔اس نے کہا، ہاں۔ایاس نے کہا تو مال رکھنے کے لئے کوئی جگہ منتخب کرلو، اور دو بار بردار لے آؤ۔

اس گفتگو کے بعد ایاس نے مال کے مالک کو بلوا کر کہا کہ اب جاکر تم اس شخص سے اپنا مال مانگو اگر دے دے تو فبہا ورنہ اس سے کہنا کہ میں جاکر قاضی کو اطلاع دے دوں گا۔اس شخص نے جاکر کہا کہ میرا مال دو، ورنہ قاضی کو جاکر اطلاع دیتا ہوں،۔یہ سن کر اس نے کل روپیہ واپس کردیا، اور صاحب مال نے آکر قاضی ایاس کو اطلاع دے دی کہ میرا مال مجھ کو مل گیا۔اس کے بعد سابق قرارداد کے مطابق وہ شخص ایاس کے پاس روپے لینے کے لئے آیا انہوں نے اس کو ڈانٹ کر نکال دیا[2]۔

---

[1] الطریق الحکمیہ ابن قیم جوزی۔ص ۲۵-۲۶ [2] الطریق ابن قیم جوزی۔ص ۲۵

قضاۃ سے واقفیت:

کسی شعبہ اور صنف کے اشخاص کا اس شعبہ کے متعلق ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ اشخاص کی خصوصیات پر پوری نظر رکھتے ہوں۔ ایاس اس عہد کے تمام مفتیوں اور قضاۃ کے محاسن معائب اور خصوصیات سے پورے طور سے واقف تھے۔ حبیب بن شہید کا بیان ہے کہ ایک شخص ایاس کے پاس ایک مقدمہ میں مشورہ کے لئے آیا کہ وہ اس میں کس کی طرف رجوع کرے۔ انہوں نے کہا اگر تم اس کا صحیح فیصلہ چاہتے ہو تو عبدالمالک بن یعلی کے پاس جاؤ وہ صحیح معنوں میں قاضی ہیں اور اگر محض فتویٰ لینا ہے تو حسن بصری کے پاس جاؤ وہ میرے اور میرے باپ کے اُستاد ہیں اور اگر صلح مقصود ہے تو حمید الطویل کی طرف رجوع کرو وہ اس طریقہ سے صلح کرادیں گے کہ تم اپنے حق کا کچھ حصہ لے لو اور کچھ چھوڑ دو اور اگر مقدمہ بازی کرنا ہے تو صالح السدوسی کے پاس جاؤ وہ تم کو رائے دیں گے کہ دوسرے کے حق سے بالکل انکار کردو۔ اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرو اور جو لوگ موجود نہیں ہیں ان کو گواہ بناؤ[1]۔

صحت عقائد اور مبتدعین سے مناظرہ:

ایاس بایں ہمہ ذہانت عقائد میں جدت، اختراع اور موشگافیوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان کی ذہانت اس کی تردید میں صرف ہوتی تھی۔ وہ مبتدعین خصوصاً قدریوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ قدریہ کا عقیدہ ہے کہ خدا عادل ہے، یہاں تک تو بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس اصول کے نتیجہ میں وہ ان افعال کو جو بظاہر ظلم معلوم ہوتے ہیں، خدا کی جانب منسوب نہیں کرتے اور اس میں یہاں تک شدت برتتے ہیں کہ خدا کی قدرت مسلوب ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ ان میں اور قدریوں میں مناظرہ ہوا۔ انہوں نے قدریہ سے پوچھا ظلم کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کسی کا ایسی چیز کو لے لینا جو اس کی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی تو تمام چیزیں ہیں۔ یعنی جب وہ تمام چیزوں کا مالک ہوا تو پھر اس کے کسی فعل پر ظلم کا اطلاق صحیح نہیں ہے[2]۔

بعض اقوال: ان کے بعض اقوال نہایت دلچسپ ہیں۔ کہتے تھے کہ جس میں کوئی عیب نہیں وہ احمق ہے۔ کسی نے پوچھا آپ میں کیا عیب ہے۔ کہا فضول گوئی[3]۔ کہتے تھے کہ میں نے انسان کی تمام فضیلتوں کو آزمایا ان سب میں اشرف زبان کی سچائی ہے[4]۔

وفات: ۱۲۲ھ میں وفات پائی[5]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۰ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۱
۳؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۵ ۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۳۹۱ ۵؎ ایضاً۔ ص ۳۹۰

(۹) ایوب بن ابی تمیمہ سختیانیؒ

نام ونسب : ایوب نام، ابوبکر کنیت، والد کا نام کیسان تھا، لیکن وہ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، ایوب قبیلۂ عنزہ کی غلامی میں تھے۔

فضل وکمال : ایوب اگرچہ غلام تھے، لیکن اقلیم علم وعمل کے تاجدار تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقة ثبتا فی الحدیث جامعا عدلا ورعا کثیر العلم حجة[۱]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت، ان کی امامت ان کے حفظ، ان کی توثیق، ان کے وفور علم ان کی فہم اور ان کی سربلندی پر سب کا اتفاق ہے[۲]۔ ابن عماد حنبلی ان کو علمائے علام میں لکھتے ہیں[۳]۔

اکابر علماء کا اعتراف :

ان کے عہد کے تمام اکابر علما ان کے علمی اور اخلاقی کمالات کے معترف اور ان کی جلالت شان پر متفق ہیں۔ شعبہ ان کو سید العلماء کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ ابن عیینہ کہتے تھے کہ میں چھیاسی (۸۶) تابعین سے ملا، مگر ان میں سے کسی کو ایوب کے مثل نہ پایا۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ انہیں جن جن محدثین اور علماء کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوا ایوب ان سب سے افضل اور پابند سنت تھے۔ ایوب جھبذ العلماء کہلاتے تھے۔ ہشام بن عروہ کہتے تھے کہ بصرہ میں ایوب کا مثل نہ تھا۔ حضرت حسن بصری ان کو نوجوانان بصرہ کا سردار کہتے تھے۔ ابن عون کہتے تھے کہ ابن سیرین کی موت کے بعد ہم لوگوں کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اب کون باقی رہ گیا؟ لیکن پھر خود ہی جواب مل گیا کہ ایوب موجود ہیں[۴]۔

حدیث : بصرہ کے ممتاز ترین حفاظ حدیث تھے، امام ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ حافظ اور اعلام میں تھے[۵]۔

حدیث میں انہوں نے بڑے بڑے تابعین سے فیض پایا تھا، عمر بن سلمہ جرمی، ابو رجاء عطاردی۔ ابو عثمان نہدی، ابو الشعثاء، جابر بن زید، حسن بصری، ابن سیرین، سالم بن عبداللہ، نافع بن ابی ملیکہ، ابن منکدر، حمید بن بلال، ابو قلابہ جرمی، قاسم بن محمد، عبدالرحمن بن قاسم، عکرمہ اور عطاء وغیرہ جیسے اکابر علماء سے سماع حدیث کیا تھا، حدیث میں ان کی وسعت علم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد آٹھ سو اور بعض روایات کے مطابق دو ہزار تک پہنچتی ہے[۶]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۴ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۳۱ ۳۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۸۰ ۴۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۳۲ وتذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۱
۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۱ ۶۔ تہذیب۔ ص ۳۹۷، ۳۹۹۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق ۱۔ ص ۱۳۲

امام مالک سفیان ثوری، ابن عیینہ، ابن ابی عروبہ، معمر، اعمش، قتادہ اور شعبہ وغیرہ جیسے اکابر علماء اور آئمہ آپ کے خوشہ چینوں میں تھے[۱]۔

ارباب فن میں آپ کی مرویات کا پایہ :

کیفیت کے اعتبار سے ان کی روایت کا جو پایہ تھا، اس کا اندازہ ذیل کی رایوں سے ہوگا۔ ابو حاتم کا ان کی روایت کے متعلق خیال تھا کہ ان کے جیسے شخص کے متعلق پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں۔ ابن سیرین ان کو مثبت کہتے تھے۔ مسلم بن اکیس کا بیان ہے کہ میں نے ابن اسیرین سے پوچھا کہ آپ سے فلاں فلاں حدیث کس نے بیان کی، انہوں نے جواب دیا مثبت ایوب نے[۲]۔ ابن مدائنی، نسائی اور ابن خیثمہ وغیرہ سب ان کی روایت کو اعلیٰ درجہ کی سمجھتے تھے، شعبہ ان کی ان روایات کو جن میں انہیں خود کچھ شک ہوتا، دوسروں کی یقینی اور غیر مشتبہ روایات پر ترجیح دیتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے ان سے ایک حدیث پوچھی انہوں نے جواب دیا مجھے اس میں شک ہے، شعبہ نے کہا آپ کا شک مجھے دوسروں کے یقین سے زیادہ پسند ہے[۳]۔

فقہ : فقہ میں بھی پورا کمال حاصل تھا، شعبہ انہیں سید الفقہاء کہتے تھے، لیکن انتہائی احتیاط کی وجہ سے ان کے کمالات فقہی ظاہر نہ ہو سکے[۴]۔

احتیاط : ان محدثانہ اور فقہی کمالات کے باوجود وہ حدیث بیان کرنے اور فقہی مسائل بتانے میں بڑے محتاط تھے۔ حماد بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ایوب اور یونس سے زیادہ میں نے سوالات کے جوابات میں لاعلمی ظاہر کرنے والا نہیں دیکھا۔ جواب بھی دیتے تھے تو جواب دینے سے پہلے سائل کے حافظہ کا امتحان کر لیتے تھے، کہ وہ ان کے جواب کو غلط نقل نہ کرلے۔

حماد بن یزید بیان کرتے ہیں، کہ جب کوئی شخص ایوب سے کسی چیز کے متعلق پوچھتا تھا، تو پہلے اس کا سوال دہراتے تھے، اگر وہ بعینہ پہلی مرتبہ کی طرح دہرا دیتا تو جواب دیتے، اور اگر ذرا بھی تغیر و تبدل اور غلط ملط کرتا تو جواب نہ دیتے اور جواب میں اپنی رائے کو دخل نہ دیتے تھے، بلکہ صرف احادیث و سنن کا حکم بتا دیتے اور اگر کوئی سند نہ ہوتی تو لاعلمی ظاہر کر دیتے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے کسی چیز کے متعلق سوال کیا، جواب دیا مجھے کوئی علم نہیں، سائل نے کہا اپنی رائے سے بتائیے۔ فرمایا میری رائے بھی کوئی نہیں ہے[۵]۔

۱۔ تہذیب التہذیب حوالہ مذکور ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۳۱۔ ۱۳۲
۳۔ تہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۸ ۴۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق ۱۔ ص ۱۳۱ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۷

رائے کو وہ ایک باطل شے سمجھتے تھے، کسی نے ان سے کہا، آپ مسائل میں رائے کیوں نہیں دیتے، آپ نے یہ تمثیلی جواب دیا کہ کسی نے گدھے سے کہا تم جگالی کیوں نہیں کرتے، اس نے کہا باطل شے کا چبانا پسند نہیں کرتا[1]۔

پندار علم کا خوف اور اس سے احتراز :

انسان کسی مرتبہ اور درجہ پر پہنچ کر مشکل ہی سے عجب وغرور سے بچ سکتا ہے اس لئے ایوب ہمیشہ اس سے خائف رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کون انسان اس سے محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ایک شخص حدیث بیان کرتا ہے اور اس کی بنا پر قوم کے دل میں وہ ایک مقام حاصل کر لیتا ہے اس وقت اس کے دل میں بعض چیزوں (عجب وغرور وغیرہ) کی آمیزش ہو جاتی ہے[2]۔

لیکن ان کا دامن اس سے محفوظ تھا۔ علم کا ایک پندار یہ بھی ہے کہ صاحب علم اپنی لاعلمی دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دے، اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بہتر سے سائلوں کو صاف جواب دیتے تھے۔ کہ مجھے نہیں معلوم بعض سائلوں سے کہہ دیتے کہ کسی دوسرے صاحب علم سے پوچھ لو[3]۔

اہل علم کی عزت : اہل علم کی بڑی عزت ومحبت کرتے تھے خواہ وہ کیسے ہی معمولی حالت میں کیوں نہ ہو، اس کی وقعت میں فرق نہ آتا ربیع بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ایوب سختیانی کا ہم سفر تھا راستہ میں ایک لحیم شحیم شخص سے جس کے جسم پر نہایت موٹا لباس تھا ملاقات ہوئی وہ ایوب کو پوچھ رہا تھا۔ میں نے ان کو اطلاع دی کہ ایک شخص آپ کو تلاش کر رہا ہے جیسے ہی ایوب نے اس شخص کو دیکھا دوڑ کر گلے لپٹ گئے، لوگوں نے پوچھا یہ کون شخص ہے معلوم ہوا سالم بن عبداللہ ہیں[4]۔

زہد وعبادت : ایوب میں جس درجہ کا علم تھا اس سے کچھ بڑھ کر زہد وتقویٰ تھا، امام مالک کا بیان ہے کہ وہ علمائے باعمل صاحب خشوع بڑے عبادت گزار اور اخیار لوگوں میں تھے[5]۔ چالیس مرتبہ حج کے شرف سے مشرف ہوئے[6]۔

عبادت کا اخفاء : لیکن ہمیشہ عبادت وریاضت کو چھپاتے تھے فرماتے تھے کہ آدمی کے لئے اپنے زہد کا چھپانا ظاہر کرنے سے بہتر ہے[7]۔ ساری ساری رات عبادت کرتے تھے لیکن لوگوں سے چھپانے کے لئے صبح کو اس طرح آواز بلند کرتے کہ سننے والوں کو معلوم ہو کہ ابھی سو کر اٹھے ہیں[8]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۱۷ [2] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۴ [3] ایضاً [4] ایضاً۔ ص ۱۵
[5] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۸ [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۷
[7] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۶۔ [8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۷

ذات نبوی سے عقیدت ومحبت :

ذات نبوی کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی، حدیث نبوی سن کر ایسا زار زار روتے کہ دیکھنے والوں کو رحم آجاتا[1]۔ امام مالک کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے اجلال کو دیکھ کر ان سے حدیثیں لکھنی شروع کر دی تھیں[2]۔

اتباع رسول : اس عقیدت ومحبت کا ایک نتیجہ اتباع سنت میں اہتمام تھا حماد بن زید بیان کرتے ہیں کہ جن جن لوگوں کے پاس میں بیٹھا ان سب میں زیادہ افضل اور متبع سنت ایوب کو پایا[3]۔

شہرت سے نفرت اور اہل دنیا سے اجتناب :

ان اوصاف اور کمالات کی وجہ سے ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی تھی لیکن دنیا اہل دنیا اور شہرت ونمود سے دور بھاگتے تھے، عام مجمعوں اور لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے راستہ چلنے میں عام مالوف راستوں کو چھوڑ کر نامانوس اور دور دراز راستہ اختیار کرتے۔ حماد بن زید بیان کرتے ہیں کہ راہ چلنے میں ایوب مجھے دور کے راستوں سے لے جاتے۔ میں ان کو قریب کا راستہ بتاتا، تو کہتے میں ان مجالس سے بچنا چاہتا ہوں۔

ایک دوسری روایت میں حماد بیان کرتے ہیں مجھے ایسے راستوں سے لے جاتے کہ ان کی تلاش پر تعجب ہوتا اور محض لوگوں کی نگاہ سے بچنے کے لئے لیکن جب کسی کا سامنا ہو جاتا، تو خود سلام میں پیش قدمی کرتے، ان کی شخصیت کی وجہ سے لوگ ان کے سلام کے جواب میں بہت کچھ اضافہ کرتے، ان کو یہ امتیاز بھی گوارا نہ تھا۔ چنانچہ ان کے جوابات سن کو فرماتے، خدایا تو خوب جانتا ہے کہ یہ میری خواہش نہیں ہے، خدایا تو خوب جانتا ہے کہ یہ میری خواہش نہیں ہے۔

لوگوں کی نظر بچانے کے لئے اکثر دوسرے کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے، شعبہ بیان کرتے ہیں کہ بسا اوقات میں اپنی ضرورت سے ان کے ساتھ جانا چاہتا تو وہ مجھے اجازت نہ دیتے اور گھر سے نکل کر مختلف گلیوں میں ادھر ادھر نکل جاتے تاکہ لوگ انہیں جاننے نہ پائیں[4]۔

اس غرض کے لئے اپنے طبقہ کی مالوف وضع چھوڑ دی تھی کہ لوگوں کی نظر نہ پڑنے پائے۔ اس زمانہ کے عابدوں اور زاہدوں کے پیراہن کا دامن چڑھا رہتا تھا، اور یہ ان کا امتیازی نشان تھا۔ اس لئے وہ اپنے پیراہن کا دامن لٹکاتے تھے۔ معبد بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایوب کی قمیص کا دامن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۷ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۷ [3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۳۲ [4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵۔ ۱۶۷

لٹکتا ہوا دیکھ کر ان پر اعتراض کیا۔ انہوں نے کہا، ابو عروہ اگلے زمانہ میں دامن لٹکا کر چلنے میں شہرت تھی، اور اب سمیٹ کر چلنے میں ہے[۱]۔

ارباب دول و ثروت سے گریز :

ارباب دول سے ملنے میں بہت گریز کرتے تھے، اور اپنے گھر میں خلفاؤ سلاطین تک کے آنے کے روادار نہ تھے، فرماتے تھے کہ مجھے اپنا لڑکا بکر دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے لیکن مجھ کو اسے دفن کردینا پسند ہے، لیکن خلفاء کا پاس آنا پسند نہیں ہے۔

خوش اخلاقی : اس سے یہ نہ قیاس کرنا چاہئے کہ وہ مردم بیزار اور کج خلق تھے۔ وہ صرف اپنے کو چھپانے کے لئے لوگوں کے میل جول سے بچتے تھے، ورنہ طبعاً نہایت خوش خلق تھے۔

حماد بن زید کا بیان ہے کہ میں نے ایوب سے زیادہ کسی کو لوگوں سے تبسم اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے نہیں دیکھا۔ جب کوئی بیمار ہوتا یا کسی کے یہاں موت ہو جاتی تو وہ عیادت اور تعزیت کے لئے ضرور جاتے اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ شخص ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ معزز اور محترم ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ معمولی معمولی درجہ کے آدمیوں کے یہاں بھی ضرور حاضری دیتے تھے۔ یعلی بن حکم نامی ایک غلام ان کا ہم محلہ تھا وہ مرگیا، اس کی صرف ایک ماں تھی۔ ایوب اس کے یہاں تین دن تک برابر گئے اور اس کے دروازے پر بیٹھتے تھے[۲]۔

وفات : ۱۳۱ھ میں بصرہ میں طاعون کے مرض میں وفات پائی ۶۳ سال کی عمر تھی۔ ایک سرخ چادر انہوں نے عرصہ سے کفن کے لئے مخصوص کردی تھی اور اس کو وہ حرام کی حالت میں اور رمضان کی تیسویں شب کو اوڑھتے تھے لیکن یہ چادر مرنے سے پہلے چوری ہوگئی تھی[۳]۔

حلیہ : سر پر پٹھے تھے جو سال میں ایک مرتبہ (غالباً حج کے موقع پر) منڈوایا کرتے تھے سر اور داڑھی دونوں کے بال سپید ہوگئے تھے، ان میں کبھی کبھی سرخ خضاب کرتے تھے۔

(۱۰) بسر بن سعیدؒ

نام و نسب : بسر نام، والد کا نام سعید تھا، حضرمیوں کے غلام تھے، مدینۃ الرسول میں بنی جدیلہ کے محلہ میں رہتے تھے۔ زہد و ورع کے اعتبار سے مدینہ کے ممتاز بزرگوں میں تھے۔

---

[۱] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵ [۲] ایضاً ص ۱۶ [۳] ایضاً

فضل وکمال : علمی اعتبار سے ان کا شمار علمائے ربانیین میں تھا، حافظ ذہبی لکھتے ہیں : بسر بن سعید العالم الربانی المجاب الدعوۃ احد الاتابعین .... [1] حدیث رسول کی معتد بہ تعداد ان کے حافظہ میں محفوظ تھی۔ ابن سعد لکھتے ہیں : کان ثقۃ کثیر الحدیث [2]۔ حدیث میں وہ حضرت سعید بن ابی وقاصؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور سعید بن مالکؓ جیسے اجلہ صحابہ سے فیضیاب ہوئے تھے، اور سالم ابوالنصر بکر بن الاشج محمد بن ابراہیم، یعقوب بن اشج، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور یزید بن خصیفہ وغیرہ ان کے خوشہ چینیوں میں تھے [3]۔

زہد و ورع : ان کے دستار فضیلت کا نمایاں طرہ زہد و ورع تھا، ابن سعد لکھتے ہیں، "کان بسر من العباد المنقطعین واھل الزھد فی الدنیا" [4] ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں، "بسر بن سعید المدنی الزھد العابد المجاب الدعوۃ" [5]۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز پر اثر :

ان کے زہد و ورع کے بڑے بڑے اتقیاء اور صلحائے امت معترف تھے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز جیسے بزرگ انہیں تمام اہل مدینہ سے افضل سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ولید بن عبدالملک نے ان سے پوچھا کہ اہل مدینہ میں سب سے افضل کون ہے، فرمایا بنی حضرمی کا غلام بسر [6]۔

وفات : ۱۰۰ھ میں مدینۃ الرسول میں وفات پائی انتقال کے وقت اٹھتر (۷۸) سال کی عمر تھی۔ زہد کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت کفن تک نہ چھوڑا، اسی زمانہ میں عبدالملک کے لڑکے عبداللہ کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے اسی مدسونا چھوڑا، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اس تفاوت راہ پر فرمایا کہ اگر دونوں کے جانے کی جگہ ایک ہوتی تو میں دنیا میں عبداللہ کی جیسی عیش و آرام کی زندگی پسند کرتا۔ اس تعریض پر عبداللہ کے بھائی مسلمہ نے کہا، امیر المومنین آپ نے اپنے خاندان پر چوٹ کی۔ فرمایا میں صاحب فضل کی فضیلت کا ذکر نہیں چھوڑ سکتا [7]۔

(۱۱) بکر بن عبداللہ مزنیؒ

نام ونسب : بکر نام باپ کا نام عبداللہ تھا نسبی تعلق قبیلہ مزینہ سے تھا۔

---

[1] دول الاسلام ذہبی۔ جلد اول۔ ص ۵۱ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۸ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۴۳۷
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۸ [5] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۱۸ [6] تہذیب التہذیب جلد اول۔ ص ۴۳۷
[7] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۸

فضل وکمال: بکر علمائے بصرہ میں تھے اور ان کے علمی کمالات کی وجہ سے شیخ البصرہ، حضرت حسن کے مقابلہ میں ان کا لقب "فتی البصرہ" تھا[1]۔

حدیث: حدیث کے ممتاز حفاظ میں تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقة ما مونا ثبتا مامو کثیر الحدیث حجة[2] صحابہ میں انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباس اور مغیرہ بن شعبہؓ۔ اور تابعین میں ابورافع، صائغ، ابوتیمہ ہجیمی وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا۔ ثابت البنانی سلیمان تیمی، قتادہ، غالب القطان، عاصم الاحول، سعید بن عبداللہ اور مطرالوراق ان کے تلامذہ میں ہیں۔ ان کی مرویات کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے[3]۔

فقہ: فقہ میں بھی درک تھا۔ علامہ ابن سعد ان کے حفظ حدیث کے ساتھ انہیں فقیہ بھی لکھتے ہیں[4]۔

عہدہ قضاء کی پیشکش سے انکار:

ان کے فقہی کمال کی بنا پر عہدۂ قضاء ان کے سامنے پیش کیا گیا مگر یہ اس کی ذمہ داریوں سے بہت گھبراتے تھے، اس لئے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اور یہ معقول منطقی دلیل پیش کی کہ خدائے وحدہ لاشریک کی قسم مجھے قضاء میں کوئی درک نہیں ہے، اگر میں سچ کہتا ہوں تو ظاہر ہے کہ اس عہدہ کا اہل نہیں اور اگر غلط کہتا ہوں تو جھوٹا شخص قاضی بنائے جانے کے لائق نہیں[5]۔

متبدعانہ عقائد سے نفرت:

عقائد میں بکر صحابہ کرام کے صاف اور سادہ عقیدہ کے پابند تھے، عقلی موشگافیوں کو سخت ناپسند اور جدت طرازیوں سے سخت نفرت کرتے تھے، اس زمانہ میں قدر کا مسئلہ چھڑ چکا تھا، اگر بکر کبھی اس کا ذکر بھی سن لیتے تو اس کے کفارہ میں دو رکعت نماز ادا کرتے تھے[6]۔

فارغ البالی اور تحدیث نعمت:

خدا نے بکر کو دنیاوی حیثیت سے بہت فارغ البال بنایا تھا۔ اور وہ تحدیث نعمت کے لئے امیرانہ اور عیش وراحت کی زندگی بسر کرتے تھے، اچھے لباس کے بڑے شائق تھے، چار چار ہزار تک کی قیمت کا لباس استعمال کرتے تھے، مزاج میں بڑی نفاست تھی، ایک مرتبہ چار سو کی ایک چادر خریدی، درزی نے لباس قطع کرنے کے لئے اس پر مٹی سے نشان لگانا چاہا، بکر نے روک دیا اور کافور پسوا کر اس سے نشان لگوایا[7]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۵۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۴۸۴
[4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۱۵۲ [5] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۱۵۲ [6] ایضاً۔ ص ۱۵۲ [7] ایضاً۔ ص ۱۵۲۔۱۵۳

فروتنی اور تواضع :

لیکن اس امارت میں عجب وغرور مطلق نہ تھا بلکہ اس قیمتی ملبوس میں وہ بے تکلف غربا کے مجمعوں میں حدیث سنانے کے لئے چلے جاتے تھے[۱]۔

بارگاہ ایزدی میں الحاح :

اس فراغت واطمینان کی حالت میں بھی وہ اپنے کو خدا کی بارگاہ کا ایک گدائے بےنوا سمجھتے تھے، اور ہمیشہ اس کے فضل وکرم کے طالب رہا کرتے تھے، چنانچہ دعا کیا کرتے تھے خدایا مجھے اپنے فضل وکرم سے رزق عطا فرما تاکہ میں اور زیادہ شکر گزار ہوں صرف تیری ہی احتیاج ہے، تیرے ماسوا سے استغنا ہے خدایا نہ میری امیدیں اور آرزوئیں میرے اختیار میں ہیں، اور نہ پسندیدہ باتوں کا روکنا میرے بس میں ہے، میرے تمام معاملات کسی اور کے ہاتھ میں ہیں، دنیا میں کوئی محتاج مجھ سے زیادہ محتاج نہیں، یہ دعا کر کے فرماتے اے ابن آدم ایسی امید وآرزو نہ کر جو خدا کی نیرنگی سے بےخوف کردے اور نہ ایسا خوف وہراس طاری کر جو خدا کی رحمت سے مایوس کردے[۲]۔

شرط رفاقت :

آپ کے بعض اصول ہر انسان کے لئے لائق عمل ہیں، شرط رفاقت کے سلسلہ میں فرماتے تھے کہ اگر تمہارے ساتھی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے اور تم اس کا بھی انتظار نہ کرو کہ وہ اپنا تسمہ درست کرلے یا وہ پیشاب کے لئے بیٹھے اور تم اس کے فارغ ہونے کا انتظار نہ کرو تو تم اس کے ساتھی نہیں ہو[۳]۔

زیادہ باتیں مضر ہیں :

فرماتے تھے زیادہ باتیں نہ کیا کرو، اگر تم نے صحیح اور درست باتیں کیں تو اس کا کوئی اجر نہ ملے گا اور اگر غلط کیں تو تم سے ان کا مواخذہ ہوگا[۴]۔

وفات: ۱۰۸ھ میں بصرہ میں وفات پائی، مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جنازہ پر خلقت ٹوٹی پڑتی تھی[۵]۔

(۱۲) ثابت بن اسلم بنانیؒ

نام ونسب: ثابت نام، ابو محمد کنیت، نسباً قریشی کی شاخ بنی سعد سے اور بصرہ کے صاحب علم وعمل تابعین میں تھے۔

---

۱ ابن سعد جلد ۷ ص ۱۵۲ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً ۵ ایضاً ص ۱۵۳

فضل وکمال: علمی اعتبار سے وہ بصرہ کے ممتاز علماء میں تھے۔ حافظ ذہبی انہیں امام وحجت اور ابن عماد حنبلی علم وفضل اور عبادت میں سادات تابعین میں لکھتے ہیں[1]۔

حدیث: انس بن مالکؓ کے خاص اصحاب میں تھے ان کی صحبت نے اُن کو بڑا حافظ حدیث بنادیا تھا۔ ان کی مرویات کی تعداد ابن مدائنی کے بیان کے مطابق ڈھائی سو تک پہنچی ہے[2]۔ صحابہ میں انہوں نے انسؓ بن مالکؓ، عبد اللہؓ بن عمر، عبد اللہ بن ابی لیلیٰ، مطرف بن عبد اللہ، ابو رافع عمرو بن ابو سلمہ، شعیب، عبد اللہ بن رباح، عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ، مطرف بن عبد اللہ، ابو رافع صائغ سے سماع حدیث کیا تھا[3]۔ حمید الطویل شعبہ، جریر بن ابی حازم، معمر، ہمام، ابو عوانہ، جعفر بن سلیمان، سلمان مغیرہ، داؤد بن ابی ہند، عطاء بن ابی رباح، عبد اللہ بن عبید وغیرہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں ہیں[4]۔

زہد وورع: ان کی شہرت ان کے علم سے زیادہ ان کے عمل اور زہد وورع اور عبادت وریاضت کی وجہ سے ہے، صحابہ تک ان کے مذہبی اور اخلاقی اوصاف کے معترف تھے، حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ ہر شے کی ایک کنجی ہوتی ہے۔ ثابت خیر کی کنجی ہیں[5]۔ بکر بن عبد اللہ کہتے تھے کہ جسے دنیا کا سب سے بڑا عابد دیکھنا ہو وہ ثابت کو دیکھ لئے، میں نے ان سے بڑا عابد نہیں دیکھا[6]۔

سوز وگداز: ان کا دل سوز وگداز کی آتش سوزاں تھا، گداز قلب سے ان کی آنکھیں ہر وقت اشکبار رہتی تھیں، اور اس بے قراری کے ساتھ روتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا پسلیاں الٹ جائیں گیں شدت گریہ سے آنکھیں خراب ہوگئی تھیں اور ان کے بے نور ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، لوگوں نے اتنی اشکباری پر عرض کیا تو فرمایا، آنکھوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ روتی رہیں اور علاج کرنے سے انکار کردیا[7]۔

عبادت وریاضت:

ان کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ عبادت تھا فرماتے تھے کہ کسی شخص میں خواہ ساری دنیا کی بھلائیاں کیوں نہ ہوں لیکن جب تک وہ روزے نماز کا پابند نہیں ہے اس وقت تک وہ عابد نہیں ہوسکتا، جس مسجد کی طرف سے گزرتے تھے اس میں نماز ضرور پڑھتے تھے تہجد کی نماز میں یہ پر موعظت آیت،

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۱ وشذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۶۱　۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲
۳ ایضا　۴ ایضا　۵ ابن سعد جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۳　۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۲　۷ ایضا

"اکفرت بالذی خلقک من تراب ثم من نطفة"۔

"اے انسان تو اس سے کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو مٹی پھر نطفہ سے پیدا کیا"۔

بار بار تاثر کے ساتھ پڑھتے تھے، اور زار زار روتے تھے[1]۔

صائم الدہر تھے، کبھی روزہ ناغہ نہ ہوتا تھا[2]۔ ایک شبانہ یوم میں پورا قرآن ختم کرتے تھے[3]۔

توبہ اور استغفار:

غفار الذنوب کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار بہت پسند تھا، فرماتے تھے، مجھ سے یہ پسند ہے کہ مجھ سے گناہ کبیرہ سرزد ہوں، اور خدا سے استغفار کر کے اس گناہ کو چھوڑ دوں، اس کے مقابلہ میں کہ صغیرہ سرزد ہو اور استغفار اور اس کو چھوڑنے کی توفیق نہ ہو[4]۔

موت کی یاد کا عمل پر اثر پڑتا ہے:

فرماتے تھے کہ جو شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کا نمایاں اثر پڑتا ہے[5]۔

وفات: ۱۲۳ھ میں وفات پائی، وفات کے وقت اسی سال سے اوپر عمر تھی[6]۔

(۱۴) جابر بن زیدؒ

نام و نسب: جابر نام، ابو الشعثاء کنیت نسباً قبیلہ ازد سے تھے۔

فضل و کمال: جابر نے بہت سے علماء صحابہ سے استفادہ کیا تھا، لیکن حبر الامت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی صحبت میں زیادہ رہے تھے، اس تعلق سے وہ صاحب ابن عباس، یعنی ابن عباس کے ساتھی کہلاتے تھے[7]۔ ان کے فیض صحبت نے جابر کا دامن علم نہایت وسیع کر دیا تھا، اور وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء میں تھے، حافظ ذہبی انہیں علمائے اعلام میں لکھتے ہیں[8]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ آئمہ اور فقہائے تابعین میں ہیں[9]۔

قرآن: قرآن، حدیث، فقہ، جملہ علوم میں انہیں یکساں کمال تھا، علوم قرآنیہ میں خاص مہارت تھی ان کے استاد حضرت عبداللہ بن عباس جو خود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے، فرماتے تھے اگر اہل بصرہ جابر بن زید کا قول اختیار کریں، تو کتاب اللہ کے بارہ میں ان کا علم نہایت وسیع ہو جائے[10]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷ ق ۲۔ ص ۳　۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۲　۳ ایضاً　۴ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۳
۵ ایضاً۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۳　۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۲　۷ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۲
۸ ایضاً　۹ تہذیب الاسماء جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۴۲　۱۰ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۳۸

حدیث: حدیث کے بھی بڑے حافظ تھے، حافظ ذہبی حفاظ حدیث میں انہیں علمائے اعلام کا درجہ دیتے ہیں، حدیث میں انہوں نے عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن عمرؓ، ابن زبیرؓ حکم بن عمروؓ غفاری، اور امیر معاویہؓ وغیرہ سے استفادہ کیا تھا، اور عمرو بن دینار، یعلی بن مسلم، ایوب سختیانی اور عمرو بن حزم وغیرہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں ہیں[1]۔

فقہ: فقہ میں بھی ان کو پوری مہارت تھی، علامہ نووی انہیں آئمہ اور فقہائے تابعین میں لکھتے ہیں[2]۔ صحابہ اور تابعین ان کے تفقہ کے معترف تھے، ایک مرتبہ عبداللہ بن عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ تم بصرہ کے فقہا میں ہو، اور لوگوں کو فتوی دیتے ہو، اس کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ کبھی نص قرآنی اور سنت کے خلاف فتوی نہ دینا، ورنہ تم خود ہلاک ہو گے، اور دوسروں کو ہلاک کرو گے[3]۔

ایوب حیرت آمیز استعجاب کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے[4]۔ ایاس بن معاویہ جو بصرہ کے نامور قاضی تھے کہتے تھے کہ جابر کے علاوہ اہل بصرہ کا کوئی حقیقی مفتی نہ تھا[5]۔ حضرت حسن بصری کی عدم موجودگی میں جابر افتاء میں ان کی قائم مقامی کرتے تھے[6]۔

جابر ایک مرتبہ کسی سلسلہ میں قید ہو گئے تھے، قیاس یہ ہے کہ حجاج کے زمانہ میں جبکہ بہت سے صلحاء و اخیار امت قید و بند کا شکار ہوئے تھے جابر بھی اس کے مظالم کا نشانہ بنے ہوں گے، اہل بصرہ کو ان کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ قید کی حالت میں بھی انہی کی طرف رجوع کرتے تھے، قتادہ کا بیان ہے کہ جابر بن زید قید کیے گئے تھے، لوگوں نے خنثیٰ کی میراث کی بارے میں ان کے پاس استفتاء بھیجا، انہوں نے کہا کہ تم لوگ بھی خوب ہو مجھ کو قید کراتے ہو اور پھر مجھ ہی سے فتوی پوچھتے ہو، یہ جتا کر فتوی کا جواب دیا[7]۔

جامعیت: جابر کی شخصیت جامع العلم تھی وہ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے، عمرو بن دینار کہتے تھے کہ میں نے ابوالشعثاء سے زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا[8]۔ ان کی موت کے وقت قتادہ کی زبان پر یہ جملہ تھا کہ، آج روئے زمین کا علم دفن ہو گیا[9]۔

کتابت پسند نہ تھی:

اس عہد کے بعض بزرگوں کی طرح جابر بھی علم کو قلم بند کرنا پسند نہ کرتے تھے عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں کہ جابر بن زید سے بعض لوگوں نے کہا کہ لوگ آپ سے جو سنتے ہیں اس کو لکھ لیتے ہیں۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۳۸ ۲ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۴۲ ۳ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۲ ۴ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۱۔ ص ۱۳۱ ۵ ایضاً ۶ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۳۸ ۷ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۱ ۸ ایضاً ۹ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۲

انہوں نے یہ سن کر کہا انا للہ وہ لوگ لکھ لیتے ہیں، ان کی ناپسندیدگی دیکھ کر ان کے بعض تلامذہ نے لکھنا ترک کر دیا[1]۔

فضائل اخلاق :

اس علم کے ساتھ وہ فضائل اخلاق سے بھی آراستہ تھے، عمل خیر کے مقابلہ میں دنیا کی نعمت کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے، فرماتے تھے کہ ساٹھ برس کی عمر ہونے کو آئی، اس طویل مدت میں بہت کچھ ملا، اور خدا نے بہت سی نعمتیں عطا فرمائیں، لیکن اس خیر کے علاوہ جسے میں نے کیا ہے، باقی اور تمام نعمتیں میرے نزدیک جوتے سے بھی فروتر ہیں[2]۔

دولت کے مقابلہ میں بھی ان سے لغزش نہ ہوتی تھی محمد بن حسین کہتے تھے کہ خدا جابر پر رحم کرے وہ درہم کے مقابلہ میں بھی مسلمان تھے[3]۔

ایک الزام سے برأت :

جابر کے پاس فرقہ اباضیہ (خارجی فرقہ کی ایک شاخ) کے افراد کی آمد ورفت رہتی تھی۔ اس لئے بعض لوگوں کو یہ گمان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بھی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں یا کم از کم ان کے خیالات سے متاثر ہیں۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ وہ بارہا اپنی زندگی میں اور آخر وقت مرض الموت میں اباضیہ کے عقائد سے اپنی برأت ظاہر کی۔

جب ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ثابت البنائی نے پوچھا کہ آپ کی کوئی خواہش ہے۔ کہا حسن بصری کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت وہ (غالباً حکومت) کے خوف سے ابی خلیفہ کے گھر میں روپوش تھے۔ ان کو جابر کی خواہش کی اطلاع دی گئی، وہ فوراً آنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ثابت نے روکا کہ پکڑ جانے کا خوف ہے آپ نے جواب دیا، خدا مجھ کو دشمنوں کی نظر سے بچائے گا۔ چنانچہ اسی وقت جابر کے پاس پہنچے۔

جابر میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی، دوسرے کا سہارا لے کر اٹھے۔ حسن بصری نے انہیں کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کلام اللہ کی آیات تلاوت کیں۔ حسن بصری نے دم آخر اباضیہ کے مسئلہ کو صاف کرنے کے لئے پوچھا۔ اباضیہ تم سے دوستی رکھتے ہیں۔ جابر نے کہا میں خدا سے ان سے برأت چاہتا ہوں۔ حسن بصری نے سوال کیا، نہروانیوں کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جابر نے ان سے بھی برأت ظاہر کی۔ جابر کی حالت بہت نازک تھی۔ اس لئے حسن بصری صبح تک انہیں رخصت

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

کرنے کا انتظار کرتے رہے، لیکن ابھی وقت موعود پورا نہیں ہوا تھا، اس لئے صبح کے آثار نمودار ہونے کے بعد نماز جنازہ کے طور پر چار تکبیریں کہہ کے ان کے حق میں دعائے مغفرت کی اور صبح ہونے سے پہلے اپنے قیام گاہ لوٹ گئے۔[1]

وفات: اسی بیماری میں ۱۰۳ھ میں وفات پائی۔[2]

(۱۴) جعفرؒ بن محمد المقلب بہ صادقؒ

نام ونسب: جعفر نام، ابو عبداللہ کنیت، صادق لقب، آپ امام محمد الملقب بہ باقر کے صاحبزادے اور فرقہ امامیہ کے چھٹے امام ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے: جعفر بن محمد بن علی بن ابی طالب، آپ کی ماں فردہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پرپوتے قاسم بن محمد کی لڑکی تھیں۔ ننھیالی شجرہ یہ ہے: ام فردہ بنت قاسم بن محمد بن عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ، اس طرح جعفر صادق کی رگوں میں صدیقی خون بھی شامل تھا۔[3]

پیدائش: ۸۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔[4]

فضل وکمال: آپ اس خانوادۂ علم وعمل کے چشم وچراغ تھے، جس کے ادنیٰ ادنیٰ خدام مسند علم کے وارث ہوئے آپ کے والد امام باقر اس پایہ کے عالم تھے کہ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان جیسے اکابر اُمت ان کے شاگرد تھے۔[5] اس لئے جعفر صادق کو علم گویا وراثۃً ملا تھا۔ فضل وکمال کے لحاظ سے آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ حافظ امام ذہبی آپ کو امام اور احد السادۃ الاعلام لکھتے ہیں۔ اہل بیت کرام میں علم میں کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ فقہ، علم اور فضل میں سادات اہل بیت میں تھے۔[6] امام نووی لکھتے ہیں کہ آپ کی امامت، جلالت اور سیادت پر سب کا اتفاق ہے۔[7]

حدیث: حدیث آپ کے جد امجد علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اقوال ہیں، اس لئے آپ سے زیادہ اس کا کون مستحق تھا، چنانچہ آپ مشہور حفاظ حدیث میں تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان کثیر الحدیث۔[8] حافظ ذہبی آپ کو سادات اور اعلام حفاظ میں لکھتے ہیں۔[9] حدیث میں اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقر، محمد بن منکدر، عبیداللہ بن ابی رافع، عطاء، عروہ، قاسم بن محمد، نافع اور زہری وغیرہ سے فیض پایا تھا۔ شعبہ، دونوں سفیان، ابن جریج، ابو عاصم، امام مالک، امام ابوحنیفہ وغیرہ آئمہ آپ کے تلامذہ میں تھے۔[10]

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۳۴ [2] ایضاً [3] صحیح نسب نامہ یوں ہے: جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (خورشید) [4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰ [5] ایضاً۔ ص ۱۴۹

[6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۴ [7] تہذیب الاسماء۔ ص ۱۵۰ [8] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۴۔ بحوالہ ابن سعد [9] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰ [10] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۳

احترام حدیث: حدیث رسول ﷺ کا اتنا احترام تھا کہ ہمیشہ طہارت کی حالت میں حدیث بیان کرتے تھے[1]۔

فقہ: فقہ میں اتنا کمال حاصل تھا کہ افقہ الفقہاء امام زمن امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ میں نے جعفر بن محمد سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا[2]۔

علماء کا مرتبہ: آپ فرماتے تھے کہ علما انبیاء کے امین ہیں جب تک وہ سلاطین کی آستان بوسی نہ کریں۔

اقوال: آپ کے اقوال وکلمات طیبات، تہذیب اخلاق، علم وحکمت اور پند وموعظت کا دفتر ہیں۔ سفیان ثوری سے آپ نے ایک مرتبہ فرمایا، سفیان جب خدا تم کو کوئی نعمت عطا کرے اور تم اس کو ہمیشہ باقی رکھنا چاہو تو زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرو، کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ، اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا، جب رزق ملنے میں تاخیر ہو رہی ہو، تو استغفار زیادہ کرو۔ اللہ عزوجل اپنی کتاب میں فرماتا ہے۔

"استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمدد کم باموال وبنین ویجعل لکم جنت ویجعل لکم انھارا"۔ (سورۂ نوح)

"اپنے رب سے مغفرت چاہو وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے تم پر آسمان سے موسلا دھار پانی برسائے گا اور دنیا میں مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور آخرت میں تمہارے لئے جنت اور نہریں بنائیگا۔"

جب تمہارے پاس سلطان وقت یا اور کسی کا کوئی حکم پہنچے تو **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** زیادہ پڑھو، وہ کشادگی کی کنجی ہے۔

جو شخص اپنی قسمت کے حصہ پر قناعت کرتا ہے وہ مستغنی رہتا ہے، اور جو دوسرے کے مال کی طرف نظر اٹھاتا ہے وہ فقیر مرتا ہے۔ جو شخص خدا کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا وہ خدا کو اس کے فیصلہ پر متہم کرتا ہے۔ جو شخص دوسرے کی پردہ داری کرتا ہے، خدا اس کے گھر کے خفیہ حالات کی پردہ داری کردیتا ہے۔ جو بغاوت کے لئے تلوار کھینچتا ہے، وہ اسی سے قتل کیا جاتا ہے۔ جو اپنے بھائی کے لئے گڈھا کھودتا ہے، وہ خود اس میں گرتا ہے۔ جو سفیہوں کے پاس بیٹھتا ہے، وہ حقیر ہو جاتا ہے۔ جو علماء سے ملتا جلتا ہے وہ معزز ہو جاتا ہے۔ جو برے مقامات پر جاتا ہے، وہ بدنام ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ حق بات کہو، خواہ تمہارے موافق ہو یا مخالف۔ آدمی کی اصل اس کی عقل ہے۔ اس کا حسب اس کا دین ہے۔ اس کا کرم اس کا تقویٰ ہے۔ تمام انسان آدم کی نسبت میں برابر ہیں۔ سلامتی بہت نادر چیز ہے۔ یہاں تک کہ

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۵ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰

اس کے تلاش کرنے کی جگہ بھی مخفی ہے، اگر وہ کہیں مل سکتی ہے تو ممکن ہے گوشہ گمنامی میں ملے۔ اگر تم اس کو گوشہ گمنامی میں تلاش کرو اور نہ ملے، تو ممکن ہے تنہانشینی میں ملے۔ گوشہ تنہائی گوشہ گمنامی سے مختلف ہے، اگر گوشہ تنہائی میں بھی تلاش سے نہ ملے تو سلف صالحین کے اقوال میں ملے گی۔

استغفار: فرماتے تھے جب تم سے کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کی مغفرت چاہو، انسان کی تخلیق کے پہلے سے اس کی گردن میں خطاؤں کا طوق پڑا ہے، گناہوں پر اصرار ہلاکت ہے۔

دنیا: فرماتے تھے خدا نے دنیا کی طرف وحی کی ہے کہ جو شخص میری خدمت کرتا ہے تو اس کی خدمت کر اور جو تیری خدمت کرتا ہے، اسے تھکا دے۔

اچھے کاموں کے شرائط:

فرماتے تھے بغیر تین باتوں کے عمل صالح مکمل نہیں ہوتا۔ جب تم اسے کرو تو اپنے نزدیک اسے چھوٹا سمجھو، اس کو چھپاؤ اور اس میں جلدی کرو، جب تم اس کو چھوٹا سمجھو گے تب اس کی عظمت بڑھے گی، جب تم اس کو چھپاؤ گے اس وقت اس کی تکمیل ہوگی۔ اور جب تم اس میں جلدی کرو گے تو خوشگواری محسوس کرو گے۔

حسن ظن: فرماتے تھے جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لئے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لئے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کا سبب اور اس کی کوئی تاویل ضرور ہوگی، جس کا تم کو علم نہیں۔

اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو جب وہ محمول نہ ہو سکے تو اپنے نفس کو ملامت کرو۔

تہذیب و اخلاق:

فرماتے تھے چار چیزوں میں شریف کو عار نہ کرنا چاہئے، اپنے باپ کی تعظیم میں اپنی جگہ سے اٹھنے میں، مہمان کی خدمت کرنے اور خود اس کی سواری کی دیکھ بھال کرنے میں خواہ گھر میں سو غلام کیوں نہ ہوں، اور اپنے استاد کی خدمت کرنے میں۔

ایک نکتہ: جب دنیا کسی کے موافق ہوتی ہے تو دوسروں کی بھلائیاں بھی اسے دے دیتی ہے اور جب منہ پھیر لیتی ہے تو خود اس کی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔

فضائل اخلاق: آپ کی ذات فضائل اخلاق کا زندہ پیکر تھی، آپ کا ایک نظر دیکھ لینا آپ کی خاندانی عظمت کی شہادت کے لئے کافی تھا، عمرو بن المقدام کا بیان ہے کہ جب میں

جعفر بن محمد کو دیکھتا تھا تو نظر پڑتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ نبیوں کے خاندان سے ہیں[1]۔

عبادت وریاضت: عبادت آپ کے شبانہ یوم کا مشغلہ تھی، آپ کا کوئی دن اور کوئی وقت عبادت سے خالی نہ ہوتا تھا، امام مالک کا بیان ہے کہ میں ایک زمانہ تک آپ کی خدمت میں آتا جاتا رہا آپ کو ہمیشہ یا نماز پڑھتے پایا یا روزہ رکھتے ہوئے یا قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے[2]۔

انفاق فی سبیل اللہ:

انفاق فی سبیل اللہ اور فیاضی وسیرچشمی اہل بیت کرام کا امتیازی اور مشترک وصف رہا ہے، جعفر صادق کی ذات اس وصف کا مکمل ترین نمونہ تھی، ہیاج بن بسطام روایت کرتے ہیں کہ جعفر صادق بسا اوقات گھر کا کل کھانا دوسروں کو کھلاتے تھے، اور خود ان کے اہل وعیال کے لئے کچھ نہ باقی رہ جاتا تھا[3]۔

لباس امارت میں خرقہ فقر:

آپ بظاہر اہل دنیا کے لباس میں رہتے تھے، لیکن اندر لباس فقر مخفی ہوتا تھا، سفیان ثوری کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ جعفر بن محمد کے پاس گیا۔ اس وقت ان کے جسم پر خز کا جبہ اور دخانی خز کی چادر تھی، میں نے کہا یہ آپ کے بزرگوں کا لباس نہیں ہے، فرمایا وہ لوگ افلاس اور تنگ حالی کے زمانہ میں تھے، اور اس زمانے میں دولت بہہ رہی ہے یہ کہہ کر انہوں نے اوپر کا کپڑا اٹھا کر دکھایا تو خز کے نیچے پشمینہ کا جبہ تھا۔ اور فرمایا ثوری یہ ہم نے خدا کے لئے پہنا ہے، اور وہ تم لوگوں کے لئے جو خدا کے لئے پہنا تھا۔ اس کو پوشیدہ رکھا ہے۔ اور جو تم لوگوں کے لئے تھا، اس کو اوپر رکھا ہے[4]۔

مذہبی اختلافات سے بچنے کی ہدایت:

مذہب میں جھگڑنا سخت ناپسند کرتے تھے، تم لوگ خصومت فی الدین سے بچو، اس لئے کہ وہ قلب کو مشغول کر دیتی ہے، اور نفاق پیدا کرتی ہے[5]۔

جرأت: نہایت جری بلند اور بے خوف تھے، بڑے بڑے جابر کے سامنے ان کی بے باکی قائم رہتی تھی، ایک مرتبہ منصور عباسی کے اوپر ایک مکھی آکر بیٹھی وہ بار بار ہنکاتا تھا اور مکھی بار بار آکر بیٹھتی تھی، منصور اس کو ہنکاتے ہنکاتے عاجز آگیا مگر وہ نہ ہٹی اتنے میں جعفر پہنچ گئے۔ منصور نے ان سے کہا ابو عبداللہ مکھی کس لئے پیدا کی گئی ہے، فرمایا جبابرہ کو ذلیل کرنے کے لئے[6]۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰ [2] تہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۴ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰
[4] ایضاً [5] ایضاً [6] صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۴۱

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق عقیدہ :

گو تمام حق پرست اہل بیت کرام کو خلفائے اربعہ کے ساتھ یکساں عقیدت تھی لیکن جعفر صادق کی رگوں میں صدیقی خون بھی شامل تھا، اس لئے آپ کو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ خاص تعلق تھا، اور وہ اپنے جدامجد حضرت علیؓ کی طرح ان پر بھی اپنا حق سمجھتے تھے، چنانچہ فرماتے کہ مجھے علیؓ سے جس قدر شفاعت کی امید ہے، اتنی ہی ابوبکرؓ سے ہے[۱]۔

وفات : ۱۴۸ھ میں وفات پائی[۲]۔

(۱۵) حسنؒ بن حسنؓ

نام ونسب : حسن نام ہے۔ خاندان نبوت کے چشم وچراغ یعنی حضرت امام حسن بن علی علیہما اسلام کے فرزند ارجمند اور آپ کے جانشین تھے۔ ماں کا نام خولہ تھا۔ ننھیالی نسب نامہ یہ تھا : خولہ بنت منظور بن زبان بن سیار بن عمرو بن جابر بن عقیل بن ہلال بن سمی بن مازن فزاری۔

فضل وکمال : فضل وکمال کے لحاظ سے حسن کا کوئی قابل ذکر پایہ نہ تھا۔ تاہم اپنے جدامجد کی باتوں یعنی احادیث نبوی کے امین تھے، اور اس کو اپنے والد بزرگوار حضرت حسنؓ اور عبداللہ بن جعفرؓ سے سنا تھا۔ آپ کے صاحبزادے ابراہیم، عبداللہ، حسن اور چچیرے بھائی حسن بن محمد بن حنفیہ اور حباب بن سدید کوفی، سعید بن ابی سعید، عبدالرحمٰن بن حفص اور ولید بن کثیر وغیرہ سے آپ نے روایتیں کی ہیں[۳]۔

خلافت کے بارہ میں باطل عقائد کی تردید :

حسن خلق میں اپنے بے نیاز عالم والد بزرگوار حضرت حسنؓ کے خلف الصدق تھے، نسبی فخر وغرور کا ادنی شائبہ نہ تھا، بعض سادات کرام، حامی مدعیان محبت اہل بیت کے فریب میں پھنس جاتے تھے، اگرچہ ان کے عقائد وخیالات سے ان کا دامن پاک ہوتا تھا، لیکن بعض حالات کی وجہ سے وہ ان کے ہفوات کو انگیز کر لیتے تھے۔

لیکن حسن اس باپ کے بیٹے تھے، جس نے ملتی ہوئی خلافت چھوڑ دی۔ اس لئے وہ خلافت کے بارہ میں گمراہ کن خیالات کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور برملا ان کی تردید کرتے تھے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰ [۳] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۳

ایک مرتبہ آپ نے ایک غالی مدعی محبت سے فرمایا تم لوگوں کو دعویٰ ہے کہ تم ہم سے خدا کے لئے محبت کرتے ہو، اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو ہم جب تک خدا کی اطاعت کریں تم ہم سے محبت کرو، اور جب اس کی نافرمانی کریں تو ہم سے دشمنی کرو آپ کے یہ خیالات سن کر ایک شخص نے کہا کہ آپ لوگ تو رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار اور اہل بیت میں سے ہیں آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے اگر اللہ تعالیٰ بغیر اپنی اطاعت کے محض قرابت رسول کی وجہ سے کسی سے رکنے والا ہوتا تو سب سے زیادہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچتا جس کے مادری اور پدری سلسلے ہم سے زیادہ رسول اللہ (ﷺ) سے قریب ہیں، خدا کی قسم مجھ کو خوف ہے کہ ہم میں (اہلبیت) کے گنہگار کو عام گنہگاروں سے دگنا عذاب دیا جائے گا، اور یہ امید بھی ہے کہ ہماری جماعت کے مطیع اور محسن کو اجر بھی دوگنا ملے گا تم لوگوں کی حالت پر افسوس ہے خدا سے ڈرو اور ہمارے بارے میں قول حق کہو، کیونکہ وہ اس چیز کو جسے تم چاہتے ہو بدرجہ اتم پورا کرنے والا ہے اور ہم بھی قول حق ہی سے تم سے راضی ہو سکتے ہیں۔

پھر فرمایا جو کچھ تم لوگ کہتے ہو، اگر وہ خدا کے دین کی بات ہے تو ہمارے بزرگوں نے ہمارے ساتھ بڑی برائی کی کہ انہوں نے اس کو نہ ہمیں بتایا اور نہ اس کی جانب رغبت دلائی یہ سن کر اس رافضی نے کہا کیا مولا علیؓ کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** فرمایا ہاں کہا ہے لیکن اگر اس سے مراد خلافت اور حکومت ہوتی تو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اسلامی ارکان کی طرح اس کی بھی وضاحت اور تصریح فرمادیتے اور صاف صاف ارشاد فرماتے کہ لوگو میرے بعد یہ تمہارے ولی ہیں، کیونکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ رسول ﷺ تھے (اس لئے آپ کو ایک دینی مسئلہ میں صریح حکم دینا چاہئے تھا) اگر تم لوگوں کے قول کے مطابق یہ صحیح مان لیا جائے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے علیؓ کو خلافت اور رسول اللہ کے بعد ان کی جانشینی کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ تو ایسی صورت میں علیؓ سب سے بڑے مجرم اور خطا کار ٹھہرتے ہیں کہ انہوں نے اس چیز کو جس کے قیام کا رسول اللہ نے حکم دیا تھا چھوڑ دیا[1]۔

ابو العباس سفاح سے تعلقات و مراسم:

ابو العباس سفاح عباسی، حسن اور ان کے بھائی عبداللہ دونوں کو بہت مانتا تھا۔ یہ دونوں طالبین[2] کی جماعت کے ساتھ اس کے پاس جاتے تھے، وہ ان کی خدمت کرتا تھا، عبداللہ پر اتنا مہربان تھا کہ دربار میں جانے کے لئے ان پر پورے لباس کی پابندی نہ تھی، اور وہ بلا تکلف محض

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۵ [2] عبدالمطلب کی اولاد

معمولی کرتا پہن کر سفاح کے سامنے چلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ یہ غیر معمولی برتاؤ دیکھ کر لوگ ان سے کہتے تھے کہ امیر المومنین تمہارے علاوہ کسی کو اس لباس میں نہیں دیکھتے تم کو انہوں نے اپنا فرزند تصور کیا ہے۔

لیکن ان تعلقات و مراسم اور اس شفقت و کرم کے باوجود سفاح کو ان کے لڑکوں محمد اور ابراہیم کی جانب سے اپنی مخالفت کا بڑا خطرہ تھا، ایک دن اس نے عبداللہ سے پوچھا کہ تمہارے دونوں لڑکے اپنے خاندان والوں کے ساتھ میرے پاس کیوں نہیں آتے، عبداللہ خاموش رہے، سفاح نے دوبارہ پھر پوچھا، عبداللہ نے حسن سے اس کا تذکرہ کیا انہوں نے کہا، اگر اب وہ سوال کرے تو کہہ دینا کہ ان کے چچا (یعنی خود حسن) کو ان کا حال معلوم ہے ان سے پوچھئے، عبداللہ نے کہا تم میرے لیئے اتنی بڑی ذمہ داری برداشت کرو گے انہوں نے کہا ہاں

چنانچہ سفاح نے جب دوبارہ پھر پوچھا تو عبداللہ نے کہہ دیا کہ امیر المومنین ان کے چچا کو ان کا علم ہے۔ سفاح نے حسن کو بلا کر ان سے پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ پہلے آپ یہ بتایئے کہ میں آپ سے کس طرح کی گفتگو کروں۔ خلافت کی عظمت و جلالت کو ملحوظ رکھ کر یا چچیرے بھائی کی طرح۔ سفاح نے کہا بالکل بے تکلف جیسے بھائی بھائی سے کرتا ہے۔

حسن نے کہا میں آپ کو خدا کا واسطہ دلا کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اگر خدا نے خلافت کا کوئی حصہ محمد اور ابراہیم کے لئے مقدر کر دیا ہے تو کیا آپ اور آپ کے ساتھ ساری روئے زمین کی طاقت اور کوشش خدا کی تقدیر کو روک سکتی ہے۔ سفاح نے کہا نہیں، حسن نے کہا میں آپ کو خدا کا واسطہ دلا کر پوچھتا ہوں کہ اگر خدا نے ان کی قسمت میں کچھ نہیں لکھا ہے تو کیا وہ دونوں سارے روئے زمین کی حمایت اور کوشش سے کچھ پالیں گئے۔ سفاح نے کہا نہیں، حسن نے کہا تو پھر آپ ان پیر و مرد (عبداللہ) کی ان نعمتوں اور الطاف و عنایات کو جو آپ ان پر کرتے ہیں بے لطف اور مکدر کیوں کرتے ہیں۔ حسن کی اس گفتگو کے بعد سفاح نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی ان دونوں کا تذکرہ نہ کریگا، اور مرتے وقت تک اس عہد پر قائم رہا۔

قید اور وفات :

لیکن اس کے جانشین منصور نے اس کا لحاظ نہیں رکھا، اور محمد اور ابراہیم کے جرم میں حسن اور عبداللہ دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا، چنانچہ دونوں نے قید ہی میں ۱۴۵ھ میں وفات پائی، وفات کے وقت حسن کی عمر اٹھاسی سال کی تھی [1]۔

---

[1] یہ واقعات تاریخ خطیب۔ جلد ۷۔ ۲۹۳، ۲۹۴ سے ماخوذ ہیں

(۱۶) حسن بصریؒ

نام ونسب: حسن نام،ابو سعید کنیت،والد کا نام یسار تھا،علمی کمالات کے لحاظ سے سرخیل علماء اور اخلاقی وروحانی فضائل کے اعتبار سے سرتاج اولیاء تھے۔

ان کے والدین غلام تھے،ان کی غلامی کے بارہ میں مختلف بیانات ہیں،ایک روایت یہ ہے کہ ان کے والد یسان کے قیدیوں میں تھے ،انس بن مالک کی پھوپھی ربیع بنت نضر نے خرید کر آزاد کیا تھا۔دوسری روایت یہ ہے کہ ان کے والد اور والدہ دونوں بنی نجار یعنی ایک انصاری کی غلامی میں تھے،انہوں نے بیوی کے مہر میں بنی سلمہ کو دیدیا تھا، بنی سلمہ نے ان کو آزاد کردیا،تیسری روایت یہ ہے کہ ان کے والد حضرت زید بن ثابتؓ کے غلام تھے،اوران کی ماں اُم المومنین حضرت سلمہؓ کی لونڈی تھیں،ان اختلافات سے قطع نظر کر کے اتنا مسلم ہے کہ یسار اور ان کی بیوی لونڈی غلام تھے، اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا آخری روایت زیادہ مستند ہے۔

اُم المومنین اُم سلمہؓ کی رضاعت :

حسن بصری آخری عہد فاروقی میں جب کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کو دو سال باقی رہ گئے تھے یعنی ۲۱ھ میں پیدا ہوئے ،اُم المومنین ام سلمہؓ کی غلامی کی نسبت سے ان کو وہ شرف میسر ہوا جو کم خوش قسمتوں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ان کی ماں لونڈی تھیں۔اس لئے اکثر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں۔جب وہ حسن بصری کو چھوڑ کر کسی کام میں لگ جاتیں اور وہ رونے لگتے ،تو حضرت اُم سلمہؓ ان کو بہلانے کے لئے چھاتی منہ میں دے دیتیں،پھر ان کی ماں لوٹ کر دودھ پلاتیں،اس طرح ان کو اُم المومنین کی رضاعت کا شرف حاصل ہوا۔

حسن بصری حضرت اُم سلمہؓ کے سایۂ شفقت میں پلے تھے۔ان کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی ان کی آمد ورفت رہتی تھی۔ان کا خود بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک جب کہ ان کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی وہ بے تکلف ازواج مطہرات کے گھروں میں آتے جاتے تھے[1]۔

علمی کمالات : حسن بصری ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ صحابہ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی اور ایسے مقام پر ان کی نشوونما ہوئی تھی جہاں کی گلی گلی علوم نبوی کا مخزن تھی ، پھر انہیں صحبت ایسے

---

[1] ابن سعد۔جلد ۷۔ق ۲

بزرگوں کی میسر آئی جو تعلیمات اسلامی کا زندہ نمونہ اور اخلاق نبوی کی مجسم تصویر تھے، اس لئے ان کا دامن علم وعمل، فضل وکمال اور زہد وورع جملہ اخلاقی اور روحانی فضائل سے مالا مال ہو گیا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، "کان الحسن جامعاً عالماً عالیاً رفیعاً فقیهاً ،ماموناً ،عابداً ، ناسكاً، كبيرا لعلمه فصيحا جميلا و سفياً" [1]

حسن بصری جامع کمالات تھے۔ عالم تھے، بلند مرتبت رفیع المنزلت تھے، فقیہ تھے، مامون تھے، عابد وزاہد تھے، وسیع العلم تھے، فصیح وبلیغ اور حسین وجمیل تھے، غرض وہ جملہ ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں، حافظ ،علامة من بحور العلم ،فقيه النفس ، كبير لشان ،عديم النظير ،مليح التذكير ، بليغ الموعظة ،راس في انواع الخير [2]

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ وہ مشہور عالم تھے، ان کی جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے [3]

اکابر علماء کی رائے :

اس عہد کے تمام علماء اور ارباب کمال کا ان کی جلالت شان پر اتفاق ہے۔ امام شعبی کہتے تھے کہ میں نے اس ملک (عراق) کے کسی شخص کو بھی ان سے افضل نہیں پایا۔ قتادہ لوگوں کو ہدایت کرتے تھے کہ اس شخص (حسن بصری) کا دامن پکڑو، میری رائے میں اس سے زیادہ کسی شخص کو عمر بن الخطابؓ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ اعمش کہتے تھے کہ حسن حکمت کو محفوظ رکھتے تھے، اور اس کو بولتے تھے۔

امام باقر فرماتے تھے کہ ان کی باتیں انبیاء کی باتوں کے مشابہ ہیں۔ غالب القطان کہتے تھے کہ اس عہد کے علماء پر حسن کو ایسی ہی فضیلت حاصل تھی جیسے طیور میں باز کو گوریوں پر ہوتی ہے، جو شخص اس زمانہ کے سب سے بڑے عالم کو دیکھنا چاہے اسے حسن کو دیکھنا چاہئے۔ عمرو بن مرہ کہتے ہیں کہ مجھے اہل بصرہ پر حسن اور محمد دو شخصوں کی وجہ سے رشک ہے، یونس بن عبید اللہ اور حمید الطویل کہتے تھے کہ میں نے بہت سے فقہا کو دیکھا لیکن حسن سے زیادہ کسی کو کامل المروۃ نہیں پایا، عطاء بن ابی رباح لوگوں کو ہدایت کرتے تھے کہ تم لوگ اس شخص (حسن) کی طرف مسائل میں رجوع کیا کرو، وہ بہت بڑے عالم، امام اور مقتداء ہیں۔

امام مالک فرماتے تھے کہ تم لوگ حسن بصری سے مسائل پوچھا کرو کیونکہ انہوں نے محفوظ رکھا اور ہم نے بھلا دیا۔ بعض لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ اگر حسن نے سن شعور میں عہد صحابہ پایا ہوتا تو یہ بزرگوار رائے میں ان کے محتاج ہوتے [4]

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۱۵　[2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۲　[3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۱۔ ص ۱۶۱　[4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲ تذکرہ حسن بصری

اگرچہ حسن بصری جامع العلوم تھے، لیکن ان کی زندگی زیادہ تر زہد و عبادت اور روحانی مشاغل میں بسر ہوتی تھی، اس لئے ان کے روحانی مرتبہ کے مقابلہ میں ان کے علم کی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں، تاہم جتنے حالات ملتے ہیں وہ سرسری اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں، ان کو تفسیر فقہ اور حدیث جملہ مذہبی علوم میں یکساں دستگاہ حاصل تھی۔

تفسیر: مفسر کی حیثیت سے انہوں نے کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی، لیکن تفسیر کی تعلیم انہوں نے بڑی محنت سے حاصل کی تھی، بارہ برس کے سن میں وہ حافظ قرآن ہو گئے تھے، ابوبکر الہندالی کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سورۃ کی تفسیر و تاویل اور شان نزول وغیرہ سے پوری واقفیت نہ حاصل کر لیتے تھے، اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے[1] اس محنت نے ان کو قرآن کا بڑا عالم بنا دیا تھا اور وہ تفسیر کا درس دیتے تھے[2]۔

حدیث: حدیث میں ان کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ حافظ ذہبی کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ علامہ اور علم کے سمندروں میں تھے[3]۔ حدیث میں انہوں نے ان بزرگوں سے فیض پایا تھا جن میں سے اکثر اس فن کے اساطین اور رکن اعظم تھے چنانچہ صحابہ میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن معاویہؓ، معقل بن یسار، ابی بکرؓ، عمران بن حصین۔ اور جندب بجلیؓ سے براہ راست استفادہ کیا تھا اور عمر بن الخطابؓ، ابن کعب، سعد بن عبادہؓ، عمار بن یاسر، ابو ہریرہؓ، ثوبان عثمان، بن ابی العاص اور معقل بن سنان سے بالواسطہ مستفید ہوئے، صحابہ کے علاوہ اکابر تابعین کی ایک بڑی جماعت سے سماع حدیث کیا تھا[4]۔

منافقین حدیث کا مرجوعہ:

جہاں تک ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے، غالباً ان کا کوئی خاص حلقہ درس نہ تھا اور وہ اس سلسلہ کو اپنے لئے پسند نہ کرتے تھے اور حدیث بہ درجہ مجبوری بیان کرتے تھے، چنانچہ فرماتے تھے، کہ اگر خدا نے اہل علم سے عہد نہ لیا ہوتا تو میں تم لوگوں کے سب سوالات میں حدیث نہ بیان کرتا[5]۔

لیکن ان کی شخصیت ایسی تھی کہ لوگ ان کا دامن نہ چھوڑتے تھے۔ اکثر شائقین علم خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے، اور جہاں وہ جاتے تھے خلق اللہ کا مرجع بن جاتے تھے۔ مکہ تک میں جو مدینہ کے بعد علم کا دوسرا مرکز تھا لوگوں کا ہجوم لگ جاتا تھا۔ اہل مکہ آپ کو تخت پر بٹھا کر

---

[1] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۶
[2] تہذیب التہذیب تذکرہ جابر بن زید۔
[3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۲
[4] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۳
[5] ایضاً

حدیثیں سنتے تھے، اور مجاہد، عطاء اور طاؤس جیسے اکابر علماء سننے والوں میں ہوتے تھے، اور ان کی زبان پر یہ کلمہ ہوتا تھا کہ ہم نے اس شخص کا مثل نہیں دیکھا[۱]۔

روایت بالمعنی : احادیث کو بالفاظہا روایت کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، صرف معنی اور مطلب کے ادا ہو جانے کو کافی سمجھتے تھے عموماً ان کی روایات بالمعنی ہوتی تھیں[۲]، بعض الفاظ میں اختلاف اور کمی و بیشی ہو جاتی تھی، لیکن معنی ایک ہی رہتے تھے[۳]۔

تلامذہ : روایت حدیث میں احتیاط کے باوجود آپ کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان کی مختصر فہرست یہ ہے، حمید الطویل، یزید بن ابی مریم، ایوب، قتادہ، ابوبکر بن عبداللہ مزنی جریر بن ابی حام، ابوالاشہب، ربیع بن صبیح، سعد بن ابراہیم، سماک بن حرب، ابن عدن، خالد الحذاء، عطاء بن سائب، عثمان (البتی) قرہ بن خالد، مبارک بن فضالہ، یعلی بن زیاد ہشام بن حسان، یونس بن عبید، منصور بن زادان، سعید بن ہلال، مجاہد اور عطاء اور طاؤس وغیرہ[۴]۔

فقہ: فقہ کے امام اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ حسن حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے[۵]۔ ایوب کا بیان ہے کہ حسن سے بڑا فقیہ میری آنکھوں نے نہیں دیکھا ربیع بن انس کا بیان ہے کہ میں کامل دس سال تک حسن کے پاس آتا جاتا رہا، اور ان سے ہمیشہ نئے نئے مسائل معلوم ہوتے تھے[۶]۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حدیث وفقہ میں بعض کتابیں بھی لکھی تھیں۔ اس تفقہ کے لئے مجتہدانہ نظر ضروری تھی۔ چنانچہ جن مسائل میں روایتی سند نہ ہوتی تھی، اس میں رائے اور قیاس سے اجتہاد کرتے تھے، ایک مرتبہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے پوچھا کہ آپ جن جن مسائل میں لوگوں کو فتوی دیتے ہیں کیا ان سب میں آپ کے پاس سماعی سند ہوتی ہے۔ فرمایا نہیں خدا کی قسم سب میں سماعی سند نہیں ہوتی لیکن ہماری رائے سائلوں کی رائے سے ان کے لئے بہتر ہوتی ہے[۷]۔

ان کی رائے اصابت وصحت میں اصحاب رائے صحابہ کے برابر ہوتی تھی، ابوقتادہ لوگوں کو مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتے تھے اور کہتے تھے خدا کی قسم میں نے ان کی رائے سے زیادہ کسی کی رائے کو عمر و بن الخطاب کی رائے کے مشابہ نہیں دیکھا[۸]۔ بعض ارباب علم تو

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۴ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۱۵ ۳۔ ایضاً
۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۴ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۱۸ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۵ ۷۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۲۰ ۸۔ ایضاً۔ ۱۱۷

یہاں تک ان کی اصابت رائے اور دقتِ نظر کے معترف تھے اور کہتے تھے کہ اگر حسن سن شعور میں عہد صحابہ میں ہوتے تو وہ بزرگوار رائے میں ان کے محتاج ہوتے[1]۔

زبان وادب: ان مذہبی علوم کے علاوہ وہ زبان وادب کے بڑے ماہر اور فصیح و بلیغ تھے، ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ فصاحتِ زبان اور عربیت میں رؤبہ بن عجاج کے مشابہ تھے[2]۔

ارباب علم کی صحبت:

ارباب علم کی صحبت اور ان سے علمی مذاکرہ اور ذکر و فکر کا شغل بہت مرغوب خاطر تھا، ایک مرتبہ چند اہل علم آپ سے ملنے کے لئے آئے، باتوں باتوں میں دوپہر کا وقت آگیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ان کے صاحبزادے نے حاضرین سے کہا آپ نے والد پر بہت بار ڈالا، آپ انہیں آرام لینے دیجئے، ابھی تک انہوں نے کھانا تک نہیں ہے، یہ سن کر آپ نے صاحبزادے کو تنبیہ فرمائی کہ ان لوگوں کی دید سے زیادہ میرے لئے کوئی آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں۔ جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو باہم حدیث بیان کرتے ہیں خدا کا ذکر اور اس کی تحمید و تقدیس کرتے ہیں، یہاں تک کہ قیلولہ کا موقع بھی نہیں ملتا[3]۔

حقیقی عالم: آپ کے نزدیک تنہا بار علم سے کوئی شخص عالم کہلانے کا مستحق نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کے لئے بہت سے شرائط تھے۔ ایک مرتبہ مطر الوارق نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا اور عرض کیا، فقہا آپ کی مخالفت کرتے ہیں، فرمایا تیری ماں تجھ کو روئے، تو نے فقیہ دیکھا بھی ہے، اور جانتا بھی ہے فقیہ کسے کہتے ہیں، فقیہ وہ ہے جو زاہد و متورع ہو، اپنے سے بلند مرتبہ کی پرواہ نہ کرتا ہو، اور اپنے سے کم رتبہ والے کا مذاق نہ اڑاتا ہو، اور خدا نے اس کو جو علم عطا کیا ہے اس سے قلیل دنیاوی منفعت نہ حاصل کرتا ہو[4]۔

علم باطن: گو حسن بصری علوم ظاہری میں بھی شیخ الاسلام کا درجہ رکھتے تھے، لیکن یہ علوم ان کے لئے سرمایۂ فخر و امتیاز نہ تھے، ان کا اصل اور حقیقی مقام عرفان و حقیقت کا کنگرہ تھا ان کی ذات تصوف کا منبع اور علم باطن کا سرچشمہ تھی، تصوف کی تمام نہریں اسی سرچشمہ سے پھوٹتی ہیں، چنانچہ تصوف کے اکثر بڑے بڑے سلاسل آپ ہی کے واسطہ سے حضرت علیؓ تک منتہی ہوتے ہیں، اس طرح گویا آپ ہی کے واسطہ سے دنیا میں یہ دریائے نور وارد ہوا۔

۱؎ ابن سعد تذکرہ حسن بصری ۲؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸ ۳؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۲۳
۴؎ ایضاً۔ ص ۱۲۹

اگر چہ محدثین کے نزدیک حضرت علیؓ سے آپ کا استفادہ روحانی ثابت نہیں ہے لیکن ارباب تصوف کا اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری حضرت علیؓ ہی کے فیض یافتہ تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ارباب طریقت کے نزدیک حسن بصری حضرت علیؓ کی جانب یقینی منسوب ہیں محدثین کے نزدیک یہ انتساب ثابت نہیں ہے، لیکن شیخ احمد قسناشی نے اپنی کتاب عقد الفریدفی سلاسل اہل التوحید میں ایک تشفی بخش بحث کے ذریعہ سے اہل تصوف کی تائید کی ہے، ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری نے حضرت علیؓ سے فیض پایا ہے[1]۔

سلف سے لے کر خلف تک تمام اکابر صوفیہ حضرت حسن بصری کو اس سلسلۂ نورانی کا سر چشمہ اور شیخ الشیوخ مانتے ہیں، ان کے اقوال سے سند لاتے ہیں، صوفیہ کے تذکروں میں ان کا نام سر فہرست ہوتا ہے، ان کے اقوال تعلیم تصوف کا نصاب مانے جاتے ہیں۔

شیخ فریدالدین ان الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر شروع کرتے ہیں، ان پروردہ نعمت آن خو کردہ فتوت، آن کعبہ علم و عمل، آن خلاصہ ورع و حلم، آں سبق بردہ بصاحب صدری صدر سنت حسن بصری رضی اللہ عنہ مناقب او بسیار است و محامد او بے شمار[2]۔

شیخ علی بن عثمان ہجویری المتوفی ۴۶۵ھ[3] اپنی کتاب کشف المحجوب میں جو فارسی میں تصوف کی سب سے قدیم کتاب ہے لکھتے ہیں، امام عصر فرید دہر ابوعلی الحسن بصری رضی اللہ عنہ، وے را قدرے وخطرے بزرگ است نزدیک اہل طریقت لطیف الاشارہ بودہ است اندر علم و معاملت[4]۔

شیخ ابونصر سراج المتوفی ۳۷۰ھ اور شیخ شہاب الدین سہروردی وغیرہ اکابر صوفیہ نے اپنی کتابوں کتاب اللمع اور عوارف المعارف میں حسن بصری کے اقوال سے استناد کیا ہے[5]۔

فضائل اخلاق :

روحانی اور اخلاقی کمالات کے اعتبار سے حسن بصری زہد و ورع کا مجسم پیکر اور فضائل اخلاق مجسم تصویر تھے، اگر چہ انہوں نے رسالت کا مقدس زمانہ نہیں دیکھا تھا، اور آنحضرت ﷺ کی صحبت سے مشرف نہ ہوئے تھے، لیکن ان کے اخلاق اسی مقدس سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، تابعین کی جماعت میں ان سے زیادہ کوئی شخص صحابہ رسول سے مشابہ نہ تھا، ان کی ہر ادا سے شان صحابیت آشکارا تھی اکابر تابعین کو اس کا اعتراف تھا، حضرت ابو بردہ جو ایک بلند مرتبہ تابعی ہیں فرماتے تھے کہ میں نے کسی

---

[1] ایضاً فی سلاسل اولیاء اللہ۔ ص ۳۱۔ ص ۱۸ [2] تذکرۃ الاولیاء فریدالدین عطار۔ جلد اول ص ۳۲۴
[3] ان کے سنہ وفات میں اختلاف ہے ۴۵۶ تک کسی سنہ میں وفات پائی [4] کشف المحجوب نسخہ قلمی دار المصنفین
[5] دیکھو کتاب اللمع و عوارف المعارف

غیر صحابی کو حسن سے زیادہ اصحاب رسول سے مشابہ نہیں دیکھا[1]۔ امام شعبی نے ستر صحابہ کرام کو دیکھا تھا، اور اس شرف میں وہ شاید حسن بصری سے بھی ممتاز تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی بڑی عظمت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے نے ان سے پوچھا، ابا میں دیکھتا ہوں کہ جیسا برتاؤ آپ اس شیخ (حسن بصری) کے ساتھ کرتے ہیں ویسا کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہیں کرتے ہیں۔ شعبی نے جواب دیا بیٹا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر اصحاب کو دیکھا ہے، اور حسن سے زیادہ کسی کو ان سے مشابہ نہیں پایا[2]۔

سوز و گداز: روحانیت سرچشمہ سوز و گداز قلب ہے، اسی سے عبادت و ریاضت زہد و ورع وغیرہ تمام اخلاقی اور روحانی فضائل کے سوتے پھوٹتے ہیں، حسن کا دل ایسا شکستہ ساز تھا، جس سے درد کے سوا کوئی نغمہ نہ نکلتا تھا، یونس کا بیان ہے کہ ان پر ہمیشہ حزن اور غمگینی چھائی رہتی تھی ان کے لب ہنسی سے بالکل نا آشنا تھے، فرماتے تھے کہ مومن کی ہنسی قلب کی غفلت کا نتیجہ ہے زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[3]۔ کلام پاک کی آیات پڑھ کر شدت تاثر سے زار زار رویا کرتے تھے[4]۔

خشیت الٰہی: خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر آن لرزاں رہتے تھے، یونس بن عبید کا بیان ہے کہ جب حسن آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی عزیز قریب کو دفن کیے ہوئے آرہے ہیں۔ جب بیٹھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے قیدی ہیں جس کی گردن مار دے جانے کا حکم دیا جاچکا ہے، اور جب دوزخ کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ صرف انہی کے لیے بنائی گئی ہے[5]۔

زہد و ورع: ان کی زندگی سرتاپا زہد و ورع میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کی ذات عبادت و ریاضت اور زہد و ورع کا مجسم پیکر تھی، حجاج الاسود کا بیان ہے، کہ ایک شخص آرزو کیا کرتا تھا کہ کاش مجھے حسن کا زہد، ابن سیرین کا ورع، عامر بن عبد قیس کی عبادت اور سعید بن مسیب کا تفقہ میسر آئے لوگوں نے دیکھا تو یہ تمام اوصاف حسن کی تنہا ذات میں جمع تھے[6]۔

ان کی مجلس میں آخرت کے علاوہ کسی شے کا ذکر نہ ہوتا تھا، اشعث کا بیان ہے کہ ہم جب حسن کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم سے نہ کوئی دنیاوی خبر پوچھی جاتی اور نہ کوئی خبر دی جاتی، بس صرف آخرت کا ذکر رہتا تھا[7]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۸ ۲۔ ایضاً ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۲۲۔ ص ۱۲۵
۴۔ ایضاً ص ۱۲۷ ۵۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸ ۶۔ ابن سعد۔ ص ۱۲۰ ۷۔ ایضاً

عبادت کے بعض خاص احوال:

فرائض وسنن کے علاوہ آپ کی خاص عبادت تنہائی میں ہوتی تھی۔ اس وقت آپ، کسی اور عالم میں ہوتے تھے۔ حمید کا بیان ہے کہ ہم ایک مرتبہ مکہ میں تھے کہ شعبی نے حسن سے تخلیہ کی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے حسن سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے کہا جب دل چاہے آئیں ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ ایک دن آ گئے، میں دروازے پر موجود تھا۔ میں نے ان سے کہا اس وقت حسن گھر میں تنہا موجود ہیں اندر جاؤ لیکن تنہا جانے کی ان کی ہمت نہ پڑی۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی، میں بھی ساتھ ہو لیا۔

جس وقت ہم لوگ اندر پہنچے اس وقت حسن قبلہ رو ایک عجیب عالم میں کہہ رہے تھے، ابن آدم تو نیست تھا ہست کیا گیا تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا، لیکن جب تیری باری آئی اور تجھ سے مانگا گیا تو تو نے انکار کر دیا، افسوس تو نے کتنا برا کام کیا۔ یہ کہہ کر وہ بے خبر ہو جاتے تھے، پھر ہوش میں آ کر یہی کلمات دہراتے۔ یہ رنگ دیکھ کر شعبی نے مجھ سے کہا کہ لوٹ چلو اس وقت شیخ کسی اور عالم میں ہے۔[1]

عمل اور اخلاص فی العمل:

آپ کے نزدیک زہد محض زبانی دعووں اور ظاہری وضع بنانے کا نام نہ تھا بلکہ اصل شے عمل واخلاص تھا فرماتے تھے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے اگر اس کو کچھ کرتا بھی ہے تو یہ فضیلت ہے اور اگر کرنے سے زیادہ کہتا ہے تو وہ عار ہے۔[2]

آپ کی زندگی سرتاپا عمل تھی۔ ابوبکر ہذلی کا بیان ہے کہ وہ جب تک خود ایک کام نہ کر لیتے تھے، اس وقت تک دوسروں کو اس کے کرنے کی ہدایت نہ کرتے تھے اور جب تک خود کسی کام کو چھوڑ نہ دیتے تھے اس وقت تک دوسرے کو اس سے منع نہ کرتے، یونس بن عبید سے کسی نے پوچھا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو حسن بصری کے ایسے اعمال کرتا ہو انہوں نے کہا ان کے جیسے اعمال کرنا تو کجا میں کسی ایسے شخص کو بھی نہیں جانتا جو زبان سے ان کی باتیں کہتا ہو۔[3]

بغیر اخلاص کے محض حلقہ نشینی اور گلیم پوشی کو فریب تصور کرتے تھے، چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے حلقہ میں بہت سے لوگ بیٹھتے ہیں لیکن اس سے ان کی غرض دنیا ہوتی ہے، ایک مرتبہ آپ کے سامنے گلیم پوشوں کا تذکرہ کیا گیا فرمایا یہ لوگ دل کی گہرائیوں میں غرور کے بت چھپائے ہیں اور

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۲۲ ۲؎ ایضاً ۳؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۷ وص ۱۳۸

ظاہری لباس سے تواضع اور فروتنی ظاہر کرتے ہیں بخدا یہ اپنی گلیم گدائی میں بیش قیمت ردا پوشوں سے زیادہ مغرور ہیں۔

بزیر دلق مرقع کمانہا دارند

کلاہ تتری: اس پرفریب وضع سے بچنے کے لئے آپ کبھی کبھی اچھا لباس بھی پہن لیتے تھے کلثوم بن جوشن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حسن یمنی جبہ اور رداء اوڑھ کر نکلے اس پوشاک میں دیکھ کر فرقد نے اعتراض کیا کہ آپ جیسے شخص پر یہ لباس زیب نہیں دیتا آپ نے جواب دیا ابن ام فرقد تم کو یہ معلوم نہیں کہ دوزخیوں کا بڑا حصہ گلیم پوشوں میں سے ہوگا[1]۔

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

فریب نفس کا خوف:

انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے جو اس کو کبھی قبولیت عامہ اور شہرت طلبی کبھی ریاکاری اور کبھی عجب وغرور کے فریب میں مبتلا کر کے برباد کر دیتا ہے حضرت حسن بصری اس پرفریب اور چمکیلے سراب سے بہت خائف رہتے تھے اور اٹھتے بیٹھتے یہ دعا کرتے تھے خدایا شرک، غرور نفاق، ریا، فریب، شہرت طلبی اور اپنے دین میں شک وشبہ سے ہمارے قلوب کو بچا اے مقلب القلوب ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم اور استوار رکھ اور اسلام قیم کو ہمارا دین بنا[2]۔

عوام کی عقیدت کو بڑا ابتلا سمجھتے تھے غالب القطان کا بیان کہ ایک مرتبہ حسن مسجد آئے ان کی سواری کا گدھا واپس جا چکا تھا اس لئے انہیں واپس پہنچانے کے لئے میں نے اپنا گدھا منگالیا اس کی عادت تھی کہ اکثر سواری کی ٹانگ پکڑ لیا کرتا تھا اس لئے میں نے حفاظت کے خیال سے اس کی لگام پکڑلی حسن کی سواری تھی اس لئے بہت سے آدمی ساتھ ہو گئے انہیں دیکھ کر حسن نے کہا تمہارا برا ہو اگر مسلمان اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا ہے اور وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں کہ وہ بالکل تہی دامن ہے تو ان لوگوں کے جوتوں کی چاپ ضعیف انسان کے دل کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے[3]۔

فریب نفس اور عجب وغرور سے بچنے کے لئے اپنی تعریف سننا پسند نہ کرتے تھے سعید بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ اگر کوئی شخص حسن کے منہ پر ان کی تعریف کرتا تھا، تو وہ انہیں سخت ناگوار ہوتی تھی اور اگر لوگ ان کے لئے دعا کرتے تو وہ اس سے خوش ہوتے تھے[4]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۲۲۳ ۲ ابن سعد۔ جلد اول۔ ۷۔ ص ۱۲۸ ۳ ایضاً۔ ص ۱۲۲ ۴ ایضاً۔ ص ۱۲۹

جہاد فی سبیل اللہ :

عموماً حجروں کی برودت راہ خدا میں جانبازی کی حرارت کو سرد کردیتی ہے لیکن حسن بصری کی رگوں کا خون ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ میں گرنے کے لئے جوش زن رہتا تھا اگرچہ چند مہمات کے علاوہ جہاد میں ان کی شرکت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ارباب سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ بچپن سے ان کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ موجزن تھا اور انہوں نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد جہاد کو مشغلہ حیات بنالیا تھا[۱]۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مہمات میں شریک رہے ہوں گے۔ لیکن تصریح کے ساتھ کابل، اندقان اور زابکستان کی مہمات کے علاوہ اور دوسری مہمات میں شرکت کا پتہ نہیں چلتا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک خاموش اور شہرت سے نفور بزرگ تھے جہاد سے غرض نام ونمود نہیں بلکہ حصول شرف تھا، اس لئے عام سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے ہوں گے، جن کا تذکرہ عموماً تاریخوں میں نہیں ہوتا[۲]۔

ظلم کی تلوار کے مقابلہ میں توبہ کی سپر :

ظالم حکومتوں اور جابر امراء کے مقابلہ میں اعلان حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صلحائے امت کا خاص طغرائے امتیاز رہا ہے، لیکن اس باب میں حسن بصری کا طرز عمل ان سے مختلف تھا، وہ ان کے مقابلہ میں سکوت افضل سمجھتے تھے، عمارہ بن مہران کا بیان ہے کہ حسن بصری سے لوگوں نے کہا آپ امراء کے پاس جاکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیوں نہیں فرماتے۔ جواب دیا، مومن کو اپنا نفس ذلیل نہ کرنا چاہئے۔ اس زمانہ کے امراء کی تلواریں ہماری زبانوں سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ جب ہم ان سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمیں تلواروں سے جواب دیتے ہیں[۳]۔ ان حالات میں آپ ظلم کی تلوار کے مقابلہ میں توبہ کی ڈھال استعمال کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔

ابو مالک کا بیان ہے کہ حسن سے جب کہا جاتا کہ آپ میدان میں نکل کر ان حالات کو بدلتے کیوں نہیں تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ تلوار سے نہیں بلکہ توبہ سے بدلتا ہے[۴]۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب لوگ اپنے حکمران کی جانب سے آزمائش میں مبتلا کئے جائیں اور اس پر صبر کریں تو خدا ان کو جلد اس مصیبت سے نکال دیگا، لیکن جو تلوار نکال لیتے ہیں اور اس پر اعتماد کرنے لگتے ہیں، خدا کی قسم اس کا کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۶۱　۲ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۱۔ ص ۱۱۵　۳ ایضاً۔ ص ۱۲۸　۴ ایضاً۔ ص ۱۲۵

شوروفتن سے کنارہ کشی :

اسی لئے آپ ہمیشہ شوروفتن اور انقلاب سے علیحدہ رہتے تھے۔ اُمویوں کے زمانہ میں بڑے سیاسی انقلاب ہوئے۔ مختلف اوقات میں مختلف جماعتیں ان کے خلاف اُٹھیں، لیکن حضرت حسن بصری اپنے اصول کی بنا پر کبھی ان میں شریک نہ ہوئے، بلکہ دوسروں کو بھی اس میں پڑنے سے روکتے تھے۔

عبدالملک کے زمانہ میں جب ابن اشعث نے اور یزید ابن عبدالملک کے زمانہ میں ابن مہلب نے علم بغاوت بلند کیا تو کچھ آدمیوں نے حضرت حسن بصری سے پوچھا کہ ان فتنوں میں شرکت کے بارہ میں آپ کا خیال کیا ہے فرمایا فریقین میں سے کسی کا ساتھ نہ دو۔ ایک شامی نے کہا امیر المومنین کا بھی ساتھ نہ دیں۔ آپ نے شامی کو ہاتھوں سے دھکا دے کر اس کا جملہ دھرا کر فرمایا، ہاں امیر المومنین کا ساتھ بھی نہیں۔

ابن اشعث حجاج کے خلاف اٹھا تھا، اور ایک بڑی جماعت جس میں بعض اکابر تابعین بھی تھے، اس کے ساتھ ہوگئی تھی عقبہ بن عبدالغافر، ابوالجوزاء، اور عبداللہ بن غالب چند سربرآوردہ آدمیوں نے آکر ان سے پوچھا، ابوسعید اس طاغیہ (حجاج) سے جو خون ناحق بہاتا ہے، حرام مال لیتا ہے، تارکِ نماز ہے، ایسا ہے ویسا ہے، لڑنے کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے فرمایا میرے نزدیک نہ لڑنا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر وہ خدا کا عذاب ہے تو تم اسے تلوار سے نہیں دور کر سکتے اور اگر یہ آزمائش ہے، تو اس پر صبر کرنا چاہئے تاکہ خدا خود اس کا فیصلہ کردے۔ خدا بڑا فیصلہ کرنے والا ہے۔

ابن اشعث کی شورش کے زمانہ میں حسن بصری خود بڑی آزمائش میں پھنس گئے تھے۔ لیکن جان پر کھیل کر کسی نہ کسی طرح اپنے کو اس سے نکالا۔ آپ کی شخصیت ایسی تھی کہ بصرہ کیا سارے عراق پر آپ کا اثر تھا۔ اس انقلاب میں آپ کی علیحدگی کی وجہ سے بہت سے محتاط ابن اشعث کا ساتھ دینے میں پہلو بچاتے تھے۔ اس لئے لوگوں نے اس سے کہا تم چاہتے ہو کہ جس طرح لوگ جنگ جمل میں حضرت عائشہ کے اُونٹ کے گرد جانبازی دکھاتے تھے اسی طرح تمہارے لئے جان دیں تو حسن کو کسی نہ کسی طرح میدان میں لاؤ۔

اس مشورہ پر ابن اشعث زبردستی آپ کو کھینچ لے گیا۔ آپ جبراً اُدھر چلے تو گئے لیکن جیسے ہی لوگ آپ کی طرف سے غافل ہوئے آپ جان پر کھیل کر ایک دریا میں پھاند پڑے اور کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل آئے۔

اسی زمانہ میں ایک شخص سعید بن ابی الحسن نے جو حجاج کے مخالفین میں تھا۔ اور لوگوں کو اس کے خلاف ابھارا کرتا تھا حسن بصری سے پوچھا کہ ہم نے نہ امیر المومنین کی اطاعت سے منہ موڑا ہے اور نہ ان کو تخت سے اتارنا چاہتے ہیں بلکہ ہم کو صرف اس لئے امیر المومنین سے برہمی ہے کہ انہوں نے حجاج جیسے جابر شخص کو حاکم بنایا ہے ایسی صورت میں آپ کی کیا رائے ہے اور اہل شام کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے، آپ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا، لوگو خدا نے حجاج کو محض عقوبت کے لئے مسلط کیا ہے، اس لئے تلوار سے عقوبت خداوندی کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ صبر وسکون اور خاموشی اور بارگاہ خداوندی میں سکون اور تضرع سے کام لو تم نے شامیوں کے بارہ میں میری رائے پوچھی ہے میرا خیال ہے کہ حجاج ا نہیں دنیا کا لقمہ تر دے کر ان سے ہر کام کرا سکتا ہے[1]۔

اظہار حق: لیکن حکام اور سلاطین کے مقابلہ میں وہ ہر موقع پر خاموشی ہی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ جب کبھی ان کے سامنے خیالات کے اظہار کا موقع آجاتا تھا تو وہ بلاخوف وخطر اپنے حقیقی خیالات ظاہر کر دیتے تھے، یزید بن عبدالملک کے زمانے میں جب عمر بن ہبیرہ خراسان اور عراق کا والی مقرر ہوا تو اس نے عراق کے اکابر علماء حسن بصری، محمد بن سیرین اور امام شعبی کو بلا کر ان سے بطور استفتاء سوال کیا کہ یزید خدا کا خلیفہ ہے، خدا نے اس کو بندوں پر اپنا نائب بنایا ہے، اور ان سے اس کی اطاعت اور ہم (حکام) سے اس کے احکام کی تکمیل کا وعدہ لیا ہے، آپ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس نے ہم کو والی بنایا ہے، اور ہمارے پاس احکام بھیجتا ہے، میں اس کی تعمیل کرتا ہوں ان حالات میں آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے، ابن سیرین اور شعبی نے گول جواب دیا حسن بالکل خاموش تھے، ابن ہبیرہ نے ان سے پوچھا آپ اپنا خیال ظاہر کیجئے، انہوں نے جواب دیا۔

ابن ہبیرہ یزید کے بارہ میں خدا کا خوف کر اور خدا کے معاملہ میں اس کا خوف نہ کیا کر خدا تجھ کو یزید سے بچا سکتا ہے لیکن یزید تجھ کو خدا سے نہیں بچا سکتا، وہ زمانہ قریب ہے کہ خدا تیرے پاس ایسا فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو تخت حکومت سے اُتار کر اور قصر کی وسعت سے نکال کو قبر کی تنگی میں ڈال دے گا اس وقت تیرے اعمال کے سوا کوئی اور شے تجھ کو نجات نہ دلا سکے گی خدا نے بادشاہ اور حکومت کو اپنے دین اور اپنے بندوں کی امداد واعانت کے لئے بنایا ہے، اس لئے خدا کی دی ہوئی حکومت کے ذریعہ سے تم خدا کے دین اور اس کے بندوں پر سوار نہ ہو جاؤ، خدا کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کرنی چاہئے[2]۔

---

[1] یہ تمام واقعات ابن سعد۔ جلد ۷ ق اول۔ ص ۱۱۹ تا ۱۲۰ سے ماخوذ ہیں [2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹

مسئلہ تقدیر: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری قدری تھے[1]۔ جو صحیح نہیں ہے، اس شہرت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بعض اکابر تابعین اس باب میں اتنے متشدد تھے کہ قدریوں سے ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے، اور حسن بصری ان سے ملنے جلنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے، اس لئے ناواقفوں نے اس میل جول کی وجہ سے قدریوں کے خیالات کو ان کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ ان کا دامن اس سے پاک تھا۔ عمر کا بیان ہے کہ قدری حسن کے پاس آتے جاتے تھے۔ لیکن ان کے خیالات ان کے مخالف تھے۔ حسن کہتے تھے۔

ابن آدم خدا کو ناراض کر کے کسی انسان کی خوشنودی حاصل نہ کر خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہ کر خدا کے افضال پر کسی انسان کی تعریف نہ کر جو شے خدا نے تجھے نہیں دی اس پر کسی انسان کو ملامت نہ کر خدا نے خلق اور خلائق کو پیدا کر دیا، اور وہ اپنی تخلیق کے اصول پر چل رہے ہیں، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اپنی حرص سے اپنے رزق میں اضافہ کر سکتا ہے تو اگر اس کا یہ گمان صحیح ہے تو ذرا اپنی عمر بڑھا کر دکھادے اپنا رنگ بدل دے یا اپنے اعضاء و جوارح میں کوئی اضافہ کر دے[2]۔ جب ایسا نہیں کر سکتا تو معلوم ہوا انسان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہر شے تقدیر الٰہی پر چل رہی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان کے بعض مشتبہ اقوال سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے، اگر کسی حد تک وہ اس سے متاثر بھی تھے تو آخر میں اس سے رجوع کر لیا تھا، اصمعی اپنے والد کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ حسن کبھی قدر کے بعض حصوں پر گفتگو کرتے تھے، لیکن پھر اس سے رجوع کر لیا تھا قاضی عطاء بن یسار قدری تھے، ان کی زبان میں جادو کا اثر تھا، وہ اور سعید جہنی حسن کے پاس آتے تھے، اور ان سے سوالات کرتے تھے اور کہتے تھے، ابو سعید یہ سلاطین و فرمان روا مسلمانوں کا خون بہاتے ہیں اور ان کا مال لیتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمارے یہ اعمال خدا کی تقدیر کے مطابق ہیں، حسن یہ سن کر کہتے وہ دشمنان خدا جھوٹے ہیں اس تردید اور بعض اس قبیل کے دوسرے واقعات سے لوگوں نے ان کے قدری ہونے کا نتیجہ نکالا ہے[3]۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص موقع تھا جس کو عقیدہ قدر سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض اقوال اور کلمات طیبات:

بے کار اور بے نتیجہ باتیں بہت کم کرتے تھے، ان کی گفتگو کا بیشتر حصہ حکمت اور موعظت کے موتی ہوتے تھے[4]۔ ان کے حکیمانہ اقوال معنویت اور بلاغت ادا کے اعتبار سے پند و موعظت اور

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷، ق ۱، ص ۱۲۲　[2] ایضاً۔ جلد ۷، ص ۱۲۵　[3] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸　[4] ایضاً۔ ص ۱۲۷

علم وحکمت کا دفتر ہیں، جن سے بہت سے اخلاقی اور روحانی اسرار وحکم پر روشنی پڑتی ہے۔ان میں سے بعض اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) فرماتے تھے جو سوسے ایسے ہیں کہ پیدا ہوتے ہیں اور نکل جاتے ہیں وہ شیطان کی جانب سے ہیں ان کے ازالہ میں ذکر خدا اور تلاوت قرآن سے مدد لینی چاہیے،اور جو پیدا ہو کہ قائم ہو جاتے ہیں وہ نفس کی جانب سے ہیں،ان کے دور کرنے میں نماز ،روزہ اور ریاضت سے مدد لینی چاہئے۔

(۲) خدا جس بندہ کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے،اس کو اہل وعیال کی بندشوں میں نہیں پھنساتا ہے۔

(۳) متواضع ہونے کی یہ شرط ہے کہ گھر سے باہر کسی سے بھی ملے تو اس کو اپنے سے افضل اور برتر سمجھے۔

(۴) جب بندہ گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اس سے خدا کے ساتھ اس کی قربت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۵) ایک شخص نے آپ سے اپنے قلب کی قساوت کی شکایت کی،فرمایا اس کو ذکر وفکر کے مقامات میں لے جایا کرو۔

(۶) مردہ کے لئے سب سے بڑے خود اس کے گھر والے ہوتے ہیں کہ اس پر روتے ہیں،حالانکہ اس کے مقابلہ میں اس کے قرض کا ادا کرنا ان پر آسان نہیں ہوتا۔

(۷) ایک شخص کی عداوت کے بدلہ میں ہزار آدمیوں کی دوستی بھی نہ خریدو۔

(۸) طمع عالم کو رسوا کر دیتی ہے۔

(۹) انسان کا علانیہ اپنے نفس کی مذمت کرنا درحقیقت اس کی مدح ہے،

(۱۰) اپنے بھائیوں کی عزت کرو تو ہمیشہ اُن کے ساتھ تمہاری دوستی قائم رہے گی۔

(۱۱) اگر اپنی موت کی رفتار پر ابن آدم کی نظر ہوتی ہے تو وہ اپنے فریب امید کا دشمن بن جاتا۔

(۱۲) جو شخص عاجزی کے لئے خدا کے سامنے صوف پہنتا ہے تو خدا اس کی نگاہ اور قلب کا نور بڑھاتا ہے،اور جو پندار کے لئے پہنتا ہے وہ سرکشوں کے ساتھ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

(۱۳) کاش میں کوئی ایسا کھانا کھالیتا جو میرے پیٹ میں اینٹ بن جاتا کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اینٹ پانی میں تین سو برس تک باقی رہتی ہے۔

(۱۴) ایک مرتبہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ فقیہ ایسا ایسا کہتے ہیں،فرمایا تم لوگوں نے فقیہ دیکھا بھی ہے،فقیہ وہ ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہو،دین میں بصیرت رکھتا ہو،خدائے عزوجل کی عبادت پر مداومت کرتا ہو۔

(۱۵) خدا کی قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ جس شخص نے مال وزر کو عزت دی خدا نے اس کو ذلیل کیا۔

(۱۶) عقلمند کی زبان قلب کے پیچھے ہے، جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو قلب کی طرف رجوع کرتا ہے، اگر وہ بات اس کے فائدہ کی ہوتی ہے تو کہتا ہے، ورنہ رک جاتا ہے اور جاہل کا قلب اس کی زبان کی نوک پر رہتا ہے، وہ قلب کی طرف رجوع نہیں کرتا جو زبان پر آتا ہے بک جاتا ہے۔

(۱۷) دنیا درحقیقت تمہاری سواری ہے، اگر تم اس پر سوار ہو گئے تو وہ تمکو (اپنی پیٹھ پر) اُٹھائے گی اور اگر وہ تم پر سوار ہوگئی تو تم کو ہلاک کر ڈالے گی۔

(۱۸) جب تم کسی شخص سے دشمنی کرنا چاہو تو پہلے اس پر نظر کرو اگر وہ خدا کا مطیع ہے تو اس سے بچو، کیونکہ خدا اس کو کبھی تمہارے قبضہ میں نہ دے گا اور تمہارے لئے اس کو تنہا نہ چھوڑیگا اور اگر وہ خدا کا نافرمان ہے تو تم کو اس کی عدوت کی ضرورت ہی نہیں اپنے نفس کو خواہ مخواہ اس عداوت میں پریشان نہ کرو یعنی وہ خود ہلاک ہو جائے گا خدا کی دشمنی اس کے لئے کافی ہے۔

(۱۹) جو شخص خدا کی اطاعت کرتا ہے اس سے دوستی تم پر ضروری ہے کیونکہ جو شخص صالح آدمی کو دوست رکھتا ہے وہ گویا خدا کو دوست رکھتا ہے۔

(۲۰) میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے دنیا چاہی ہو اور اسے آخرت ملی ہو اس کے برخلاف جو آخرت چاہتا ہے اسے دنیا بھی مل جاتی ہے، یعنی پھر ایسی چیز کیوں نہ چاہی جائے، جس سے دونوں چیزیں مل جائیں۔

(۲۱) اسلام یہ ہے کہ تم اپنے قلب کو خدا کے سپرد کر دو اور ہر مسلمان تمہارے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔

(۲۲) محبت کا متوالا ہمیشہ مست و بے خود رہتا ہے اسے صرف محبوب کا مشاہدہ جمال ہوشیار کرتا ہے[1]۔

وفات: بعض خاصان حق کے دنیا چھوڑنے سے پیشتر وصل محبوب کے اشارات مل جاتے ہیں خود قرآن نے وفات نبوی کا اشارہ کر دیا تھا بعض آدمیوں کو عالم رویا میں حسن بصری کی وفات کا بھی اشارہ مل گیا تھا چنانچہ ان کی وفات سے چند دنوں پیشتر ایک شخص نے خواب دیکھا کہ ایک طائر نے مسجد کی سب سے خوبصورت کنکری اٹھالی مشہور معبر خواب ابن سیرین نے اس کی یہ تعبیر دی کہ حسن کا انتقال ہو جائے گا[2]۔

---

[1] یہ اقوال مختصر صفوۃ الصفوہ۔ص ۲۳۱ تاص ۲۳۶ ۔ سے ماخوذ ہیں [2] ابن خلکان۔جلد اول۔ص ۱۲۹

اس خواب کے چند ہی دنوں کے بعد حسن بصری مرض الموت میں مبتلا ہوئے، دوران علالت میں فرماتے تھے کاش انسان نے اپنی صحت وتندرستی کے زمانہ میں بیماری کے دن کے لئے کچھ رکھ چھوڑا ہوتا۔ وقت آخر اپنے صاحبزادے کو اپنی کتابیں اکٹھا کرنے کا حکم دیا، انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد خادم کو تنور جلانے کا حکم دیا، اس نے جلادیا اور چشم زدن میں علوم وفنون کا سارا دفتر جل کر خاکستر ہوگیا کہ اب اس کا وقت آگیا تھا۔

صد کتاب وصد ورق در نار کن　　　جان ودل را جانب دلدار کن

صرف ایک کتاب باقی رہنے دی[۱] ممکن ہے یہ قرآن کے متعلقات میں رہی ہو جس کو احتراماً چھوڑ دیا ہو۔

دم آخر کاتب کو بلا کر لکھوایا کہ حسن اس کی شہادت دیتا ہے کہ **لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ** جس نے موت کے وقت صدق دل سے اس کی شہادت دی وہ جنت میں داخل ہوگیا[۲]۔

ان تیاریوں سے فراغت کے بعد ۱۱۰ھ میں شب جمعہ کو سفر آخرت کیا محدث ایوب اور حمید الطویل نے غسل دیا[۳]۔ دوسرے دن بعد نماز جمعہ عاشق کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے اٹھا ساری خلقت جنازہ پر ٹوٹ پڑی شہر اتنا خالی ہوگیا کہ اس دن جامع بصرہ میں کوئی عصر کی نماز پڑھنے والا نہ تھا[۴]۔

حلیہ : حضرت حسن بصری جمال معنوی کے ساتھ حسن ظاہر سے بھی آراستہ تھے۔ صورۃً نہایت حسین وجمیل تھے[۵]۔ اس حسن کے ساتھ خدا نے وجاہت اور رعب بھی عطا فرمایا تھا جس مجمع میں بیٹھتے تھے سب میں ممتاز نظر آتے تھے، عاصم احول کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بصرہ جاتے وقت امام شعبی سے پوچھا کہ بصرہ میں آپ کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے شعبی نے کہا حسن کو میرا سلام پہنچا دینا عاصم نے کہا میں ان کو پہچانتا نہیں ہوں۔ شعبی نے یہ نشان بتایا کہ بصرہ میں داخل ہونے کے بعد تم کو جو سب سے زیادہ حسین شخص نظر آئے اور تمہارے دل پر جس کا سب سے زیادہ رُعب پڑے اسی کو سلام پہنچانا، اس نشان پر شعبی نے سلام پہنچایا جو ٹھیک حسن بصری کو پہنچا[۶]۔

لباس : اس حسن ظاہری کے ساتھ بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے۔ چنانچہ ظاہری وضع وقطع میں زیادہ تقشف کو پسند نہ کرتے بلکہ اس کو جامۂ ریا سمجھتے تھے، اسی لئے نہایت بیش قیمت اور خوبصورت

---

[۱] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۱۔ ص ۱۲۷　[۲] ایضاً۔ ص ۱۲۶　[۳] ایضاً۔ ص ۱۲۹　[۴] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۱۲۸
[۵] ابن سعد۔ جلد ۱۔ ص ۱۱۵　[۶] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۶۴

کپڑے استعمال کرتے تھے مشہور مشہور مقامات کے عمدہ کپڑے منگاتے تھے، مثلاً کتان یمن کی چادر اور پھول دار چادریں استعمال کرتے تھے لباس میں جبہ، رداء اور عمامہ پورے کپڑے ہوتے تھے، بغیر عمامہ کے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے [1]۔

(۱۷) حکم بن عتیبہؒ

نام ونسب: حکم نام ابوعبداللہ کنیت، کندہ کے غلام تھے۔

فضل وکمال: علمی اعتبار سے کوفہ کے ممتاز ترین علماء میں تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

كان الحكم بن عتيبة ثقة فقيها عالما رفيعا كثير الحديث [2]۔ اکابر علماء ان کے کمالات کے معترف تھے۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ کوفہ میں حکم کا مثل نہ تھا، اس عہد کے تمام علماء ان کی دولت علم کے سامنے دامن احتیاط پھیلاتے تھے، مجاہد بن رومی کہتے تھے کہ مجھ کو حکم کے حقیقی کمال کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا تھا، جب بڑے بڑے علماء مسجد منیٰ میں جمع ہو جاتے تھے، اور وہ سب ان کی دولت علم کے دست نگر معلوم ہوتے تھے [3]۔

حدیث: کوفہ کے ممتاز حفاظ حدیث میں تھے، حافظ ذہبی انہیں حافظ اور شیخ کوفہ [4]۔ اور علامہ ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں [5]۔ حدیث میں انہوں نے صحابہ میں ابوجحیفہ، زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن اوفیؓ اور تابعین میں قاضی شریح، قیس ابن حازم، موسیٰ بن طلحہ، زید بن شریک تیمی، عبداللہ ابن شداد، سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء، طاؤس، قاسم بن مخیمرہ، مصعب بن سعد، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ سے فیض اٹھایا تھا۔

آپ کے تلامذہ میں، اعمش، منصور، ابو اسحاق سبیعی، ابو اسحاق شیبانی، قتادہ، ابان ابن صالح، حجاج بن دینار، اوزاعی، مسعر، شعبہ، ابوعوانہ جیسے علماء تھے [6]۔

فقہ: ابراہیم نخعی ائمہ فقہ میں تھے، حکم ان کے خاص اصحاب میں تھے [7]۔ ان کے فیض صحبت نے ان کو کوفہ کا بہت بڑا فقیہ بنا دیا تھا، عبدہ بن ابی لبابہ کہتے تھے کہ میں نے دونوں کناروں کے درمیان حکم سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا، لیث بن سلیم کہتے تھے کہ حکم امام شعبی سے بھی بڑے فقیہ تھے [8]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ تذکرہ حسن بصری　[2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۶　[3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۴　[4] ایضاً۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۴　[5] ابن سعد۔ جلد ۱۔ ص ۲۳۶　[6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۴۳۳　[7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۴۳۳　[8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۴

شعبی کی جانشینی:

حضرت شعبی کے بعد کوفہ کی مسند علم انہی کے حصہ میں آئی، اسرائیل بیان کرتے ہیں۔ کہ حکم کو میں نے سب سے پہلے شعبی کی موت کے دن جانا ان کی موت کے بعد ایک شخص کوئی مسئلہ پوچھنے آیا، لوگوں نے اس سے کہا حکم بن عتیبہ کے پاس جاؤ[1]۔

عبادت وریاضت: اس علم کے ساتھ وہ بڑے عبادت گذار بھی تھے، عباس مروزی کا بیان ہے کہ وہ صاحب عبادت وفضل تھے، پابندی سنت میں خاص اہتمام تھا[2]۔

عظمت واحترام:

ان کے علمی واخلاقی کمالات کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عظمت تھی۔ مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مدینہ آتے تھے تو لوگ ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کا ساریہ خالی کردیتے تھے، اس میں وہ نماز پڑھتے[3]۔

وفات: ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت ۱۰۵ھ میں وفات پائی[4]۔

(۱۸) خارجہ بن زیدؒ

نام ونسب: خارجہ نام، ابوزید کنیت، مشہور صحابی زید بن ثابتؓ کے صاحبزادے ہیں نسب نامہ یہ ہے، خارجہ بن زید بن ثابت بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد مناف بن مالک بن امرا القیس بن مالک بن ثعلبہ خزرجی۔

فضل وکمال: خارجہ کے والد حضرت زید بن ثابت علماء صحابہ میں تھے، خصوصاً حفظ قرآن میں جماعت صحابہ میں ممتاز تھے، کلام اللہ انہی کی زیر نگرانی مدون ہوا تھا، خارجہ نے اسی آغوش علم میں پرورش پائی تھی، باپ کے فیض تعلیم سے ان کا شمار ان کے عہد کے کبار علماء میں ہو گیا تھا حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ کبار علماء میں تھے[5]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ علم میں امام بارع تھے، اور ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[6]۔

حدیث: حدیث میں انہوں نے اپنے والد زید، اپنے چچا یزید، اسامہؓ بن زید، سہل بن سعد، عبدالرحمٰن ابن ابی عمرہ سے سماع حدیث کیا تھا، خود ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے لڑکے

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۱ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۴۳۳ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲
[4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۱ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۰۔۸۱ [6] تہذیب الاسماء نووی۔ جلد ۱۔ ص ۱۷۲

سلیمان، بھتیجے سعید اور قیس بن سعد اور عام لوگوں میں عبداللہ بن عمرو بن عثمان مطلب عبداللہ اور یزید ابن قسیط وغیرہ لائق ذکر ہیں[1]۔

فقہ: فقہ ان کا امتیازی فن تھا، اس میں وہ امامت اور اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے، چنانچہ مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں ایک ان کا نام بھی تھا[2]۔

فرائض: حضرت زید بن ثابت فرائض کے بھی بڑے عالم تھے، اس لئے خارجہ کو یہ دولت گویا وراثۃً ملی تھی، چنانچہ علمائے مدینہ میں وہ اور طلحہ بن عبداللہ بن عوف میراث تقسیم کرتے تھے اور تقسیم کے وثیقے لکھتے تھے، اور اس میں ان کا قول سند مانا جاتا تھا[3]۔

وفات: حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت ۱۰۰ھ میں وفات پائی، وفات سے کچھ دنوں پہلے خواب دیکھا کہ ستر سیڑھیاں بنائی ہیں، انہیں بنانے کے بعد گر پڑے۔ اسی سال انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت پورے ستر سال کی عمر تھی۔ ابوبکر بن محمد والی مدینہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی[4]۔

حلیہ اور لباس:

خارجہ کا جسم نہایت سڈول اور خوبصورت تھا خز کی چادر اوڑھتے تھے۔ سپید عمامہ باندھتے تھے اور بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے[5]۔

اولاد: وفات کے بعد متعدد اولادیں یادگار چھوڑیں لڑکوں میں زید، عمر، عبداللہ، محمد اور لڑکیوں میں حبیبہ، حمیدہ، ام یحییٰ اور ام سلیمان تھیں، اور یہ سب اولادیں ام عمرو بنت حزم کے بطن سے تھیں[6]۔

(۱۹) خالد بن معدانؒ

نام و نسب: خالد نام، ابوعبداللہ کنیت، نسب نامہ یہ ہے، خالد بن معدان بن ابی کریب کلاعی۔

فضل و کمال: خالد کو علم و فن کے ساتھ خاص ذوق و شغف تھا اور وہ ان کا مشغلہ حیات بن گیا تھا، بحیر کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ علم سے چسپاں رہنے والا نہیں دیکھا[7]۔ اس ذوق نے ان کو حمص کا ممتاز عالم بنا دیا تھا[8]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۷۵　[2] ایضاً　[3] ایضاً　[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۹۴　[5] ایضاً
[6] ایضاً　[7] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۱　[8] ایضاً

حدیث: حدیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ (۷۰) ستر صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل تھا[1]۔ ان میں سے ثوبانؓ ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، عتبہ بن عبد السلمیؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، مقدام بن معدیکربؓ اور ابوامامہؓ سے سماع حدیث کیا تھا، عبادہ بن ثابتؓ ابودرداؓ، معاذ بن جبلؓ ابوعبیدہؓ ابوذر غفاریؓ اور عائشہ صدیقہؓ سے مرسل روایات کی ہیں[2]۔

فقہ: فقہ میں بھی انہیں پورا درک تھا صحابہ کرامؓ کی جماعت کے بعد فقہائے شام کے تیسرے طبقہ میں ان کا شمار تھا[3]۔

حلقہ درس: ان کا حلقہ درس بھی تھا لیکن شہرت سے اس قدر گھبراتے تھے کہ جب حلقہ زیادہ بڑھا تو شہرت کے خوف سے درس وتدریس کی مسند اٹھادی[4]۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بحیر بن سعید محمد بن ابراہیم تیمی ثور بن یزید حریز بن عثمان عامر بن جشیب حسان بن عطیہ اور فضیل بن فضالہ وغیرہ لائق ذکر ہیں[5]۔

کتابت علم: انہوں نے اپنے تمام معلومات قلم بند کر لئے تھے، ان کے تلمیذ بحیر کا بیان ہے کہ ان کا سارہ علم ایک مصحف میں تھا[6]۔

ارباب علم کا اعتراف:

اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے سفیان ثوری کہتے تھے کہ میں خالد بن معدان پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا[7]۔ امام اوزاعی ان کی بڑی عظمت کرتے تھے، اور لوگوں کو ان کی لڑکی عبدہ کے پاس بھیج کر ان کے طریقے معلوم کراتے تھے[8]۔

عبادت: اس علم کے ساتھ وہ عمل کی دولت سے بھی مالا مال تھے، ابن حبان ان کو بہترین خدا کے بندوں میں لکھتے ہیں[9]۔ دن بھر میں ستر ہزار تسبیحیں پڑھتے تھے[10]۔ عبادت وریاضت کا نشان پیشانی پر تاباں تھا[11]۔

موت کا ذوق: موت خاصان خدا کے لئے پیام وصل ہے، اس لئے خالد اس سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اس کے شائق رہتے تھے، چنانچہ کہتے تھے اگر موت کوئی ایسا علم ہوتی جس کی جانب

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۱ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۹ ۳۔ ایضا
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۱ ۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۸ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۱
۷۔ ایضا ۸۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۹ ۹۔ ایضا ۱۰۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۱
۱۱۔ ابن سعد۔ جلد ۸۔ ص ۱۶۲

مسابقت کی جا سکتی، تو میں سب سے پہلے اس کے پاس پہنچتا اور اس شخص کے سوا جو اپنی قوت سے آگے بڑھ جاتا، اور کوئی مجھ سے بازی نہ لے جا سکتا[1]۔

وفات: یزید بن عبدالملک کے عہد میں یہ ذوق پورا ہوا اور ۱۰۳ھ میں وفات پائی وفات کے دن روزے سے تھے[2]۔

(۲۰) داؤد بن دینارؒ

نام ونسب: داؤد نام، ابوبکر کنیت، طہمان القسیری کے غلام تھے، اصل وطن سرخس تھا، لیکن بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

فضل وکمال: داؤد کا پیشہ خیاطی تھا[3]۔ لیکن یہ پیشہ انہیں تحصیل علم اور کسب کمال سے نہ روک سکا، انہوں نے خیاطی کے ساتھ قرآن، حدیث اور فقہ میں اتنا کمال کر لیا کہ حافظ ذہبی انہیں امام حافظ اور مفتی لکھتے ہیں[4]۔

تعلیم قرآن: قرآن کے ساتھ انہیں خاص شغف تھا، اس شغف کا باعث ایک خاص واقعہ ہوا جو خود انہی کی زبان میں یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ طاعون میں مبتلا ہوا، بے ہوشی کی حالت میں مجھے نظر آیا کہ میرے پاس دو آدمی آئے ہیں، ان میں سے ایک نے میری زبان کی جڑ کو اور دوسرے نے میرے تلوے کو دبا کر ایک نے دوسرے سے پوچھا کیا چیز معلوم ہوتی ہے، دوسرے نے جواب دیا تسبیح تکبیر اور کچھ مسجد کی طرف چلنا اور تھوڑی سی قرآن کی قرأت میں نے اس وقت تک قرآن حاصل نہ کیا تھا، بیماری سے اٹھنے کے بعد ہمہ تن تعلیم قرآن کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کو حاصل کر لیا[5]۔

حدیث: حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کان ثقۃ کثیر الحدیث[6] حافظ ذہبی امام حافظ اور ثبت لکھتے ہیں[7] حدیث میں انہوں نے ابوالعالیہ سعید بن مسیب، ابوعثمان نہدی شعبی، عکرمہ، عزرہ بن عبدالرحمن، محمد بن سیرین، ابوالزبیر، مکحول شامی وغیرہ سے سماع کیا تھا اور شعبہ، ثوری، مسلمہ بن علقمہ ابن جریج، حماد، وہیب بن خالد، عبدالوارث ابن سعید، عبدالاعلیٰ ابن الاعلیٰ، یحییٰ القطان، یزید بن زریع اور یزید بن ہارون وغیرہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں تھے[8]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۱۶۲ ۲؎ ایضاً ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۰۴ ۴؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۱

۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۰ ۶؎ ایضاً ۷؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۱

ان کے مرویات کی تعداد دو سو تک پہنچتی ہے[1]۔ کیفیت کے اعتبار سے ان کی مرویات کے متعلق ائمہ فن کی یہ رائے تھی، امام احمد ابن حنبل فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہے، ایک مرتبہ کسی نے داؤد کے بارے میں آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا داؤد جیسے شخص کے متعلق بھی پوچھنے کی ضرورت ہے[2]۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ متقنین فی الروایہ میں تھے[3]۔ عجلی کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، جید الاسناد اور رفیع تھے[4]۔ ان کی روایات صحاح کی تمام کتابوں میں ہیں۔

فقہ : ان کے تفقہ کے لئے یہ سند کافی ہے کہ بصرہ جیسے علمی مرکز کے مفتی تھے[5]۔

قوت استدلال :

اس علم کے ساتھ اُن کا دماغ نہایت عقلی تھا، قوت استدلال ایسی زبردست تھی کہ بڑے سے بڑے معترضین کو دو جملوں میں خاموش کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شام گئے، وہاں غیلان قدری سے ملاقات ہوئی اس نے کہا میں آپ سے چند مسائل پوچھنا چاہتا ہوں، آپ نے جواب دیا تم پچاس مسائل پوچھ سکتے ہو، لیکن مجھے دو سوالوں کی اجازت دو۔ غیلان نے کہا فرمایئے۔

آپ نے سوال کیا خدا نے انسان کو سب سے افضل کون سی شے عطا کی ہے۔ غیلان نے کہا عقل۔ فرمایا، اچھا بتاؤ عقل اختیاری شے ہے کہ جس کا دل چاہے لے اور جس کا دل چاہے نہ لے، یا خدا کی جانب سے تقسیم ہوتی ہے۔ غیلان ان چند جملوں کو سن کر خاموشی سے چلا گیا، اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس وقت داؤد نے کہا عقل ہی کی طرح خدا نے ایمان و مذہب ہر شے تقسیم فرمائی ہے۔ خدا ہی کی قوت اصل ہے[6]۔ اور جب تمام امور خدا کی طرف سے ہوئے تو پھر قدر کہاں رہ گیا۔

عمل : اس علم کے ساتھ داؤد نے عمل کی دولت سے بھی وافر حصہ پایا تھا، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ راس فی العلم والعمل تھے[7]۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ صالح آدمی تھے[8]۔ راستہ چلتے بھی خدا کا ذکر جاری رہتا تھا[9]۔ چالیس سال تک مسلسل روزے رکھے اور لوگوں کو خبر تک نہ ہونے پائی۔ صبح کو گھر سے کھانا لے کر دکان چلے جاتے تھے، اور راستہ میں اس کو خیرات کر دیتے تھے اور شام کو گھر واپس ہو کر افطار کرتے تھے[10]۔

وفات : ۱۳۹ھ میں حج سے واپسی میں راستہ میں وفات پائی[11]۔

۱؎ تہذیب الکمال۔ ص ۱۱۱ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۰۴ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۱ ۶؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۱ ۷؎ ایضاً ۸؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۰۴ ۹؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۲ ۱۰؎ ایضاً۔ ص ۱۳۱ ۱۱؎ ایضاً و ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۰

(۲۱) ربیع بن خثیمؒ

نام ونسب : ربیع نام، ابو یزید کنیت، نسباً قبیلہ ثعلبہ کی ایک شاخ ثور سے تھے، نسب نامہ یہ ہے۔ ربیع بن خثیم بن عائذ بن عبداللہ بن منقذ بن ثور ثوری، ربیع ان تابعین میں ہیں، جنہوں نے رسالت کا مقدس دور پایا تھا، لیکن شرف صحابیت سے محروم رہے، تاہم وہ اس عہد کے برکات سے مالا مال تھے، اور عمل وعلم اور زہد وتقویٰ کے اعتبار سے ممتاز ترین تابعین میں ہیں۔

فضل وکمال : وہ صاحب علم تابعین میں تھے، لیکن ان کے علم کی روشنی کو زہد وورع کے نور نے مدہم کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم سے زیادہ تقویٰ میں مشہور ہیں، ورنہ جہاں تک ان کے علمی کمالات کا تعلق ہے اس میں بھی وہ اپنے اقران میں ممتاز تھے۔ انہوں نے زمانہ ایسا پایا تھا جب علماء صحابہ کی بڑی جماعت موجود تھی۔ چنانچہ صحابہ میں انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوایوب انصاریؓ سے فیض اٹھایا تھا[1]۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ مستفید ہوئے تھے، ان کی بارگاہ میں ربیع کو اتنا تقرب حاصل تھا کہ جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو جب تک دونوں کی تنہائی کی صحبت ختم نہ ہو جاتی اور دونوں کی ضرورتیں پوری نہ ہو جاتیں، اس وقت تک کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ملتی، ابن مسعودؓ پر ان کے فضائل وکمالات کا اتنا اثر تھا کہ وہ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ ابو یزید اگر تم کو رسول اللہ ﷺ دیکھتے تو تم سے محبت فرماتے، جب میں تم کو دیکھتا ہوں تو متواضعین یاد آتے ہیں[2]۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت وہ تھی جس نے معمولی معمولی انسانوں کو صیقل علم سے جلا دے کر چمکا دیا۔ ربیع تو فطرۃً نہایت صالح اور صاحب استعداد تھے اس لئے وہ ابن مسعودؓ کے علمی برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوئے۔

قرآن : ربیع کو قرآن، حدیث، فقہ جملہ علوم میں درک حاصل تھا، عملی حیثیت سے قرآن کے ساتھ زیادہ شغف کا بڑا ملکہ تھا، جس کا ذکر آئندہ آئے گا، قرآن کی تفسیر وتاویل وآیات قرآنی سے استدلال کا بڑا ملکہ تھا، اپنی واعظانہ تقریروں میں وہ نہایت موزونیت سے آیات قرآنی کو کھپاتے تھے، جس کا اندازہ ان کے مواعظ سے ہوتا ہے۔ ان کا وعظ عموماً یہ ہوتا تھا۔

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۴۲ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۷

اے خدا کے بندے ہمیشہ بھلی بات کہا کر، اور بھلائی پر عمل کیا کر، ہمیشہ بھلی خصلتوں پر رہا کر، اپنی مدت (حیات) کو زیادہ نہ سمجھ، اپنے قلب کو سخت نہ بنا، اور ان لوگوں کا مصداق نہ بن جو کہتے ہیں ہم نے سنا، حالانکہ وہ نہیں سنتے۔

"لاتکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لایسمعون"۔ (انفال۔۳)

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا حالانکہ نہیں سنتے''۔

اے خدا کے بندے اگر تو اچھے کام کرتا ہے تو ایک بعد دوسرا برابر کیے جا، کیونکہ عنقریب تجھے وہ دن پیش آنے والا ہے، جب تجھ کو یہ حسرت رہ جائے گی کہ کاش زیادہ اچھے کام کیے ہوتے اگر تجھ سے کچھ برائیاں سرزد ہو چکی ہیں تو بھی اچھے کام کر کہ خدا فرماتا ہے۔

''ان الحسنات یذھبن السیات ذالک ذکریٰ للذاکرین''۔ (ہود۔۱۰)

''بھلائیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں اور یہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے''۔

اے بندۂ خدا خدا نے اپنی کتاب میں جو علم تجھے عطا کیا ہے، اس پر اس کا شکر ادا کر، اور اس نے تجھ کو نہیں دیا بلکہ اپنے لئے مخصوص رکھا ہے اس کو اس کے جاننے والے کے سپرد کر اور بناوٹ نہ کر کیونکہ خدا فرماتا ہے[1]۔

"قل ما اسئلکم علیه من اجر وما انا من المتکلفین ان ھو الا ذکر للعلمین ولتعلمن نباہ بعد حین"۔ (صٓ۔۵)

''(اے پیغمبر) کہہ دے کہ میں اس پر تجھ سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور میں تکلیف کرنے والوں میں نہیں ہوں، قرآن دونوں عالموں کے لئے نصیحت ہے اور ایک وقت آئے گا، جب تم کو اس کی حقیقت معلوم ہوگی''۔

حدیث: حدیث میں ہے انہیں حافظ ذہبی امام اور قدوہ لکھتے ہیں[2]۔ عبداللہ بن مسعود، ابوایوب انصاری، عمرو بن میمون اور عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا، اور ابراہیم نخعی، امام شعبی، منذر ثوری، ہلال بن یساف اور بکر بن ماعز وغیرہ جیسے اکابر ان کے تلامذہ میں ہیں[3]۔ معیار کے اعتبار سے ان کی روایات کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ ان آراء سے ہو سکتا ہے امام شعبی کہتے تھے کہ ربیع سچائی کا معدن ہیں، ابن معین کا قول تھا کہ ربیع جیسے شخص کے متعلق کچھ پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں[4]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۸ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۵۰ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۴۲
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۳

فقہ : اگرچہ ربیع نے فقیہ کی حیثیت سے کوئی شہرت حاصل نہیں کی، لیکن ان کے تفقہ کے لئے یہ سند کافی ہے کہ وہ فقیہ الامت عبداللہ بن مسعودؓ کے جن کے فتاوی پر عراقی فقہ کی بنیاد ہے، تربیت یافتہ اور خاص اصحاب میں تھے، لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ان کی ان حیثیتوں کو ان کی زہد و ورع نے بالکل دبا دیا تھا۔

بنی ثور کی بعض خصوصیات :

عموماً ہر خاندان میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کم وبیش اس کے تمام افراد میں پائی جاتی ہیں۔ کوئی خاندان علم وفن میں ممتاز ہوتا ہے کوئی زہد و ورع میں۔ کوئی اور کسی خاص وصف میں۔ ربیع کا خاندان یعنی بنی ثور عبادت وریاضت میں نمایاں اور ممتاز تھا۔

شبرمہ کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ میں بنی ثور سے زیادہ فقیہ اور عبادت گذار شیوخ اور کسی قبیلہ میں نہیں دیکھے، ابی بکر زبیدی اپنے باپ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ثوریوں اور غریبوں سے زیادہ مسجد میں بیٹھنے والا کوئی خاندان نہیں دیکھا[1]۔

زہد وورع : ربیع اسی عبادت گذار قبیلہ کے فرد تھے جو مذہبی اور روحانی کمالات میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھا، وہ نہ صرف اپنے قبیلہ بلکہ جماعت تابعین کے عابدترین افراد میں تھے ان کا شمار ان چند تابعین میں تھا جو زہد و ورع کے لحاظ سے پوری جماعت میں ممتاز تھے[2]۔

ان کے زہد وورع اور عبادت وریاضت پر تمام علماء اور مصنفین کا اتفاق عام ہے امام شعبی کا بیان ہے کہ ربیع اپنی جماعت میں سب سے زیادہ متورع تھے[3]۔

ابی عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ربیع سے زیادہ لطیف العبادہ نہیں دیکھا[4]۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ربیع کا زہد اور ان کی عبادت اس قدر مشہور ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں[5]۔

خشیت الٰہی : اعمال حسنہ کا اصل سرچشمہ خشیت الٰہی ہے، ربیع پر خشیت اتنی طاری رہتی تھی کہ روتے روتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی، عذاب دوزخ کا ذکر ہوتا تو بےہوش ہو جاتے تھے، اعمش بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ربیع لوہاروں کی بھٹی کی طرف سے گذرے تو بھٹی دیکھ کر بےہوش ہو گئے[6]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۳۳ ۔ ۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۴۲ ۔ ۳ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰
۴ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۷ ۔ ۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۴۲ ۔ ۶ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۳۱

شب بیداری: ان کی عبادت کا خاص وقت شب کی تاریکی تھا، ساری رات عبادت کرتے تھے[1]۔ پُرموعظت آیات پڑھتے تھے، اور شدتِ تاثر میں ان کو دہراتے دہراتے صبح کردیتے ان کے غلام نسیر بن ذعلوق بیان کرتے ہیں کہ ربیع رات کی تاریکی میں تہجد پڑھتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے:

"ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصالحات سواء محیاھم ومماتھم سآء ما یحکمون"۔ (جاثیہ۔۲)

"کیا جنہوں نے برائیاں کی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کو ان لوگوں کے برابر کریں گے جنہوں نے اچھے اعمال کیے جن کی زندگی اور موت برابر ہے، وہ لوگ کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں"۔

تو اس کو دہراتے دہراتے صبح کردیتے تھے[2]۔

جماعت کا اہتمام:

نماز باجماعت کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر میں فالج کے اثر سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے، لیکن اس وقت بھی نماز باجماعت قضا نہ ہوتی تھی، دوسرے کے سہارے یا گھسٹتے ہوئے مسجد پہنچتے تھے۔ ابوحیان اپنے والد کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ربیع فالج سے معذور ہوگئے تھے۔ لیکن نماز کے لئے پیروں سے گھسٹتے ہوئے یا دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں آتے تھے۔ لوگ کہتے ابویزید اس مجبوری کی حالت میں تو گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ جواب دیتے حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح سننے کے بعد جہاں تک ہوسکے اس کا جواب دینا چاہئے، خواہ گھٹنے کے بل چلنا پڑے[3]۔

جہاد لوجہ اللہ: اگر ربیع ایک زاہد گوشہ نشین تھے اسی لئے وہ خلافت راشدہ کے دور میں موجود ہونے کے باوجود اس عہد کی عملی زندگی میں نہیں نظر آتے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گوشۂ عزلت سے باہر نکل آتے تھے، اور یہ جہاد اس قدر خالص اور لوجہ اللہ ہوتا تھا، کہ مال غنیمت بھی اپنے تصرف میں نہ لاتے تھے، بلکہ جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا ہی کی راہ میں صرف کردیتے تھے۔

عبد خیر بیان کرتے ہیں کہ میں ایک جنگ میں ربیع کا رفیق جہاد تھا، اس میں انہیں غنیمت میں بہت سے غلام اور مویشی ملے، چند دنوں کے بعد مجھے ان کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو ان میں سے کوئی چیز نظر نہ آئی، میں نے پوچھا غلام اور مویشی کیا ہوئے؟ اس مرتبہ انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب میں نے دوبارہ پوچھا تو فرمایا۔

۱۔ تہذیب الکمال۔ ص ۱۱۵　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص ۲۳　۳۔ ایضاً۔ جلد ۶۔ ص ۱۳۲

فی سبیل اللہ: سبیل اللہ ان کا خاص وصف تھا، آپ کو شیرینی مرغوب تھی، اس لئے جب کوئی سائل آتا تو اسے شکر دیتے، لوگ آپ سے کہتے کہ وہ شکر کیا کرے گا۔ اس کے لئے تو اس سے بہتر روٹی ہے، جواب دیتے خدا فرماتا ہے: **ویطعمون الطعام علی حبه**[۱]۔

حاجت مند، نادار اور مجنون پڑوسیوں کو اچھے اچھے کھانے پکوا کر کھلاتے تھے منذر ثوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ربیع نے اپنے گھر والوں سے خبیص (ایک قسم کا کھانا) پکانے کو کہا، چونکہ وہ اپنے لئے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی بیوی نے بڑے اہتمام سے خبیص تیار کیا، ان کے پڑوس میں ایک دیوانہ رہتا تھا، ربیع نے خبیص لے جا کر اپنے ہاتھ سے اس کو کھلایا، اس کے منہ سے لعاب بہتا جاتا تھا۔ جب کھلا کر گھر واپس آئے تو بیوی نے کہا ہم نے زحمت اٹھا کر اتنے اہتمام سے پکایا اور تم نے لے جا کر ایسے شخص کو کھلا دیا جو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے کیا کھایا، آپ نے جواب دیا خدا تو جانتا ہے[۲]۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کی زندگی کا اہم مشغلہ تھا، اگرچہ وہ نہایت خاموش اور عزلت نشین تھے، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے یہ عزلت نشینی اور خاموشی ٹوٹ جاتی تھی، آپ کے پاس جو شخص آتا اس سے فرماتے اچھی باتیں کہا کرو، اور خود اچھی باتوں پر عمل کیا کرو، ہمیشہ بھلائی پر رہا کرو، جہاں تک ہو سکے نیک کاموں میں زیادتی کرو اور برے کاموں میں کمی، اپنے دلوں کو سخت نہ بنالو، تمہاری مدت زیادہ نہیں ہے، ان لوگوں میں نہ ہو جو زبان سے تو کہتے ہیں ہم سنتے ہیں لیکن حقیقۃً نہیں سنتے[۳]۔

جو شخص نصیحت کی درخواست کرتا اسے قرآنی احکام لکھوا دیتے؛ ایک شخص نے درخواست کی کہ کچھ وصیت فرمایئے، اس کی درخواست پر کاغذ منگا کر **قل تعالوا اتل ما حرم علیکم** سے **لعلکم تتقون** تک قرآن کی آیات لکھوا دیں، اس شخص نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ آپ مجھے وصیت فرمائیں گے فرمایا بس اسی پر عمل کرو[۴]۔

پندار تقوی سے احتراز:

اس راہ کی سب سے کٹھن منزل پندار تقوی ہے، جس میں بڑے بڑے زاہدوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور عبائے زہد کا دامن پندار کے داغ سے داغدار بن جاتا ہے ربیع کا یہ خاص کمال تھا کہ

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۔ ۲ ایضاً ص ۱۳۶ ۳ ایضاً ۴ ایضاً

وہ تقویٰ کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کے باوجود گنہگاروں کے لئے بھی اپنی زبان سے کوئی ناروا کلمہ نہ نکالتے تھے، نسر بن ذعلوق کا بیان ہے کہ کسی نے ربیع سے پوچھا کہ آپ لوگوں کو برا نہیں کہتے۔ آپ نے جواب دیا خدا کی قسم مجھے خود اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے۔ کہ دوسروں کو برا کہوں، لوگوں کا عجیب حال ہے کہ وہ دوسروں کے گناہوں پر تو خدا سے ڈرتے ہیں لیکن خود اپنے گناہوں کی جانب سے بے خوف ہیں[1]۔

شدت احتیاط: ربیع کو اوامر و نواہی کی پابندی میں اتنا اہتمام تھا اور وہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں میں اتنی احتیاط برتتے تھے کہ ہر شخص کا ذہن بھی ان کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ بکر بن ماعز کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ربیع کی بچی نے ان سے کہا، ابا میں کھیلنے جاتی ہوں، فرمایا جاؤ، اچھی باتیں کہو، چھوٹی بچی اس کو کیا سمجھتی وہ سر ہوگئی کہ میں کھیلنے جاتی ہوں لوگوں نے ربیع سے کہا آپ اسے کھیل کے لئے کیوں نہیں جانے دیتے۔ فرمایا میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے آج کے نامہ اعمال میں یہ لکھا جائے کہ میں نے کھیل کا حکم دیا[2]۔ نرشیر کا کھیل لہو و لعب میں ہے اور اس کی ممانعت کی حیثیت بھی اسی حد تک ہے لیکن ربیع شدت احتیاط میں کہتے تھے کہ میں نردشیر کے پانسوں کو اپنے ہاتھوں سے الٹنے کے مقابلہ میں سور کے گوشت کو اٹھا لینا زیادہ پسند کرتا ہوں[3]۔

انکسار و تواضع: ان کمالات پر انکسار و تواضع کا یہ حال تھا کہ پاخانہ تک اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے، ایک شخص نے کہا اس کام کے لئے دوسرے لوگ موجود ہیں جواب دیا میں چاہتا ہوں کہ گھر کے کار و بار میں بھی حصہ لوں، ان کی خاکساری کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ تم کو دیکھ کر متواضعین کی یاد آجاتی ہے[4]۔ کسی موقع پر بھی ان کی زبان سے برا کلمہ نہ نکلتا تھا، کسی سے تکلیف پہنچتی تو اس کو دعا دیتے، ایک مرتبہ مسجد میں نمازیوں کا ہجوم زیادہ تھا، جب جماعت کھڑی ہونے لگی اور لوگ آگے بڑھے تو ایک شخص نے جو ربیع کے پیچھے تھا، ان سے کہا کہ آگے بڑھو لیکن کثرت اژدہام سے آگے راستہ نہ تھا، انہوں نے صرف اس قدر کہا، خدا تم پر رحم کرے اس شخص نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ربیع تھے انہیں دیکھ کر وہ فرط ندامت سے رونے لگا[5]۔

مجمعوں سے احتراز:

ربیع نہایت تنہائی پسند تھے، نہ کہیں آتے جاتے تھے، نہ کسی مجمع میں بیٹھتے تھے، امام شعبی کا بیان ہے کہ ربیع جب سے سن شعور کو پہنچے نہ کسی مجلس میں بیٹھے نہ کسی شاہراہ پر گئے، اس کی وجہ وہ یہ بیان

---

[1] ابن سعد، جلد ۶، ص ۱۲۹ [2] ایضاً، ص ۱۲۷ [3] ایضاً، ص ۱۳۱ [4] ایضاً، ص ۱۲۷ [5] ایضاً، ص ۱۳۰

کرتے تھے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ میں کسی مقام پر جاؤں اور وہاں کوئی ایسی چیز دیکھوں جس میں شہادت میں بلایا جاؤں اور شہادت نہ دے سکوں، یا کسی گرانبار آدمی کو دیکھوں اور اس کی مدد نہ کرسکوں یا مظلوم کو دیکھوں اور اس کی اعانت نہ کرسکوں![1]

سکوت وخاموشی:

آپ گھر میں بھی عموماً خاموش رہتے تھے، بہت کم باتیں کرتے تھے، فضول کلمہ تو زبان سے نکلتا ہی نہ تھا، ایک شخص کا جو آپ کی خدمت میں بیس سال تک رہا تھا، بیان ہے کہ میں نے بیس سال کی طویل مدت میں ان کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں سنا جس پر نکتہ چینی کی جاسکے[2]، اسی شخص کا بیان ہے کہ میں نے بیس سال کے عرصہ میں ربیع کو کلمۂ خیر کے علاوہ دوسرا کلمہ زبان سے نکالتے ہوئے نہیں دیکھا[3]۔

ایک تیمی کا بیان ہے کہ میں دو سال تک ربیع کے پاس بیٹھا اس دوران میں انہوں نے مجھ سے انسانوں کے دنیاوی حالات کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا، صرف ایک مرتبہ اتنا پوچھا کہ تمہاری ماں زندہ ہیں۔ اور تمہارے محلہ میں کتنی مسجدیں ہیں؟[4]

وہ دوسروں کو بھی فضول گوئی سے منع کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ باتیں کم کیا کرو، اگر ہوسکے تو فضول باتوں کے بجائے سبحان اللہ، الحمد للہ، لاالہ الا اللہ، اللہ اکبر کا ورد کیا کرو، لوگوں کو اچھی باتیں کرنے کی تلقین کیا کرو، بری باتوں سے روکا کرو، قرآن پڑھا کرو، خدا سے بھلائی کی درخواست کیا کرو، اور شر سے پناہ مانگا کرو[5]۔

دوسروں پر اخلاق کا اثر:

ربیع گو خاموش اور عزلت نشین تھے، لیکن پھول کی خوشبو اور آفتاب کی روشنی قید نہیں کی جاسکتی، اس لئے ان کی گوشہ گیری کے باوجود ان کی نکہت اخلاق ہر طرف پھیل گئی، اور ہر شخص ان کے اخلاقی فضائل سے متاثر ہوگیا، شفیق روایت کرتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعودؓ کے چند اصحاب کے ساتھ ربیع کی ملاقات کو گئے، ایک شخص نے راستہ میں پوچھا کہاں جاتے ہو، ہم نے کہا ربیع سے ملنے کے لئے، اس نے کہا تم لوگ ایسے شخص کے پاس جارہے ہو کہ جب وہ کوئی بات کہتا ہے تو جھوٹ نہیں کہتا، جب وہ وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی نہیں کرتا اگر اس کے پاس امانت رکھو تو اس میں خیانت نہیں کرتا[6]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۹ [2] ایضاً۔ ص ۱۲۸ [3] ایضاً۔ ص ۱۲۵ [4] ایضاً۔ ۱۲۹ [5] ایضاً۔ ص [6] ایضاً۔ ص ۱۳۰

کسی انسان کی حقیقی عظمت اس کے معاصرین کا اعتراف ہے، ربیع کے معاصرین ان سے اتنا متاثر تھے کہ ان کے مقابلہ میں ذہنی بڑائی بھی اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک شخص نے ابووائل سے پوچھا کہ تم بڑے ہو یا ربیع، انہوں نے جواب دیا کہ سن میں ان سے بڑا ہوں لیکن وہ عقل میں مجھ سے بڑے ہیں[1]۔

توکل علی اللہ: توکل اور اعتماد علی اللہ کے اصل معنی ہیں کوشش کر کے کسی کام کی کامیابی اور ناکامی کو خدا کے حوالہ کر دینا، لیکن توکل کا ایک درجہ اس سے بھی بلند ہے جو صرف خاصانِ خدا کا حصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیاوی وسائل ہی نہ اختیار کیے جائیں اور اس کو بھی خدا کے حوالہ کر دیا جائے، ربیع اس درجہ قصوی پر فائز تھے کہ وہ موت و زیست کے سوال کے موقع پر دنیاوی وسائل نہ اختیار کرتے تھے۔ فالج جیسے موذی اور زندہ درگور کر دینے والے مرض میں مبتلا تھے، لیکن کسی طرح علاج نہیں کرتے تھے۔ لوگ ان سے کہتے، کاش آپ علاج کرتے فرماتے، عاد و ثمود اور اصحاب رس سب گزر گئے، ان کے درمیان بہت سے قرن تھے اور ان میں علاج کرنے والے بھی موجود تھے لیکن نہ تو علاج کرنے والے ہی باقی رہ گئے اور نہ علاج کرانے والے، سب مٹ گئے[2]۔

وفات: اس توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر فالج نے مرض الموت کی شکل اختیار کر لی دم آخر انہوں نے لوگوں کے روبرو یہ اعترافات کیے کہ میں اپنے نفس پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں، وہ اپنے نیک بندوں کی شہادت، انہیں بدلہ دینے اور ثواب دینے کے لئے کافی ہے، میں خدا کی ربوبیت، دین اسلام، محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت اور قرآن کی امامت سے راضی ہوں اور اپنی ذات اور اس شخص سے جو میری اطاعت کرے، اس بات پر راضی ہوں، کہ ہم سب عابدین کے زمرہ میں خدا کی عبادت کریں، اور حمد کرنے والوں میں اس کی حمد کریں اور مسلمانوں کی خیر خواہی کریں[3]۔ ان وصیتوں کے بعد واصل بحق ہوئے، یہ کوفہ پر عبیداللہ بن زیاد کی ولایت کا زمانہ تھا[4]۔

(۲۳) ربیعہؒ بن فروخ المقلب بہ رائے

نام ونسب: ربیعہ نام، ابوعثمان کنیت، رائے لقب، باپ کا نام فروخ اور کنیت ابوعبدالرحمن تھی، فروخ قبیلہ بنی تمیم بن جرہ کے غلام تھے، اس غلام کے گھروں میں ربیعہ پیدا ہوئے جو آگے چل کر اقلیم علم کے تاجدار بنے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۳۰ [2] ایضاً، ص ۱۳۲ [3] ایضاً [4] ایضاً

فضل وکمال :

فضل وکمال کے اعتبار سے ربیع ائمہ تابعین میں تھے، ان کی علمی جلالت تمام علماء ومحدثین میں مسلم تھی، علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ربیع کی توثیق جلالت اور علمی اور عقلی عظمت پر تمام علماء اور محدثین کا اتفاق ہے[۱]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ امام تھے، حافظ تھے، فقیہ تھے، مجتہد تھے، اور رائے میں انہیں خاص بصیرت تھی، اس لئے ربیعۃ الرائے کہلاتے تھے[۲]۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ تھے، اور فقہ وحدیث کے حافظ تھے[۳]۔

پیدائش وتعلیم :

ربیعہ کے ابتدائی اور تعلیمی حالات نہایت سبق آموز اور دلچسپ ہیں۔ ابھی وہ شکم مادر میں تھے کہ ان کے والد فروخ کو خراسان کی مہم میں چلا جانا پڑا اور کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے گئے کہ وہ کامل ستائیس برس تک وطن نہ آسکے۔ ربیعہ کی ماں نہایت عاقلہ اور عاقبت اندیش خاتون تھیں۔ ربیعہ کی پیدائش کے بعد ان کی تعلیم وتربیت کا بڑا خیال رکھا۔

چنانچہ شوہر کی عدم موجودگی میں انہوں نے پوری توجہ سے لڑکے کی تعلیم وتربیت دلائی اور شوہر کا کل اندوختہ جس کی تعداد تیس ہزار اشرفی تھی، ربیعہ کی تعلیم پر صرف کردیا۔ ربیعہ خود نہایت ذہین طباع اور شائق تھے، اس لئے انہوں نے بہت جلد تعلیم حاصل کرلی، اور آغاز شباب ہی میں وہ جملہ علوم میں کامل ہوگئے، چھبیس ستائیس سال کی عمر میں ان کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا، اور ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔

ستائیس سال کے بعد ان کے والد گھر واپس آئے۔ گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ باپ بیٹے دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ربیعہ باہر نکلے تو دروازہ پر ایک اجنبی کو دیکھ کر سخت برہم ہوئے اور کہا دشمن خدا تو میرے گھر پر حملہ کرتا ہے۔ فروخ نے جواب دیا دشمن خدا تو میرے حرم میں گھسا ہوا ہے۔ دونوں میں یہاں تک گفتگو بڑھی کہ باہم دست وگریبان ہوگئے۔ یہ شور ہنگامہ سن کر پاس پڑوس کے آدمی جمع ہوگئے، یہاں آکر دیکھا تو دونوں آدمی گتھے ہوئے تھے۔ ربیعہ فروخ سے لپٹے ہوئے کہہ رہے تھے کہ خدا کی قسم تجھ کو حاکم شہر کے پاس لے جائے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ فروخ کی زبان پر بھی یہی کلمات تھے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۱۵۹ [۲] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۱

[۳] تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۱

اتنے میں حضرت انس بن مالکؓ پہنچ گئے، اور فروخ سے کہا، بڑے میاں آپ کسی دوسرے گھر میں ٹھہر جائیے۔ اس وقت فروخ نے اپنا تعارف کرایا کہ میں بنی فلاں کا غلام ہوں میرا نام فروخ ہے، اور یہ میرا گھر ہے۔ ان کی آواز سن کر ان کی بیوی گھر سے نکل آئیں اور انہیں پہچان کر بیٹے سے کہا کہ یہ تمہارے باپ ہیں اور شوہر کو بتایا کہ یہ تمہارا فرزند ہے، جسے تم حمل کی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔

یہ پردہ اُٹھنے کے بعد دونوں باپ بیٹے گلے مل کر خوب روئے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد فروخ نے بیوی سے اندوختہ کے متعلق پوچھا اور کہا میرے پاس چار ہزار دینار اور ہیں۔ بیوی کل روپے بیٹے کی تعلیم میں صرف کر چکی تھیں۔ جواب دیا ابھی ایسی جلدی ہی کیا ہے۔ روپیہ حفاظت سے ہے، اطمینان سے نکالوں گی۔ اس وقت ربیعہ کی ذات طالبان علم کا مرجع بن چکی تھی۔ مسجد نبوی میں ان کا حلقہ درس قائم تھا، جس میں مدینہ کے بڑے بڑے ارباب علم، عماد اور اشراف شریک ہوتے تھے۔ ربیعہ معمول کے مطابق وقت پر مسجد چلے گئے۔ ان کی ماں نے درس کا وقت پہچان کر شوہر سے کہا، ذرا مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھ آؤ۔

فروخ مسجد گئے تو دیکھا کہ ایک شخص کے گرد لوگوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ امام مالک، حسن بن زید، ابن ابو علی لہبی اور مساحقی وغیرہ مدینہ کے شرفاء اور اکابر حلقہ درس میں شریک ہیں۔ فروخ یہ ہجوم دیکھ کر قریب چلے گئے، لوگوں نے راستہ دے دیا۔ ربیع نے درس میں خلل پڑنے کے خیال سے سر جھکا لیا۔ فروخ نے لوگوں سے پوچھا یہ کون بزرگ ہیں۔ انہوں نے بتایا، ربیعہ بن ابی عبدالرحمن فروخ یہ سن کر فرط مسرت میں بول اُٹھے، خدا نے میرے بیٹے کو یہ رتبہ عطا کیا، اور گھر جا کر بیوی سے کہا، میں نے تمہارے لڑکے کو ایسے رتبہ پر دیکھا کہ اس سے قبل کسی صاحب علم وفقہ کو نہ دیکھا تھا۔ شوہر کی زبان سے یہ اعتراف سننے کے بعد بیوی نے کہا، اب بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ بیٹے کی یہ عظمت وشان یا تیس ہزار اشرفیاں۔ فروخ نے جواب دیا، خدا کی قسم لڑکے کی عظمت وشان۔ بیوی نے کہا تو پھر تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے تمہاری کل دولت اس کی تعلیم میں صرف کر دی۔ فروخ نے کہا خدا کی قسم ٹھکانے لگی۔[1]

حدیث: ربیعہ کی شہرت زیادہ تر ان کے فقہی کمال کی وجہ سے ہے لیکن وہ حدیث کے بھی ممتاز حفاظ میں تھے، ان کے حفظ حدیث پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن سعد انہیں ثقہ اور کثیر الحدیث[2]

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۱ تا ۴۲۳ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۵۸، بحوالہ ابن سعد

خطیب بغدادی حافظ فقہ و حدیث[1] اور حافظ حدیث لکھتے ہیں[2] ان کی حدیث دانی ان کے معاصرین میں مسلم تھی۔ ایک مرتبہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ عراق گئے، عراقیوں نے ان سے کہا کہ ربیعہ ''رائے'' کی حدیث سنی ہیں۔ انہوں نے کہا تم لوگ ان کو ''ربیعہ رائے'' کہتے ہو، خدا کی قسم میں نے ان سے زیادہ کسی کو سنت پر حاوی نہیں دیکھا[3]۔

حدیث میں ان کے درجہ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یحییٰ بن سعید جو ان کے تلمیذ رشید تھے۔ ان کی زندگی ہی میں صاحب درس ''محدث'' بن گئے تھے اور ربیعہ کی عدم موجودگی میں حدیث کا درس دیتے تھے[4]۔

صحابہ میں ربیعہ نے انسؓ بن مالک اور سائب بن یزید اور تابعین میں محمد بن یحییٰ بن حبان، ابن مسیب، قاسم بن محمد، ابن ابی لیلیٰ، اعرج، مکحول، حنظلہ بن قیس اور عبداللہ بن یزید وغیرہ جیسے محدثین سے استفادہ کیا تھا اور یحییٰ بن سعید، ان کے بھائی عبدربہ، سلیمان التیمی مالک شعبہ، دونوں سفیان، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ اکابر محدثین ان کے تلامذہ میں تھے[5]۔

فقہ: لیکن ربیعہ کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا، اس میں وہ امامت واجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور اپنے تمام معاصرین پر فائق تھے ان کے فقہی کمالات میں ان کی فطری استعداد کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ یحییٰ بن سعید کہتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ زیرک نہیں دیکھا، دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ان سے زیادہ صحیح عقل والا نہیں دیکھا[6]۔

اس ذہانت وذکاوت نے ان میں اجتہاد، استنباط اور تفریع مسائل کا خاص ملکہ پیدا کردیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ربیعہ امام، حافظ فقیہ اور مجتہد تھے، رائے میں انہیں اتنی بصیرت حاصل تھی کہ ''رائے'' ان کا لقب ہوگیا تھا[7]۔

اس فقہی کمال کی وجہ سے وہ مدینۃ العلم مدینہ کی مسند افتا پر فائز ہوگئے، کان صاحب الفتویٰ بالمدینۃ[8]۔ عباسی حکومت کے قیام کے بعد سفاح عباسی نے ان کو بلا کر عہدہ قضا پر ممتاز کیا۔ امام مالک ان کے تلامذۂ خاص میں تھے۔ ربیعہ کی موت کے بعد ان کی زبان پر یہ حسرت کلمہ تھا کہ ربیعہ کے بعد فقہ کا مزا جاتا رہا[9]۔

۱۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۱ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۱ ۳۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۲
۴۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۲ ۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۵۸ ۶۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۲
۷۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۱ ۸۔ تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۱ ۹۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۶

امام ابوحنیفہؒ جو فقہ رائے اور قیاس کے امام اعظم ہیں، ربیعہ کی خدمت میں استفادہ کے لئے آتے تھے، اور ان کے اقوال و آراء کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے[1]۔

فتاویٰ میں احتیاط :

لیکن اس قوت اجتہاد اور رائے اور قیاس میں اس ملکہ کے باوجود وہ اس قدر محتاط تھے کہ مسائل میں اپنی رائے اور قیاس کو کم دخل دیتے تھے اور بغیر سند کے جواب دینا سخت ناپسند کرتے تھے، عبدالعزیز بن ابی سلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ربیعہ کے مرض الموت میں ان سے کہا کہ ہم لوگوں نے آپ ہی سے فیض پایا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے مسائل پوچھتے ہیں جس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی سند نہیں ہوتی اور ہم کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ہماری رائے ان کی رائے سے بہتر ہوگی۔ ایسی حالت میں کیا ہم اپنی رائے سے فتویٰ دیا کریں۔

یہ سن کر ربیعہ سہارا لے کر اٹھ بیٹھے، اور فرمایا عبدالعزیز تم پر افسوس ہے کسی مسئلہ میں بغیر علم کے جواب دینے سے یہ بہتر ہے کہ تم جاہل مر جاؤ، اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا[2]۔

حلقہ درس : ربیعہ کی ذات مرجع خلائق تھی، ان کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، اس میں مدینہ کے تمام بڑے بڑے علماء، عمائد اور شرفاء شریک ہوتے تھے، امام مالک یحییٰ انصاری امام اوزاعی اور شعبہ وغیرہ ائمہ اسی حلقہ درس کے فیض یافتہ تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شمار کیا گیا تو چالیس بڑے بڑے عمامہ پوش ان کے حلقہ درس میں تھے[3]۔

تلامذہ : ربیعہ کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا، ممتاز تلامذہ میں امام مالک، یحییٰ انصاری، سفیان ثوری، شعبہ، لیث، اوزاعی، ابن عیینہ، سلیمان بن ہلال وغیرہ لائق ذکر ہیں۔ عام تلامذہ کی فہرست نہایت طویل ہے[4]۔

ربیعہ کے معاصرین کا اعتراف :

ربیعہ کے تمام معاصرین میں ان کی علمی فضیلت مسلم تھی۔ عبیداللہ بن عمر کہتے تھے کہ ربیعہ ہماری مشکلات کے عقدہ کشا، ہمارے عالم اور ہم سب میں افضل تھے[5]۔

معاذ بن معاذ کا بیان ہے کہ سوار بن عبداللہ کہتے تھے کہ میں نے کسی کو ربیعہ رائے سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ میں نے ان سے پوچھا، حسن اور ابن سیرین کو بھی نہیں۔ انہوں نے کہا، حسن اور

---

۱ تاریخ بغداد۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۲ ۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۵۹ ۳ ایضاً و تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص۔ ۲۵۸ ۴ تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۳ ۵ تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۳

ابن سیرین کو بھی نہیں[1]۔ یحییٰ بن سعید انصاری اگرچہ ربیعہ کے خوشہ چینوں میں تھے لیکن عمر میں اُن کے برابر تھے اور صاحب درس وافتاء تھے، لیکن ربیعہ کی موجودگی میں درس نہیں دیتے تھے[2]۔

معاصرین تو پھر بھی برابر کے لوگ تھے، ربیعہ کے شیوخ تک ان کی وسعت علم کے قائل تھے، چنانچہ قاسم بن محمد سے جو ان کے شیوخ میں ہیں جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر قرآن وحدیث میں اس کا جواب مل جاتا تو وہ خود بتادیتے ورنہ سائل کو ربیعہ کے پاس بھیج دیتے[3]۔

زہد وعبادت: اس علم کے ساتھ وہ بڑے عابد وزاہد تھے ابن زید کا بیان ہے کہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن ایک مدت دراز تک عبادت گزار رہے، رات دن نمازیں پڑھتے تھے لیکن پھر جب انہوں نے علمی مجلسوں میں شرکت شروع کی اس وقت ان کا یہ رنگ قائم نہ رہ سکا[4]۔

بے نیازی: ربیعہ زرومال کی جانب سے بڑے بے نیاز تھے سلاطین اور خلفاء تک کا احسان اٹھانا پسند نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ سفاح عباسی کے پاس غالباً عہدۂ قضاء کے سلسلے میں ابنار گئے سفاح نے بطور نذر ایک رقم پیش کی ربیع نے اسے قبول نہ کیا ان کے انکار پر سفاح نے لونڈی کی خریداری کے نام سے پانچ ہزار کی رقم دینی چاہی انہوں نے اسے بھی نہیں لیا[5]۔

فیاضی: لیکن اپنے مال میں بڑے فیاض وسیر چشم تھے اور ان کے مال دوسروں کے لئے وقف تھا ابن زید کا بیان ہے کہ مدینہ میں ربیعہ سے زیادہ دوستوں، دوست کے لڑکوں اور عام سائلین کے لئے اپنے مال میں فیاض نہ تھا[6]۔

گویائی کا لطیفہ: ربیعہ بڑے گویا اور لسان تھے کہا کرتے تھے کہ خاموش آدمی خواب آور گونگے پن کی حالت میں ہوتا ہے وہ ہر وقت باتیں کیا کرتے تھے ایک دن حسب معمول اپنی مجلس میں باتوں کی پھلجھڑی چھوڑ رہے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور دیر تک خاموشی کے ساتھ ان گلفشانیوں کو سنتا رہا، ربیعہ سمجھے کہ وہ ان کی باتوں سے مسحور ہو رہا ہے اعراب کی فصاحت وبلاغت مشہور ومسلم ہے، ربیعہ نے غالباً داد لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟ اس نے جواب دیا "ادائے معنی کے ساتھ الفاظ میں اختصار" ربیعہ نے پوچھا اور عجز بیان کسے کہتے ہیں اعرابی نے جواب دیا جس میں تم مبتلا ہو" یہ پرلطف جواب سن کر ربیعہ سخت شرمندہ ہوئے[7]۔

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً۔ ص
[6] ایضاً۔ ص [7] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۸

وفات: ربیعہ کے سنہ وفات اور جائے وفات دونوں کے بارے میں دو بیانات ہیں۔ سنہ کے بارہ میں یہ اختلاف ہے کہ ۱۳۰ھ یا ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔ جائے وفات کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ ایک بیان کے مطابق انبار میں اور دوسرے بیان کے مطابق مدینۃ الرسول میں انتقال کیا۔ ۱۳۶ھ والی روایت زیادہ مستند ہے[1]۔

(۲۳) رجاء بن حیوۃؒ

نام ونسب: رجاء نام، ابونصر کنیت، نسب نامہ یہ ہے رجاء بن حیوۃ بن جرول بن الاحنف ابن السمط بن امراؤالقیس بن عمرو الکندی اردنی رجاء کے دادا جرول صحابی تھے۔

فضل وکمال: فضل وکمال کے اعتبار سے رجاء شام کے اکابر علماء میں تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقۃ عالما فاضلا کثیر العلم[2]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں، ان کی جلالت اور ان کی شخصی اور علمی فضیلت پر سب کا اتفاق ہے[3]۔

حدیث: آپ حدیث اور فقہ دونوں میں یکساں کمال رکھتے تھے، حافظ ذہبی انہیں امام اور شیخ اہل الشام لکھتے ہیں[4]۔ مطر الوراق کہتے تھے کہ رجاء بن حیوۃ سے افضل شامی اور ان سے زیادہ روایات میں رفقہ شخص سے نہیں ملا[5]۔ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص، عدی عمیرہ، عبادہ بن صامتؓ، عبدالرحمن بن غنم، معاویہ نواس بن سمعان، ابو درداء، ابوسعید، خدریؓ، ابوامامہ، مسور بن مخرمہ، قبیصہ بن ذویب، ابو صالح السمان اور وراد کاتب وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا، اور عدی بن عدی، ابن عجلان، ثور بن یزید ابن عون، مطر الوراق، زہری، محمد بن جحادہ اور حمید الطویل وغیرہ آپ کے زمرہ تلامذہ میں ہیں[6]۔

روایت میں الفاظ کی پابندی:

روایت حدیث میں محتاط تھے۔ حدیثوں کو الفاظ کی پابندی کے ساتھ روایت کرتے تھے[7]۔

فقہ: حدیث سے زیادہ فقہ میں ان کو دستگاہ تھی، مطر الوراق کہتے تھے کہ میں نے کسی شامی کو ان سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا[8]۔ ابن حبان انہیں فقہائے شام میں لکھتے ہیں[9]۔ ان کے تفقہ کی ایک سند یہ بھی ہے کہ وہ منصب قضاء پر ممتاز تھے[10]۔

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۲۶ [2] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۶۱ [3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۹۰
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۴ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۶۵ [6] ایضاً۔ ص ۲۶۵
[7] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۶۱ [8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۵ [9] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۶۶
[10] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۹۰

علماء میں رجاء کا درجہ :

اپنے ہمعصر علماء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، اس عہد کے تمام علماء ان کے کمالاتِ علمی کے معترف تھے، مکحول جو شام کے بڑے نامور عالم تھے، ان کو اپنا شیخ اپنا آقا اور سارے اہل شام کا سردار کہتے تھے[۱]۔ ان کی موجودگی میں مکحول خود کسی مسئلہ کا جواب نہ دیتے تھے۔ موسیٰ بن یسار کا بیان ہے کہ ایک شخص نے مکحول سے مسجد میں کوئی مسئلہ پوچھا انہوں نے اس سے کہا ہمارے شیخ اور ہمارے سردار رجاء بن حیوۃ سے پوچھو[۲]۔ ابن عونؒ کہتے تھے کہ رجاء کا مثل شام میں نہیں دیکھا، ابن سیرین کا مثل عراق میں اور قاسم کی مثل حجاز میں نہیں دیکھا[۳]۔

زہد و عبادت :

اس علم کے ساتھ وہ بڑے عابد و زاہد تھے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ شام کے عبادت گزار اور زاہد لوگوں میں تھے ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مسلمہ بن عبد الملک کہتا تھا کہ کندہ کے تین آدمیوں کے طفیل میں خدا پانی برساتا ہے اور دشمنوں پر مدد دیتا ہے ان میں ایک رجاء ہیں[۴]۔

امراء سے استغناء :

اس زہد و تقویٰ کی وجہ سے وہ امراء اور سلاطین سے ہمیشہ بے نیاز رہے اور کسی کے آستانہ پر حاضری نہیں دی، ایک مرتبہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ حاکم وقت کے پاس کیوں نہیں جاتے، جواب دیا میرے لئے اس رب العالمین کی ذات کافی ہے۔ جس کے لئے میں نے ان کو چھوڑا ہے[۵]۔

ایک اہم کارنامہ :

ان کا سب سے اہم کارنامہ اور سب سے بڑی مذہبی خدمت یہ ہے کہ انہی نے سلیمان بن عبد الملک کو عمر بن عبد العزیزؒ کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا[۶]۔ اس لئے الداعی الی الخیر کفاعلہ کے مطابق وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہیں۔

وفات : ۱۱۲ھ میں وفات پائی[۷]۔

حلیہ : آخر عمر میں سر اور داڑھی کے بال سپید ہو گئے تھے، سر میں خضاب لگاتے تھے، اور داڑھی کو نورانی چھوڑ دیا تھا۔

۱۔ تہذیب التہذیب، جلد ۳، ص ۔ ۲۔ ایضاً ۳۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱۰۵ ۴۔ تہذیب التہذیب، جلد ۳، ص ۲۶۶ ۵۔ تہذیب الاسماء، جلد ۱، ص ۱۹۰ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۱۰۵ ۷۔ ایضاً

(۲۴) زر بن حبیشؒ

نام ونسب: زر نام، ابومریم کنیت، نسباً اسدی تھے، نسب نامہ یہ ہے، زر بن حبیش بن حباشہ ابن اوس بن بلال اسدی۔

فضل وکمال: زر مخضری تھے، یعنی انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا تھا، اس لئے ان کو کبار صحابہ کی صحبت کا موقعہ ملا، ان کے فیض نے انہیں جلیل القدر تابعی بنا دیا، امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے، ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[1]۔ حافظ ذہبی ان کو امام اور قدوہ لکھتے ہیں[2]۔

قرآن: قرآن کے ممتاز قاری اور عالم تھے، حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں، کان عالما بالقران قارئا فاضلا[3]۔ قرآن کا درس بھی دیتے تھے، عاصم بن بہدلہ انہی کے حلقہ درس کے فیض یافتہ تھے[4]۔

حدیث: حدیث کے بڑے حافظ تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کان ثقۃ کثیر الحدیث[5]۔ حافظ ذہبی ائمہ حفاظ میں لکھتے ہیں، حدیث میں انہوں نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابوذرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبدالرحمن بن عوف، عباس بن مطلبؓ، سعید بن زیدؓ، حذیفہ بن یمان، ابی ابن کعبؓ وغیرہ جیسے اکابر صحابہ سے روایتیں کی ہیں۔

حضرت ابراہیم نخعی، عاصم بن بہدلہ، منہال بن عمرو، عیسیٰ بن عاصم، عدی بن ثابت، امام شعبی، زبید الیمامی اور ابواسحٰق شیبانی وغیرہ آپ کے خوشہ چینوں میں تھے[6]۔

ادب: مذہبی علوم کے علاوہ زر عربی زبان کے بھی بڑے فاضل تھے، اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے بزرگ ان سے استفادہ کرتے تھے[7]۔

اختلاف رائے کے ساتھ اتحادِ عمل:

ان لوگوں کے لئے جن کی زبانیں ادنیٰ ادنیٰ اختلاف پر آپس میں تیرونشتر چلاتی ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جنگ وجدال تک نوبت آجاتی ہے۔ ان بزرگوں کا یہ نمونہ قابل تقلید ہے کہ اختلاف مسلک کے باوجود بشرطیکہ اس کا تعلق اصول اسلام سے نہ ہوتا تو سب وشتم کجا اس کا اثر ان کے

۱؎ تہذیب الاسماء، جلد اول، ص ۱۹۷ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۴۹ ۳؎ استیعاب، جلد اول، ص ۲۱۲
۴؎ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱ ۵؎ ابن سعد، جلد ۶، ص ۷۱ ۶؎ تہذیب
التہذیب، جلد، ص ۳۲۱ ۷؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۹

تعلقات تک پر نہ پڑتا، اور ایک دوسرے کا احترام میں سر مو فرق نہ آنے دیتے، زر علوی تھے اور ایک دوسرے تابعی ابووائل عثمانی دونوں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، اور باہم اس اختلاف مسلک کا تذکرہ تک نہ کرتے تھے، دونوں ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، ابووائل زر کا بڑا احترام کرتے تھے[۱]۔

توہین مذہب پر غیظ وغضب :

لیکن اگر کسی چیز میں کسی دینی شعار کی توہین کا ادنیٰ شائبہ بھی نکلتا تو یہ مصالحت اور درگزر غیظ وغضب میں بدل جاتا تھا، ایک مرتبہ زر اذان دے رہے تھے، ایک انصاری کا ادھر سے گزر ہوا اس نے کہا ابومریم میں تم کو اس سے بالاتر سمجھتا تھا، اذان کی یہ توہین سن کر انہوں نے کہا جب تک میں زندہ رہوں گا تم سے ایک لفظ نہ بولوں گا[۲]۔

وفات : زر نے بڑی طویل عمر پائی۔ آخر عمر میں اعضاء میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ باختلاف روایت ۸۱ھ یا ۸۲ھ یا ۸۳ھ میں وفات پائی[۳]۔ وفات کے وقت ۱۲۲ سال کی عمر تھی[۴]۔

(۲۵) زید بن اسلمؒ

نام ونسب: زید نام ہے۔ ابواسامہ کنیت۔ حضرت عمرؓ کی غلامی کا شرف رکھتے تھے۔

فضل وکمال : زید اس بزرگ اور محترم ہستی کے غلام تھے۔ جس کے ادنیٰ صحبت یافتہ علم وعمل کے پیکر بن گئے۔ زید تو خاص غلاموں میں سے تھے، انہوں نے آقا سے زیادہ آقازادہ یعنی حضرت عبداللہؓ کے سرچشمہ علم سے فیض حاصل کیا۔ ان کے فیض صحبت نے زید کو دولت علم سے مالا مال کر دیا تھا، اور ان کا شمار علماء مدینہ میں ہونے لگا تھا[۵]۔

تفسیر قرآن : زید کو قرآن حدیث، فقہ، جملہ مذہبی علوم میں پورا درک تھا، وہ قرآن کی تفسیر کے بڑے عالم تھے۔ ابن حجر لکھتے ہیں، کان عالما بتفسیر القرآن[۶]۔

حدیث : حدیث میں بھی ان کے علم کا دائرہ وسیع تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقة کثیر الحدیث[۷]۔ صحابہ میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن عبداللہ، عائشہ صدیقہ، ربیعہ بن عبادہ وائلیؓ۔ سلمہ بن اکوع، اور تابعین میں ابوصالح السمان عطاء بن یسار،

---

[۱] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۷۱ [۲] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۲۲ [۳] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۷۱
[۴] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۲۲ [۵] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۹۶ [۶] ایضاً
[۷] ایضاً۔ بحوالہ ابن سعد

حمران علی بن حسین، بسر بن سعید، اعرج، عبدالرحمٰن بن وعلہ، عبدالرحمٰن بن سعید، قعقاع بن حکیم، اور عیاض، ابن عبداللہ بن سعد وغیرہ سے سماع کیا تھا[1]۔

ان کے لڑکے عبداللہ، عبدالرحمٰن اور اسامہ، مالک بن انس، ابن عجلان، ابن جریج، سلمان بن بلال، حفص بن میسرہ، داؤد بن قیس الفراء ایوب سختیانی، جریر بن حازم، عبیداللہ بن عمر، ابن اسحٰق محمد بن جعفر بن ابی کثیر وغیرہ ان کے تلامذہ میں تھے[2]۔

فقہ : فقہ میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ درک تھا، حافظ ذہبی، امام نووی، حافظ ابن حجر سب ان کو بالا تفاق فقیہ مدینہ لکھتے ہیں[3]۔

حلقۂ درس : مسجد نبوی میں زید کا حلقہ درس تھا جس میں بڑے بڑے فقہاء اور اکابر مدینہ شریک ہوتے تھے، اعرج اس حلقہ کے ایک رکن تھے، بیان ہے کہ زید بن اسلم کے حلقۂ درس میں چالیس بڑے بڑے فقہاء شریک ہوتے تھے، ان میں باہم اتنی ہمدردی تھی کہ ہر شخص کا مال دوسرے کی ضرورت کے لئے وقف تھا، اس درس میں ایسی حدیثوں پر بحث ومباحثہ میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا تھا، جس میں کوئی افادی پہلو نہ ہو[4]۔

امام زین العابدین اپنے خاندانی حلقہ کو چھوڑ کر اس حلقہ میں شریک ہوتے تھے نافع بن جبیر نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اپنی خاندانی مجلس کو چھوڑ کر ابن خطاب کے غلام کے درس میں شریک ہوتے ہیں، آپ نے جواب دیا آدمی اسی مجلس میں شریک ہوتا ہے، جس سے اس کے دین کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو[5]۔

وقار وہیبت : زید اگرچہ غلام تھے، لیکن ان کی علمی جلالت کی وجہ سے سب پر ان کی ہیبت چھائی رہتی تھی، مالک بن عجلان بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر کسی کا اتنا رعب نہ تھا، جس قدر زید ابن اسلم کا، ہیبت سے لوگوں کو سوال کرنے اور پوچھنے تک کی ہمت نہ پڑتی تھی، جب ان کا دل چاہتا خود سے حدیثیں بیان کرتے۔ جب خاموش ہوجاتے تو پھر کسی کو سوال کرنے کی ہمت نہ ہوتی[6]۔

محبوبیت : اس ہیبت کے ساتھ ان کو بڑی محبوبیت اور مقبولیت حاصل تھی، وہ لوگوں کے محبوب القلوب تھے، ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی کبھی مجھ کو اپنے کسی ہم جلیس

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۹۵ و تہذیب الاسماء [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۹۵
[3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۸ و تہذیب التہذیب حوالہ مذکور [4] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۰۰
[5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۱۹ [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۹۶

کے پاس کام سے بھیج دیتے تھے۔ یہ میرا سر چومتے اور سہلا کر کہتے، خدا کی قسم تمہارے والد مجھے میری اولاد اور میرے گھر والوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں، اگر خدا ان دونوں میں سے کسی ایک کو اٹھانا چاہے اور ہم کو انتخاب کا اختیار دے تو ہم زید کی زندگی اور سلامتی کے مقابلہ میں اپنی اولاد اور اپنے اہل وعیال کا اٹھ جانا پسند کریں گے[1]۔ ابو حازم دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا مجھے زید کی موت کا دن نہ دکھانا۔ ان کے سوا میری ذات اور میرے مذہب کے لئے کوئی پسندیدہ اور نفع بخش باقی نہیں رہا ہے[2]۔

اخلاق : علمی کمالات کے ساتھ زید اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ صالح تابعی تھے[3]۔ ان کو ایک نظر دیکھ لینے سے عبادت کی قوت پیدا ہوتی تھی، ابو حازم کہتے تھے، خدایا تو خوب جانتا ہے کہ میں زید کو اس لئے دیکھتا ہوں کہ ان کو دیکھنے سے تیری عبادت کی طاقت آتی ہے۔ جب ان کی نظر کا یہ اثر ہے تو ان سے ملاقات اور گفتگو کا کیا اثر ہوگا[4]۔

وفات : ۱۳۲ھ میں انتقال کیا۔

(۲۶) سالم بن عبداللہؒ

نام ونسب: سالم نام ہے۔ ابو عمر کنیت۔ حضرت عمرؓ کے نامور فرزند حضرت عبداللہ کے خلف الصدق تھے۔ ددھیال کی طرح ان کا ننھیال بھی روشن وتاباں تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یزدگرد شاہنشاہ ایران کی جولڑکیاں گرفتار ہوئی تھیں، ان میں سے ایک عبداللہ کو دی گئی تھی۔ سالم اسی کے بطن سے تھے، اس طرح ان کی رگوں میں ایران کے شاہی خاندان کا خون بھی شامل تھا[5]۔

فضل وکمال : سالم کے والد حضرت عبداللہؓ ان بزرگوں میں سے تھے جو علم وعمل کا پیکر اور زہد وورع کی تصویر تھے، ان کی تعلیم وتربیت نے انہیں بھی اپنا مثنیٰ بنا دیا تھا، ارباب سیر کا متفقہ بیان ہے کہ عمرؓ کی تمام اولادوں میں سب سے زیادہ ان سے مشابہ عبداللہ تھے، اور عبداللہ کی اولادوں میں ان کے مشابہ سالم تھے[6]۔ اس طرح سالم گویا عمر فاروق کا نقش ثانی تھے۔

ان کا شمار مدینہ کے ان تابعین میں تھا جو اقلیم علم وعمل دونوں کے فرماں روا تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ سالم فقیہ، حجت اور ان مخصوص علماء میں تھے جن کی ذات علم وعمل دونوں کی جامع تھی[7]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۹۶　[2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۸　[3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۰۰
[4] ایضاً　[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۴۳۸　[6] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۵
[7] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۷

امام نووی لکھتے ہیں کہ سالم کی امامت، جلالت، زہد وورع اور علوئے مرتبت پر سب کا اتفاق ہے[۱]۔

تفسیر: تفسیر، حدیث، فقہ جملہ فنون میں ان کو یکساں درک تھا، لیکن شدتِ احتیاط کی وجہ سے قرآن کی تفسیر نہ بیان کرتے تھے[۲]۔ اسی لئے مفسر کی حیثیت سے انہوں نے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل کی۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن عمرؓ حدیث کے رکنِ اعظم تھے۔ سالم نے زیادہ تر انہی کے خرمن سے خوشہ چینی کی تھی، ان کے علاوہ اکابر صحابہ میں ابوہریرۃ، ابوایوبؓ انصاری اور عائشہؓ صدیقہ وغیرہ سے بھی استفادہ کیا تھا[۳]۔ ان بزرگوں کے فیض سے ان کا دامنِ علم نہایت وسیع ہو گیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ سالم ثقہ، کثیر الحدیث اور عالی مرتبہ لوگوں میں تھے[۴]۔

تلامذہ: حدیث میں عمرو بن دینار، امام زہری، موسیٰ بن عقبہ، حمید الطویل، صالح بن کیسان عبید اللہ بن عمرو بن حفص، ابو واقد لیثی، عاصم بن عبیداللہ، عبداللہ بن ابی بکر، اور ابو قلابہ جرمی جیسے اکابر محدثین ان کے تلامذہ میں تھے[۵]۔

فقہ: سالم کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا، اس میں وہ امامت کا درجہ رکھتے تھے، بعض آئمہ جن میں ایک ابن مبارک بھی ہیں ان کو مدینہ کے مشہور سات فقہا میں شمار کرتے تھے[۶]۔ گو ساتویں فقیہ کی تعین میں اختلاف ہے، مختلف اشخاص نے اپنی اپنی نظر وبصیرت کے مطابق مختلف نام لئے ہیں۔ لیکن ہر سال اس زمرہ میں سالم کا نام بھی لیا جاتا ہے ان کے فقہی کمالات کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ مدینہ کی صاحب افتاء جماعت کے وہ ممتاز رکن تھے[۷]۔

زہد وتقویٰ: سالم علم کے ساتھ عمل کے بھی اسی درجہ پر تھے، امام مالک فرماتے تھے کہ سالم کے زمانہ میں ان سے زیادہ زہد وورع میں سلف صالحین سے مشابہ کوئی نہ تھا[۸]۔ امام نووی اور حافظ ذہبی وغیرہ جملہ ارباب سیر ان کے زہد وورع پر متفق البیان ہیں۔

صحت عقیدہ: عقائد میں وہ سلف صالحین کے سادہ اور بے آمیز عقیدہ کے پابند تھے اور بعد میں جو نکتہ آفرینیاں ہوئیں انہیں سخت ناپسند کرتے تھے، چنانچہ قدریوں پر جو قدر کی بنا پر خیر وشر کا عقیدہ رکھتے ہیں لعنت بھیجتے تھے[۹]۔

---

۱ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۷ ۲ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۸ ۳ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۴۳۸ ۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۵ ۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۴۳۷ ۶ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۰۸ ۷ اعلام الموقعین۔ جلد ۱۔ ص ۲۵ ۸ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۷۷ ۹ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۸

رتبیل کے حدود حکومت میں پہنچ کر بہت سے علاقوں کو فتح کرلیا، اور مزید پیش قدمی ایک سال کے لئے روک کر حجاج کو اس کی اطلاع دے دی۔ حجاج رتبیل سے بہت برافروختہ تھا، اس لئے اس نے لکھا کہ یہ آرام کا موقع نہیں ہے، میرا حکم پہنچتے ہی فوراً پیش قدمی شروع کردو، اور اگر تم سے یہ کام نہیں ہوسکتا تو فوج کی کمان اپنے بھتیجے اسحاق کے سپرد کردو۔ ابن اشعث نے مصلحۃً پیش قدمی روکی تھی، اس لئے وہ اس حکم پر بگڑ گیا، اور رتبیل سے مصالحت کر کے حجاج کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا[1]۔

فوج تمام تر عراقی تھی جو حجاج کے مظالم سے پہلے سے برہم تھی، اس لئے اس نے ابن اشعث کا پورا ساتھ دیا اور رفتہ رفتہ حجاج کی مخالفت نے عبدالملک کی مخالفت کی شکل اختیار کرلی۔ ابن جبیر نے بھی ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ ابن اشعث سیستان سے عراق پہنچا، حجاج بھی مقابلہ کے لئے نکلا دونوں میں مہینوں جنگ جاری رہی، اور ابن اشعث نے عراق کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ اس مخالفت میں کوفہ کے بہت سے، علماء اور قراء بھی ابن اشعث کے ساتھ ہوگئے۔

حضرت ابن جبیر اس جماعت کے سرگردہ تھے، اور میدان جنگ میں لوگوں کو حجاج اور بنی امیہ کے خلاف یہ کہہ کر ابھارتے تھے کہ ان کی ظالمانہ حکومت ان کی بے دینی، خدا کے بندوں پر ان کے مظالم، نمازوں میں تاخیر اور مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر پر ان کا مقابلہ کرو[2]۔

لیکن اس جوش مخالفت میں بھی حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا، ایک غلام زبیر قان اسدی کا آقا حجاج کے حامیوں میں تھا۔ غلام مذکور نے ابن جبیر سے پوچھا ایسی حالت میں کہ میرا آقا حجاج کے ساتھ ہے، اگر میں ابن اشعث کے ساتھ ہو جاؤں اور لڑ کر جان دے دوں تو مجھ پر اس کا مواخذہ تو نہ ہوگا، ابن جبیر نے جواب دیا، تم مت لڑو اگر تمہارا آقا یہاں موجود ہوتا تو تم کو لے کر حجاج کی طرف سے لڑتا[3]۔

شکست اور گرفتاری :

اگرچہ ابتداء میں ابن اشعث کی قوت نہایت مضبوط تھی۔ اور اس نے عراق کا بڑا حصہ فتح کرلیا تھا۔ لیکن اس مخالفت میں اس نے حکومت کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اس لئے زیادہ دنوں تک مقابلہ دشوار تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیر جماجم کے معرکہ میں اس کو نہایت فاش شکست ہوئی اس کی قوت بالکل پاش پاش ہوگئی، اور وہ شکست کھا کر سیستان بھاگ گیا۔

---

[1] یہ واقعات ابن کثیر سے ملخصاً ماخوذ ہیں　[2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۵　[3] ایضاً۔ ص ۱۸۲

اس شکست کے بعد ابن جبیر مکہ چلے آئے۔ یہاں کے والی خالد بن عبداللہ قسری نے انہیں گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھجوادیا۔ وہ ان سے خار کھائے ہوئے تھا، اس لئے انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا :

حجاج تمہارا کیا نام ہے۔؟

ابن جبیر سعید بن جبیر۔

حجاج نہیں بلکہ اس کے برعکس شقی بن کسیر۔

ابن جبیر میری ماں تم سے زیادہ میرے نام سے واقف تھی۔

حجاج تمہاری ماں بھی بد بخت تھی اور تم بھی بد بخت ہو۔

ابن جبیر غیب کا علم دوسری ذات کو ہے۔

حجاج میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔

ابن جبیر اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تم کو معبود بنالیتا۔

حجاج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟

ابن جبیر وہ امام ہدی اور نبی رحمت تھے۔

حجاج علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں کیا رائے ہے، وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں۔؟

ابن جبیر اگر میں وہاں گیا ہوتا، اور وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا ہوتا تو بتا سکتا تھا۔
(غیب کے سوال کا میں کیا جواب دے سکتا ہوں)

حجاج خلفاء کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟

ابن جبیر میں ان کا وکیل نہیں ہوں۔

حجاج ان میں سے تم کس کو زیادہ پسند کرتے ہو ؟

ابن جبیر جو میرے خالق کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ تھا۔

حجاج خالق کے نزدیک کون سب سے پسندیدہ تھا ؟

ابن جبیر اس کا علم اس ذات کو ہے جو بھیدوں اور ان کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔

حجاج عبدالملک کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔؟

ابن جبیر تم ایسے شخص کے متعلق کیا پوچھتے ہو، جس کے گناہوں میں سے ایک گناہ تمہارا وجود ہے۔

گوشت بہت کم کھاتے تھے، اور لوگوں کو منع کرتے تھے کہ گوشت کم کھایا کرو اس میں شراب جیسی تیزی ہوتی ہے[۱]۔

لیکن اس غذا کے باوجود جسم نہایت تروشاداب تھا، ایک مرتبہ ہشام نے حج کے موقعہ پر جب کہ لباس میں صرف احرام ہوتا ہے، ان کے جسم کی تازگی دیکھ کر پوچھا ابوعمیر کیا کھاتے ہو انہوں نے کہا روٹی اور روغن زیتون، اس نے کہا یہ غذا کیسے کھائی جاتی ہے فرمایا اسے ڈھک کر رکھ دیتا ہوں جب بھوک معلوم ہوتی ہے اس وقت کھالیتا ہوں[۲]۔

اولاد : اپنے بعد کئی اولادیں یادگار چھوڑیں، عمر، ابوبکر، عبداللہ، عاصم، جعفر، عبدالعزیز، فاطمہ اور حفصہ۔

(۲۷) سعید بن جبیرؒ

نام ونسب : سعید نام، ابوعبداللہ کنیت، بنی والبہ بن حارث اسدی کے غلام تھے، اس نسبت سے وہ والبی کہلاتے تھے، ان کا شماران تابعین میں ہے، جو علم وعمل کے مجمع البحرین تھے۔

فضل وکمال :

حضرت سعید کا آغاز اگرچہ غلامی سے ہوا، لیکن آگے چل کر وہ اقلیم علم کے تاجدار بنے حافظ ذہبی انہیں علمائے اعلام میں لکھتے ہیں[۳]۔ امام نووی کا بیان ہے کہ سعید تابعین کے ائمہ کبار میں تھے، تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت، اور زہد و ورع جملہ کمالات میں وہ کبار آئمہ اور سرگردہ تابعین میں تھے[۴]۔

تعلیم : سعید نے گو اس زمانہ میں ہوش سنبھالا، جب اکابر صحابہ کی بڑی تعداد اٹھ چکی تھی، پھر بھی باقیات صالحات میں عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ ابوسعید خدریؓ ابوہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ اور انس بن مالکؓ وغیرہ علمائے صحابہ موجود تھے، سعید بن جبیر ان کے فیضان علم سے پورے طور سے مستفید ہوئے[۵]۔ خیر الامۃ عبداللہ بن عباس کے خرمن کمال سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ خوشہ چینی کی تھی[۶]۔

۱۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۱۹۸　۲۔ ابن سعد۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸　۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۵
۴۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۱۶　۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۱
۶۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۴

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا حلقہ درس اتنا وسیع اور جامع تھا کہ اس میں قرآن تفسیر، حدیث فقہ، فرائض ادب وانشاء اور شعر وشاعری جملہ علوم وفنون کا دریا بہتا تھا[1]۔ سعید بن جبیر اس بحر بے کراں سے زیادہ سیراب ہوئے۔ وہ نہایت پابندی سے اس حلقہ میں شریک ہوتے تھے۔

ان کے تعلیم حاصل کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ باہر کے سائلین جو سوالات کرتے تھے اور جو مسائل پوچھتے تھے اور ابن عباس ان کے جو جوابات دیتے تھے، سعید خاموشی کے ساتھ ان کو سنا کرتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی کچھ پوچھ لیتے تھے۔ ان سوالات میں حدیثیں بھی ہوتی تھیں اور فقہ کے مسائل بھی ہوتے تھے لیکن انہیں قلمبند کرنے کے بارہ میں ابن عباسؓ کی ممانعت تھی، اس لئے کچھ دنوں تک ابن جبیر بغیر لکھے ہوئے زبانی یاد کرلیا کرتے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر لکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔

چنانچہ انہوں نے لکھنا شروع کردیا تھا۔ بعض بعض دن اس کثرت سے مسائل پیش ہوتے تھے کہ لکھتے لکھتے ابن جبیر کی بیاض پُر ہوجاتی تھی، اور انہیں کپڑوں اور ہتھیاروں پر لکھنے کی نوبت آجاتی تھی، کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا کہ سائل نہ آتا اس دن ایک حدیث بھی لکھنے کی نوبت نہ آتی تھی، اور یوں ہی لوٹ آتے تھے[2]۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بعد انہوں نے ابن عمرؓ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا، ان سے استفادہ کا سلسلہ ابن جبیر کے قیام کوفہ تک جب کہ وہ خود صاحب افتاء ہوگئے تھے، قائم رہا، چنانچہ ان کا خود بیان ہے کہ جب کسی مسئلہ میں علماء کوفہ میں اختلاف ہوتا تھا تو میں اسے لکھ لیتا تھا اور ابن عمرؓ سے پوچھتا تھا[3]۔

ان بزرگوں کے فیض نے انہیں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور فرائض وغیرہ جملہ مذہبی علوم کا دریا بنادیا تھا[4]۔

قرأت :

قرآن کے نہایت اچھے قاری تھے۔ قرأت ترجیع کے ساتھ کرتے تھے، لیکن گا کر قرآن پڑھنا سخت ناپسند کرتے تھے[5]۔ تمام مشہور قرأتوں کے عالم تھے۔ اسمٰعیل بن عبدالملک کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر رمضان میں ہماری امامت کرتے تھے۔

---

[1] مستدرک حاکم۔ جلد ۳ ص ۵۳۸ [2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۹ [3] ایضاً۔ ص ۱۸۰ [4] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۱۶ [5] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۱

معمول تھا کہ ایک شب کو عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق قرآن سناتے تھے، ایک شب کو زید بن ثابت کی قرأت کے مطابق اسی طریقہ سے ہر شب کو باری باری سے تمام مشہور قاریوں کی قرأت سناتے تھے[۱]۔

تفسیر: قرأت اور تفسیر دونوں فنون کی تعلیم انہوں نے اس فن کے امام حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حاصل کی تھی[۲]۔ آیات قرآنی کے شانِ نزول اور ان کی تفسیر و تاویل پر پوری نظر تھی، جب ان کے سامنے قرآن کی کوئی آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ اس کا پورا ماله وما عليه بتادیتے تھے، ابو یونس قزی کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ سعید بن جبیر کے سامنے یہ آیت:

" المستضعفين من الرجال والنساء والولدان "۔

" مگر ناتواں مردوں عورتوں اور لڑکوں میں سے "۔

پڑھی تو انہوں نے کہا، اس میں جن کا تذکرہ ہے وہ مکہ کے کچھ مظلوم تھے، میں نے کہا میں ایسے ہی لوگوں (یعنی حجاج کے ستم رسیدہ) کے پاس آیا ہوں، سعید نے کہا، بھتیجے ہم لوگوں نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی لیکن کیا کیا جائے خدا کی مرضی یہی ہے[۳]۔

حضرت اعمش روایت کرتے ہیں کہ سعید بن جبیر ان ارضي واسعة کی تفسیر میں بیان کرتے تھے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس میں گناہ کیا جائے تو اس سے نکل جاؤ[۴]۔

تفسیر کا درس:

حضرت ابن جبیر تفسیر کا درس بھی دیتے تھے، وقاء بن ایاس بیان کرتے ہیں کہ عزرہ تفسیر کی کتاب (غالباً کاپی اور بیاض) اور دوات لے کر ابن جبیر کے پاس آتے جاتے تھے[۵] لیکن بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفسیر کا قلمبند کرنا ناپسند کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنے لئے آپ سے تفسیر قلمبند کرنے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا تفسیر قلمبند کرنے کے مقابلہ میں مجھے یہ پسند ہے کہ میرا ایک پہلو مفلوج ہو جائے[۶]۔

حدیث: حدیث کے اکابر حفاظ میں تھے، صحابہ میں انہوں نے ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیرؓ، انس بن مالکؓ، ابو سعید خدری، ابو موسیٰ اشعری، ابو ہریرہؓ، ابو مسعود بدریؓ، عائشہ صدیقہؓ اور عدی بن حاتم وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا[۷]۔

---

۱ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۵ ۲ ایضاً۔ ص ۲۰۴ ۳ ابن سعد۔ ص ۱۸۳ ۴ ایضاً ۵ ایضاً۔ ص ۱۸۶
۶ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۵ ۷ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۱

حضرت عبداللہ بن عباس کے حلقہ درس سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ مستفید ہوئے تھے، ان کے علمی استعداد کی وجہ سے عبداللہ بن عباس ان پر بڑی شفقت کرتے تھے، اور ان کی تعلیم میں خصوصیت برتتے تھے۔ ان کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے کبھی کبھی وہ امتحاناً ان سے حدیثیں سنتے تھے۔ مجاہد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے ابن جبیر سے کہا کہ حدیثیں سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا آپ کی موجودگی میں حدیث سناؤں۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ بھی خدا کی نعمت ہے کہ تم میرے سامنے حدیث بیان کرو، اگر صحیح بیان کرو گے تو فبہا اور اگر کہیں غلطی ہوئی تو میں اس کی تصحیح کردوں گا[1]۔

بنی وداعہ کے موذن کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ابن عباس کے پاس گیا۔ وہ حریر کے گدے پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے، اور سعید ان کے پیروں کے پاس بیٹھے تھے۔ ابن عباس ان سے کہہ رہے تھے کہ تم نے مجھ سے بہت سی حدیثیں حفظ کی ہیں، دیکھو ان کو کیسے روایت کرتے ہو[2]۔

ان کی اس توجہ نے ابن جبیر کو حفاظ حدیث کا امام اور سرگروہ بنا دیا تھا ان کی مرویات کا بڑا حصہ ابن عباسؓ کی احادیث پر مشتمل ہے، اس سے حدیث میں ان کے درجہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقہ: فقہاء کی جماعت میں بھی انہیں امتیازی درجہ حاصل تھا[3]۔ اس فن کی تعلیم بھی انہوں نے ابن عباس ہی سے حاصل کی تھی اور اس میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مرکز فقہ کوفہ کے صاحب افتاء تابعین میں ہو گئے تھے[4]۔ کوفہ کے عہدہ قضاء پر بھی کچھ دنوں تک ممتاز رہے۔ پھر ابو بریدہ ابن موسیٰ اشعری قاضی کوفہ کے مشیر ہو گئے تھے[5]۔ مرکز علم و افتاء مکہ میں جب آنا ہوتا تھا، تو یہاں بھی افتا کا سلسلہ جاری رہتا تھا[6]۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے فتووں پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر کوفہ کا کوئی آدمی آپ سے فتویٰ پوچھنے کے لئے آتا تو آپ اس سے فرماتے کیا سعید بن جبیر تمہارے یہاں نہیں ہیں[7]۔ مسائل طلاق کے خصوصیت کے ساتھ بڑے عالم تھے، کان اعلم التابعین بالطلاق سعید بن جبیر[8]۔

فرائض: ریاضی کے بڑے ماہر تھے اس لئے فرائض میں خاص ملکہ تھا، اکابر صحابہ فرائض کے سائلین کو ان کے پاس بھیجتے تھے، ایک مرتبہ ابن عمرؓ کے پاس فرائض کا ایک سائل آیا آپ نے اس سے کہا ابن جبیر کے پاس جاؤ وہ مجھ سے زیادہ حساب جانتے ہیں، وہ تم کو وہی بتائیں گے جو فرض مقرر ہے[9]۔ جب انہیں مدینہ جانے کا اتفاق ہوتا تھا، تو علمائے مدینہ ان سے فرائض سیکھتے تھے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۹ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق ۱۔ ص ۲۱۶ [4] ایضاً
[5] ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۲۰۴ [6] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۴ [7] تہذیب الاسماء۔ ق اول۔ ص ۲۱۶
[8] شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۸ [9] ابن سعد۔ ص ۱۸۰

امام زین العابدین کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر جب ہمارے یہاں سے گزرتے تھے۔ تو ہم لوگ ان سے فرائض اور ان باتوں کو پوچھتے تھے جن سے خدا ہم کو فائدہ پہنچاتا تھا[1]۔

جامعیت : غرض سعید بن جبیر کی ذات جملہ علوم و فنون کی جامع تھی، جو کمالات دوسرے علماء میں فرداً فرداً تھے، وہ ان کی ذات میں تنہا مجتمع تھے، خصیف کا بیان ہے کہ مسائل طلاق کے سب سے بڑے عالم سعید بن مسیب تھے، حج کے عطاء تھے، حلال و حرام کے طاؤس تھے۔ اور تفسیر کے مجاہد تھے، اور ان سب کی جامع سعید بن جبیر کی ذات تھی[2]۔

وہ علم کا ایسا سرچشمہ تھے جس کی اس عہد کے تمام علماء کو احتیاج تھی، میمون بن مہران کا بیان ہے کہ سعید نے ایسے وقت میں انتقال کیا کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ رہا ہو[3]۔

اشاعت علم : علم و فن کا یہ ذخیرہ انہوں نے اپنی ذات تک محدود نہ رکھا، بلکہ جہاں تک ہو سکا اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا، آپ کے بعض کوتاہ نظر اصحاب آپ کو حدیث بیان کرنے پر ملامت کرتے تھے، آپ انہیں جواب دیتے، مجھے تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے حدیث بیان کرنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ میں اسے اپنی قبر میں ساتھ لے جاؤں[4]۔

تلامذہ : آپ کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا، بعضوں کے نام یہ ہیں، آپ کے صاحبزادگان عبدالملک اور عبداللہ، یعلی بن حکیم، یعلی بن مسلم، ابو اسحٰق سبیعی، ابوالزبیر مکی، آدم بن سلیمان اشعث بن ابی الشعثا، ذر بن عبداللہ مرہبی، سالم الافطس سلمہ بن کہیل، طلحہ بن مصرف اور عطاء بن سائب وغیرہ[5]۔

ناقدروں سے بخل :

لیکن یہ علمی فیاضی انہی لوگوں کے لئے تھی، جو اس کے مرتبہ شناس اور قدردان ہوتے تھے۔ ورنہ نااہلوں سے وہ اسے چھپاتے تھے، محمد بن حبیب کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر کے اصفہان کے قیام کے زمانہ میں جب لوگ ان سے حدیثیں پوچھتے تو وہ نہ بتاتے۔ لیکن جب کوفہ آئے تو فیض جاری کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا، ابو محمد کیا بات ہے، اصفہان میں تو آپ حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے، اور کوفہ میں بیان کرتے ہیں۔ جواب دیا اپنی متاع وہاں پیش کرو جہاں اس کے قدرشناس ہوں[6]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۸۰ [2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۵ [3] ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص ۱۸۶ [4] ایضاً
[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۲ [6] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۴

مذہبی کمالات : مذہبی کمالات میں بھی تابعین میں ابن جبیر کا درجہ نہایت بلند تھا، وہ عبادت وریاضت اور زہد وورع کا مجسم پیکر تھے۔

سوزِ قلب وخشیت الٰہی :

ابن جبیر کا دل اتنا پرسوز تھا، اور ان پر خشیت الٰہی کا اتنا غلبہ تھا کہ ہروقت ان کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ پردہ شب کی تاریکی میں جوان کی عبادت اور راز ونیاز کا خاص وقت تھا، زار زار روتے تھے۔ روتے روتے ان کی آنکھوں کی بینائی کم ہوگئی تھی، اور ان سے پانی بہنے لگا تھا[1]۔

نماز میں تاثر اور خشوع :

ان کی نماز تاثر اور خشوع وخضوع کی تصویر ہوتی تھی، کبھی کبھی ایک ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے، پرموعظت آیات کو بار بار دہراتے تھے سعید بن عبید کا بیان ہے کہ میں نے جبیر کو امامت کی حالت میں اس آیت :

" اذا لاغلال فی اعنا قهم والسلا سل یسحبون فی الحمیم "۔ (مومن۔۸)

''جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گئے اور زنجیریں اور وہ کھولتا ہوا پانی پینے کے لئے کھینچے جاتے ہوں گے''۔

کو بار بار دھراتے سنا ہے[2]۔ قسم بن ایوب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کو یہ آیت :

" واتقوا یوما ترجعون فیه الی اللّٰه "۔ (بقرہ۔۳۸)

''اس دن سے ڈرو جس دن خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

بیس مرتبہ سے زیادہ دہراتے سنا ہے[3]۔

ذکر وشغل : صبح صادق سے لے کر نماز فجر تک ذکر وشغل میں مصروف رہتے تھے، اس وقت خدا کے ذکر کے علاوہ کسی سے نہ بولتے تھے[4]۔

رمضان میں عبادت :

رمضان میں ان کی عبادت بہت بڑھ جاتی تھی۔ مغرب سے عشاء تک کا وقت جو عموماً روزہ داروں کے آرام وسکون کا وقت ہوتا ہے۔ تلاوت قرآن میں گزرتا تھا۔ رمضان کے زمانہ میں کبھی کبھی ایک نشست میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے[5]۔ اپنے قبیلہ کی مسجد میں اعتکاف کرتے تھے[6]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۱ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۲۶ ۳؎ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۱
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۱ ۵؎ ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۲۰۵ ۶؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۲

حج: حجوں کی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی، لیکن مختلف روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حج کرتے تھے، اور وفور شوق میں کوفہ ہی سے احرام باندھ کر نکلتے تھے[1]۔ مکہ کے قیام کے زمانہ میں طواف کبھی ناغہ نہ ہوتا تھا، گرفتاری کے زمانہ میں جس کے حالات بعد میں آئیں گے پا بجولاں طواف کرتے تھے[2]۔

تلاوتِ قرآن:

تلاوت قرآن سے خاص شغف تھا۔ عموماً دو رات میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے، سفر اور بیماری کی حالت میں صرف اس معمول میں فرق آتا تھا[3]۔

تحقیرِ نفس:

اپنے نفس کو اس قدر حقیر سمجھتے تھے کہ گنہگاروں کو بھی ان کے گناہوں پر ٹوکتے ہوئے شرماتے تھے، فرماتے تھے کہ میں ایک شخص کو گناہ میں مبتلا دیکھتا ہوں، لیکن خود اپنا نفس اپنی نگاہ میں اتنا حقیر ہے کہ دوسرے کو ٹوکتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے[4]۔

غیبت سے احتراز:

غیبت کرنا اور غیبت سننا دونوں باتیں سخت ناپسند تھیں، مسلم البطین کا بیان ہے، کہ سعید اپنے سامنے کسی کو کسی کی غیبت نہ کرنے دیتے تھے غیبت کرنے والے سے فرماتے کہ جو کچھ تم کو کہنا ہے اس شخص کے منہ پر کہو[5]۔

عبادت کے معنی:

عبادت آپ کے نزدیک محض روزہ نماز اور تسبیح و تہلیل کا نام نہ تھا، بلکہ اس کے ایک خاص معنی اور اس کا ایک جامع مفہوم تھا، آپ کے نزدیک اطاعت سب سے اہم عبادت تھی، فرماتے تھے کہ جو شخص خدا کی اطاعت کرتا ہے، وہ ذاکر ہے، اور جو نافرمانی کرتا ہے وہ ذاکر نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی تسبیح اور تلاوت قرآن کیوں نہ کرے۔

آپ سے کسی نے سوال کیا سب سے بڑا عبادت گزار کون ہے، فرمایا جو شخص گناہوں میں مبتلا ہو کر پھر اس سے تائب ہو گیا، اور جب اس نے اپنے گناہوں کو یاد کیا تو اس کے مقابلہ میں اپنے اعمال کو بے حقیقت سمجھا۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۴　[2] ایضاً　[3] ایضاً　[4] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۱
[5] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۴

علمائے سوء کا خطرہ:

اُمت مسلمہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ علماء سوء کو سمجھتے تھے، ہلال بن خباب نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا، لوگوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی، فرمایا ان کے علماء کے ہاتھوں [1]۔

سیر و سیاحت:

حضرت سعید بن جبیر ایک زمانہ تک مدینہ میں رہے، پھر یہاں سے نکل کر عجم چلے گئے۔ کچھ دنوں عراق کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے، پھر کوفہ میں سکونت اختیار کر لی [2]۔ کوفہ کے زمانہ قیام میں کچھ دنوں عبداللہ بن عتبہ بن مسعود قاضی کوفہ کے کاتب اور کچھ دنوں ابو بردہ بن ابوموسیٰ اشعری کے کاتب رہے [3]۔

حجاج پر اثر: حجاج انہیں بہت مانتا تھا، ان کی بڑی عزت کرتا تھا، اور انہیں جامع کوفہ کا امام مقرر کیا تھا، اور کوفہ کے عہدہ قضاء پر بھی ممتاز کر دیا تھا، لیکن پھر اہل کوفہ کے اس احتجاج پر کہ قاضی کسی عربی النسل کو ہونا چاہئے، ابن جبیر کو علیحدہ کر کے ابو بردہ بن ابوموسیٰ اشعری کو ان کی جگہ مقرر کیا، لیکن ان کو ہدایت کر دی کہ وہ بغیر ابن جبیر کے مشورہ کے کوئی کام نہ کیا کریں گے۔

حجاج کی مخالفت:

لیکن ابن جبیر حجاج کی اس توجہ کے باوجود اس سے مطلق متاثر نہ تھے۔ اور برابر دل میں اس کے مظالم کو برا سمجھتے رہے، چنانچہ جب ابن اشعث نے اس کے خلاف علم مخالفت بلند کیا تو ابن جبیر اس کیساتھ ہو گئے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبدالملک کے زمانہ سیستان کے فرمان روا، رتبیل کی روش باغیانہ ہو چلی تھی اور وہ کبھی کبھی خراج روک لیتا تھا۔ اس لئے حجاج نے عبیداللہ بن ابی بکرہ کو اس کی تنبیہ پر مامور کیا۔ انہوں نے ۷۹ھ میں سیستان پر فوج کشی کی اور بہت دور تک آگے بڑھتے چلے گئے، لیکن غلطی سے پیچھے کی حفاظت کا کوئی سامان نہ کیا۔ اس لئے رتبیل نے ہر طرف سے گھیر کر بڑی سخت شکست دی، اور مسلمانوں کو بڑا مالی اور جانی نقصان اُٹھا کر ناکام واپس آنا پڑا۔

حجاج کو اس شکست کا بڑا غم ہوا۔ اس نے دوبارہ محمد بن عبدالرحمٰن بن اشعث کو چالیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا، اور سعید بن جبیر کو فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے کی خدمت سپرد کی۔ ابن اشعث نے

---

[1] ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۲۰۵ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۳ [3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۵

رتبیل کے حدود حکومت میں پہنچ کر بہت سے علاقوں کو فتح کرلیا، اور مزید پیش قدمی ایک سال کے لئے روک کر حجاج کو اس کی اطلاع دے دی۔ حجاج رتبیل سے بہت برافروختہ تھا، اس لئے اس نے لکھا کہ یہ آرام کا موقع نہیں ہے، میرا حکم پہنچتے ہی فوراً پیش قدمی شروع کردو، اور اگر تم سے یہ کام نہیں ہوسکتا تو فوج کی کمان اپنے بھتیجے اسحاق کے سپرد کردو۔ ابن اشعث نے مصلحۃً پیش قدمی روکی تھی، اس لئے وہ اس حکم پر بگڑ گیا، اور رتبیل سے مصالحت کر کے حجاج کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا[1]۔

فوج تمام تر عراقی تھی جو حجاج کے مظالم سے پہلے سے برہم تھی، اس لئے اس نے ابن اشعث کا پورا ساتھ دیا اور رفتہ رفتہ حجاج کی مخالفت نے عبدالملک کی مخالفت کی شکل اختیار کرلی۔ ابن جبیر نے بھی ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ ابن اشعث سیستان سے عراق پہنچا، حجاج بھی مقابلہ کے لئے نکلا دونوں میں مہینوں جنگ جاری رہی، اور ابن اشعث نے عراق کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ اس مخالفت میں کوفہ کے بہت سے علماء اور قراء بھی ابن اشعث کے ساتھ ہو گئے۔

حضرت ابن جبیر اس جماعت کے سرگروہ تھے، اور میدان جنگ میں لوگوں کو حجاج اور بنی اُمیہ کے خلاف یہ کہہ کر اُبھارتے تھے کہ ان کی ظالمانہ حکومت ان کی بے دینی، خدا کے بندوں پر ان کے مظالم نمازوں میں تاخیر اور مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر پر ان کا مقابلہ کرو[2]۔

لیکن اس جوش مخالفت میں بھی حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا، ایک غلام زبیر قان اسدی کا آقا حجاج کے حامیوں میں تھا۔ غلام مذکور نے ابن جبیر سے پوچھا ایسی حالت میں کہ میرا آقا حجاج کے ساتھ ہے، اگر میں ابن اشعث کے ساتھ ہو جاؤں اور لڑ کر جان دے دوں تو مجھ پر اس کا مواخذہ تو نہ ہوگا، ابن جبیر نے جواب دیا تم مت لڑو اگر تمہارا آقا یہاں موجود ہوتا تو تم کو لے کر حجاج کی طرف سے لڑتا[3]۔

شکست اور گرفتاری :

اگرچہ ابتداء میں ابن اشعث کی قوت نہایت مضبوط تھی۔ اور اس نے عراق کا بڑا حصہ فتح کرلیا تھا۔ لیکن اس مخالفت میں اس نے حکومت کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اس لئے زیادہ دنوں تک مقابلہ دشوار تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیر جماجم کے معرکہ میں اس کو نہایت فاش شکست ہوئی اس کی قوت بالکل پاش پاش ہوگئی، اور وہ شکست کھا کر سیستان بھاگ گیا۔

---

[1] یہ واقعات ابن کثیر سے ملخصاً ماخوذ ہیں [2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۵ [3] ایضاً۔ ص ۱۸۲

اس شکست کے بعد ابن جبیر مکہ چلے آئے۔ یہاں کے والی خالد بن عبداللہ قسری نے انہیں گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ان سے خار کھائے ہوئے تھا، اس لئے انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا:

حجاج — تمہارا کیا نام ہے۔؟

ابن جبیر — سعید بن جبیر۔

حجاج — نہیں بلکہ اس کے برعکس شقی بن کسیر۔

ابن جبیر — میری ماں تم سے زیادہ میرے نام سے واقف تھی۔

حجاج — تمہاری ماں بھی بد بخت تھی اور تم بھی بد بخت ہو۔

ابن جبیر — غیب کا علم دوسری ذات کو ہے۔

حجاج — میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔

ابن جبیر — اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تم کو معبود بنا لیتا۔

حجاج — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟

ابن جبیر — وہ امام ہدی اور نبی رحمت تھے۔

حجاج — علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں کیا رائے ہے، وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں۔؟

ابن جبیر — اگر میں وہاں گیا ہوتا، اور وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا ہوتا تو بتا سکتا تھا۔ (غیب کے سوال کا میں کیا جواب دے سکتا ہوں)

حجاج — خلفاء کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

ابن جبیر — میں ان کا وکیل نہیں ہوں۔

حجاج — ان میں سے تم کس کو زیادہ پسند کرتے ہو؟

ابن جبیر — جو میرے خالق کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ تھا۔

حجاج — خالق کے نزدیک کون سب سے پسندیدہ تھا؟

ابن جبیر — اس کا علم اس ذات کو ہے، جو بھیدوں اور ان کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔

حجاج — عبدالملک کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔؟

ابن جبیر — تم ایسے شخص کے متعلق پوچھتے ہو، جس کے گناہوں میں سے ایک گناہ تمہارا وجود ہے۔

حجاج　　تم ہنستے کیوں نہیں ؟

ابن جبیر　　وہ کس طرح ہنس سکتا ہے، جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، اور مٹی کو آگ کھا جاتی ہے۔

حجاج　　پھر ہم لوگ تفریحی مشاغل سے کیوں ہنستے ہیں؟

ابن جبیر　　سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔

حجاج　　تم نے کبھی تفریح کا سامان دیکھا بھی ہے۔

یہ پوچھ کر حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ اس کا نغمہ سن کر ابن جبیر رو دیئے۔ حجاج نے کہا یہ رونے کا کیا موقع ہے، موسیقی تو ایک تفریح کی چیز ہے۔ ابن جبیر نے جواب دیا نہیں وہ نالۂ غم ہے، بانسری کی پھونک نے مجھے وہ آنے والا بڑا دن یاد دلایا، جس دن صور پھونکا جائے گا اور عود ایک کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے، جو ممکن ہے ناحق کاٹی گئی ہو، اور اس کے تار ان بکریوں کے پٹھوں کے ہیں، جو ان کے ساتھ قیامت کے دن اُٹھائی جائیں گی۔

یہ سن کر حجاج بولا، سعید تمہاری حالت بھی افسوس کے قابل ہے۔ انہوں نے جواب دیا، وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے۔ جو آگ سے نجات دے کر جنت میں داخل کیا گیا۔ اس گفتگو کے بعد پھر مکالمہ شروع ہوگیا :

حجاج　　کیا میں نے تم کو کوفہ کا امام نہیں بنایا تھا؟

ابن جبیر　　ہاں بنایا تھا۔

حجاج　　کیا میں نے تم کو عہدہ قضاء پر نہیں ممتاز کیا۔ اور جب کوفہ والوں نے تمہاری مخالفت کی کہ قاضی عربی النسل ہونا چاہئے تو میں نے ابو بردہ کو قاضی بنایا اور ان کو ہدایت کردی کہ وہ بغیر تمہارے مشورہ کے کوئی کام نہ کریں۔

ابن جبیر　　یہ بھی صحیح ہے۔

حجاج　　کیا میں نے تم کو اپنا ندیم خاص نہیں بنایا حالانکہ وہ سب سرداران عرب تھے۔؟

ابن جبیر　　ہاں یہ بھی درست ہے۔

حجاج　　کیا میں نے تم کو ایک لاکھ کی خطیر رقم حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لئے نہیں دی، اور پھر اس کا کوئی حساب کتاب نہیں مانگا۔؟

ابن جبیر　　ہاں دی۔

حجاج — ان احسانات کے بعد پھر تم کو کس چیز نے میری مخالفت پر آمادہ کیا۔؟

ابن جبیر — میری گردن میں ابن اشعث کی بیعت کا طوق تھا۔

حجاج — ایک دشمن خدا کی بیعت کا اتنا پاس تھا اور امیر المومنین کی بیعت اور خدا کا کوئی پاس نہ تھا، خدا کی قسم میں تم کو قتل کر کے واصل جہنم کئے بغیر اس جگہ سے نہ ہٹوں گا۔ بتاؤ تم کس طرح قتل کیا جانا پسند کرتے ہو۔؟

ابن جبیر — خدا کی قسم تم دنیا میں جس طرح مجھے قتل کرو گے خدا تم کو آخرت میں اسی طرح قتل کرے گا۔

حجاج — کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم کو معاف کر دوں۔

ابن جبیر — اگر تم معاف کر دو گے تو وہ خدا کی جانب سے ہوگا (تمہارا احسان نہ ہوگا)۔

حجاج — تو میں تم کو قتل کر دوں گا۔

ابن جبیر — اللہ تعالیٰ نے میرا ایک وقت مقرر کر دیا ہے، اس وقت تک پہنچنا ضروری ہے، اس کے بعد اگر میرا وقت آ گیا ہے، تو پھر وہ ایک فیصل شدہ امر ہے، اس سے مفر نہیں ہے، اور اگر عافیت مقدر ہے، تو وہ بھی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

قتل کا حکم اور استقلال واستقامت :

اس گفتگو کے بعد حجاج نے جلاد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم سن کر حاضرین میں سے ایک شخص رونے لگا، ابن جبیر نے اس سے پوچھا تم کیوں روتے ہو اس نے کہا آپ کے قتل پر، فرمایا، اس کے لئے رونے کی ضرورت نہیں، یہ واقعہ تو خدا کے علم میں پہلے سے موجود تھا۔ پھر یہ آیت تلاوت کی :

" ما اصاب من مصیبة فی الا رض و لا فی انفسکم الافی کتاب قبل ان نبر اھا" ۔

"تم کو زمین اور اپنی جانوں میں جو مصیبتیں پہنچیں ان کو پیدا کرنے سے پہلے ہم نے لکھ رکھا ہے"۔

مقتل میں جانے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو دیکھنے کے لئے بلایا، وہ بھی آ کر رونے لگے آپ نے ان سے فرمایا تم کیوں روتے ہو، ستاون سال کے بعد تمہارے باپ کی زندگی تھی ہی نہیں، پھر رونے کا کون سا مقام ہے۔

غرض نہایت صبر واستقلال کے ساتھ ہنستے ہوئے مقتل کی طرف چلے حجاج کو اطلاع دی گئی کہ اس وقت بھی ابن جبیر کے لبوں پر ہنسی ہے، اس نے واپس بلا کر پوچھا تم ہنس کس بات پر رہے تھے۔

فرمایا، خدا کے مقابلہ میں تمہاری جرأتوں اور تمہارے مقابلہ میں اس کے حکم پر۔

آخری مشاغل :

یہ سن کر حجاج نے اپنے سامنے ہی قتل کا چمڑا بچھانے کا حکم دیا، اور قتل کا ارشاد دیا، ابن جبیر نے کہا اتنی مہلت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں، حجاج نے کہا اگر مشرق کی سمت رخ کرو تو اجازت مل سکتی ہے، فرمایا کچھ ہرج نہیں۔ اینما تولوا فثم وجه الله، پھر یہ آیت تلاوت کی :

"انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰت والارض حنيفاً وما انا من المشركين"۔ (انعام۔۹)

"میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں نہیں ہوں"۔

حجاج نے حکم دیا سر کے بل جھکا دو، یہ حکم سن کر ابن جبیر نے راہ تسلیم و رضا میں خود سر کو خم کر دیا اور یہ آیت پڑھی۔

"منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى"۔

(طٰہٰ۔۳)

"اس زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے، پھر اسی میں سے تم کو دوبارہ نکالیں گے"۔

اور کلمۂ شہادت پڑھ کر بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ خدایا میرے قتل کے بعد پھر اس کو (حجاج) کسی کے قتل پر قادر نہ کرنا۔

شہادت : جلاد شمشیر برہنہ موجود تھا۔ حجاج کے حکم پر دفعۃً تلوار چمکی اور ایک کشتۂ حق کا سر زمین پر تڑپنے لگا۔ زمین پر گرنے کے بعد زبان سے آخری کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ نکلا۔

ایک تعجب انگیز امر :

اس سلسلہ میں یہ واقعہ لائق ذکر ہے کہ ابن جبیر کے جسم سے عام قتل ہونے والوں سے بہت زیادہ خون نکلا تھا۔ حجاج نے اطبا کو بلا کر اس کا سبب دریافت کیا کہ دوسرے مقتولوں کے جسم سے خون بہت کم نکلتا ہے، اور ان کے جسم سے خون کے فوارے رواں تھے۔ اطباء نے جواب دیا کہ خون روح کے تابع ہے۔ جن لوگوں کو پہلے قتل کیا گیا۔ ان کی روح قتل سے پہلے ہی اس کے حکم ہی سے تحلیل

ہو چکی تھی، اور ابن جبیر کی روح پر اس کا کوئی اثر نہ تھا[1]۔ یہ واقعہ شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا، اس وقت ابن جبیر کی عمر باختلاف روایت۔ ۵۰ یا ۴۹ سال کی تھی۔

حسن بصری پر اثر :

حضرت سعید بن جبیر کی شخصیت ایسی تھی کہ تمام اکابر تابعین اس واقعہ سے سخت متاثر ہوئے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا، خدایا ثقیف کے فاسق (حجاج) سے اس کا انتقام لے۔ خدا کی قسم اگر سارے روئے زمین کے باشندے بھی ان کے قتل میں شریک ہوتے۔ تو خدا ان سب کو منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیتا[2]۔

حلیہ : حلیہ یہ تھا، رنگ سیاہ، سر اور داڑھی دونوں سپید، خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے، کسی نے وسمہ کے خضاب کے بارے میں پوچھا، فرمایا خدا تو بندہ کے چہرے کو نور سے روشن کرتا تھا، اور بندہ اس کو سیاہی سے بجھا دیتا ہے[3]۔

حجاج کا انجام :

حضرت سعید کی بددعا بے اثر نہ رہی، ان کا خون ناحق رنگ لایا۔ چنانچہ ان کے مقتول ہونے کے بعد ہی حجاج سخت دماغی امراض اور توہم میں مبتلا ہو کر چند ہی دنوں کے بعد بستر مرگ پر لیٹ گیا۔ بیماری کی حالت میں اس کو بے ہوشی کے دورے ہوتے تھے۔ بے ہوشی اور غنودگی کی حالت میں اسے نظر آتا تھا کہ ابن جبیر اپنے کپڑے سمیٹے ہوئے اس سے پوچھ رہے ہیں کہ دشمن خدا تو نے مجھے کس جرم میں قتل کیا؟ یہ خواب پریشان دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا تھا، اور کہتا تھا، مجھے سعید سے کیا واسطہ۔ اسی مجنونانہ حالت میں ۹۵ھ میں مر گیا۔ اس طرح ابن جبیر کے قتل کے بعد اسے دوسرے آدمیوں کے قتل کرنے کا موقع نہ مل سکا[4]۔

حجاج کی موت کے بعد اس کو ایک شخص نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا خدا نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے کہا ہر ہر مقتول کے بدلہ میں مجھے ایک ایک مرتبہ قتل کیا گیا اور ابن جبیر کے انتقام میں ستر مرتبہ[5]۔

---

[1] یہ تمام حالات ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۵۔ ص ۲۰۶، و شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹۔ ص ۱۱۰۔ اور ابن سعد۔ جلد ۶۔ صص ۱۸۴۔ ص ۱۸۵۔ کی مختلف روایات میں غیر مرتب طور سے ہیں، ہم نے انہیں سلسلہ وار کر دیا۔

[2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۶ [3] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۸۶ [4] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۶ [5] ایضاً

(۲۸) سعید بن مسیّبؒ

نام ونسب: سعید نام ہے۔ابو محمد کنیت۔نسب نامہ یہ ہے،سعید بن مسیّب بن حزن بن ابی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب قرشی مخزومی ان کی ماں قبیلہ اسلم سے تھیں،نانہالی شجرہ یہ ہے،ام سعید بنت حکم بن امیہ بن حارثہ بن الاوقص اسلمی۔

حضرت ابن مسیّب بڑے جلیل القدر تابعی اور ان نفوس قدسیہ میں تھے،جو اپنے علم وعمل کے اعتبار سے ساری دنیائے اسلام کے امام اور مقتدی مانے جاتے تھے۔ان کے والد مسیّب اور دادا حزن دونوں صحابی تھے۔فتح مکہ کے دن مشرف بااسلام ہوئے تھے۔

آنحضرت ﷺ ایسے ناموں کو جن کے معنی میں رائی کا پہلو نکلتا ہو پسند نہ فرماتے تھے،اس لئے حزن کا نام جس کے معنی غم کے ہیں بدل کر سہیل رکھنا چاہا،لیکن حزن نے جن میں اس وقت تک قدامت پرستی کا جذبہ باقی تھا،یہ عذر کیا کہ یارسول اللہ یہ نام والدین کا رکھا ہوا ہے،اور اس نام سے مشہور بھی ہو چکا ہوں،اس لئے اس کو نہ بدلئے۔ان کے عذر پر آنحضرت ﷺ نے رہنے دیا،لیکن اس نام کی نحوست کا یہ اثر تھا کہ سعید بن مسیّب کا بیان ہے کہ ہمارے گھر میں ہمیشہ غمگینی چھائی رہی[1]۔

پیدائش: باختلاف روایت ۲؁ھ یا ۴؁ھ جلوس عمری میں سعید بن مسیّب پیدا ہوئے ایک بیان یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات سے دوسال پہلے تولد ہوئے،لیکن پہلی روایت زیادہ معتبر ہے[2]۔

عہدِ معاویہ: ابن مسیّب خلافت راشدہ کے آخری دور میں بالکل کم سن تھے،اس لئے اس عہد کا ان کا کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں ہے،امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی وہ عملی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتے بعض روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحصیل علم سے فارغ ہوکر مسند علم وافتا کی زینت بن چکے تھے[3]۔

ابنِ زبیر کی بیعت سے اختلاف:

حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانہ سے ان کے حالات کا پتا چلتا ہے اور اس کا آغاز ان کی حق گوئی سے ہوتا ہے وہ ایسے حق گو اور حق پرست تھے کہ خلفاء اور سلاطین کے مقابلہ میں بھی ان کی زبان خاموش

---

[1] ابن سعد۔جلد ۵۔ص ۸۸ [2] ابن سعد۔جلد ۵۔ص ۸۹ [3] ایضاً۔ص ۹۰

نہ رہتی تھی۔ چنانچہ ان کی تاریخ کا آغاز ہی خلفاء کے ساتھ اختلاف سے ہوتا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے جب خلافت کا دعویٰ کیا اور جابر بن اسود عامل مدینہ سے ان کی بیعت لینے کو آیا تو ابن مسیب نے اختلاف کیا اور کہا جب تک تمام مسلمانوں کا کسی شخص پر اتفاق نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنی چاہئے[1]۔

کوڑوں کے مقابلہ میں اعلانِ حق:

ابن مسیب مدینہ کے ممتاز ترین بزرگ تھے۔ ان کی مخالفت کے معنی یہ تھے کہ مدینہ سے ایک ہاتھ بھی بیعت کے لئے نہ بڑھتا، اس لئے جابر نے حکومت کے گھمنڈ میں آپ کو کوڑوں سے پٹوایا، لیکن آپ کی حق گو زبان جبر وتشدد سے رکنے والی نہ تھی۔ چنانچہ وہ عین سزا کی حالت میں بھی اعلان حق کرتی رہی۔

جابر کے چار بیویاں تھیں ایک کو اس نے طلاق دے کر عدت گزرنے سے پہلے پانچویں شادی کر لی تھی، جو صریحاً حرام ہے۔ چنانچہ ٹھیک اس وقت جب ان پر کوڑے برس رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم سنانے سے مجھے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ خدا فرماتا ہے، انکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و رُبعٰ اور تو نے چوتھی کی عدت ختم ہونے سے قبل پانچویں عورت سے شادی کر لی جو تیرے دل میں آئے کر گزر عنقریب تجھ پر برا وقت آنے والا ہے۔
اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ قتل ہو گئے[2]۔ ابن زبیرؓ کو اپنے مقتول ہونے سے پہلے ابن مسیب کے ساتھ جابر کی اس گستاخی کا علم ہو چکا تھا، وہ ان کے مرتبہ شناس تھے، اس لئے انہوں نے جابر کو خط لکھ کر سخت تنبیہ کی اور لکھا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرو[3]۔

عبدالملک سے اختلاف:

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بعد عبدالملک خلیفہ ہوئے، اس کے ساتھ بھی ابن مسیب کا اختلاف قائم رہا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اموی حکومت کا بانی اور مجدد مروان بن حکم اپنے بعد علی الترتیب عبدالملک اور اس کے بعد اس کے بھائی عبدالعزیز کو خلیفہ بنا گیا تھا۔ مروان کے بعد عبدالملک کی نیت میں فتور پیدا ہوا، اس نے عبدالعزیز کو ولی عہد سے خارج کر کے اپنے لڑکوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنانا چاہا، لیکن پھر قبیصہ بن ذویب کے سمجھانے سے کہ اس میں آپ کی بڑی بدنامی ہے، رک گیا، عبدالملک کی خوش قسمتی سے چند ہی دنوں بعد عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا[4]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد۵۔ ص۹۰　[2] ابن سعد۔ جلد۵۔ ص۹۱　[3] ایضاً ص۹۰　[4] ابن اثیر۔ جلد۴۔ ص۴۰۹

عبدالعزیز کے انتقال کے بعد عبدالملک کے لئے میدان بالکل صاف ہوگیا، اور اس نے ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنا کر ان کی بیعت کے لئے صوبہ داروں کے نام فرمان جاری کر دیئے، چنانچہ ہشام بن اسمٰعیل والی مدینہ نے اہل مدینہ سے بیعت لے کر سعید بن مسیب کو بلایا۔ انہوں نے کہا میں بغیر سوچے سمجھے بیعت نہیں کرسکتا، ایک بیان یہ ہے کہ انہوں نے جواب یہ دیا کہ میں عبدالملک کی زندگی میں دوسری بیعت نہیں کرسکتا[1]۔

کوڑوں کی مار اور قید کی سزا :

ان کے اس جواب پر ہشام نے انہیں کوڑوں سے پٹوایا، اور تشہیر کرتے ہوئے راس الثنیہ تک جہاں مجرموں کو سولی دی جاتی تھی، بھیجا، سعید بن مسیب سولی کے لئے تیار ہو گئے تھے، چنانچہ سولی کے وقت ستر کھل جانے کے خیال سے جانگھیا پہن لی تھی، راس الثنیہ لے جانے کا منشا غالباً محض تخویف تھا، اس لئے وہاں لے جا کر واپس لے آئے، ابن مسیب نے پوچھا۔ اب کہاں لئے جاتے ہو؟ جواب ملا قید خانہ چنانچہ واپس لا کر قید کر دیئے گئے، اور ہشام نے اپنی اس کارگزاری کی اطلاع بارگاہ خلافت بھجوا دی[2]۔

استقلال : قید خانہ میں انہیں سمجھا بجھا کر رام کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ ابوبکر بن عبدالرحمن نے ان سے مل کر کہا سعید تم بالکل سٹھیا گئے ہو، انہوں نے جواب دیا ابوبکر خدا سے ڈرو اور اس کو اب قوتوں سے بڑھ کر سمجھو، ابوبکر برابر یہی کرتے رہے کہ تم تو اور زیادہ سٹھیا گئے ہو کسی طرح نرم ہی نہیں پڑتے، آخر میں ابن مسیب نے جواب دیا خدا کی قسم تمہارے دل اور آنکھ دونوں کی روشنی جاتی رہی ہے، یہ جواب سن کر ابوبکر واپس چلے گئے، ہشام نے پچھوا بھیجا کہ سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے۔ ابوبکر نے جواب دیا تمہارے اس سلوک کے بعد سے خدا کی قسم وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں، اب اپنا ہاتھ روک لو[3]۔

رہائی : قبیصہ بن ذویب عبدالملک کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ تمام شاہی ڈاک پہلے ان کے پاس آتی تھی۔ یہ پڑھنے کے بعد اس کو عبدالملک کے سامنے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ہشام کا خط بھی جس میں اس نے عبدالملک کو اپنی کارگزاریوں کی اطلاع دی تھی، پہلے قبیصہ کے ہاتھ میں پڑا۔ یہ بڑے عاقبت اندیش، مصلحت شناس، اور سعید بن مسیب کے مرتبہ شناس تھے اس لئے ہشام کی کارگزاری پڑھ کر بہت برہم ہوئے اور اسی وقت عبدالملک کے پاس خط لے جا کر کہا امیر المومنین ہشام خود رائی سے

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۲ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۲ [3] ایضاً۔ ص ۹۳

جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ ابن مسیب کو اس طرح مارتا اور ان کی تشہیر کرتا ہے۔ خدا کی قسم وہ اس تشدد اور مار سے اور زیادہ سخت ہو جائیں گے، اگر وہ بیعت نہ کریں تب بھی ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جن سے رخنہ اندازی یا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا خطرہ ہو۔ وہ اہل سنت والجماعت میں ہیں۔ آپ خود سعید کو اس کی معذرت لکھئے۔

عبدالملک نے کہا تم ہی اپنی طرف سے لکھ دو اور یہ ظاہر کردو کہ ہشام نے میرے منشاء کے خلاف یہ کاروائی خود کی ہے۔ چنانچہ قبیصہ نے اسی وقت ابن مسیب کو خط لکھ دیا۔ انہوں نے اسے پڑھ کر کہا کہ جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے، اس کے اور میرے درمیان خدا ہے۔[1]

ابن مسیب کو خط بھجوانے کے بعد عبدالملک نے ہشام کو بھی ایک تنبیہ اور ملامت آمیز خط بھیجا اور لکھا کہ خدا کی قسم ابن مسیب مارے جانے کے بجائے صلح رحم کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ ان سے کسی مخالفت اور تفرقہ کا خطرہ نہیں ہے۔[2] یہ خط پڑھ کر ہشام سخت نادم اور شرمسار ہوا اور ابن مسیب کو رہا کر دیا۔[3]

ولید کا زمانہ : ولید کے ساتھ ابن مسیب کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی، لیکن جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا، کہ انہوں نے کبھی اس کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا۔

حجاج کا طرز عمل :

یہ عجیب حیرت انگیز بات ہے کہ اموی خلفاء کے مقابلہ میں اس بے نیازی اور خودداری کے باوجود حجاج نے جو ہر شخص کا جو امویوں کا بندہ فرمان نہ ہو سخت دشمن تھا۔ ابن مسیب کے ساتھ کوئی بد سلوکی نہیں کی، لوگوں کو اس پر سخت حیرت تھی، چنانچہ بعض آدمیوں نے ابن مسیب سے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے کہ حجاج نہ آپ کے پاس کسی کو بھیجتا ہے، نہ آپ کو اپنی جگہ سے ہٹاتا ہے۔ نہ کوئی تکلیف پہنچاتا ہے۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے خود اس کا سبب نہیں معلوم، ایک واقعہ البتہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، ایک مرتبہ وہ اپنے والد کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، اور رکوع اور سجدہ ٹھیک نہیں کرتا تھا۔ میں نے تنبیہ کے لئے ایک مٹھی کنکریاں اس پر ماری تھیں، لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد سے اس کی نماز درست ہوگئی۔[4]

وفات : ولید ہی کے عہد ۹۴ھ میں سعید بن مسیب مرض الموت میں مبتلا ہوئے دم آخرت اپنے صاحبزادے محمد کو بلا کر تجہیز و تکفین وغیرہ کے متعلق وصیت کی کہ جنازہ پر سرخ چادر نہ اڑھائی جائے،

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۳ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۹۴ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۵

جنازہ کے پیچھے آگ نہ لے جائی جائے۔ ایسے بین کرنے والے ساتھ نہ ہوں جو وہ اوصاف بیان کریں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ کسی کو جنازہ اٹھنے کی اطلاع نہ دی جائے، صرف چار آدمی اُٹھانے کے لئے کافی ہیں۔ قبر پر خیمہ نہ لگایا جائے۔

احتضار کی حالت میں نافع بن جبیر نے محمد سے کہا کہ بستر کو قبلہ رخ کردو، ابن مسیب نے سن کر کہا اس کی ضرورت نہیں، میں اسی (قبلہ) پر پیدا ہوا ہوں، اسی پر مروں گا، اور انشاءاللہ تعالیٰ قیامت میں اسی پر اٹھوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد غشی طاری ہوگئی، اس وقت نافع نے بستر کو قبلہ رخ کردیا، ابن مسیب کو ہوش آیا، تو پوچھا بستر کو کس نے پھیرا، کسی کو جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی لیکن ہوش کی حالت میں نافع کو کہتے سن چکے تھے، اس لئے خود ہی جواب دیا کہ نافع نے کیا ہوگا، پھر فرمایا اگر میں مسلمان ہوں تو خواہ کسی سمت مروں قبلہ ہی کی جانب رخ رہے گا، اور اگر ملت اسلام پر نہیں ہوں اور دل قبلہ کی جانب نہیں ہے تو پھر رخ کو قبلہ کی طرف پھیرنے سے کوئی فائدہ نہیں، میں مسلمان ہوں جس سمت بھی رخ ہو قبلہ ہی کی طرف ہوگا۔ اینما تولوا فثم وجه الله۔

وفات کے وقت آلائش دنیا سے کچھ دینار پاس تھے، ان کے متعلق بارگاہ ایزدی میں معذرت کی، خدایا تو خوب جانتا ہے کہ میں نے ان کو محض اپنی آبرو اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

اسی مرض میں ۹۴ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ۷۵ سال کا سن شریف تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سال بہت بڑے بڑے فقہاء کا انتقال ہوا۔ اسی لئے اس سن کو سنة الفقهاء کہا جاتا تھا[1]۔

فضل وکمال:

سعید بن مسیب کو ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے، جب رسالت کا مقدس دور ختم ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی اس بہار کو گزرے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا، مدینہ کی گلی گلی عہد رسالت کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی، دوچار کے سوا اکثر اکابر صحابہ جو علوم نبوی کے وارث تھے مدینۃ العلم کے زیب مسند تھے، ابن مسیب کا علم کا فطری ذوق تھا، اس لئے ان بزرگوں کے فیض نے انہیں علم و عمل کا مجمع البحرین بنادیا، وہ بالاتفاق اپنے زمانہ میں علم و عمل اور جملہ علمی اور اخلاقی فضائل وکمالات میں یگانہ ویکتا تھے، امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت وجلالت، علمی فضیلت اور جملہ اعمال خیر میں ان کے

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۵، ۱۰۶

معاصرین پر ان کے تفوق اور برتری پر تمام علماء کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں تمام اہل مدینہ کے سردار تھے[1]۔ حافظ ذہبی ان کو امام شیخ الاسلام اور اجلہ تابعین میں لکھتے ہیں[2]۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، تفسیر، فقہ زہد وورع اور عبادت جملہ علمی اور عملی کمالات جمع تھے[3]۔

تفسیر قرآن:

جیسا کہ عماد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن میں بھی ان کو پورا کمال حاصل تھا، لیکن قرآن میں شدت احتیاط کی وجہ سے انہوں نے بحیثیت مفسر کوئی شہرت نہیں حاصل کی، قرآن کی تفسیر میں وہ اتنے محتاط اور متشدد تھے کہ آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل میں کبھی لب کشائی نہ کرتے تھے، جب ان سے کچھ پوچھا جاتا تو جواب دیتے کہ میں قرآن کے بارہ میں کچھ نہ کہوں گا[4]۔ اسی احتیاط کی وجہ سے ان کی قرآنی مہارت ظاہر نہ ہوسکی۔

حدیث: حدیث رسول کا انہیں خاص ذوق تھا۔ ایک ایک حدیث کے لئے وہ کئی کئی رات اور کئی کئی دن کا سفر کرتے تھے[5]۔ ایک طرف ان کا یہ ذوق تھا، دوسری طرف ان کا مولد ومنشا یعنی مدینۃ الرسول اکابر صحابہ سے جو علم حدیث کے اساطین تھے معمور تھا اور حضرت عثمانؓ، علیؓ، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، ابن عباس، ابن عمرو بن العاص، زید بن ثابتؓ، حسان ابن ثابتؓ ابوموسیٰ اشعریؓ ابودرداءؓ انصاری، ابوذر غفاری، ابوقتادہ انصاریؓ، حکیم حزامؓ، جبیر بن مطعمؓ، عبداللہ بن زبیر، صفوان بن امیہ، مسور بن مخرمہ جابر بن عبداللہؓ، ابوسعید خدریؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، معمر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن زید حارثی، عتابؓ بن اسید، عثمان ابی العاصؓ وغیرہ صحابہ کرام کی بڑی جماعت موجود تھی۔

ابن مسیب نے ان تمام خرمنوں سے خوشہ چینی کی۔ مشہور حافظ حدیث صحابی حضرت ابوہریرہؓ ان کے خسر تھے، اس تعلق سے ان خصوصیت کے ساتھ زیادہ فیض یاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی مرویات کا بڑا حصہ ابوہریرہ ہی کی احادیث پر مشتمل ہے[6]۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک مرتبہ جو بات کانوں میں پڑ جاتی تھی، وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتی تھی[7]۔ اس حافظہ اور ذوق نے حدیث میں سعید بن مسیب کا دامن علم نہایت وسیع کردیا تھا۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۲۰ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۶ [3] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲ [4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۱ [5] ایضاً۔ ص ۸۹ [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۴۔ وتہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۱۔ ص ۲۲۰ [7] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۰

علماء کا اعتراف :

ان کے عہد کے تمام علماء ان کے کمال حفظ حدیث کے معترف تھے۔ مکحول جو خود بڑے امام اور محدث تھے کہتے تھے کہ میں نے علم کی تلاش میں ساری دنیا کا سفر کیا، لیکن سعید بن مسیب جیسا عالم کوئی نہیں ملا[1]۔ امام زین العابدین فرماتے تھے کہ سعید بن مسیب گذشتہ آثار کے سب سے بڑے واقف کار تھے[2]۔ علی بن مدائنی کہتے ہیں کہ تابعین کی جماعت میں سعید بن مسیب سے زیادہ وسیع العلم کسی کو نہیں جانتا[3]۔

روایات کا پایہ : محدثین اور ارباب فن کے نزدیک ان کی مرویات کا پایا اتنا بلند تھا کہ امام احمد بن حنبل وغیرہ ان کی مرسلات کو بھی صحاح کا درجہ دیتے تھے[4]۔ امام شافعی فرماتے تھے کہ سعید کی مسیب ہمارے نزدیک حسن ہیں[5]۔ اگرچہ حضرت عمرؓ سے سعید کا سماع ثابت نہیں ہے، لیکن امام احمد ان سے بھی ان کی روایت کو حجت سمجھتے تھے[6]۔ یحییٰ بن معین ان کی مرسلات کو حسن بصری کی مرسلات پر ترجیح دیتے تھے[7]۔ علی بن مدائنی کہتے تھے کہ کسی مسئلہ میں سعید بن مسیب کا صرف یہ کہہ دینا کہ اس بارہ میں سنت موجود ہے۔ کافی ہے[8]۔

فقہ : سعید بن مسیب کا خاص فن فقہ تھا، وہ اس عہد کے مدینہ کے ان سات مشہور فقہاء میں سے تھے، جو اس فن کے امام مانے جاتے تھے[9]۔ اور ان میں بھی بلکہ پوری جماعت تابعین میں ابن مسیب کا پایہ سب سے بلند تھا، ابن حبان کا بیان ہے، کہ سعید بن مسیب اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار اور فتویٰ میں ان سب پر فائق تھے۔ ان کو فقیہ الفقہاء کہا جاتا تھا۔ قتادہ کہتے تھے کہ میں نے ابن مسیب سے زیادہ حلال وحرام کا جاننے والا نہیں دیکھا۔ سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ سعید بن مسیب افقہ التابعین تھے[10]۔ باہر کے جو طالبین فقہ مدینہ آتے تھے، انہیں سیدھے ان کا گھر بتادیا جاتا تھا۔ میمون ابن مہران کا بیان ہے کہ میں جب مدینہ گیا اور وہاں کے سب سے بڑے فقیہ کا پوچھا تو لوگوں نے سعید بن مسیب کے گھر پہنچادیا[11]۔

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ عبادلہ اربعہ یعنی عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے بعد دنیائے اسلام میں فقہ کی مسند موالی کے

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۲۰　[2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۰　[3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۱ اول۔ ص ۲۲۰　[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۷　[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۶
[6] ایضاً۔ ص ۸۵　[7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۶　[8] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق ۱۔ ص ۲۲۰
[9] اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۵　[10] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۲۰　[11] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۰

قبضہ میں آ گئی تھی، مکہ کے فقیہہ عطاء تھے۔ یمن کے طاؤس یمامہ کے یحییٰ بن ابی کثیر، بصرہ کے حسن بصری، کوفہ کے ابراہیم نخعی شام کے مکحول، اور خراسان کے عطاء خراسانی، صرف مدینہ کی مسند ایک قرشی یعنی سعید بن مسیب کے حصہ میں رہی[1]۔

شیخین کے فیصلوں سے واقفیت:

اگر چہ سعید بن مسیب نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ نہیں پایا، عہد فاروقی میں بہت صغیر السن تھے، لیکن تلاش و جستجو سے وہ آنحضرت ﷺ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کے سب سے بڑے واقف کار بن گئے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اب مجھ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمرؓ کے فیصلوں کا جاننے والا کوئی نہیں ہے، حضرت عمرؓ کے فیصلوں سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ واقفیت رکھتے تھے، اسی لئے وہ روایہ عمر، کہلاتے تھے[2]۔

حضرت عمرؓ کے احکام اور فیصلوں کے بارہ میں ان کا علم اتنا وسیع تھا کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ تک جو خود حبر الامۃ تھے اپنے والد بزرگوار کے بعض حالات کے متعلق ان سے معلومات حاصل کرتے تھے[3]۔

فقہ میں حضرت عمرؓ کا مرتبہ محتاج بیان نہیں، آپ کے زمانہ میں صدہا نئے مسائل پیدا ہوئے آپ نے ان جدید مسائل کے متعلق قوانین بتائے اور فیصلے دیئے، یہ سارا ذخیرہ معلومات ابن مسیب کے حصہ میں آیا، حضرت عثمانؓ کے فیصلوں سے بھی واقفیت تھی[4]۔

صحابہ کا اعتراف:

یہ خصوصیت و جامعیت تابعی کیا کسی صحابی میں بھی مشکل سے نکل سکتی تھی اسی لئے وہ عہد صحابہ ہی میں صاحب افتاء ہو گئے تھے[5]۔ اور بڑے بڑے صحابہ ان کی اس اہلیت کو تسلیم کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے واللہ وہ مفتیوں میں سے ایک ہیں[6] کبھی کبھی سائلین کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے اس سے کہا سعید بن مسیب کے پاس جاؤ اور وہ جو جواب دیں وہ مجھے بھی آ کر بتانا، اس نے اس حکم کی تعمیل کی، ابن عمرؓ نے جواب سن کر فرمایا میں تم لوگوں سے نہیں کہتا ہوں کہ وہ علماء میں ہیں[7]۔

---

[1] شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۳ [2] شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۸۹ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۶
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۹ [5] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۹ [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۴
[7] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۶

اکابر علماء اور تابعین کا اعتراف واستفادہ :

اس عہد کے تمام بڑے بڑے علماء اور اکابر تابعین ان کے کمالات کے اتنے معترف تھے کہ مشکل مسائل میں وہ خود ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور دوسروں کو ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے، حضرت حسن بصری جیسے بزرگ کو جب کسی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تھا تو وہ ان کے پاس لکھ بھیجتے تھے[1]۔

امام ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ عبداللہ بن ثعلبہ نے مجھ کو ہدایت کی تھی کہ اگر تم فقہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس شیخ (سعید بن مسیب) کا دامن پکڑو[2]۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز بغیر ان سے پوچھے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، اور ان کا اتنا احترام کرتے تھے، کہ انہیں اپنے پاس بلانے کی زحمت نہ دیتے تھے، بلکہ آدمی کے ذریعہ سے پچھوا بھیجتے تھے، فرماتے تھے کہ مدینہ میں کوئی عالم ایسا نہ تھا جو اپنے علم کو لے کر خود میرے پاس نہ آیا ہو، لیکن ابن مسیب کا علم میرے پاس لایا جاتا تھا[3]۔

ایک مرتبہ ایک شخص کو ابن مسیب کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے بھیجا، وہ پوچھنے کے بجائے انہیں بلا لے گیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے انہیں دیکھ کر فرمایا، اس نے غلطی سے آپ کو تکلیف دی میں نے تو صرف پوچھنے کے لئے بھیجا تھا[4]۔

تلامذہ : ابن مسیب کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا، بعض مشہور اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں، سالم بن عبداللہ بن عمر، زہری، قتادہ، شریک بن ابی نمیر۔ ابوالزناد، سعد بن ابراہیم، عمرو بن مرہ، یحییٰ بن سعید انصاری۔ داؤد بن ابی ہند۔ طارق بن عبدالرحمٰن۔ عبدالحمید بن جبیر، شعبہ عبدالخالق بن سلمہ، عبدالمجید بن سہیل۔ عمرو بن مسلم، امام باقر، ابن منکدر، ہاشم بن ہاشم بن عتبہ اور یونس بن یوسف وغیرہ[5]۔

ذوق سخن : سعید بن مسیب اگرچہ خالص مذہبی بزرگ تھے، اس کے باوجود ان کو شعر وسخن کا بھی مذاق تھا، وہ اسے خلاف تقویٰ نہیں سمجھتے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ عراق میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو شعر وشاعری کو برا سمجھتے ہیں، فرمایا ان لوگوں نے عجمی تشقف اختیار کر لیا ہے[6]۔ آپ خود تو شعر نہیں کہتے تھے، لیکن شعر سننا پسند کرتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۷　[2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۴　[3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۰
[4] ایضاً　[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۵　[6] کتاب العمدہ ابن رشیق۔ ص ۱۱

تعبیر خواب: آپ کے صحیفۂ کمال کا ایک نمایاں باب تعبیر خواب بھی ہے، آپ کو اس سے فطری مناسبت تھی، اس فن کو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماء سے سیکھا تھا۔ جنہوں نے اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیا تھا[1]۔

آپ کی تعبیروں کی بڑی شہرت تھی، اور بکثرت لوگ آپ کے پاس تعبیر لینے کے لئے آتے تھے، جب کوئی شخص آتا اور تعبیر کے لئے خواب بیان کرتا، تو آپ تفاولاً پہلے فرماتے کہ تم نے اچھی بات دیکھی[2]۔ اس موقع پر ہم یہاں چند خواب اور ان کی تعبیریں نقل کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالملک کی جنگ کے زمانہ میں ایک شخص نے آپ سے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ عبدالملک کو میں نے چت لٹا کر پھر منہ کے بل کر کے ان کی پیٹھ میں چار میخیں ٹھونک دی ہیں، یہ خواب سن کر انہوں نے اس شخص سے کہا تم نے خود یہ خواب نہیں دیکھا ہے، اس نے کہا نہیں میں نے ہی دیکھا ہے، سعید نے کہا اگر تم صحیح نہیں بیان کرتے تو میں خود بتائے دیتا ہوں، ان کے اس کہنے پر اس شخص نے اقرار کیا کہ میں نے نہیں بلکہ ابن زبیرؓ نے دیکھا ہے، اور مجھے آپ کے پاس تعبیر کے لئے بھیجا ہے، فرمایا اگر تم نے خواب صحیح بیان کیا ہے تو عبدالملک ابن زبیر کو قتل کردے گا۔ اور اس کی صلب سے چار خلیفہ ہوں گے۔

ایک اور شخص نے خواب دیکھا کہ عبدالملک نے چار مرتبہ مسجد نبوی کے سامنے پیشاب کیا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب نے اس کی یہ تعبیر دی کہ عبدالملک کی صلب سے چار خلیفہ ہوں گے، ان دونوں خوابوں کی تعبیر بالکل صحیح نکلی، ابن زبیرؓ عبدالملک کے مقابلہ میں مقتول ہوئے۔ اور عبدالملک کے چار لڑکے خلیفہ ہوئے۔ ولید، سلیمان، یزید ثانی، اور ہشام۔

حضرت شریک بن نمیر نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ میرے دانت میرے ہاتھوں میں گر گئے ہیں، اور میں نے انہیں دفن کردیا، ابن مسیب نے اس کی تعبیر دی کہ تم اپنے خاندان کے اپنے ہم سنوں کو دفن کرو گے۔

ایک اور شخص نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ اپنے ہاتھ میں پیشاب کر رہا ہوں، سعید نے تعبیر دی کہ تمہاری بیوی تمہاری محرم ہے، تحقیقات کی تو واقعی اس کی بیوی اس کے رضائی محرمات میں نکلی۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۶۸ [2] ایضاً۔ ص ۹۲

مسلم الخیاط کا بیان ہے کہ ایک شخص نے یہ خواب بیان کیا کہ ایک کبوتر مسجد کے منارہ پر آکر بیٹھ گیا۔ آپ نے تعبیر دی کہ حجاج جعفر بن ابی طالب کی پوتی سے شادی کرے گا۔

ایک اور شخص نے اپنا خواب بیان کیا، کہ ایک بکر ثنیۃ الوداع سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا مجھے ذبح کرو، ابن مسیب نے تعبیر دی کہ ابن صلاء مر جائیں گے، ابن صلاء مدینہ کے موالی میں تھے، اور لوگوں کے ساتھ سعی کیا کرتے تھے۔

عبدالرحمٰن بن سائب کا بیان ہے کہ قبیلہ فہم کے ایک آدمی نے بیان کیا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ آگ میں گھس رہا ہے۔ ابن مسیب نے تعبیر دی کہ تم اپنی موت سے پہلے بحری سفر کرو گے اور تمہاری موت قتل کے ذریعہ سے ہوگی۔ عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ واقعی اس شخص نے سمندر کا سفر کیا اور دوران سفر میں ہلاک ہوتے ہوتے بچا، پھر قدید کے معرکہ میں مقتول ہوا۔

حصین بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میری خواہش کے باوجود میرے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی، میں نے خواب دیکھا کہ میری گود میں کسی نے ایک انڈا پھینک دیا ہے۔ میں نے ابن مسیب سے بیان کیا، انہوں نے کہا وہ انڈا عجمی مرغی کا ہے۔ تم عجم میں رشتہ پیدا کرو چنانچہ میں نے ایک عجمی لونڈی کو بیوی بنالیا، اس کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا۔

ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں سایہ میں بیٹھا ہوں۔ پھر اٹھ کر دھوپ میں چلا گیا، ابن مسیب نے کہا خدا کی قسم اگر تمہارا خواب سچا ہے تو تم اسلام کے دائرہ سے نکل جاؤ گے، یہ سن کر اس شخص نے اپنے بیان کی تصحیح کی کہ مجھے زبردستی دھوپ میں لایا گیا۔ لیکن پھر میں موقع پاکے نکل آیا، اس وقت ابن مسیب نے تعبیر میں یہ ترمیم کر دی کہ تم کفر پر مجبور کیے جاؤ گے، یہ تعبیر بالکل صحیح نکلی، یہ شخص عبدالملک کے زمانہ میں کسی جنگ میں قید ہو کر زبردستی کفر پر مجبور کیا گیا، لیکن پھر چھوٹ کر مدینہ واپس آیا یہ واقعہ خود یہ شخص بیان کرتا تھا۔[۱]

کلمات طیبات:

سعید بن مسیب کے کلمات طیبات اور حکیمانہ اقوال بڑے سبق آموز ہیں فرماتے تھے کہ شیطان جب کسی کام میں انسان سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کو عورتوں کے ذریعہ سے پورا کرتا ہے[۲]۔ میں اپنے نفس کے بارہ میں سب سے زیادہ عورتوں سے خوف کرتا ہوں، لوگوں نے عرض کیا ابو محمد آپ جیسے ضعیف العمر آدمی کو تو عورتوں کی خواہش باقی نہیں رہ جاتی، اور نہ

---

۱ یہ تمام خواب اور اس کی تعبیریں ابن سعد نے نقل کی ہیں دیکھو۔ جلد ۵۔ ص ۹۱ تا ص ۹۳ ۲ مختصر صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۳۰

خود عورتیں ایسے شخص کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ (پھر کیا خطرہ) فرمایا لیکن جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں وہ واقعہ ہے[1]۔

فرماتے تھے کہ خدا کی اطاعت کرنا بندوں کے لئے اپنے نفس کی سب سے بڑی عزت کرنا ہے اور اس کی سب سے بڑی تحقیر خدا کی نافرمانی ہے۔

دنیا ایک فرومایہ شے ہے اور ہر اس فرومایہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جو بغیر حق کے اسے حاصل کرتا ہے بے جا دسیلوں سے طلب کرتا ہے، اور بے محل صرف کرتا ہے۔

اس دولت دنیا میں کوئی خیر نہیں ہے جس کو انسان اس نیت سے حاصل نہیں کرتا کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے مذہب اور اپنی شرافت کو بچائے اور صلہ رحم کرے۔ ظلم کے اعوان وانصار کو جب بھی دیکھو تو دل سے ان کے مظالم سے نفرت کرو تا کہ تمہارے اچھے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

تمام انسان خدا کی پناہ ونگرانی میں اعمال کرتے ہیں، جب خدا انہیں رسوا کرنا چاہتا ہے تو ان کو اپنی پناہ ونگرانی سے نکال دیتا ہے۔ اس وقت لوگوں میں اس کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

کوئی شریف کوئی عالم اور کوئی باکمال ایسا نہیں ہے، جس میں کوئی نہ کوئی عیب نہ ہو۔ لیکن ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے عیوب بیان نہ کرنا چاہئیں، اور یہ وہ ہیں جن کی بھلائیاں ان کی خامیوں سے زیادہ ہوں، ان کی خامیوں سے ان بھلائیوں کی وجہ سے درگزر کرنا چاہئے[2]۔

آپ کے غلام برد نے ایک مرتبہ آپ سے بعض آدمیوں کی کثرت عبادت کا تذکرہ کیا کہ وہ لوگ ظہر سے عصر تک برابر عبادت کرتے رہتے ہیں، آپ نے فرمایا برد خدا کی قسم یہ عبادت نہیں ہے، تم جانتے بھی ہو عبادت کسے کہتے ہیں، عبادت کہتے ہیں امور الٰہی میں غور وفکر کرنے اور اس کے محارم سے بچنے کو[3]۔

فضائل اخلاق: علمی کمالات کے ساتھ سعید بن مسیب فضائل اخلاق کی دولت سے بھی مالا مال تھے، اور اقلیم علم وعمل دونوں پر اس کی فرماں روائی یکساں تھی۔

زہد وورع: وہ بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ ابن مسیب فقہ دین داری زہد وورع، عبادت وریاضت جملہ فضائل میں سادات تابعین میں تھے[4]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی علمی جلالت وامامت اور ان کی دینی وبزرگی پر سلف وخلف کے اقوال متفق ہیں[5]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۰ [2] یہ تمام اقوال مختصر صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۳۰، ۱۳۱ سے ماخوذ ہیں [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۰
[4] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۸۷ [5] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص۔

جماعت کا اہتمام: نماز باجماعت میں اتنا اہتمام تھا کہ چالیس ۴۰ سال اور ایک روایت کے مطابق پچاس ۵۰ سال تک ایک وقت بھی نماز باجماعت ناغہ نہ ہوئی[1] کبھی ایسے وقت مسجد آنے کا اتفاق نہیں ہوا، جب لوگ نماز تمام کر کے واپس جارہے ہوں[2]۔

ان پُرآشوب زمانوں میں بھی جب کہ مدینہ میں گھر سے باہر قدم نکالنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا تھا، ابن مسیب سے مسجد نہ چھوٹی، مدینہ کی تاریخ میں حرہ کا واقعہ نہایت مشہور واقعہ ہے، یہ واقعہ یزید اور عبداللہ بن زبیرؓ کے اختلاف کے زمانہ میں پیش آیا تھا اہل مدینہ نے جب عبداللہ بن زبیرؓ کی حمایت میں عبداللہ بن حنظلہ کو سردار بنا کر یزید کی بیعت توڑ دی تھی اس وقت یزید کی فوجیں تین دن تک برابر مدینۃ الرسول میں قتل عام کرتی اور اس کو لوٹتی رہیں۔ اس پرآشوب زمانہ میں کوئی شخص گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ کرتا تھا، مسجدوں میں بالکل سناٹا رہتا تھا، ایسے نازک وقت میں بھی سعید بن مسیب مسجد ہی میں جا کر نماز پڑھتے تھے، بنی امیہ انہیں دیکھ کر کہتے ذرا اس بوڑھے مجنون کو دیکھو[3] (کہ اس حالت میں بھی مسجد نہیں چھوڑتا)۔

نماز باجماعت کے خیال سے علاج اور صحت کے لئے بھی ایسے مقامات پر نہ جاتے تھے جہاں نماز باجماعت کا انتظام نہ ہوسکتا ہو، آپ کی آنکھ میں شکایت پیدا ہوگئی تھی، لوگوں نے مشورہ دیا کہ مدینہ سے باہر عقیق چلے جاؤ، وہاں کے سبزہ زار سے آپ کی آنکھوں کو فائدہ پہنچے گا، فرمایا رات اور صبح کی نماز کی حاضری کو کیا کروں[4]۔

ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابن مسیب سے دیہات کی خوبیوں اور اس کی پرلطف زندگی کا تذکرہ کر کے ان سے کہا کیا اچھا ہوتا آپ کچھ دنوں کے لیے دیہات چلے جاتے، فرمایا رات کی نماز کی حاضری کس طرح ہوگی[5]۔

عبادت شب اور محاسبہ نفس:

آپ کی عبادت کا اصل وقت تاریکی شب میں تھا، اس وقت وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے، روزانہ رات گئے اپنے نفس سے خطاب کرتے کہ برائیوں اور بدیوں کا سرچشمہ اٹھ میں تجھ کو اس اونٹ کی طرح ذلت کر کے چھوڑوں گا جو خستگی اور ماندگی سے چلنے میں لڑکھڑاتا ہے[6]۔ یہ کہہ کر تہجد میں مشغول ہوجاتے تھے اور صبح تک پڑھتے رہتے رات بھر کھڑے کھڑے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے۔ صبح کو پھر

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۷　[2] ایضاً ص ۹۰　[3] ابن سعد۔ ج ۵۔ ص ۹۰　[4] ایضاً۔ ص ۹۱　[5] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۱　[6] صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۳۰

نفس سے مخاطب ہو کر فرماتے، تجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور تو اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے[۱]۔

روزے: ممنوعہ دنوں کے علاوہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، مغرب کے وقت افطار کے لیے گھر سے پینے کی کوئی چیز آجاتی تھی اسی سے مسجد میں افطار کرتے تھے[۲]۔

حج: قریب قریب ہر سال حج کرتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق آپ کے حجوں کی مجموعی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے[۳]۔ بنی اُمیہ نے مخاصمت کی وجہ سے درمیان میں کچھ دنوں کے لئے ان کو حج سے روک دیا تھا۔ علی بن زید نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ آپ کو حج سے اس لئے روکا گیا ہے کہ آپ نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا تھا کہ جب کعبہ کو دیکھیں گے تو آل مروان کے لئے بددعا کریں گے۔ فرمایا یہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن میں ہر نماز میں ان کے لئے بددعا کرتا ہوں۔

ساری عمر میں صرف ایک حج یا عمرہ فرض ہے، اور میں بیس حج سے زیادہ کر چکا ہوں۔ تمہاری قوم میں بہتیرے ایسے آدمی ہیں جنہیں دینداری کا دعویٰ ہے، اور وہ حج اور عمرہ کر کے مرجاتے ہیں، لیکن ان کا حج نہیں ہوتا۔ میں تو نفل کے حج اور عمرہ سے جمعہ کی نماز کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں[۴]۔

تلاوت: قرآن کی تلاوت کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، سفر کی حالت میں سواری پر تلاوت کرتے تھے[۴]۔

محرماتِ الٰہی کا احترام:

آپ تمام محترم چیزوں کی بڑی عظمت کرتے تھے۔ انبیاء و رسل کا اتنا احترام تھا کہ ان کے نام پر اپنے لڑکوں کے نام رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ قرآن اور مسجد کی اتنی عظمت کرتے تھے کہ اس کی تصغیر بھی گوارہ نہ تھی۔

ابن حرملہ کا بیان ہے کہ سعید بن مسیب کہتے تھے کہ مصحیف اور مسیجد یعنی چھوٹا قرآن اور چھوٹی مسجد نہ کہا کرو۔ خدا نے جس چیز کو بڑائی بخشی ہے اس کی عظمت کیا کرو، خدا نے جس کو بڑائی دی ہے وہ بڑی اور اچھی ہے[۵]۔

بیماری کی حالت میں بھی حدیث سناتے وقت اُٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے بیماری کی حالت میں آپ سے ایک حدیث پوچھی، آپ لیٹے ہوئے تھے فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے، سائل نے کہا میں چاہتا تھا کہ آپ زحمت نہ اٹھاتے، آپ نے فرمایا میں لیٹے لیٹے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرنا برا سمجھتا ہوں[۶]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۸ ۲؎ صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۰ ۳؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۹ ۴؎ ایضاً
۵؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۱ ۶؎ مختصر صفوۃ۔ ص ۱۴

اخلاق وآداب : عادات وخصائل میں سعید بن مسیب صحابہ کرام کا نمونہ تھے۔ بڑے بڑے صحابہ ان کے اخلاقی کمالات کے معترف تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان کو دیکھتے تو خوش ہوتے[1]۔

نرمی وصلح پسندی :

طبعاً بڑے نرم اور صلح پسند تھے، اختلاف اور جنگ وجدال کو سخت ناپسند کرتے تھے، عمران بن عبداللہ خزاعی کا بیان ہے کہ سعید بن مسیب کسی سے جھگڑتے نہ تھے اگر کوئی شخص ان کی چادر چھیننا چاہتا تو وہ اس کو خود اس کی طرف پھینک دیتے[2]۔

شدتِ احتیاط :

منہیات کے بارے میں اس قدر محتاط تھے کہ بچوں کے کھیل تک میں اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنی لڑکی کو ہاتھی دانت کی گڑیا کھیلنے کی اجازت نہ دیتے تھے[3]۔

جرأت وحق گوئی :

لیکن اعلان حق میں یہ نرمی درشتی اور سختی سے بدل جاتی تھی، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ سعید بن مسیب بڑے حق گو تھے[4]۔ حق کے مقابلہ میں وہ کبھی خاموش نہ رہتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو سختیاں جھیلیں اس کے حالات اوپر گزر چکے ہیں، بنی امیہ کے مقابلہ میں ان کی تیغ زبان ہمیشہ بے نیام رہتی تھی۔ کسی موقعہ پر بھی ان کی عیب چینی سے باز نہ رہتے تھے۔

مطلب بن سائب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں ابن مسیب کے ساتھ بازار میں بیٹھا ہوا تھا کہ بنی مروان کا ہرکارہ ادھر سے گزرا۔ سعید نے پوچھا، تم بنی مروان کے ہرکارے ہو۔ اس نے کہا، ہاں! پوچھا تم نے ان کو کس حال میں چھوڑا۔ اس نے کہا، اچھے حال میں۔ ابن مسیب نے کہا وہ انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ یہ سن کر ہرکارہ سخت غضبناک ہوا۔

میں نے سمجھا بجھا کر کسی طرح اسے واپس کیا اور سعید سے کہا کہ خدا تمہاری مغفرت کرے، تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ انہوں نے کہا، احمق چپ رہ۔ خدا کی قسم جب تک میں خدا کے حقوق کی حفاظت کرتا ہوں، اس وقت تک وہ مجھے ان کے قبضہ میں نہ دے گا[5]۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۶ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۹۹ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۷
[5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۷

خلفاء اور سلاطین سے بے نیازی:

خلفاء اور سلاطین کے مقابلہ میں سعید بن مسیب کی بے نیازی بے اعتنائی کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، انہوں نے متعدد اموی خلفاء کا زمانہ پایا، لیکن ان میں سے کسی کے سامنے سرخم نہیں کیا بلکہ، ان کو قابل التفات بھی نہیں سمجھا، عبدالملک کے ساتھ ان کے کئی واقعات اس قسم کے پیش آئے جن سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر عبدالملک کبھی ان سے ملنے کی خواہش بھی کرتا تھا۔ تو وہ انکار کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ مدینہ گیا اور مسجد نبوی کے دروازہ پر کھڑے ہو کر انہیں ملنے کے لیے بلا بھیجا عبدالملک کے آدمی نے ان کے پاس جا کر کہا امیر المؤمنین دروازہ پر کھڑے ہیں، آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے جواب دیا نہ امیر المؤمنین کو مجھ سے کوئی ضرورت ہے اور نہ مجھے ان سے اگر امیر المؤمنین کی کوئی ضرورت ہو بھی تو وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ آدمی نے جا کر عبدالملک کو یہ جواب سنا دیا، اس نے پھر اس کو واپس کیا کہ وہ دوبارہ جا کر کہے لیکن اگر وہ نہ آئیں تو زبردستی نہ کرنا آدمی نے دوبارہ جا کر کہا پھر وہی جواب ملا۔ عبدالملک کے آدمی نے یہ خشک جواب سن کر کہا اگر امیر المؤمنین نے ہدایت نہ کر دی ہوتی تو میں تمہارا سر لے جاتا۔ امیر المؤمنین تم کو بار بار بلا بھیجتے ہیں اور تم اس قسم کا جواب دیتے ہو۔

حضرت ابن مسیب نے کہا اگر وہ میرے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتا ہے تو وہ تمہیں بخشتا ہوں اور اگر اس کا کچھ اور ارادہ ہے تو میں اس وقت تک حبوۃ[1] نہ کھولوں گا، جب تک وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اسے کر نہ گزرے۔ عبدالملک کے آدمی نے پھر واپس جا کر یہ جواب سنایا۔ اس نے سن کر کہا، خدا ابو محمد پر رحم کرے، ان کی سختی بڑھتی ہی جاتی ہے[2]۔

ایک مرتبہ اور عبدالملک مدینہ آیا ہوا تھا۔ ایک رات اسے نیند نہیں آئی، اس نے حاجب کو حکم دیا کہ مسجد میں جا کر دیکھو اگر مدینہ کا کوئی قصہ خوان مل جائے تو لے آؤ۔ حاجب مسجد گیا مگر ایسے وقت یہاں کون ملتا۔ سعید بن مسیب ذکر و شغل میں مشغول تھے۔ حاجب انہیں پہچانتا نہ تھا ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اشارہ سے ان کو بلایا۔ یہ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

حاجب نے یہ خیال کر کے کہ یہ شخص شاید متوجہ نہیں ہوا ہے قریب جا کر اشارہ کیا اور کہا میں نے تم کو اشارہ کیا تھا تم نے دیکھا نہیں۔ ابن مسیب نے کہا اپنی ضرورت بیان کرو۔ حاجب نے کہا

---

[1] نشست کا ایک خاص طریقہ ہے جس میں پاؤں اٹھا کر بیٹھتے ہیں۔ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۵

امیر المومنین کی آنکھ کھل گئی ہے، انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ کسی باتیں کرنے والے کو لے آؤں۔ اس لئے تم چلو۔ ابن مسیب نے پوچھا کیا مجھ کو بلایا ہے۔ حاجب نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو اگر اہل شہر میں سے کوئی قصہ خوان ہو تو لے آؤ۔ میں نے تم سے زیادہ مستعد کسی کو نہیں پایا۔

یہ سن کر ابن مسیب نے کہا، امیر المومنین سے جا کر کہہ دو کہ میں ان کا قصہ خوان نہیں ہوں۔ یہ جواب سن کر حاجب سمجھا کہ یہ کوئی دیوانہ آدمی ہے، اس لئے لوٹ گیا، اور عبدالملک سے کہا کہ مسجد میں صرف ایک بوڑھا شخص نظر آیا میں نے اس کو اشارہ کیا، مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ پھر میں نے اس کے پاس جا کر کہا کہ امیر المومنین نے مجھے کسی باتیں کرنے والے کو بلانے کے لئے بھیجا ہے اس شخص نے جواب دیا کہ امیر لمومنین سے جا کر کہہ دو کہ میں ان کا قصہ خوان نہیں ہوں۔ عبدالملک ان کے مزاج سے خوب واقف تھا، اس لئے یہ واقعہ سن کر اس نے کہا وہ سعید بن مسیب ہیں انہیں چھوڑ دو[1]۔

امیر عبدالملک کو ایسے ایسے تلخ جواب دیتے تھے کہ معمولی آدمیوں کو بھی نہیں دیئے جا سکتے ایک مرتبہ اس نے ان سے کہا ابو محمد اب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر اچھا کام کرتا ہوں تو اس کی کوئی خوشی نہیں ہوتی برا کام کرتا ہوں تو اس کا کوئی رنج نہیں ہوتا، فرمایا اب تمہارا قلب پوری طرح سے مرگیا ہے[2]۔

امیر عبدالملک کے بعد ولید کے ساتھ بھی یہی طرز عمل رہا۔ مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کرانے کے بعد جب ولید اس کے معائنہ کے لیے آیا تو مسجد میں جس قدر آدمی تھے سب ہٹا دیئے گئے۔ ابن مسیب بھی مسجد کے ایک گوشہ میں تھے، انہیں اٹھانے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ ایک شخص نے صرف اتنا کہا کہ اس وقت اگر آپ ہٹ جاتے تو اچھا ہوتا۔ آپ نے جواب دیا، میرے اٹھنے کا جو وقت ہے اس سے پہلے نہ اٹھوں گا۔ عرض کیا گیا، اچھا نہ اٹھیے۔ لیکن کم از کم اتنا کیجئے کہ جب امیر المومنین ادھر سے گزریں تو سلام کے لئے کھڑے ہو جایئے۔

فرمایا، خدا کی قسم میں اس کے لئے نہیں کھڑا ہو سکتا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ولید کو مسجد کا معائنہ کرا رہے تھے۔ یہ ابن مسیب کے مرتبہ شناس اور ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ اس لئے ولید کی نظر سے بچانے کے لئے اس کو دوسری سمتوں میں ادھر ادھر پھراتے رہے لیکن جب وہ قبلہ کی طرف

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۹۶ [2] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۴۱۵

بڑھا تو اس کی نظر ابن مسیب پر پڑ گئی۔ اس نے پوچھا، یہ شیخ کون ہیں؟ سعید تو نہیں ہیں۔ عمرؓ بن عبدالعزیز نے جواب دیا، ہاں! اور ان کی جانب سے معذرت کے طور پر ان کی مجبوریاں بیان کرنے لگے کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں، آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے اگر وہ آپ کو پہچانتے تو سلام کے لئے ضرور اُٹھتے۔ ولید نے کہا، ہاں! میں ان کی حالت سے واقف ہوں۔ میں خود ان کے پاس چلتا ہوں۔ چنانچہ گھومتا پھرتا سعید کے پاس پہنچا اور پوچھا، شیخ کیسا مزاج ہے؟ شیخ نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا، الحمدللہ اچھا ہوں، لیکن اتنا اخلاق برتا کہ جواب میں ولید کا مزاج پوچھ لیا۔ اس مختصر گفتگو کے بعد ولید یہ کہتا ہوا لوٹ گیا کہ یہ پرانی یادگار ہیں[1]۔

پردہ پوشی: اگرچہ سعید احکام خداوندی کے باب میں متشدد تھے لیکن کسی کے گناہ کی پردہ دری پسند نہ کرتے تھے اور دوسروں کو پردہ پوشی کی تلقین کرتے تھے۔ ابن حرملہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں صبح کو باہر نکلا تو ایک شخص کو نشہ کی حالت میں پایا۔ اس کو زبردستی اپنے گھر گھسیٹ لایا اس کے بعد سعید سے ملاقات ہوئی، ان سے میں نے پوچھا کہ ایک شخص نے ایک شخص کو نشہ کی حالت میں پایا اس صورت میں وہ کیا کرے۔ اس کو حاکم کے سپرد کر کے اس پر حد جاری کرائے؟

حضرت ابن مسیب نے جواب دیا اگر تم اس کو اپنے کپڑے سے چھپا سکو تو چھپا لو۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا، اس وقت وہ شخص ہوش میں آ چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرہ پر شرمندگی طاری ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ کوئی شرم نہیں آتی۔ اگر تم صبح اس حالت میں پکڑ لئے جاتے اور تم پر حد جاری کی جاتی تو لوگوں کی نگاہوں میں تمہاری کیا آبرو رہ جاتی۔ تم زندگی ہی میں مردہ ہو جاتے۔ تمہاری شہادت تک قبول نہ کی جاتی۔ یہ نصیحت سن کر اس شخص نے کہا، خدا کی قسم آئندہ کبھی ایسا نہ کروں گا۔ اس پردہ پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا[2]۔

ایک سبق آموز واقعہ:

حضرت ابن مسیب کی لڑکی کی شادی کا واقعہ ایثار، ہمدردی، غربت پسندی اور سادگی مختلف حیثیتوں سے نہایت سبق آموز ہے۔ ان کی ایک لڑکی بڑی حسین وجمیل اور تعلیم یافتہ تھی۔ عبدالملک اس کو اپنی بہو بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ولی عہد کے ساتھ اس کی نسبت کا پیغام بھیجا۔ ابن مسیب نے انکار کر دیا۔ عبدالملک نے بہت دباؤ ڈالا اور مختلف قسم کی سختیاں کیں۔ ابن مسیب برابر انکار پر قائم رہے اور چند دنوں کے بعد قریش کے ایک نہایت معمولی اور غریب آدمی ابوودا عہ کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۴۔ ص ۴۳۸ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۱

اس واقعہ کے بارے میں خود ابووداعہ کا یہ بیان ہے کہ میں سعید بن مسیب کے پاس پابندی کے ساتھ جا کر بیٹھتا تھا۔ ایک مرتبہ چند دن غیر حاضری کے بعد جانے کا اتفاق ہوا۔ ابن مسیب نے پوچھا اتنے دن کہاں غائب رہے۔ میں نے کہا میرے بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے حاضر نہ ہو سکا۔ فرمایا، مجھے کیوں نہ خبر دی، میں بھی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اُٹھنے لگا تو انہوں نے کہا تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا۔ میں نے جواب دیا میں غریب نادار دو چار پیسے کی حیثیت کا آدمی ہوں، میرے ساتھ کون شادی کرے گا۔ فرمایا میں کروں گا تم تیار ہو۔ میں نے کہا بہت خوب۔ سعید نے اسی وقت دو یا تین درہم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔ میں وہاں سے اُٹھا تو فرط مسرت میں میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ گھر پہنچ کر رخصتی کے لئے قرض کی فکر میں پڑ گیا۔

شام کے وقت سعید بن مسیب نے اپنی لڑکی کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ پہلے دو رکعت نماز خود پڑھی اور دو رکعت لڑکی سے پڑھوائی۔ اس کے بعد اس کو لئے ہوئے میرے گھر پہنچے۔ میں مغرب کے بعد روزہ افطار کرنے جا رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا سعید۔ میں سوچنے لگا سعید بن مسیب تو اپنے گھر کے اور مسجد کے علاوہ کہیں آتے جاتے نہیں، یہ سعید کون ہیں۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا سعید بن مسیب تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے کہا، آپ نے کیوں زحمت گوارا کی مجھے بلا بھیجا ہوتا۔ فرمایا نہیں مجھے تمہارے پاس آنا چاہئے تھا۔ میں نے عرض کیا فرمایئے کیا ارشاد ہے۔ فرمایا،

تم تنہا آدمی تھے اور تمہاری بیوی موجود تھی، میں نے خیال کیا کہ تنہا کیوں رات بسر کرو اس لئے تمہاری بیوی کو لے کر آیا ہوں، وہ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کو دروازے کے اندر کر کے باہر سے دروازہ بند کر لیا۔ میری بیوی شرم سے گر پڑی۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا، اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں میں اعلان کیا کہ آج سعید بن مسیب نے اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا ہے اور اسے میرے گھر پہنچا گئے۔ میری ماں نے تین دن تک دستور کے مطابق اس کو بنایا سنوارا۔ بننے سنوارنے کے بعد میں نے اس کو دیکھا تو وہ نہایت حسین، کتاب اللہ کی حافظ، سنت رسول اللہ ﷺ کی عالم، اور حقوق شوہر کی واقف کار عورت تھی[1]۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۰۷، یہ واقعہ مختصراً ابن سعد میں بھی لکھا ہے

ذریعہ معاش :

اگرچہ ابن مسیب بڑے عابد و زاہد اور دنیا سے کنارہ کش بزرگ تھے۔ اس قدر ترکِ دنیا ناپسند کرتے تھے جس سے انسان اپنی عزت نہ قائم رکھ سکے اور دوسروں کے ساتھ سلوک نہ کر سکے[1] اس لئے کسب معاش کے لئے تجارت کا پاک مشغلہ اختیار کیا تھا۔ روغنِ زیتون وغیرہ کی تجارت کیا کرتے تھے[2]۔

ایک زمانہ میں حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا لیکن پھر اسے لینا بند کر دیا تھا ان کے وظیفہ کی تیس ہزار سے زیادہ رقم بیت المال میں جمع تھی۔ کئی مرتبہ انہیں اس لئے لینے کے لئے بلایا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا مجھے اس وقت تک اس کی حاجت نہیں جب تک خدا میرے اور بنی مروان کے درمیان فیصلہ نہ کر دے[3]۔

حلیہ ولباس :

آخر عمر میں سر اور ڈاڑھی دونوں کے بال سپید ہو گئے تھے جو کبھی یوں ہی رہتے تھے اور کبھی داڑھی میں خضاب کرتے تھے۔ مونچھیں کبھی بہت باریک اور کبھی ذرا موٹی کترواتے تھے۔ لباس میں کوئی خاص اہتمام نہ تھا لیکن بالعموم اچھا لباس پہنتے تھے۔ سپید لباس زیادہ مرغوب خاطر تھے، عمامہ البتہ سیاہ ہوتا تھا، کبھی سپید عمامہ بھی باندھ لیتے تھے، کبھی کبھی کلاہ بھی استعمال کرتے تھے، طیلسانی کپڑا زیادہ مرغوب تھا اس میں کتان کی گھنڈی ہوتی تھی، کبھی باریک ابریشم کی چادر استعمال کرتے تھے، کپڑے پورے پہنتے تھے ازار، قمیص، کرتا، موزہ اور عمامہ۔ کبھی کبھی پاجامہ بھی پہنتے تھے[4]۔

(۲۹) سلمہ بن دینارؒ

نام ونسب : سلمہ نام، ابو حازم کنیت، نسلاً عجمی تھے۔ ان کے والد ایرانی تھے اور ان کی ماں رومی تھیں۔ ابن سعد بن ابی سفیان مخزومی کے غلام تھے اس نسبت سے مخزومی کہلاتے۔

فضل وکمال : اگرچہ وہ ماں باپ دونوں کی جانب سے عجمی نژاد تھے لیکن اسلام کے فیضِ مساوات نے ان کے مدینہ کے شیوخ اور وہاں کے عابد و زاہد علما کے گروہ میں شامل کر دیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں : الواعظ الزاهد عالم المدينة و شيخها[5]۔ امام نووی لکھتے ہیں ان کی توثیق و جلالت اور مدح وثنا پر سب کا اتفاق ہے[6]۔

---

[1] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۰　[2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۷　[3] ایضاً۔ ص ۹۵　[4] ایضاً۔ ص ۱۰۲، ص ۱۰۳

[5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۹　[6] تہذیب الاسماء۔ جلد ۲۔ ص ۲۰۸

حدیث: حدیث کے بڑے حافظ تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں: "کان ثقة کبیر الحدیث"[1]۔ حدیث میں انہوں نے صحابہ میں سہیل بن سعد الساعدیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی تھی لیکن محدثین کے نزدیک آخر الذکر دونوں بزرگوں سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔ غیر صحابی علماء میں ایک جماعت کثیر سے روایتیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ابوامامہ بن سہل بن حنیف، سعید بن مسیب، عامر بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن ابی قتادہ، نعمان بن ابی عیاش، یزید بن رومان، عبیداللہ بن مقسم، ابراہیم بن عبدالرحمٰن، نجیہ بن عبداللہ، ابوصالح السمان، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابن منکدر وغیرہ۔

زہری، عبیداللہ بن عمرو بن اسحٰق، ابن عجلان، ابن ابی ذئب، مالک، حماد، سفیان، سلیمان، ابن بلال، سعید بن بلال، عمر بن علی، ابوغسان المدنی، ہشام بن سعد، وہیب بن خالد، ابو صخر حمید بن زیادہ الخراط، اسامہ بن زید لیثی، محمد بن جعفر بن ابی کثیر اور فلیح بن سلیمان النمری وغیرہ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں ہیں[2]۔

فقہ: فقہ میں بھی انہیں پورا ادراک تھا اور وہ مدینہ کے مشہور فقیہ تھے۔ حافظ ذہبی اور امام نووی سب انہیں فقہا میں لکھتے ہیں[3]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ النفس تھے ان کے مناقب بہت ہیں۔ وہ فقیہ ثبت اور بلند مرتبہ تھے[4]۔ ان کے تفقہ کی ایک سند یہ ہے کہ وہ مدینۃ الرسول کے قاضی تھے[5]۔

وعظ و پند: مدینہ میں وعظ و پند کے فرائض بھی انجام دیتے تھے[6]۔

زہد و عبادت: عبادت و ریاضت کے لحاظ سے ان کا شمار صلحائے مدینہ میں تھا۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ مدینہ کے عابد و زاہد لوگوں میں تھے[7]۔ حافظ ذہبی، امام نووی اور ابن حجر وغیرہ سب ان کے نام کے ساتھ "زاہد" کا لقب لکھتے ہیں۔ غرض جماعت تابعین میں وہ ہر اعتبار سے نہایت ممتاز تھے۔ محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ میں کوئی ان کا مثل نہ تھا[8]۔

امراء اور سلاطین سے بے نیازی:

امراء و سلاطین سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ کبھی ان کی آستان بوسی کا ننگ گوارا نہ کیا، سلیمان بن عبدالملک نے ایک مرتبہ ان کو امام زہری کی وساطت سے بلا بھیجا، انہوں نے زہری سے

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۴۴۔ بحوالہ ابن سعد
[2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۴۳
[3] دیکھو تذکرۃ الحفاظ و تہذیب الاسماء حوالہ مذکور
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۱۹
[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۴۴
[6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۹
[7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۴۴
[8] تہذیب الاسماء۔ جلد ۲۔ ص ۲۰۸

کہا اگر اس کو مجھ سے کوئی ضرورت ہے تو اس کو خود میرے پاس آنا چاہئے، اور میری اس سے کوئی ضرورت نہیں ہے[1]۔

حکمت ودانائی:

مذہبی اور اخلاقی کمالات کے ساتھ ان کو حکمت سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کے منہ سے ابوحازم کے منہ سے زیادہ حکمت قریب ہو[2]۔ ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ حکم ومواعظ میں ان کے زمانہ میں کوئی ان کا مثل نہ تھا[3]۔

حکیمانہ مقولے:

آپ کے بعض حکیمانہ مقولوں سے آپ کی حکمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ فرماتے تھے کہ وہ تمام اعمال جن کی وجہ سے موت کا آنا گراں گزرتا ہو ان کو چھوڑ دو۔ پھر جس وقت بھی موت آجائے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ جو بندہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان فرائض وتعلقات کو اچھا اور درست رکھتا ہے تو خدا اس کے اور دوسرے بندوں کے تعلقات کو درست رکھتا ہے اور جو بندہ اپنے اور خدا کے فرائض میں کوتاہی کرتا ہے تو خدا اس کے اور دوسرے بندوں کے درمیانی فرائض میں کوتاہی پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص سے تعلقات خوش گوار رکھنا بہت سے لوگوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھنے سے زیادہ آسان ہے۔ یعنی اگر ایک خدا سے تعلقات خوشگوار ہوں تو ساری دنیا سے خوشگوار ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہشام نے آپ سے پوچھا کہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کے مواخذہ سے کس طرح بچ سکتا ہوں؟ فرمایا، بہت آسان ہے۔ ہر چیز کو طریقہ سے لو، اور جائز مصرف میں اس کو صرف کرو۔ ہشام نے کہا یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو ہوائے نفس سے بچنے کی خدا کی جانب سے توفیق حاصل ہو[4]۔

وفات: ۱۴۰ھ میں وفات پائی[5]۔

(۳۰) سلیمان بن طرخان تیمیؒ

نام ونسب: سلیمان نام، ابو معتمر کنیت، نساً مری تھے، بنی تمیم میں بود وباش اختیار کرلینے کی وجہ سے تیمی مشہور ہوگئے تھے، بصرہ کے بڑے عابد وزاہد تابعین میں تھے۔ کان من العباد المجتهدين[6]۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۴۔ ص ۱۴۴ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۹۹ [3] شذرات الذہب۔ ص ۲۰۸

[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۹ [5] ایضاً [6] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۸

فضل وکمال : اگرچہ سلیمان کا طغرائے کمال ان کا زہد وورع اور ریاضت وعبادت ہے، لیکن علمی حیثیت سے بھی وہ بصرہ کے بڑے علمائے میں تھے، حافظ ذہبی حافظ امام، اور شیخ الاسلام کے القاب کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے ہیں[1]۔

حدیث : حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے، علامہ ابن سعد انہیں ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں[2]۔ اس عہد کے اکابر محدثین ان کی فقط حدیث دانی کے معترف تھے، سفیان ثوری لکھتے ہیں کہ بصرہ کے حفاظ تین ہیں، ان میں ایک سلیمان کا نام تھا[3]۔

صحابہ میں انہوں نے انس بن مالک اور تابعین میں حسن بصری، اعمش، قتادہ طاؤس ابو اسحق سبیعی، ابو عثمان نہدی، ابونضرہ عبدی، نعیم بن ابی ہند، ابی المنہال، ثابت، البنانی، ابومجلز یزید بن عبداللہ بن شخر، معبد بن ہلال اور یحیی بن معمر وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[4]۔

ان کی مرویات کی تعداد دوسو تک پہنچتی ہے[5]۔ شعبہ ان سے زیادہ کسی کو سچا نہ سمجھتے تھے[6]۔ اور ان کے شک کو بھی یقین کا درجہ دیتے تھے[7]۔

احتیاط فی الروایہ : اس حفظ کے باوجود وہ حدیث بیان کرنے میں اتنے محتاط تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے وقت ان کا رنگ بدل جاتا تھا[8]۔

ان کے تلامذہ کا دائرہ خاصہ وسیع تھا، ان میں معتمر، شعبہ، دونوں سفیان، زائدہ، زہیر، حماد بن سلمہ، ابن علیہ، ابن مبارک، عبدالوارث بن سعید، ابراہیم بن سعد، جریر، حفص بن غیاث، عیسیٰ بن یونس، معاذ بن معاذ، ہشیم، قطان اور محمد بن عبداللہ انصاری لائق ذکر ہیں[9]۔

زہد وورع : لیکن ان کا اصل طغرئی کمال ان کا زہد وورع اور ان کی عبادت وریاضت ہے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ بڑے سخت عبادت گزار لوگوں میں تھے[10]۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ عابد وزاہد قائم اللیل صائم النہار اور خدا کے مطیع لوگوں میں تھے[11]۔

خشیت الٰہی : خدا کا خوف ان کی رگ وپے میں جاری وساری تھا، یحیی القطان کہتے تھے کہ میں نے سلیمان سے زیادہ خدا کا خوف کرنے والا نہیں دیکھا[12]۔

---

1. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ 2. ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۸ 3. تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۲ 4. ایضاً۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۱ 5. ایضاً 6. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ 7. تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۲ 8. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ 9. تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۱
10. ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۸ 11. شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۱۱ 12. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۳۵

عبادت وریاضت:

ساری رات عبادت کرتے تھے، اکثر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے، ان کے صاحبزادے معتمر بھی باپ کا صحیح نمونہ تھے۔ دونوں باپ بیٹے رات بھر گھوم گھوم کر مختلف مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے[1] معتمر کا بیان ہے کہ چالیس سال تک انہوں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی، ہر سجدہ میں ستر مرتبہ سبحان ربی الاعلی کہتے تھے، اور عصر سے لے کر مغرب تک تسبیح پڑھتے تھے[2]۔

روزوں سے بھی بہی شغف تھا، تاہم بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ناغہ دے کر[3]۔

صدقہ وخیرات:

صدقہ بکثرت کرتے تھے، جریر کا بیان ہے کہ سلیمان ہر وقت صدقہ کیا کرتے تھے، جب صدقہ کے لیے کوئی چیز نہ ملتی تھی، تو اس کے بدلے میں دو رکعت نماز ہی پڑھ لیتے[4]۔

حسن عمل: غرض ان کی زندگی کا ہر لمحہ حسن عمل میں گزرتا تھا، حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ جب ہم خدا کی عبادت کے اوقات میں سلیمان کے پاس جاتے تو ان کی اطاعت ہی کرتے پاتے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں معصیت کا مادہ ہی نہ تھا[5]۔

مواخذہ کا خوف:

لیکن اس زندگی کے باوجود انہیں اپنے اعمال پر اعتماد نہ تھا کہ خدا کے یہاں کیا معاملہ پیش آنے والا ہے فضیل بن عیاض کا بیان ہے کہ سلیمان سے کسی نے کہا کہ آپ ہی ہیں، آپ کے مثل کون ہے، فرمایا ایسا نہ کہو مجھے نہیں معلوم کہ میرا رب میرے ساتھ کیا معاملہ کریگا، اس نے خود فرمایا ہے کہ **بدالهم من الله مالم یکونوا یحتسبون۔** ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایسی بات ظاہر ہوگئی جس کا وہ لوگ گمان بھی نہ کرتے تھے[6]۔

ادنی ادنی باتوں میں مواخذہ کا خوف کرتے تھے، سعید بن عامر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بیماری کی حالت میں رونے لگے، کسی نے پوچھا رونے کا کیا سبب ہے، فرمایا ایک مرتبہ میں ایک قبر کے پاس سے گزرا تھا تو اسے سلام کیا تھا مجھے خوف ہے کہ اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیا جائے[7]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۸ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً

امر بالمعروف ونہی المنکر:

امر بالمعروف اور نہی المنکر بھی حسن عمل کا ایک بڑا درجہ ہے[1] سلیمان اس کو ایک ضروری فرض سمجھتے تھے اور امراء کے قصور و محلات میں جا کر اس فرض کو ادا کرتے تھے[2]۔

ایک نکتہ: مانا کہ کوئی دور سہولت پسند افراد بلکہ جماعتوں تک سے خالی نہیں رہا ہے۔ اور آج کل تو ہر شخص مذہب میں آسانی ڈھونڈھتا ہے۔ اس قبیل کے اشخاص آسانی کے لئے، کسی خاص مسلک کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب تمام آئمہ برحق ان کی رائیں صحیح اور ان کے مسلک درست ہیں، تو پھر کسی خاص امام اور خاص مسلک کی پابندی کیوں ضروری ہے، اور "الدین یسر" کے ماتحت ان سب کے آسان مسائل کیوں نہ اختیار کئے جائیں۔

سلیمان اس قسم کی سہل پسندی کے مفاسد میں ایک دلچسپ نکتہ ارشاد فرماتے تھے کہ اگر تمام علماء کی رخصتوں یعنی جائز کردہ چیزوں اور ان کی لغزشوں کو تم اختیار کرلو تو تمہاری ذات میں ساری برائیاں جمع ہو جائیں گی[3]۔

وفات: ۱۴۳ھ میں وفات پائی[4]۔ وفات کے وقت ستاون سال کی عمر تھی۔

(۳۱) سلیمان بن یسارؒ

نام ونسب: سلیمان نام، ابو تراب کنیت، ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی غلامی کا شرف رکھتے تھے، پھر انہوں نے ان کو مکاتب بنادیا تھا، اس غلامی نے سلیمان کو علم وعمل کی دولت سے مالا مال کردیا تھا۔

حرم نبویؐ میں آمد ورفت:

حضرت میمونہؓ کی غلامی کے توسل سے سلیمان حضرت عائشہؓ وغیرہ کی خدمت میں آتے جاتے تھے، اور وہ ان کی غلامی کے زمانہ تک ان سے پردہ نہ کرتی تھیں خود سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر باریابی کی اجازت چاہی۔ آپ نے آواز پہچان کر فرمایا، تم نے آزادی کے متعلق جو طے کیا تھا، اسے پورا کیا۔ میں نے عرض کیا، ہاں لیکن ابھی تھوڑا سا باقی

---

[1] طبقات کبریٰ امام شعرانی۔ جلد اول۔ ص ۴۳ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۵ [3] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۸ [4] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۰۱ [5] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۰

ہے، فرمایا تو اندر چلے آؤ، تم اس وقت تک غلام ہو جب تک تمہارے ذمہ کچھ بھی باقی ہے[۵]۔

فضل وکمال:

سلیمان اولاً خود ذاتی صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے نہایت ذہین اور سمجھدار تھے[۱]۔ پھر انہیں امیر المؤمنین کی غلامی کے تعلق سے مدینہ رہنے والے صحابہ کرام کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا، اس لیئے وہ مدینہ کے ممتاز ترین علماء میں ہوگئے[۲]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ جلالت اور علمی کمال پر سب کا اتفاق ہے[۳]۔

قرآن: ان کو قرآن مجید، حدیث نبوی، فقہ جملہ علوم میں درک تھا، قرآن کے ممتاز قاریوں میں تھے[۴]۔

حدیث: جس گھر کے وہ خادم تھے، وہ حدیث نبوی کا سرچشمہ تھا، اس لئے قدرۃً احادیث نبوی کا معتد بہ ذخیرہ ان کے حصہ میں آیا تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کہ وہ عالی مرتبہ ارفع المنزلت فقیہ، اور کثیر الحدیث تھے[۵]۔

انہوں نے حدیث میں اُم المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور میمونہؓ کے خرمن کمال سے زیادہ خوشہ چینی کی تھی، ان کے علاوہ اکابر صحابہ میں زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عباسؓ، فضل ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، مقداد بن اسود، عبداللہ بن خدافہ سہمی، اور عام محدثین میں جعفر بن امیہ ضمری، عبداللہ بن حارث نوفل، عبدالرحمٰن بن جابر، عراک بن مالک، مالک بن عامر اصحی وغیرہ سے فیضیاب ہوئے تھے[۶]۔

تلامذہ: حدیث میں ان کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا، بعض کے نام یہ ہیں، عمر بن دینار عبداللہ بن دینار، عبداللہ بن فضل ہاشمی، ابوالزناد، بکیر بن الاشج، جعفر بن عبداللہ، ابن حکم، سالم، ابوالنصر، صالح بن کیسان عمرو بن میمون، محمد بن ابی حرملہ، ازہری، مکحول، نافع، یحیٰی بن سعید انصاری، یعلی بن حکیم، اور یونس بن سیف وغیرہ[۷]۔

فقہ: مگر ان کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا، اس میں وہ امامت اور اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ علم اور آئمہ اجتہاد میں تھے[۸]۔ وہ مدینہ کے ان سات مشہور فقہاء میں تھے، جو اس عہد کے

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۹ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد۔ اول۔ ق اول۔ ص ۲۲۸ ۳۔ ایضاً۔ ص ۳۵
۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۹ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۰ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۲۸
۷۔ ایضاً ۸۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۹ ۹۔ تہذیب الاسماء تذکرۃ الحفاظ حوالہ مذکور

امام فقہ مانے جاتے تھے[۹]۔ مسائل طلاق کے خصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے عالم تھے۔

قتادہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں طلاق کے مسائل کا سب سے بڑا عالم کون ہے، لوگوں نے سلیمان بن یسار کا نام بتایا[۱]۔

بعض علماء فقہ میں انہیں ان آئمہ پر جن کی علمی عظمت مسلّم تھی، ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ محمد بن حنفیہ کے صاحبزادے حسن انہیں سعید بن مسیب سے زیادہ فہیم سمجھتے تھے[۲]۔ خود ابن مسیب ان کے اتنے معترف تھے کہ جب ان کے پاس کوئی مستفتی آتا تھا، تو اسے سلیمان کے پاس بھیج دیتے تھے[۳]۔ اور فرماتے تھے، موجودہ لوگوں میں سب سے بڑے عالم وہی ہیں[۴]۔

زہد وورع: زہد و عبادت کے اعتبار سے بھی ممتاز شخصیت رکھتے تھے، ابوزرعہ کا بیان ہے کہ سلیمان بن یسار مدنی فاضل اور عبادت گزار تھے[۵]۔ عجلی ان کے فضائل علمی کے ساتھ ان کی عبادت و ریاضت کی بھی شہادت دیتے ہیں[۶]۔

عفت: بڑے عفیف و پاک دامن تھے، اگرچہ تابعین کی مقدس جماعت کے لیے عفت و پاک دامنی کوئی بڑا وصف نہیں ہے، لیکن ترغیبات اور آزمائش وامتحان کے موقع پر پورا اترنا ہر شخص کے لئے کمال ہے، سلیمان نہایت حسین وجمیل تھے، ایک مرتبہ ایک عورت نے آپ کے گھر کے اندر آکر دام ڈالنا چاہا آپ گھر سے نکل کر بھاگ گئے[۷]۔

وفات: آپ کے زمانہ وفات کے بارہ میں کئی روایتیں ہیں، ان سب میں زیادہ معتبر یہ ہے کہ ۱۰۷ھ میں وفات پائی، وفات کے وقت ۷۳ سال کی عمر تھی[۸]۔

(۳۲) قاضی شریح بن حارثؒ

نام ونسب: شریح نام، ابوامیہ کنیت، نسب نامہ یہ ہے: شریح بن حارث بن قیس بن الجہم بن معاویہ بن عامر بن رائش بن حارث بن معاویہ بن ثور بن مرتع بن کندہ کندی، بعض روایتوں میں نسب نامہ کے اوپر کے ناموں میں تھوڑا سا اختلاف ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ شریح نسلاً عرب نہ تھے بلکہ عجم کے ان خانوادوں میں سے تھے، جو کندہ کے حلیف، بن کر یمن میں آباد ہو گئے تھے۔

۱۔ ابن خلکان جلد ۱۔ ص ۲۱۳ ۲۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۱۳ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۹
۴۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۴ ۵۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۳۵ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۲۳۰ ۷۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۰ ۸۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۰

عہدِ رسالت :

شریح عہد رسالت میں موجود تھے، اور بعض روایتوں کے مطابق وہ آنحضرت ﷺ کے شرف زیارت سے بھی مشرف ہوئے، لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ اسلام کے شرف سے تو بیشک وہ اسی عہد میں مشرف ہو گئے تھے، لیکن دولت دیدار سے محروم رہے حافظ ابن حجر کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ خلفاء اربعہ کے زمانہ کے شریح کے حالات بہت ملتے ہیں، لیکن کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا، جس سے رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات ثابت ہوتی ہو[1]۔

علامہ ابن سعد اور حافظ بن عبدالبر وغیرہ تمام ارباب سیر وطبقات اسی کے قائل ہیں اور شریح کو تابعین ہی میں شمار کرتے ہیں، البتہ تابعین کے زمرہ میں وہ نہایت ممتاز شخصیت رکھتے تھے، اور تاریخ اسلام کے مشہور قاضی تھے۔

فضل وکمال : شریح نے بہت سے اکابر صحابہ کو پایا تھا، اور ان کی صحبت اٹھائی تھی۔ پھر وہ فطرۃً نہایت ذہین وطباع تھے[2]۔ اس لیے علمی اعتبار سے انہوں نے اپنے اقران میں نہایت ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی، امام نووی لکھتے ہیں کہ شریح کی توثیق، دینداری فضل وکمال ذکاوت اور ان کی روایات سے احتجاج پر سب کا اتفاق ہے[3]۔ حافظ صفی الدین خزرجی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر اور ذکی علماء میں تھے[4]۔

حدیث : بصرہ کے ممتاز حفاظ حدیث میں تھے، انہوں نے حضرت عمرؓ، علیؓ، وعبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابت جیسے اکابر سے استفادہ کیا تھا، امام شعبی، ابووائل قیس بن ابی حازم، ابن سیرین، عبدالعزیز بن رفیع، مجاہد بن جبیر، عطاء بن سائب، بن انس بن سیرین اور ابراہیم نخعی جیسے آئمہ ان کے زمرہ تلامذہ میں تھے[5]۔

فقہ : شریح حدیث کے بھی حافظ تھے، لیکن ان کا خاص فن فقہ تھا، حافظ ذہبی اور ابن حجر وغیرہ ان کا خصوصی فن فقہ ہی کا شمار کرتے ہیں، اور ان کے نام کے ساتھ فقیہ کا لقب لکھتے ہیں[6]۔ وہ مرکز فقہ کوفہ کی جماعت افتاء کے ایک رکن تھے[7]۔

قیافہ وشاعری : حدیث وفقہ کے علاوہ وہ عرب کے مروجہ فنون قیافہ اور شاعری میں بھی دستگاہ رکھتے تھے[8]۔ شاعری میں اتنا کمال حاصل تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے نظم میں فیصلہ دیا تھا۔

---

[1] اصابہ۔ جلد ۲۔ ص ۲۰۲ [2] استیعاب۔ جلد ۲۔ ص ۶۷ [3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۴۴
[4] تہذیب الکمال۔ ص ۱۶۵ [5] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۴۴ [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۱ وتہذیب التہذیب حوالہ مذکور [7] اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۷ [8] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۰

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت کے خلاف جس کے ایک لڑکا تھا اور اپنے شوہر کی موت کے بعد اس نے دوسری شادی کر لی تھی، اس کی ساس نے قاضی شریح کے یہاں دعویٰ دائر کیا، عورت کا دعویٰ تھا کہ لڑکے کی ولی وہ ہے۔ کیونکہ اس کے باپ کی ماں ہے اور ساس کا دعویٰ تھا کہ بہو کے عقد ثانی کے بعد حق تولیت اسے ملنا چاہیے، ساس نے نظم میں دعویٰ پیش کیا۔

یا ابا امیته اتیناک　　وانت المرء تا تیه

اتاک ابنی واماہ　　وکلتا نا ففدیه

تزوجت فھا تیه　　ولا یذھب بک الیته

فلو کنت تا بیت　　مما ناز عتنی فیه

یعنی ابوامیہ ہم آپ کے پاس انصاف کے لئے آئے ہیں، میرا لڑکا (پوتا) اور اس کی ماں تیرے پاس آئے ہیں اور ہم دونوں اس پر فدا ہیں (بہو سے خطاب) جب تم نے دوسری شادی کر لی تو لڑکا مجھے دے دو، زبردستی مت کرو، بیوہ ہو جانے کے بعد تم اس کے بارہ میں مجھ سے کیوں جھگڑا کرتی ہو، (قاضی سے خطاب) قاضی صاحب لڑکے کے بارہ میں ہم دونوں کا قصہ یہ ہے۔

بہو نے ساس کے دعویٰ کا یہ جواب دیا۔

یا ایھا القاضی　　قد قلت لک ا لجده

وقولا فاسمع منی　　ولا تبطر نی رده

اعزی النفسی عن ابن　　وکبلی حملت کبده

فلما کانا فی حجری　　یتیما ضا نعا وحده

تزوجت رجاء الخیر　　من یکفینی فقده

ومن یظھر لی وده　　ومن یکفل لی رفده

قاضی صاحب دادی یعنی میری ساس کا بیان آپ نے سن لیا، اب میرا بھی سنئے اور اس کو رد نہ کیجئے، میں اپنے لڑکے سے اپنے دل کو تسلی دیتی ہوں، میں نے ہمیشہ اس کو کلیجے سے لگائے رکھا ہے، میری بیوگی و تنہائی کی وجہ سے اس یتیم کے ضائع جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے میں نے اس کی بھلائی اور اس کی نگہداشت کے خاطر ایسے شخص سے شادی کر لی جو اس کو ضائع نہ ہونے دے، اور اس کی کفالت کر سکے۔ چونکہ ساس بہو دونوں نے نظم میں دعویٰ پیش کیا تھا، اس لئے قاضی شریح نے نظم ہی میں اس کا فیصلہ دیا۔

قد فهم القاضي ما قلتما وقضا بينكما ثم فصل

بقضاء بين بينكما وعلى القاضي جهدا ن عقل

قال للجده بيني با لصبي وخذي ابنک من ذات العلل

انها لو صبرت كان لها قبل دعوا ها تبغيها لبدل

تم دونوں نے جو کچھ کہا قاضی نے اسے سمجھا، اور دونوں کے درمیان ایک واضح فیصلہ کر دیا اگر قاضی سمجھدار ہے تو اس پر کوشش کرنا فرض ہے پھر دادی سے کہا لڑکے کو اس حیلہ ساز سے لے کر الگ ہو جا اگر وہ نکاح نہ کرتی تو بچہ اس کے پاس رہتا[1]۔

قضا کی استعداد و قابلیت:

ایک قاضی کے لئے جن اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمام شریح کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھیں، فضل و کمال کا حال اوپر گزر چکا، طبعاً وہ نہایت ذہین، ذکی، طباع، فریس، اور فہیم تھے[2]۔ پیچیدہ سے پیچیدہ اور ظاہر فریب سے ظاہر فریب معاملات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی، ان اوصاف نے ان میں قدرۃً قضاء کی نہایت اعلیٰ استعداد پیدا کر دی تھی، حضرت علیؓ جن کو زبان رسالت سے اقضاھم علی کی سند ملی تھی، شریح کو اقضی العرب، عرب کا سب سے بڑا قاضی فرماتے تھے[3]۔

عہدۂ قضاء پر تقرر:

عہدہ قضا پر تقرر سے پہلے ان کی یہ استعداد و صلاحیت مشہور ہو چکی تھی اور لوگ متنازعہ فیہ معاملات میں ان کو حکم بناتے تھے، چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر انہیں کوفہ کا قاضی بنا دیا۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے بشرط پسندگی ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے ایک سوار کو دیا، گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہو گیا، حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا، گھوڑے کے مالک نے لینے سے انکار کر دیا، اس پر نزاع ہوئی، اور شریح ثالث بنائے گئے، انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں[4]۔

---

[1] ابن سعد، جلد ۶، ص ۹۲ [2] استیعاب، جلد ۲، ص ۶۷ [3] تہذیب الاسماء، جلد اول، ص ۲۴۳

[4] کتاب الاوائل الباب السابع ذکر القضاۃ

ایک دوسری روایت میں اس واقعہ کی شکل یہ ہے کہ گھوڑا امتحان میں ہلاک ہو گیا، حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا، اس پر تنازعہ ہوا، اور شریح حکم مقرر ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ جس کو خریدا ہے اسی کو لینا ہوگا یا جس حالت میں لیا تھا اسی حالت میں واپس کرنا ہوگا، اس فیصلہ پر حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا قاضی بنا دیا[1]۔

قاضی شریح نے اس خدمت کو اس قابلیت، اس خوش اسلوبی اور دیانت سے ادا کیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کے زمانہ تک مسلسل ساٹھ برس قاضی رہے[2]۔ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات وحوادث ہوئے، خلافت راشدہ کا دور ختم ہو کر اموی حکومت کا آغاز ہوا، ابن زبیرؓ اور امویوں میں خوں ریز معرکہ آرائیاں ہوئیں، ساری دنیائے اسلام میں انقلاب برپا ہوا، لیکن شریح بدستور مسند قضا پر متمکن رہے، ابن زبیرؓ اور عبدالملک کی جنگ کے زمانہ میں اپنا دامن بچانے کے لئے صرف چند برسوں کے لیے مستعفی ہو گئے تھے[3]۔

فیصلوں میں عدل :

ایک قاضی کا سب سے مقدم فرض اور سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں کسی خارجی اور داخلی اثر سے متاثر نہ ہو، اور کسی حالت میں بھی حق وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، شریح میں یہ وصف اس حد تک تھا کہ وہ قانون اور حق وانصاف کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی شخصیت اور بڑے سے بڑے تعلق کی پروہ نہ کرتے تھے۔ ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے خلاف فیصلہ دینے کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔ اگر ان کا لڑکا بھی قانون کی زد میں آجاتا تھا، تو اس کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے ایک لڑکے نے ایک ملزم کی ضمانت دی، ملزم بھاگ گیا۔ شریح نے اس کے بدلہ میں لڑکے کو قید کر دیا[4]۔ ایک مرتبہ ان کے اردلی نے ایک شخص کو کوڑوں سے مارا، انہوں نے مضروب سے اس کو کوڑے لگوائے[5]۔

ایک مرتبہ ان کے ایک ہم خاندان نے ایک شخص پر کچھ ناروا ظلم کیا، شریح نے اس کو ایک ستون میں بندھوا دیا۔ جب وہ فیصلہ کر کے اُٹھے، تو اس شخص نے کچھ کہنا چاہا، شریح نے کہا مجھ سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے تم کو نہیں قید کیا ہے، بلکہ حق نے قید کیا ہے[6]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۱ [2] استیعاب۔ جلد ۲۔ ص ۷۶ [3] ابن خلکان۔ ص ۲۲۴
[4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۲ [5] ایضاً۔ ص ۹۵ [6] ایضاً۔ ص ۹۳

اس حد تک انصاف عدل گستری کا کوئی غیر معمولی نمونہ نہیں ہے۔ شریح کے بعض ایسے واقعات بھی ہیں، جن کی مثالیں مشکل سے مل سکتی ہیں۔ ان کے ایک لڑکے اور بعض دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں تنازعہ تھا، لڑکے نے ان سے واقعات بتا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعویٰ کردوں ورنہ خاموش رہوں۔

شریح نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے دعویٰ کرنے کا مشورہ کیا، لیکن جب مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا، تو لڑکے کے خلاف فیصلہ دیا۔ فیصلہ دے کر جب گھر واپس آئے تو لڑکے نے کہا اگر میں نے پہلے آپ سے مشورہ نہ کرلیا ہوتا، تو مجھ کو آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا۔ شریح نے جواب دیا،

جان پدر تو مجھے ان لوگوں کے جیسے روئے زمین بھر کے آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے، لیکن خدا مجھے تجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مقدمہ دیکھنے کے بعد مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا، اگر میں اس وقت تجھ سے اس کو ظاہر کر دیتا تو تو ان سے صلح کر لیتا، اور ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔[1]

شہادت میں سچائی کا اہتمام یوں تو نہ کبھی جھوٹی شہادتوں کا انسداد ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے لیکن شریح حتی الامکان اخلاقی حیثیت سے جھوٹی شہادتوں کو روکنے کی کوشش کرتے تھے، اور گواہوں کو سمجھا کر جھوٹی شہادت سے روکتے تھے۔ اگر اس میں ناکامی ہوتی تو اسی شہادت پر فیصلہ دے دیتے، کیونکہ شہادت کے مقابلہ میں ذاتی علم کی کوئی حیثیت نہیں۔

علامہ ابن سیرین کا بیان ہے کہ شریح کو جب ثبوت کے گواہ مشکوک نظر آتے، مگر ان کی ظاہری صداقت پر کوئی گرفت نہ ہو سکتی، تو وہ پہلے گواہوں سے کہتے کہ میں نے تم کو طلب نہیں کیا اگر تم واپس جانا چاہو تو میں تم کو نہیں روکوں گا۔ تمہاری شہادت پر اس مقدمہ کا فیصلہ ہوگا، تمہاری شہادت سے میرا دامن محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن تم بھی اپنے کو بچاؤ۔ اگر گواہ سمجھانے سے باز نہ آتا تو مجبوراً اس کی شہادت پر فیصلہ کر دیتے کہ مجھ کو یقین ہے کہ تم اس معاملہ میں ظالم ہو مگر میں اپنے خیال و گمان پر فیصلہ نہیں کر سکتا، بلکہ ثبوت کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ جو چیز خدا نے تم پر حرام کی ہے میرا فیصلہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔[2]

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۹۲ [2] ایضاً۔ ص ۱۵۸

عزیز قریب کی شہادت کا قانون :

حدیث میں اعزہ قریب کی شہادت کی کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے ایک عزیز کے مقدمہ میں دوسرے ثقہ عزیز کی شہادت قبول کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ قاضی شریح نے عزیز کے مقابلہ میں عزیز کی شہادت نا قابل اعتبار قرار دی، اور یہ قانون بنا دیا کہ لڑکے کی شہادت باپ کے متعلق باپ کی شہادت لڑکے کے متعلق، بی بی کی شہادت شوہر کے متعلق شوہر کی شہادت بی بی کے متعلق اور غلام کی شہادت آقا کے متعلق اور اجیر کی شہادت اس شخص کے متعلق جس نے اس کو اجرت پر کیا ہو، قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس اصول پر وہ اس سختی سے عامل تھے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امام حسنؓ کی شہادت مسترد کر دی۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کہیں گر پڑی اور ایک ذمی کے ہاتھ لگی۔ حضرت علیؓ نے شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ شریح نے ذمی سے پوچھا تم کیا کہتے ہو، اس نے کہا میری ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ زرہ میرے قبضہ میں ہے۔

حضرت شریح نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کی کوئی شہادت ہے کہ زرہ گر گئی تھی انہوں نے حضرت حسنؓ اور قنبر کو شہادت میں پیش کیا۔ شریح نے کہا قنبر کی شہادت تو قبول کرتا ہوں، لیکن حسنؓ کی شہادت مسترد کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، آپ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ **الحسن والحسین سیدا شباب الجنۃ**۔ شریح نے کہا سنا ہے، لیکن میں باپ کے مقابلہ میں لڑکے کی شہادت معتبر نہیں سمجھتا، اس فیصلہ کو حضرت علیؓ نے تسلیم کر لیا، اور زرہ یہودی کے پاس رہنے دی۔

اس واقعہ کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے خود اقرار کر لیا کہ زرہ آپ ہی کی اور تمہارا دین سچا ہے۔ مسلمانوں کا قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے، اور وہ بلا چون و چرا سر خم کر دیتا ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد خدا کے سچے رسول تھے، حضرت علیؓ کو اس کے اسلام سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس یادگار میں انہوں نے زرہ اپنی طرف سے اس کو دے دی[1]۔

فقہ کی کتابوں میں یہ قانون حدیث کے حوالے سے منقول ہے، لیکن صاحب نصب الرایہ نے تصریح کر دی ہے، کہ یہ حدیث نہیں بلکہ شریح کا قول ہے[2]۔

---

[1] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۸۵ [2] نصب الرایہ باب من یقبل شہادتہ ومن لا یقبل

خفیہ تحقیقات :

شریح سے پہلے اسلامی عدالت میں خفیہ تحقیقات کا طریقہ رائج نہ تھا۔ سب سے پہلے اس کو شریح نے جاری کیا۔ چونکہ یہ نئی بات تھی اس لئے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ تم نے یہ بدعت کیوں جاری کی۔ انہوں نے جواب دیا، جب لوگوں نے نئی نئی باتیں جاری کیں تو میں نے بھی نئی بات جاری کی[1]۔ (یعنی جب نئے نئے جرائم ہونے لگے تو مجھ کو بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے)۔

جھوٹے حلف پر سچی شہادت کو ترجیح :

ثبوت کو قسم سے زیادہ اہم سمجھتے تھے، اور تنہا حلف کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے، بلکہ ثبوت کے ساتھ قسم لیتے تھے[2]۔ ایک مقدمہ میں ایک مدعی نے اپنے فریق سے قسم لے لی، قسم لینے کے بعد اس کے خلاف ثبوت پیش کیا، شریح نے کہا عادل ثبوت جھوٹی قسم سے زیادہ معتبر ہے[3]۔

اہلِ مقدمہ کو صفائی اور ثبوت کا موقع :

مدعی کو ثبوت اور ملزم کو صفائی کا پورا موقع دینا ہر عدالت کا فرض ہے، شریح اس کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ مقدمہ فیصل کر دینے کے بعد بھی اگر فریقین کچھ کہنا چاہتے تو اس کا موقع دیتے تھے، احنف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اس شریح کی عدالت میں گیا۔ انہوں نے ایک شخص کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس نے کہا ابھی جلدی نہ کیجئے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، شریح نے اسے موقع دیا جب وہ کہہ چکا تو کہا کیا میں چھوڑ دوں تم نے بہت فضول باتیں کیں تم نے جو کچھ کہا ہے اس پر ثبوت پیش کرو[4]۔

وہ خود اپنے فیصلے کے خلاف اپیل سننے کے لے تیار رہتے تھے، چنانچہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص میرے فیصلے کے خلاف دعویٰ کرے تو میرا فیصلہ اس وقت تک قائم رہے گا، جب تک مدعی اپنے دعویٰ کو ثابت نہ کر دے، حق بہر حال میرے فیصلے کے مقابلہ میں زیادہ حق ہے[5]۔

غیر جانبداری : مقدمات غیر جانبدارانہ کرتے تھے، کسی فریق کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے تھے، نہ کسی فریق سے جرح میں کمی کرتے تھے، اور نہ کسی فریق کو کوئی پوائنٹ بتاتے تھے[6]۔

۱؎ محاضرۃ الاوائل۔ ص ۹۷ ۲؎ ابن سعد۔ ص ۹۶ ۳؎ ایضاً ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۲
۵؎ ایضاً۔ ص ۹۳ ۶؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۲

رازداری: مقدمات میں پوری رازداری سے کام لیتے تھے، اور اس کی روداد کسی پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے لڑکے نے اپنے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کچھ پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ تم چاہتے ہو کہ میں تم کو تمہارے فریق پر بھڑکاؤں[1]۔

خاندانی رواج:

مقدمات میں خاندانی رواج کو قبول نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ چند غزالوں نے ایک مقدمہ دائر کیا ان میں سے بعض نے کہا کہ اس مقابلہ میں ہمارا خاندانی دستور یہ رہا ہے، شریح نے کہا تمہارے خاندانی دستور تمہارے گھر تک ہیں[2]۔

دلالوں کی مخالفت:

اہل مقدمہ کے دلالوں کے سخت مخالف تھے، انہیں اپنی عدالت سے نکلوا دیتے تھے اور لوگوں کو ان سے بچنے کی ہدایت کرتے تھے[3]۔

رشوت میں احتیاط:

رشوت سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے، مہذب دور میں رشوت ہدایا و تحائف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے بچنا بہت مشکل ہے، اس لئے شریح ہدیہ تو قبول کر لیتے تھے، لیکن رشوت سے محفوظ رہنے کے لئے فوراً اس کا بدل کر دیتے تھے[4]۔

آداب قضا: جب گھر سے عدالت جانے لگتے تو یہ کلمات کہتے، عنقریب ظالم اس حصہ کو جان لے گا، جو اس نے کم کیا ہے، اور ظالم کو سزا کا اور مظلوم کو مدد کا انتظار کرنا چاہئے[5]۔ بھوک اور غصہ کی حالت میں مقدمہ نہ کرتے تھے، اور عدالت سے اُٹھ جاتے تھے[6]۔

فیصلوں کی مقبولیت:

عموماً عدالت کے حکام جمہور کو خوش نہیں رکھ سکتے، عام حالات میں ان کے فیصلوں سے کسی نہ کسی جماعت کو شکایت ضرور رہتی ہے۔ لیکن شریح کے فیصلوں سے پبلک بہت مطمئن رہتی تھی، جابر بن زیاد کا بیان ہے کہ شریح ہمارے یہاں بصرہ میں قریب قریب ایک سال تک قاضی رہے، اس قلیل مدت میں انہوں نے ایسی بے مثل قضات کی کہ اس کے قبل اور مابعد کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی[7]۔

---

[1] ابن سعد ترجمہ شریح [2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۳ [3] ایضاً [4] ایضاً۔ ص ۹۹
[5] ایضاً۔ ص ۹۳ [6] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۴ [7] ایضاً۔ ص ۹۵

ان کے فیصلے علمی درس ہوتے تھے :

ان کے فیصلے اس قدر پُر از معلومات اور فاضلانہ ہوتے تھے کہ ان کی عدالت فقہا کی درس گاہ بن گئی تھی، بڑے بڑے علما فقہی واقفیت حاصل کرنے کے لئے ان کے فیصلے سننے کو آتے تھے۔ مکحول کا جو خود بہت بڑے عالم تھے۔ بیان ہے کہ میں چھ مہینہ تک شریح کی عدالت میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جاتا رہا، میں ان سے کچھ پوچھتا نہ تھا، ان کے فیصلے میری معلومات کے لئے کافی ہوتے تھے[1]۔

نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی :

چونکہ شریح نہایت ذہین اور طباع تھے، اس لئے اہل مقدمہ کی ظاہری حالت سے دھوکا نہ کھاتے تھے، ایک مرتبہ ایک عورت نے ایک مرد پر استغاثہ دائر کیا، اور عدالت میں آکر زار و قطار رونے لگی، امام شعبی بھی موجود تھے۔ انہوں نے شریح سے کہا یہ عورت مظلوم معلوم ہوتی ہے۔ شریح نے کہا رونا مظلومیت کا ثبوت نہیں ہے، برادران یوسف بھی باپ کے پاس روتے ہی ہوئے آئے تھے[2]۔

عبادت : علمی کمالات کے ساتھ وہ فضائل اخلاق سے بھی آراستہ تھے، بڑے دیندار اور عبادت گزار تھے، قضا کی ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کے باوجود ان کا بہائی وقت عبادت میں گزرتا تھا ان کے غلام ابو طلحہ کا بیان ہے کہ جب وہ صبح کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے تو گھر کے دروازے بند کر کے قریب قریب آدھے دن تک نوافل میں مشغول رہتے تھے[3]۔

سلام میں سبقت : طبعاً نہایت خوش اخلاق اور منکسر مزاج تھے، سلام میں ہمیشہ خود سبقت کرتے تھے، قاسم کا بیان ہے کہ کوئی شخص سلام میں شریح پر سبقت نہیں کر سکتا تھا، عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ میں ہمیشہ سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر کبھی کامیاب نہ ہوا[4]۔ میرا ان کا اکثر راہ میں سامنا ہوتا تھا، میں اس انتظار میں رہتا کہ اب سلام کروں اب سلام کروں کہ اتنے میں وہ قریب پہنچ کر السلام علیکم کہہ دیتے[5]۔

فتنہ سے کنارہ کشی :

وہ فتنہ و فساد ناپسند کرتے تھے، ان کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے، عبدالملک اور ابن زبیرؓ کا ہنگامہ برسوں جاری رہا، جس کی لپیٹ سے بہت کم لوگ محفوظ رہ سکے،

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ الطرق الحکمیہ ابن قیم۔ ص ۲۵ [2] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۲۴۴
[3] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۸ [4] ایضاً ص ۹۷ [5] ایضاً

لیکن شریح کا دامن اس سے بھی بچا رہا اس ہنگامہ کے زمانہ میں وہ چند برسوں کے لئے مستعفی ہو گئے تھے[1] اس میں پڑنے سے وہ اتنی احتیاط برتتے تھے کہ کسی سے اس کے حالات تک نہ پوچھتے تھے، لوگ بھی ان کی بے تعلقی دیکھ کر ان سے کوئی تذکرہ نہ کرتے تھے[2]۔

دوسروں کی راحت کا خیال :

دوسروں کی راحت کا اتنا خیال تھا کہ اپنے لئے کسی کو ادنیٰ تکلیف دینا بھی پسند نہ کرتے تھے، اپنے گھر کے تمام پرنالے اندر لگاتے تھے کہ اس کے پانی سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے[3]۔ اس معاملہ میں اتنے مبالغہ سے کام لیتے تھے کہ اگر ان کے گھر میں کوئی موت ہوتی تو دوسروں کی زحمت کے خیال سے کسی کو خبر نہ کرتے، اور راتوں رات دفن کر دیتے، اگر کوئی شخص مریض کی حالت پوچھتا تو کہہ دیتے اب سکون ہے، اپنے لڑکوں تک کو انہوں نے بغیر اطلاع دیئے ہوئے دفن کر دیا[4]۔

ظرافت وخوش طبعی :

طبیعت میں ظرافت وخوش طبعی کا مادہ زیادہ تھا۔ کان رجلا مزاحاً کبھی کبھی سنجیدہ مواقع پر بھی ان کی ظرافت گلفشانی کر جاتی تھی۔ ایک مرتبہ عدی بن ارطاۃ نے ان کے سامنے ایک دعویٰ پیش کیا دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

عدی : میں آپ کے سامنے کچھ باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔
شریح : فرمایئے، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔
عدی : میں شام کا رہنے والا ہوں۔
شریح : اتنے دور دراز مقام کے (مزاحاً)۔
عدی : میں نے آپ کے یہاں شادی کی ہے۔
شریح : ابالوفاء والبنین شادی مبارک ہو۔
عدی : میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔
شریح : شوہر اپنی بیوی کا حقدار اور مختار ہے۔
عدی : لیکن اس نے اپنے گھر میں رہنے کی شرط کر لی تھی۔
شریح : تو پھر شرط پوری کرنی چاہئے۔
عدی : آپ ہمارا فیصلہ کر دیجئے۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۲۴　[2] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۷　[3] ایضاً۔ ص ۹۸　[4] ایضاً ص ۹۹

شریح : فیصلہ کر دیا۔
عدی : کس کے خلاف۔
شریح : تمہاری ماں کے لڑکے کے (یعنی تمہارے)
عدی : کس کی شہادت پر۔
شریح : تمہارے ماموں کی بہن کے لڑکے کی شہادت پر (یعنی خود تمہاری شہادت پر) کیونکہ عدی نے خود اقرار کر لیا تھا کہ بیوی سے گھر میں رہنے کی شرط کر لی تھی۔

لطائف : ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بعض اوقات دلچسپ لطائف پیش آجایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بدوی نے ان سے پوچھا تم کس خاندان سے ہو، انہوں نے جواب دیا ان لوگوں میں سے ہوں جن کو خدا نے اسلام کے انعام سے نوازا ہے۔ یہ جواب سن کر وہ اعرابی ان کے پاس سے چلا گیا، اور لوگوں سے کہا، خدا کی قسم تمہارا قاضی اپنا خاندان بھی نہیں جانتا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس نے کہا کہ تم لوگوں نے مجھ کو ایک غلام کے پاس بھیج دیا[1]۔ (کیونکہ عموماً غلام یا وہ لوگ جن کا کوئی قابل ذکر نسب نہ ہوتا تھا اسلام کی طرف اپنا انتساب کرتے تھے)۔

ان میں اور ابن زیاد میں سخت اختلاف تھا۔ ابن زیاد ایک مرتبہ طاعون میں مبتلا ہوا، اس کی سمیت کا اثر داہنے ہاتھ پر زیادہ تھا۔ اطبا نے اس کو کٹوانے کا مشورہ دیا۔ اس نے شریح سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اس سے اختلاف کیا۔ ان سے پوچھا ان کے مشورے اور کچھ خوف سے ہاتھ نہیں کٹوایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سمیت کے اثر سے مر گیا۔ لوگوں نے شریح کو بڑی ملامت کی کہ تم نے محض دشمنی کی وجہ سے ہاتھ نہیں کٹوانے دیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مشیر امین ہوتا ہے اس لئے اگر مجھے اس کی خیر خواہی کا خیال نہ ہوتا تو میں تو یہ چاہتا کہ ایک دن اس کا ہاتھ کاٹا جائے ایک دن پاؤں کاٹا جائے۔ اسی طریقہ سے روزانہ اس کے تمام اعضاء جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ کر الگ کر دیئے جائیں[2]۔

ایک مرتبہ ان کی عدالت میں ایک شخص نے ایک گواہ کو جس کا نام ربیعہ تھا پکارا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی خاموشی پر پکارنے والے نے جھلا کر دوبارہ کافر کہہ کر پکارا۔ اس خطاب پر وہ بول اٹھا، شریح نے اس پر یہ ظریفانہ الزام لگایا کہ تم نے کفر کا اقرار کر لیا۔ اس لئے تمہاری شہادت قبول نہیں کی جا سکتی[3]۔

وفات : آخر میں ضعف پیری کی وجہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔ استعفا کے کچھ دنوں بعد بیمار پڑے عمر ایک سو سال سے تجاوز ہو چکی تھی، زیست کی امید باقی نہ تھی، اس لئے دم آخر لوگوں کو ہدایت کی قبر بغلی

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۰۔ ۹۱ ۲؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۲۴ ۳؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۵

کھودی جائے، جنازہ کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، جنازہ کے ساتھ نوحہ نہ کیا جائے، جنازہ کو آہستہ آہستہ لے جایا جائے، قبر پر چادر نہ ڈالی جائے، ان وصایا کے بعد انتقال فرمایا، وفات میں اختلاف ہے۔ ۷۶ھ سے لے کر ۷۹ھ تک کسی سن میں انتقال کیا[1]۔

حلیہ: شرح اطلس تھے یعنی پیدائشی طور پر ڈاڑھی مونچھ نہ تھی[2]۔

تنخواہ: پانسو ماہوار تنخواہ پاتے تھے[3]۔

(۳۴) صفوان بن سلیم زہریؒ

نام ونسب: صفوان نام، ابو عبداللہ کنیت، والد کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض سلیم اور بعض سلام لکھتے ہیں، مدینہ کے ممتاز تابعین میں تھے۔

فضل وکمال: اگرچہ صفوان کا اصل طغرئے کمال ان کا زہد وورع تھا۔ لیکن فضائل علمی سے بھی وہ تہی دامن نہ تھے۔ حافظ ذہبی ان کو ثقہ حجۃ اور اعلام میں لکھتے ہیں[4]۔

حدیث: حدیث میں انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ انس بن مالکؓ ابوامامہؓ سعید بن مسیب عبدالرحمٰن بن اغنم، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن۔ سعید بن سلمہ، عبداللہ بن سلیمان الاغر۔ عبدالرحمٰن ابن سعد، اور عطاء بن یسار وغیرہ سے فیض اٹھایا تھا[5]۔ اور زید بن اسلم، ابن منکدر، موسیٰ بن عقبہ، ابن جریج، یزید بن حبیب، مالک بن انس۔ اکابر علماء کی بڑی جماعت ان کے تلامذہ میں تھی[6]۔

فقہ: فقہ میں بھی انہیں درک تھا اور ان کا شمار مدینۃ الرسول کے فقہاء میں تھا[7]۔ ابن عماد حنبلی انہیں فقیہ القدوہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں[8]۔

عبادت وریاضت: ان کا امتیازی وصف ان کا زہد وورع اور عبادت وریاضت ہے اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ وہ خدا کے بہترین بندوں میں تھے، ان کے وسیلہ سے پانی کی دعا کی جاتی تھی[9]۔

بڑی سخت عبادتیں کرتے تھے، نیند کے خوف سے جاڑوں کے موسم میں کھلی چھت پر اور گرمیوں میں بند مکان میں عبادت کرتے تھے کہ سردی اور گرمی کے غلبہ سے نیند نہ آنے پائے،

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۹ [2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۲۴ [3] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۹۵
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰۔ [5] تہذیب التہذیب جلد ۴۔ ص ۴۲۵ [6] ایضاً [7] ایضاً
[8] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۸۹ [9] ایضاً

نمازیں پڑھتے پڑھتے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے اور تھک کر گر پڑتے تھے[1] سجدوں کی کثرت سے پیشانی زخمی ہوگئی تھی[2]۔

عبادت کی معراج کمال :

کمال کی آخری حد یہ ہے کہ پھر اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ صفوان عبادت کے اسی ذروہ کمال پر فائز تھے، ابوحمزہ کا بیان ہے کہ میں نے صفوان کو عبادت کے اس درجہ پر دیکھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کل قیامت ہے تو جس حد تک وہ پہنچ چکے تھے اس میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا[3]۔

انفاق فی سبیل اللہ :

خدا کی راہ میں انفاق کا یہ حال تھا کہ بدن کے کپڑے تک اتار کر دے دیتے تھے۔ ایک شب کو مسجد سے نکلے، سردی سخت تھی، مسجد کے باہر ایک آدمی ننگے بدن نظر آیا۔ صفوان نے اسی وقت اپنے جسم کے کپڑے اتار کر دے دیئے[4]۔

دولت دنیا سے بے نیازی :

استغناء اور بے نیازی کے اس درجہ پر تھے کہ سلاطین اور فرماں روان کی خدمت کرنا چاہتے تھے، مگر وہ قبول نہ کرتے تھے، مسجد نبوی میں عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ آئے، اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہمراہ مسجد نبوی دیکھنے کے لئے گیا ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد مقصورہ کا دروازہ کھولا تو اس میں صفوان نظر آئے سلیمان انہیں پہچانتا نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز سے پوچھا یہ کون بزرگ ہیں، ان کے بشرہ سے بہتر آثار میں نے نہیں دیکھے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے کہا امیر المومنین یہ صفوان بن سلیم ہیں، ان کا نام سن کر اس نے غلام کو پانسو دینار کی تھیلی ان کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، غلام نے لے جا کر پیش کی کہ یہ امیر المؤمنین کی جانب سے نذر ہے، وہ یہاں موجود ہیں۔ صفوان نے کہا تم کو دھوکا ہوا ہے، کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی۔ غلام نے عرض کیا آپ صفوان نہیں ہیں، فرمایا، ہوں تو میں ہی۔ غلام نے کہا تو آپ ہی کو دیا ہے، فرمایا جاؤ، دوبارہ پوچھ آؤ۔ جیسے ہی غلام پوچھنے کے لئے لوٹا صفوان فوراً جوتا اٹھا کر مسجد سے نکل گئے اور پھر جتنی دیر سلیمان مسجد میں رہا نہ دکھائی دیئے[5]۔

وفات : ۱۳۲ھ میں وفات پائی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰　[2] ایضاً　[3] صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۴۸　[4] ایضاً
[5] صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۴۸

(۳۴) صفوان بن محرزؒ

نام ونسب : صفوان نام، نسبی تعلق قبیلہ بنی تمیم کی شاخ بنی مازن سے تھا۔ بصرہ کے عابد وزاہد تابعین میں تھے۔

فضل وکمال : علم میں کوئی امتیازی حیثیت نہ رکھتے تھے تاہم اس سے بالکل تہی دامن بھی نہ تھے بصرہ کے علماء باعمل میں شمار تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان له فضل وورع۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، صفوان بن محرز المازنی احد العلماء العاملین[1]۔

حدیث میں انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، عمران بن حصینؓ اور حکیم بن حزام وغیرہ اکابر صحابہ سے استفادہ کیا تھا[2]۔

ابوحمزہ، جامع بن شداد، خالد بن عبداللہ الاشج، عاصم الاحول، قتادہ، محمد بن واسع اور علی بن زید بن جدعان وغیرہ آپ کے زمرۂ تلامذہ میں تھے[3]۔

عمل کا درجہ : صفوان کے نزدیک تنہا علم کی کوئی حیثیت نہ تھی جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ فرماتے تھے کہ ہم کو علم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک اس پر عمل نہ کریں، کاش میں کچھ نہ جانتا ہوتا[4]۔

زہد وعبادت : ان کی پوری زندگی اس اصول کا عملی نمونہ تھی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے عابد تابعین میں تھے[5]۔

گداز قلب : روح کا آئینہ نگار اشک سے جلا پاتا ہے اور دل کی کھیتی آنسوؤں کی آبیاری سے ہری ہوتی ہے۔ صفوان کی آنکھیں شمع سوزاں تھیں، انہوں نے ایک کنج یا غار بنالیا تھا جس میں بیٹھ کر رویا کرتے تھے اور صرف نماز کے اوقات میں اس سے باہر نکلتے تھے۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر فوراً اسی میں چلے جاتے تھے[6]۔

ذکر وشغل : آپ کا ذکر وشغل حدیث خوانی تھا۔ جریر کا بیان ہے کہ صفوان اور ان کے بھائی مذاکرہ حدیث کے لئے جمع ہوتے تھے، اس حلقہ میں جب کیفیت اور رقتِ قلب محسوس نہ ہوتی تو

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۷ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۲
۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۴۳۰ ۴۔ صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۹
۵۔ ایضاً۔ ص ۱۹۵ وتہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۴۳۰ ۶۔ ابن سعد۔ جلد ۷ ق اول۔ ص ۱۰۷

حاضرین ان سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کرتے۔ان کی زبان سے جیسے ہی الحمد اللہ نکلتا حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور مشکیزہ کے منہ کی طرح ان کے آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلتے[1]۔

قیامِ لیل : آپ کی عبادت کا خاص وقت شب کا تھا۔تہجد پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے[2]۔

دنیا سے کنارہ کشی :

دنیا اور اس کی نعمتوں سے کبھی دامن آلودہ نہ ہوا۔فرماتے تھے،اگر مجھے کھانے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا جس سے توانائی قائم رہ سکے اور پینے کے لئے پانی کا ایک کوزہ مل جائے تو پھر مجھے دنیا اور اہلِ دنیا کی ضرورت نہیں[3]۔

دنیا کو کارواں سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔چنانچہ مستقل گھر نہیں بنایا۔رہنے کے لئے ایک چھپر تھا۔اس کی مرمت تک نہ کراتے تھے۔

ایک مرتبہ اس کی ایک لکڑی ٹوٹ گئی لوگوں نے کہا اس کو درست کر لیجئے فرمایا کل مرنا ہے اگر گھر کا حقیقی مالک اس میں زیادہ ٹھہرنے کا موقع دیتا تو درست کر لیتا[4]۔

خانۂ خدا کا احترام :

خانہ خدا میں ہنگامہ آرائی مسجد کے احترام کے خلاف سمجھتے تھے اور ایسے موقع پر مسجد سے چلے جاتے تھے۔ایک مرتبہ کچھ لوگ مسجد میں لڑ رہے تھے آپ یہ کہہ کر وہاں سے ہٹ گئے کہ ''تم لوگ جنگجو ہو''[5]۔

فرمانِ رسول ﷺ کا پاس :

فرمانِ رسول ﷺ کا مرتے دم تک پاس رہا۔مرض الموت میں گھر والوں سے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان پیشِ نظر رہے کہ'' چلا کر بین کرنے والا ،سر نوچنے والا اور کپڑے پھاڑنے والا ہماری جماعت میں نہیں ہے''[6]۔

وفات : اس مرض میں وفات پائی۔سنہ وفات معین طور پر نہیں بتایا جاسکتا۔ابن حبان نے ۷۴ ھ لکھا ہے لیکن یہ قابلِ اعتبار نہیں۔

---

[1] ابن سعد۔جلد ۷ ق اول۔ص ۱۰۷ [2] تہذیب التہذیب۔جلد ۴۔ص ۴۳۰ [3] ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۱۰۷ [4] ایضاً [5] ایضاً۔ص ۱۰۸ [6] ایضاً

(۳۵) طاؤس بن کیسانؒ

نام ونسب: طاؤس نام، عبدالرحمٰن کنیت، بحیر بن ریسان حمیری کے غلام تھے۔ ان کے والد نسلاً عجمی تھے لیکن آل ہمدان سے تعلقات پیدا کرکے یمن کے شہر جند میں بودوباش اختیار کرلی تھی۔

فضل وکمال: فضل وکمال کے اعتبار سے طاؤس کا شمار کبار تابعین میں تھا۔ علامہ نووی لکھتے ہیں، طاؤس صاحب علم وفضل اور کبار تابعین میں تھے ان کی جلالت، فضیلت وفور علم اور صلاح وحفظ پر سب کا اتفاق ہے[۱]۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ امام اور علم وعمل کے اعتبار سے علماء اعلام میں تھے[۲]۔

حدیث: حدیث کے اعتبار سے وہ بڑے حافظ تھے۔ ان کا حفظِ حدیث ارباب علم میں مسلم تھا[۳]۔ پچاس صحابہ کے دیدار کا شرف حاصل تھا، ان میں عبداللہ بن عمرؓ، عمرو بن عباس، ابن عمر بن العاصؓ، ابن زبیرؓ، زید بن ارقمؓ، زید بن ثابتؓ، ابوہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، سراقہ بن مالکؓ، صفوان بن امیہؓ اور جابرؓ وغیرہ صحابہ کرام کے سرچشمۂ علم سے سیراب ہوئے تھے۔ حبر الامۃ عبداللہ بن مسعودؓ سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ استفادہ کیا تھا[۴]۔

فقہ: فقہ میں بڑا پایہ تھا۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں: **کان فقیها جلیل القدر رفیع الذکر**[۵]۔

تلامذہ: تلامذہ کا دائرہ بھی خاصا وسیع تھا۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں، آپ کے صاحبزادے عبداللہ، وہب بن میسرہ، حبیب بن ابی ثابت، اصم بن عتیبہ، حسن بن مسلم، سلیمان بن موسیٰ، عبدالکریم حزری، عبدالملک بن میسرہ، عمرو بن شعیب، عمرو بن دینار، عمرو بن مسلم قیس بن سعد، مجاہد لیث، ابوسلیم اور ہشام وغیرہ[۶]۔

معاصر علماء میں ان کا درجہ:

علمی اعتبار سے ان کا شمار اس عہد کے اکابر علماء کے زمرہ میں تھا۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے عبداللہ بن یزید سے پوچھا کہ تم کن لوگوں کے ساتھ ابن عباسؓ کے پاس جاتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا، عطاء اور ان کی جماعت کے ساتھ۔ میں نے کہا اور طاؤس، انہوں نے کہا وہ خواص کے ساتھ جاتے تھے[۷]۔

۱۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۵۱　　۲۔ شذرات الذہب جلد اول۔ ص ۱۳۳
۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۵۱　　۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۹
۵۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۳۲　　۶۔ ایضاً　　۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۹۱

اربابِ علم کا اعتراف :

اس عہد کے تمام ارباب علم ان کے کمالِ علم کے معترف تھے۔ عمرو بن دینار کہتے تھے کہ میں نے کسی شخص کو طاؤس کے برابر نہیں دیکھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ یمن کے ابن سیرین تھے، سعید بن ابی سیرین کا بیان ہے کہ قیس بن سعد کہتے تھے کہ طاؤس ہمارے یہاں کے ابن سیرین ہیں[۱]۔ بعض علماء انہیں حضرت ابن جبیرؓ کا ہم پایہ سمجھتے تھے۔ عثمان دارمی کا بیان ہے کہ میں نے ابن معین سے پوچھا کہ آپ کو طاؤس زیادہ پسند ہیں یا سعید بن جبیر؟ انہوں نے کسی کو ترجیح نہیں دی[۲]۔

زہد وعبادت : اس علم کے ساتھ طاؤس میں اسی درجہ کا عمل بھی تھا۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ یمن کے عبادت گزار لوگوں میں تھے[۳]۔ کثرتِ عبادت سے پیشانی پر نشانِ سجدہ تاباں تھا، بسترِ مرگ پر بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے[۴]۔ چالیس حج کئے[۵]۔ طواف میں خاموش رہتے تھے کسی بات کا جواب نہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ طواف نماز ہے[۶]۔

انفاق فی سبیل اللہ: خدا کی راہ میں بھی حسب استطاعت صرف کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سزا یاب کو اس کا جرمانہ ادا کر کے چھڑایا[۷]۔

دولتِ دنیا سے بیزاری : دنیا اور اس کی خواہشوں سے بالکل بے نیاز تھے۔ کبھی دنیاوی نعمتوں کی خواہش نہیں کی ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ "خدایا مجھے مال اور اولاد سے محروم رکھ اور اس کے بدلہ میں ایمان و عمل کی دولت عطا فرما[۸]۔"

اہل دنیا سے بے تعلقی ارباب حکومت اور ثروت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے اور ان کے شر سمجھتے تھے۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ حکومت اور حکمرانوں سے گریز کرنے والے تین آدمی تھے، ابوذر صحابی اپنے زمانے میں اور طاؤس و ثوری اپنے زمانے میں[۹]۔ فرماتے تھے ارباب شرف و دول سے زیادہ کسی کو شر نہیں دیکھا[۱۰]۔

امراء اور سلاطین کا معمولی احسان اٹھانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہب بن منبہ کے ہمراہ حجاج بن یوسف کے بھائی محمد کے یہاں گئے۔ اس وقت سردی زیادہ تھی، اس لئے محمد بن

---

۱. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۲ ۲. تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۹ ۳. ایضاً ۴. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۲ ۵. ص ۳۵۹ ۵. تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۹ ۶. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۳
۷. ایضاً۔ ص ۳۹۲ ۸. ایضاً ۹. تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۱۰ ۱۰. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۲

یوسف نے ان کے اوپر ایک چادر ڈلوادی مگر انہوں نے کندھا ہلا کر گرادیا۔ محمد کو یہ بہت ناگوار ہوا، یہاں سے اٹھنے کے بعد ان کے ہمراہی وہب نے ان سے کہا کہ اگر تم کو چادر کی ضرورت نہ تھی تو بھی لوگوں کو محمد کے غصہ سے بچانے کے لئے تم کو اس وقت لے لینا چاہئے تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے بیچ کر اس کی قیمت مساکین میں تقسیم کر دیتے۔ انہوں نے جواب دیا، اگر اس کا خیال نہ ہوتا کہ میرے بعد لوگ میرے اس فعل کو سند جواز بنائیں گے تو ایسا کرتا[1]۔

تحصیلداری کا عہدہ :

ایک مرتبہ محمد بن یوسف نے انہیں چند دنوں کے لئے تحصیلداری کے عہدہ پر مامور کر دیا ان کے جیسے شخص کو اس عہدہ سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی، وہ جس طرح اس کام کو کرتے تھے اس کی تفصیل خود ان کی زبان سے یہ ہے ابراہیم بن میسرہ نے ان سے پوچھا آپ تحصیلداری کے زمانہ میں کیا کرتے تھے فرمایا میں باقی دار سے کہتا تھا خدا تم پر رحم کرے اس نے تم کو جو عطا کیا، اس کو (شریعت کا حق دے کر) پاک کرو ما گردہ اس کہنے پر خراج دے دیتا تھا۔ تو لے لیتا تھا اور اگر کوئی اعراض کرتا تھا تو میں اسے بلاتا نہ تھا[2]۔

خلفاء کو نصیحت :

قیام عدل و خدمت خلق کا دارو مدار صالح عہدہ داروں پر ہے اس لئے طاؤس سلاطین اور خلفاء کو حکام کے انتخاب کے باب میں نصیحت کیا کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انہیں لکھ بھیجا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے تمام کام اچھے ہوں تو اچھے لوگوں کو عہدہ دار بنائیں، انہوں نے جواب میں لکھا کہ میری بھلائی کے لئے آپ کی نصیحت کافی ہے[3]۔

ان کے صاحبزادے عبداللہ بھی بالکل ان کے ہم رنگ تھے۔ ایک مرتبہ ابوجعفر منصور عباسی نے انہیں اور امام مالک کو بلا بھیجا یہ دونوں گئے، منصور نے عبداللہ سے کہا کہ اپنے والد کی کوئی حدیث سنایئے؟ انہوں نے یہ حدیث سنائی کہ "قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو خدا کی حکومت میں شرک کرے گا" یعنی اس میں ظلم کو شریک بنائے گا۔ یہ نصیحت آموز حدیث سن کر منصور خاموش ہو گیا تھوڑی دیر خاموشی کے بعد منصور نے تین مرتبہ عبداللہ سے دوات اٹھانے کے لئے کہا مگر انہوں نے تعمیل نہیں کی۔ منصور نے کہا دوات کیوں نہیں اٹھاتے؟ انہوں نے کہا اس لئے کہ اگر تم اس سے کوئی ظالمانہ حکم لکھو گے تو اس میں میری شرکت بھی ہو جائے گی۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۴ [2] ایضاً۔ ص ۲۹۳ [3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۳۳

ان کی یہ کھری باتیں سن کر منصور نے دونوں کو اٹھا دیا، عبداللہ نے کہا کہ ہم تو یہی چاہتے تھے، امام مالک کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے میں عبداللہ کے فضل کا معترف ہو گیا[1]۔

قرآن کا احترام :

وہ کلام الٰہی سے مالی فائدہ اٹھانے کو نہایت برا اور احترام قرآن کے منافی سمجھتے تھے، ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو قرآن مجید کا ہدیہ کرتے سنا تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھنے لگے[2]۔

نوجوانوں کی اصلاح :

نوجوانوں کی جدت آمیز وضع قطع اور چال ڈھال کو سخت ناپسند کرتے تھے، ایک مرتبہ قریش کے چند خوش پوش اور جدت پسند نوجوانوں کو طواف کی حالت میں دیکھ کر ٹوکا کہ تم لوگ ایسا لباس پہنتے ہو جو تمہارے اسلاف نہ پہنتے تھے، اور ایسی اٹھلاتی ہوئی چال چلتے ہو کہ ہیجڑے بھی نہیں چل سکتے[3]۔

عید المومنین :

عید کی خوشی منانا ضروری سمجھتے تھے، اس دن اپنی تمام لونڈیوں کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگواتے تھے اور فرماتے تھے یہ عید کا دن ہے[4]۔

وفات : جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے وہ حج بکثرت کرتے تھے اس کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا، خدا نے ان کے اس ذوق کو حسن قبول بخشا، چنانچہ ۱۰۱ھ کے حج کے موسم میں مکہ ہی میں ترویہ سے ایک دن پہلے انتقال کیا، اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے ارض مکہ میں مقیم ہو گئے[5]۔ حج کی وجہ سے جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ لے جانا دشوار ہو گیا، ابراہیم بن ہشام مخزومی نے انتظام کے لئے پولیس بھیجی، پھر اتنا مجمع تھا کہ جنازہ اٹھانے والوں کے کپڑے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اور ہزاروں حاجیوں کے ہاتھوں مدفون ہوئے[1]۔

(۳۶) عامر بن شراحیل الشعبیؒ

نام ونسب : عامر نام، ابو عمر کنیت، شعبی قبیلہ کی نسبت ہے لیکن شہرت کی وجہ سے اس نسبت نے لقب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یمن کے نامور حمیری خاندان میں حسان بن عمرو ایک مشہور اور تاریخی

۱؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۳۳ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۳ ۳؎ ایضاً۔ ص ۳۹۵
۴؎ ایضاً۔ ص ۳۹۳ ۵؎ ایضاً۔ ص ۳۹۵ ۱؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۳۳

شخص گزرا ہے۔ یہ شخص یمن کی ایک پہاڑی ذوالشعبین میں پیدا ہوا تھا اور مرنے کے بعد یہیں دفن ہوا اس لئے وہ خود ذوالشعبین مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد اس نسل میں بھی یہ نسبت قائم رہی، اس کی نسل کی ایک شاخ فتوحات اسلامی سے قبل ہمدان میں آباد تھی پھر اسلامی عہد میں کوفہ میں بس گئی۔ یہ شاخ شعبی کہلاتی تھی، عامر بن شراحیل اسی شاخ سے تھے۔ حسان بن عمرو کے اوپر اس خاندان کا نسب نامہ یہ ہے: بنی حسان بن عمرو بن قیس بن معاویہ بن جشم بن عبد شمس بن وائل بن غوث بن قطن بن عریب بن زہیر بن ایمن بن ہمیسع بن حمیر۔

پیدائش: عامر الشعبی کے سنہ ولادت کے بارہ میں مختلف روایات ہیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ وہ جنگ جلولاء کے سال پیدا ہوئے[1]۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ ان کی ماں جلولاء کے قیدیوں میں تھیں جو ان کے والد شراحیل کے حصہ میں پڑی تھیں۔ اس حساب سے ان کی پیدائش ۱۹ھ میں ہوئی۔

تعلیم: عامر کے ہوش سنبھالنے کے وقت صحابہ کرام کی بہت بڑی جماعت موجود تھی، اور ان کی بود و باش بھی ایسے مرکزی مقام پر تھی، جہاں بہت سے صحابہ اقامت پذیر تھے اور ان کی آمد رفت رہتی تھی۔ اس لئے انہیں پانچ سو ۵۰۰ صحابہ کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ان میں اڑتالیس ۴۸ سے فیض اٹھایا تھا[2]۔ حبر الامت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں آٹھ ۸ دس مہینہ مستقل قیام کر کے ان کے کمالات سے فیضیاب ہوئے تھے[3]۔ ان بزرگوں کے فیض نے ان کو امام عصر بنا دیا۔

فضل و کمال: علمی لحاظ سے وہ اپنے عہد کے امام تھے، حافظ ذہبی ان کو امام، حافظ، فقیہ، اور متقن[4] اور ابن عماد حنبلی امام البحر العلامہ لکھتے ہیں[5]۔ انہیں جملہ علوم میں یکساں کمال حاصل تھا، ابو اسحٰق الحبال کا بیان ہے کہ شعبی جملہ علوم میں یگانہ عصر تھے قرآن، حدیث، فقہ، مغازی، ریاضی اور ادب و شاعری سب میں انہیں یکساں دستگاہ حاصل تھی[6]۔

قرآن: قرآن کے اتنے ممتاز قاری تھے کہ زعیم القراء کہلاتے تھے[7]۔ تفسیر میں بھی انہیں پورا درک تھا، لیکن احتیاط کی وجہ سے انہوں نے مفسر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں حاصل کی، وہ تفسیر قرآن میں بڑے محتاط تھے، ہر شخص کو اس کا مجاز نہیں سمجھتے تھے، زکریا بن ابی زائدہ کا بیان ہے کہ شعبی ابو صالح کے پاس سے گزرتے تو ان کے کان پکڑ کر کہتے کہ تم قرآن نہیں پڑھتے، اور اس کی تفسیر بیان کرتے ہو[8]۔

۱۔ ابن سعد۔ ص ۱۷۲ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۷ ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۲
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۹ ۵۔ شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۱۲۶ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۹
۷۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۰ ۸۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۳

حدیث : حدیث کے جلیل القدر حافظ بلکہ امام العصر تھے۔انہوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی بڑی جماعت سے سماع حدیث کیا تھا۔صحابہ میں حضرت علیؓ ،سعد بن ابی وقاصؓ ،سعید ابن زیدؓ، زید بن ثابتؓ، قیس بن عبادہؓ، قرظ بن ؓ کعب ،عبادہ بن صامتؓ ،ابوموسیٰ اشعریؓ ،ابومسعود انصاریؓ، ابو ہریرہؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، نعمان بن بشیرؓ، ابو ثعلبہ خشنیؓ ،جریر بن عبداللہ بجلیؓ ، بریدہ ابن حصیبؓ ، براء بن عازبؓ ،معاویہؓ، جابر بن عبداللہؓ، جابر بن سمرہؓ ،حارث بن مالکؓ، حبشی ابن جنادہ، حسین بن علیؓ، زید بن ارقمؓ، ضحاک بن قیسؓ ،سمرہ بن جندبؓ، عامر بن شہرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ ،عبداللہ بن مطیعؓ ،عبدالرحمن بن سمرہؓ، عدی بن حاتمؓ ،عروہ بن جعد البعارقیؓ ،عروہ بن مضرسؓ، عمرو بن امیہؓ، عمرو بن حریث، عمران بن حصینؓ، عوف بن مالکؓ، عیاض اشعریؓ، کعب بن عجرہؓ، محمد بن سیفیؓ، مقدام بن معدیکربؓ، وابصہ بن معبدؓ، ابی جبیرہ بن ضحاکؓ، ابو سریحہ ؓ غفاریؓ، ابو سعید خدریؓ، اور صحابیات میں ام سلمہؓ، میمونہ بنت حارثؓ، اسماء بنت انیسؓ، فاطمہ بنت قیسؓ اور ام ہانی وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا۔ان میں سے بعض مرسل روایات ہیں۔صحابہ کے علاوہ تابعین کی بہت بڑی تعداد سے استفادہ کیا تھا[۱]۔

تلاشِ حدیث میں مشقت :

حدیث کا انہیں خاص ذوق تھا اور اس کو انہوں نے بڑی مشقت سے حاصل کیا تھا۔ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اتنا علم کہاں سے حاصل کیا۔انہوں نے جواب دیا، غم واندوہ کو بھلا کر ملکوں کی سیاحت کر کے گدھوں کی طاقت برداشت اور کوؤں کی سحر خیزی کے ذریعہ[۲]۔

قوتِ حافظہ :

حافظہ اتنا قوی تھا کہ کبھی کاغذ قلم اور دوات کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے ایک مرتبہ جو حدیث سن لی وہ ہمیشہ کے لئے سینہ میں محفوظ ہوگئی۔ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی بیاض کو کتابت سے سیاہ نہیں کیا یعنی کبھی لکھا نہیں۔جب کسی نے کوئی حدیث سنائی تو وہ میرے سینہ میں محفوظ ہوگئی اور اسکے دوبارہ سننے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی[۳]۔

اخذِ حدیث میں احتیاط :

لیکن دوسروں سے حدیثوں کے لینے میں وہ بڑے محتاط تھے ان ہی لوگوں سے احادیث لیتے تھے جو علم کے ساتھ عقل وتقویٰ کے زیور سے آراستہ ہوتے۔اس میں ان کا اصول یہ تھا کہ علم اسی

۱؎ تہذیب التہذیب۔جلد۵۔ص۶۶　۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول۔ص۷۱　۳؎ ایضاً۔ص۷۳

شخص سے حاصل کرنا چاہئے جس میں زہد و عبادت اور عقل و دانش دونوں جمع ہوں۔ تنہا عقل یا تنہا تقویٰ رکھنے والا علم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا[1]۔

حدیث میں وسعتِ علم :

حدیث میں ان کے علم کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے بیس سال کے عرصہ میں کسی سے کوئی ایسی نئی حدث نہیں سنی جس سے میں بیان کرنے والے سے زیادہ واقف نہ رہا ہوں[2]۔ اہلِ حجاز، بصرہ اور کوفہ تینوں علمی مرکزوں کے محدثین کی احادیث کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا[3]۔ سنن کے بھی بڑے عالم تھے۔ مکحول کا بیان ہے کہ میں نے شعبی سے زیادہ سنتِ ماضیہ کا عالم نہیں دیکھا[4]۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے تھے کہ شعبی صاحب آثار تھے اور ابراہیم صاحب قیاس[5]۔

احتیاط فی الحدیث :

لیکن اس وسعتِ علم کے باوجود وہ خود روایتِ حدیث میں بڑے محتاط تھے۔ زیادہ روایت کرنا پسند نہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ گذشتہ صلحاء زیادہ حدیثیں بیان کرنا برا سمجھتے تھے اگر مجھے یہ پہلے سے معلوم ہوتا جو بعد میں معلوم ہوا تو میں صرف محدثین کی متفقہ حدیثیں بیان کرتا[6]۔

روایت بالمعنی :

لیکن روایت بالمعنی کو خلافِ احتیاط نہیں سمجھتے تھے یعنی روایت میں الفاظ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عون کا بیان ہے کہ شعبی حدیثیں بالمعنی روایت کرتے تھے[7]۔

فقہ : اگرچہ ان کو جملہ علوم و فنون میں یکساں درک حاصل تھا لیکن ان کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا۔ اس میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ سمجھے جاتے تھے۔ ابوالحسن کہتے تھے کہ میں نے کسی کو شعبی سے بڑا فقیہ نہیں پایا۔ بعض علماء تو انہیں اس عہد کے کل آئمہ پر ترجیح دیتے تھے۔ ابومجلز کہتے تھے کہ میں نے سعید بن مسیب، طاؤس، عطاء، حسن بصری اور ابن سیرین کسی کو بھی شعبی سے بلند مرتبہ فقیہ نہیں پایا[8]۔

حضرت ابراہیم نخعی جو بہت بڑے فقیہ تھے ان کے تفقہ کے اتنے قائل تھے کہ جو مسئلہ ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے سائل کو شعبی کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۳ [2] ایضاً۔ ص ۷۳
[3] ایضاً۔ ۷۳ [4] ابن سعد۔ جلد ۔ ص ۱۷۷ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۱
[6] ایضاً۔ ص ۱۷۲ [7] ابن سعد جلد ۶۔ ق ۱۷۴ [8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۰

انہوں نے لاعلمی ظاہر کی، اسی درمیان میں شعبی گزرتے ہوئے دکھائی دیئے، ابراہیم نخعی نے مستفتی سے کہا ان شیخ کے پاس جا کر پوچھو اور وہ جو جواب دیں اسے مجھے بتاؤ۔ چنانچہ سائل نے جا کر ان سے دریافت کیا انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی، نخعی کو یہ جواب معلوم ہوا تو انہوں نے کہا واللہ یہ فقہ ہے[1]۔

ان کا فقہی کمال اتنا مسلم تھا کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں جو علوم نبوی کے حقیقی وارث تھے وہ مسند افتاء پر بیٹھ گئے تھے۔ ابوبکر ہذلی کا بیان ہے کہ ابن سیرین نے مجھے ہدایت کی تھی کہ شعبی کے ان سے وابستہ رہو کیونکہ وہ صحابہ کی بڑی تعداد کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے[2]۔

جواب میں احتیاط :

حدیث کی طرح وہ فقہ میں بھی محتاط تھے اور اس احتیاط کی بنا پر عموماً مسائل کے جواب میں اپنی لاعلمی ظاہر کر دیتے تھے۔ صلت بن بہرام کا بیان ہے کہ میں نے کسی ایسے شخص کو جو علم میں شعبی کا ہم پایہ ہو، ان سے زیادہ "لا ادری" کہنے والا نہیں دیکھا[3]۔

ابن عون کا بیان ہے کہ شعبی کے پاس جب کوئی سائل آتا تھا تو وہ حتی الامکان جواب سے بچتے تھے، اور ابراہیم برابر جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ شعبی فطرۃ خندہ جبیں اور ابراہیم خشک مزاج تھے لیکن جب دونوں کے سامنے کوئی فتویٰ پیش ہوتا تھا تو دونوں کے اوصاف بدل جاتے، شعبی میں انقباض پیدا ہو جاتا تھا اور ابراہیم میں انبساط[4]۔

لیکن بہرحال وہ ایک ممتاز عالم اور بلند پایہ فقیہ تھے کوفہ کی مسند افتاء پر تھے ان کی ذات مرجع خلائق تھی اس لئے ہمیشہ لا ادری تو کہہ نہیں سکتے تھے بہت سے مسائل کا جواب دینا ہی پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ اتنی احتیاط ہر حالت میں قائم رکھتے تھے کہ ان کے جواب کی بنیاد احادیث وسنن پر ہوتی تھی[5]۔

جواب میں اپنی رائے کو مطلق داخل نہ دیتے تھے۔ محمد بن جحادہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شعبی سے ایک مسئلہ پوچھا گیا جس کے بارے میں ان کے پاس کوئی مسند نہ تھی، کسی نے کہا اپنی رائے سے جواب دے دیجئے، فرمایا میری رائے کیا کرو گے اس پر پیشاب کرو[6]۔

قیاس کی عقلی بے حقیقتی :

وہ نہ صرف مذہباً وعقیدۃً امور شریعہ میں قیاس کو برا سمجھتے تھے بلکہ عقلاً بھی اس کے قائل نہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ابوبکر ہذلی کو اس کی حقیقت سمجھانے کے لئے ان سے پوچھا کہ اگر احنف بن قیس

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ۱۷۱ [3] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۴ [5] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳ [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۶

(تابعی جن کے حالات اُوپر گزر چکے ہیں۔ اس عہد کے ایک نامور مدبر) قتل کردیئے جائیں اور انہی کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی قتل کردیا جائے تو دونوں کی دیت برابر ہوگی یا احنف کی دیت ان کے عقل اور علم کی وجہ سے زیادہ ہوگی۔ ابوبکر نے جواب دیا برابر ہوگی۔ (حالانکہ قیاس کے اقتضاء یہ تھا کہ احنف کی دیت زیادہ ہوتی[1]۔

علم میں خوف وخشیت :

اس علم کے باوجود خوف خشیت کا یہ حال تھا کہ کہا کرتے تھے کہ کاش میں اس علم سے برابر سرابر پر چھوٹ جاتا نہ مجھ سے اس کا مواخذہ ہوتا اور نہ مجھ کو اس کا صلہ ملتا[2]۔ اگر میں ننانوے سوالوں کا صحیح جواب دوں اور صرف ایک غلط ہوجائے تو لوگ اس پر گرفت کریں گے[3]۔

مغازی : مغازی کے ممتاز عالم تھے۔ خود وہ صحابہ جنہوں نے غزوات میں شرکت کی تھی ان کی علمی واقفیت کے معترف تھے۔ عبدالملک بن عمیر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شعبی مغازی بیان کررہے تھے کہ ابن عمرؓ ادھر سے گزرے، انہوں نے سن کر کہا اگرچہ میں بذاتِ خود مغازی میں شریک ہوا ہوں لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے یہ مجھ سے زیادہ مغازی سے واقف ہیں[4]۔

ریاضی : مذہبی ذوق کے علماء کو عموماً ریاضیات سے کم لگاؤ ہوتا ہے لیکن شعبی اس فن کے بھی ماہر تھے۔ اس کی تعلیم انہوں نے مشہور ریاضی حارث الاعور سے حاصل کی تھی[5]۔

فرائض : ریاضی میں مہارت کی وجہ سے فرائض میں پورا درک تھا اور اس کو غالباً انہوں نے حضرت علیؓ سے سیکھا تھا۔ بعضوں کے نزدیک آپ نے سیکھا نہ تھا بلکہ آپ کے اقوال سے استنباط کیا تھا[6]۔

شاعری : شاعری کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ شعرائے قدیم کے ہزاروں اشعار حفظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اگر میں چاہوں تو مسلسل ایک مہینہ تک اشعار سناتا رہوں اور کوئی شعر مکرر نہ ہونے پائے[7]۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔

حلقۂ درس : صحابہ کی موجودگی ہی میں ان کا حلقۂ درس قائم ہوگیا تھا۔ ابن سیرین کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں میں کوفہ آیا اس وقت شعبی کا حلقۂ درس قائم تھا اور اصحابِ رسول ﷺ کی بڑی تعداد

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۴ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۲ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۶
[4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳ [5] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳ [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۷
[7] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۳

موجود تھی[۱]۔ حلقۂ درس میں زیادہ مجمع پسند نہ کرتے اور فرماتے تھے کہ حلقہ جب بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو شور وشغب بن جاتا ہے[۲]۔

اور جن مساجد کے حلقہائے درس میں ہنگامہ ہوتا تھا انہیں چھوڑ دیتے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم اور شعبی ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلتے ٹہلتے مسجد میں پہنچے، حماد کے گرد ان کے اصحاب کا مجمع تھا اور بڑا شور وغوغا مچا ہوا تھا۔ شعبی نے سن کر کہا خدا کی قسم ان بازاریوں نے اس مسجد کو میرے لئے مبغوض بنا دیا ہے اور یہ کہہ کر لوٹ آئے[۳]۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا صرف حدیث میں ان کے تلامذہ کی مختصر فہرست یہ ہے۔ ابو اسحٰق سبیعی، سعید بن عمرو بن اشوع، اسمٰعیل بن ابی خالد، بیان بن بشر، حصین بن عبدالرحمن، داؤد بن ابی ہند، زبید الیامی، زکریا بن ابی زائدہ، سعید بن مسروق، سلمہ بن کہیل، ابو اسحٰق شیبانی، اعمش، منصور، مغیرہ، سماک بن حرب، عاصم الاحول ابو الزناد، ابن عون، عبدالملک بن سعید بن الجبر، عون بن عبداللہ، قتادہ، مجالد بن سعید، مطرب بن طریف اور ابو حیان تیمی وغیرہ[۴]۔

اکابر علماء اور آئمہ کا اختلاف:

اس عہد کے تمام بڑے بڑے علماء اور آئمہ میں ان کی علمی منزلت مسلم تھی۔ حسن بصری ان کو کثیر العلم فرماتے تھے[۵]۔ امام زہری کہتے تھے کہ علماء صرف چار ہیں، مدینہ میں ابن مسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں حسن بصرہ اور شام میں مکحول[۶]۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ لوگ کہتے تھے کہ صحابہ کے بعد ابن عباس اپنے زمانہ میں، شعبی اپنے زمانہ میں اور ثوری اپنے زمانہ میں یگانہ تھے[۷]۔

مذہب: شعبی ابتدا میں شیعہ تھے، لیکن پھر ان کے اعمال دیکھ کر ان کے خیالات اور ان کی غیر معتدل باتیں سن کر اس مذہب سے تائب ہو گئے اور اس کی مذمت کرنے لگے تھے۔ لیکن اہل سنت کے عقائد اختیار کرنے کے بعد بھی انہوں نے عام تبدیل مذہب کرنے والوں کی طرح جادۂ اعتدال سے باہر قدم نہ نکالا۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ صالح مومنین اور صالح بنی ہاشم کو دوست رکھو لیکن شیعہ نہ بنو[۸]۔

جو چیز تمہارے علم میں نہیں ہے۔ اس میں بھلائی کی امید رکھو لیکن مرجی نہ بنو۔ اس کا یقین رکھو کہ بھلائیاں خدا کی جانب سے ہیں اور برائیاں تمہارے نفس کی جانب سے، لیکن قدری نہ بنو۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۳ ۲۔ ایضاً ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۷ ۴۔ ایضاً۔ ص ۱۷۵
۵۔ تفصیل کے لئے دیکھو تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۶ ۶۔ ایضاً۔ ص ۶۷ ۷۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۴۴
۸۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۷ ۹۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳

جس شخص کو تم اچھے اعمال کرتے دیکھو، خواہ وہ نک چپٹا سندھی ہی کیوں نہ ہو اسے دوست رکھو[1]۔

بعض حکیمانہ مقولے:

فرماتے تھے کہ فقیہ وہ ہے جو خدا کے محارم سے بچتا رہے اور عالم وہ ہے جو خدا کا خوف کرتا ہے تم لوگ کم استعداد علماء اور جاہل عبادت گزاروں سے بچتے رہو[2]۔

عادات وخصائل:

شعبی طبعاً نہایت نرم خو اور حلیم تھے۔ حضرت حسن بصری فرماتے تھے کہ واللہ شعبی بڑے صاحب علم اور بڑے حلیم الطبع تھے[3]۔ نرم خوایسے تھے کہ کبھی اپنے غلام تک کو نہ مارتے تھے، صاحب اور اعزہ شناس تھے جب ان کا کوئی عزیز قرض چھوڑ کر مر جاتا تھا تو اپنی جیب سے اس کا قرض ادا کرتے تھے[4]۔

ظرافت وخوش طبعی:

علمی کمال کے ساتھ وہ بڑے ظریف، خوش طبع اور بذلہ سنج تھے۔ کَانَ مزاحاً[5]، ظرافت کا مادہ اتنا غالب تھا کہ بات بات میں لطائف پیدا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے لطائف کتابوں میں مذکور ہیں[6]۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے پوچھا ابلیس کی بیوی کا کیا نام ہے؟ جواب دیا میں اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوتا[7]۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حرامی لڑکے کے بارے میں پوچھا کہ کیا تینوں (ماں باپ خود) میں سب سے زیادہ شر وہی ہوتا ہے۔ جواب دیا اگر سب میں زیادہ شر وہی ہوتا تو اس کے پیٹ ہی میں ہونے کی حالت میں اس کی ماں سنگسار کر دی جاتی[8]۔

حضرت عمرو بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ شعبی سے کہا کہ آپ نے مجھ سے ایک حدیث بیان کی تھی وہ اب میرے حافظہ سے جاتی رہی۔ انہوں نے کہا کچھ بتاؤ تو معلوم ہو، میں نے کہا کچھ بھی یاد نہیں۔ شعبی نے ایک حدیث سنا کر کہا کہ یہ تو نہیں ہے، میں نے کہا نہیں، انہوں نے دوسری بیان کر کے کہا شاید یہ ہو، میں نے کہا یہ بھی نہیں، آخر میں انہوں نے یہ عاشقانہ شعر پڑھ کر کہا ممکن ہے یہ ہو[9]۔

هنيا مريا غير داء مخامر　　لعزة من اعراضنا استحلت

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳　[2] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۲۷　[3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۶۷
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۷۰　[5] ایضاً　[6] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۴۴　[7] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۶　[8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۶　[9] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۴

ایک مرتبہ حجاج نے پوچھا کم عطاوک فی السنۃ سال میں تمہارا وظیفہ کتنا ہے (زبان کے لحاظ سے اس موقع پر فی السنۃ کہنا درست نہیں ہے) اس لئے شعبی نے بھی غلط جواب دیا۔ الفین (دو ہزار) حالانکہ الفین کے بجائے الفان کہنا چاہئے تھا۔ اس ٹوکنے پر حجاج نے اپنی غلطی محسوس کر کے فوراً اس کی صحیح کی کم عطاوک تمہارا وظیفہ کتنا ہے، اس وقت شعبی نے بھی صحیح جواب دیا کہ الفان، حجاج نے کہا پہلے تم نے عربی میں کیوں غلطی کی، جواب دیا، امیر نے غلطی کی جب امیر نے صحیح کہا تو میں نے بھی تصحیح کر لی میری یہ مجال نہ تھی کہ امیر تو غلط بولیں اور میں صحیح بولوں[1]۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کے گھر ان سے ملنے گیا۔ گھر میں میاں بیوی دونوں تھے شعبی خلقۃً نہایت کمزور اور پست قد تھے اس لئے آنے والے نے مذاق سے پوچھا، شعبی ان میں سے کون سے ہیں، شعبی نے بیوی کی طرف اشارہ کر دیا[2]۔

ایک مرتبہ ایک درزی سے مذاقاً پوچھا میرے پاس ایک ٹوٹا ہوا دانہ ہے اس کو سی سکتے ہو۔ درزی بھی حاضر جواب تھا، بولا اگر آپ کے پاس ہوا کا تاگا ہو تو سی دوں گا[3]۔

ایک مرتبہ ایک نصرانی کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ اسلامی سلام کیا، ایک شخص نے اعتراض کیا، شعبی نے جواب دیا کہ اگر اس پر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو وہ ہلاک ہو گیا ہوتا، اس لئے میں نے رحمۃ اللہ کہنے میں کیا غلطی کی[4]۔

اپنے بعض معاصرین کو جن سے زیادہ بے تکلفی تھی اپنی بذلہ سنجی سے اس قدر پریشان کرتے تھے کہ وہ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں غیاث کے لڑکے حفص نے غیاث سے کہا آپ جا کر شعبی سے پوچھ لیجئے۔ غیاث نے کہا ان کے پاس کیسے جاؤں، وہ جب مجھے دیکھتے ہیں میرا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں تمہاری جو ہیئت ہے علماء کی یہی ہیئت ہوتی ہے، یہ تو جلاہوں کی ہیئت ہے اور جب میں ابراہیم کے پاس جاتا ہوں تو وہ میری عزت کرتے ہیں[5]۔

شعبی کا تعلق دولت بنی اُمیہ سے :

اُموی حکومت میں شعبی مختلف اوقات میں مختلف خدمات اور عہدوں پر مامور ہوتے رہے۔ حجاج انہیں بہت مانتا تھا اس لئے اپنے دورِ امارت میں ان کو بہت آگے بڑھایا۔ ان کے وظیفہ

---

[1] ابن خلکان۔ جلد ا۔ ص ۲۴۴ [2] ایضاً [3] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۲۷
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۶ [5] ایضاً۔ ص ۷۱

میں اضافہ کیا، انہیں ان کے قبیلہ کا امام اور عریف (چودھری) بنایا اور سرکاری وفود میں عبدالملک کے پاس بھیجتا تھا[1]۔ ایک مرتبہ رتبیل والی سجستان کے یہاں سفیر بنا کر بھیجا جہاں انہیں انعام و اکرام ملا[2]۔

ایک اہم سفارت :

ان کے فہم وتدبر کی وجہ سے خود عبدالملک بعض اہم خدمات ان کے متعلق کرتا تھا اور بڑی سفارتوں میں ان کو بھیجتا تھا۔ خود شعبی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبدالملک نے مجھ کو ایک سفارت میں قیصر روم کے پاس بھیجا۔ قیصر نے مجھ سے جس قدر سوالات کیے، میں نے سب کے شافی جواب دیے۔ عموماً وہاں سفراء کے زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کا دستور نہ تھا، لیکن اس نے مجھ کو بہت دنوں تک روکے رکھا، یہاں تک کہ میں گھبرا کر لوٹنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

اس وقت اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم شاہی گھرانے سے ہو؟ میں نے کہا نہیں، بلکہ عام عربوں میں سے ہوں۔ یہ سن کو اس نے زیرِ لب کچھ کہا اور ایک رقعہ مجھے دیا کہ اپنے بادشاہ کو میرے پیغامات پہنچانے کے بعد یہ رقعہ دے دینا۔ میں نے واپس ہو کر پیغامات تو پہنچا دیے مگر رقعہ دینا بھول گیا۔ دارالخلافہ سے نکلتے وقت رقعہ یاد آیا، میں نے واپس جا کر اس کو عبدالملک کے حوالے کیا۔

اس نے رقعہ پڑھ کر مجھ سے پوچھا، قیصر نے رقعہ دینے سے پہلے تم سے کچھ کہا بھی تھا۔ میں نے کہا ہاں! اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم شاہی خاندان سے ہو، میں نے جواب دیا نہیں میں عام عربوں میں سے ہوں۔ یہ کہہ کر میں واپس ہو گیا۔ دروازہ تک پہنچا تھا کہ عبدالملک نے پھر بلا لیا اور پوچھا تم کو رقعہ کا مضمون معلوم ہے۔ میں نے کہا نہیں، اس نے پڑھنے کو کہا، میں نے اسے پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "مجھے اس قوم پر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے شخص کے ہوتے ہوئے اس نے ایک دوسرے شخص کو بادشاہ کیسے بنایا"۔

یہ تحریر پڑھ کر میں نے عبدالملک سے کہا، خدا کی قسم اگر مجھے پہلے اس مضمون کا علم ہوتا تو میں کبھی اسے نہ لاتا، اس نے ایسا اس لئے لکھا کہ آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ عبدالملک نے مجھ سے پوچھا تم سمجھے اس لکھنے کا مقصد کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ عبدالملک نے کہا مجھے تمہارے خلاف بھڑکا کر تمہارے قتل پر آمادہ کرنا چاہا ہے۔ قیصر کو عبدالملک کا یہ قیاس معلوم ہوا تو اس نے کہا واقعی میرا یہی مقصد تھا[3]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۳ [2] ایضاً۔ ص ۱۷۷ [3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۴۴

حجاج اور عبدالملک کی مخالفت :

لیکن اُموی حکومت کے ساتھ ان کے یہ روابط زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ ابن اشعث کے ہنگامہ کے زمانہ میں شعبی نے حجاج اور عبدالملک کی مخالفت کے زمانہ میں ابن اشعث کا ساتھ دیا، اس واقعہ کے متعلق ان کا بیان ہے کہ حجاج نے مجھ کو میری قوم کا عریف اور پورے ہمدان کا معتمد بنایا، اور وظیفہ مقرر کیا تھا، ابن اشعث کے ہنگامے تک اس کے یہاں میری قدر و منزلت قائم رہی ابن اشعث کے انقلاب میں کوفہ کے قاریوں نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ قاریوں کے زعیم ہیں، اس لئے ہمارا ساتھ دیجئے، اور اتنا اصرار کیا کہ مجھے اُن کے ساتھ ہو جانا پڑا، چنانچہ میدان جنگ میں صفوان کے درمیان کھڑے ہو کر حجاج کے عیوب بیان کر کے لوگوں کو اس کے خلاف اُبھارتا تھا[1]۔

شکست اور روپوشی :

دیر جماجم کے معرکہ میں ابن اشعث کو فاش شکست ہوئی اور اس کی قوت پارہ پارہ ہو گئی اس وقت شعبی روپوش ہو گئے، ایک روایت یہ ہے کہ وہ حجاج کی سفاکیوں کے خوف سے نو مہینہ تک اپنے گھر کے دروازے بند کئے بیٹھے رہے، نو مہینہ کے بعد قتیبہ بن مسلم نے خراسان پر فوج کشی کا ارادہ کیا، اور لوگوں کو اس میں شرکت کی ترغیب دینے کے لئے اعلان کرادیا کہ جو شخص فوج میں بھرتی ہو جائے گا اس کی گذشتہ خطائیں معاف کردی جائیں گی۔

اس اعلان پر شعبی فوج میں شامل ہو گئے، اور فرغانہ پہنچے، قتیبہ انہیں پہچانتا نہ تھا، ایک دن وہ مجلس عام میں بیٹھا ہوا تھا شعبی نے اپنی علمی خدمات اس کے سامنے پیش کیں کہ مجھے علم وفن میں درک ہے، قتیبہ نے پوچھا تم کون ہو وہ اگرچہ انہیں پہچانتا نہ تھا لیکن نام سے واقف تھا، اس لئے شعبی نے کہا یہ نہ پوچھو، قتیبہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا، اس کو حجاج کے پاس فتوحات کی اطلاع بھیجنی تھی، اس نے ان کو مسودہ لکھنے کا حکم دیا انہوں نے کہا مجھے لکھنے کی ضرورت نہیں اور اسی وقت زبانی بول کر لکھوا دیا، قتیبہ نے اس تحریر کو بہت پسند کیا اور اس کے صلہ میں ان کو ایک خچر اور حریری کا ایک حلہ دیا، اس کے بعد شعبی بڑی قدر و منزلت کے ساتھ رہنے لگے، رات کو قتیبہ انہیں اپنے ساتھ دستر خوان پر کھلاتا تھا۔

گرفتاری : حجاج شعبی کا انداز تحریر پہچانتا تھا، قتیبہ کے خط دیکھ کر پہچان گیا کہ شعبی کے علاوہ اور کوئی اس کا لکھنے والا نہیں ہو سکتا، چنانچہ فوراً قتیبہ کو لکھا کہ تمہارا خط لکھنے والے شعبی ہیں انہیں فوراً گرفتار کرلو،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۳۱۔

اگر وہ بچ کر نکل گئے تو تمہیں معزول کر کے تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا، یہ حکم پڑھ کر قتیبہ نے شعبی سے کہا کہ میں نے اب تک آپ کو نہ پہچانا تھا، آپ آزاد ہیں جہاں آپ کا دل چاہے چلے جایئے، میں حجاج کے سامنے ہر قسم کی قسم کھالوں گا۔ شعبی نے کہا اگر میں چلا بھی جاؤں تو میرا جیسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا۔ قتیبہ نے کہا اسے آپ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

غرض ان کے انکار پر اس نے ان کو حجاج کے پاس بھجوا دیا واسط کے قریب ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ کوفہ میں یزید بن ابی مسلم سے جوان سے ملنے کو آئے تھے ملاقات ہوئی، انہوں نے ان سے کہا کہ ابوعمرو جب تم امیر کے سامنے پیش کئے جاؤ تو تم اس سے اس طرح سے اور یہ کہنا امید ہے کہ تمہاری جان بچ جائے گی، غرض وہ بجولاں حجاج کے سامنے پیش کئے گئے[۱]۔

دوسری روایت میں اس واقعہ کی شکل یہ ہے کہ دیر جماجم کے معرکہ کے بعد شعبی عرصہ تک روپوش رہے اور یزید بن ابی مسلم کو لکھا کہ تم حجاج سے میری صفائی کرادو، انہوں نے جواب دیا مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے، میرا یہ مشورہ ہے کہ تم خود چلے آؤ اور دربار عام کے وقت امیر کے سامنے دفعۃً جا کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے معذرت پیش کرو، اس کا میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم مجھے جس چیز کا شاہد بناؤ گے میں تمہاری صفائی میں گواہی دوں گا۔

رہائی : شعبی نے اس مشورہ پر عمل کیا اور ایک دن دفعۃً حجاج کے سامنے پہنچ گئے اس نے دیکھتے ہی کہا اخاہ شعبی ہیں پھر ان کے سامنے اپنے تمام احسان جو ان پر کئے تھے گنائے، یہ احسان کا اقرار کرتے جاتے تھے آخر میں حجاج نے پوچھا تم نے عدو الرحمٰن (عبدالرحمٰن بن اشعث) کا ساتھ کیوں دیا شعبی نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے ندامت ظاہر کی، ان کے اعتراف اور انفعال پر حجاج نے ان کی خطا معاف کر دی[۲]۔

قضات : عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں کوفہ کے منصب قضاء پر مامور ہوئے[۳]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں دفعۃً انتقال کیا، انتقال کے وقت ستتر[۷۷] سال کی عمر تھی[۴]۔ لیکن ستتر ۷۷ سال کی عمر صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس لئے کہ وہ جلولاء کے سال یعنی ۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳ھ، ۱۰۴ھ میں انتقال ہوا، اس حساب سے ستتر سال سے کچھ اوپر عمر رہی ہوگی۔

حلیہ : توام پیدا ہوئے تھے، اس لئے خلقۃً نہایت کمزور اور نحیف تھے۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۷۷، ۷۵　۲ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۵　۳ ایضاً۔ ص ۷۴　۴

(۳۷) عامر بن عبداللہ رحؒ

نام ونسب: عامر نام، ابوعمر کنیت، نسب نامہ یہ ہے عامر بن عبداللہ بن قیس بن ثابت بن اسامہ بن حذیفہ بن معاویہ تیمی عنبری۔

تابعین کرام کا نمایاں اور مشترک وصف ان کا علم وعمل اور خدمتِ علم ودین تھا۔ لیکن ان میں ایک مختص جماعت ایسی بھی تھی، جس نے نہ صرف تمام دنیاوی علائق کو چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ علم کی بساط بھی نہ کر کے محض عبادت ریاضت، یادِالٰہی اور تزکیہ روح کو اپنا مقصد قرار دیا تھا، عامر بھی اسی مقدس جماعت کے ایک ممتاز فرد تھے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے بلند مرتبہ اور مرتاض تابعین میں تھے کعب احبار جو خود ایک تارک الدنیا تابعی تھے، عامر کو "امت محمدیہ کے راہب" کے لقب سے یاد کرتے تھے [1]۔

عامر پر یہ رنگ ایسا گہرا تھا اور ان کے ہر عمل میں ایسا نمایاں تھا کہ ان کی زندگی کے دوسرے حالات کو زہد وورع سے جدا کر کے دکھانا مشکل ہے ان کا کوئی عمل اس روح سے خالی نہ تھا۔

عہد فاروقی: عامر گوزاہد خلوت نشین تھے، لیکن شرف جہاد کے حصول کے لئے جنگی مہمات میں شریک ہوتے تھے، سب سے اول وہ عہد فاروقی میں مدائن کی مہم میں نظر آتے ہیں [2]۔ اگرچہ تصریح کے ساتھ دوسری مہمات میں ان کی شرکت کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر مہمات میں شریک رہتے تھے قتادہ کا بیان ہے کہ عامر جب غزوات میں جاتے اور راستہ میں جھاڑیاں ملتی اور ان سے کہا جاتا اس میں شیر کا خوف ہے، تو جواب دیتے کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کا خوف کروں [3]۔

حضرت عثمانؓ کی مخالفت:

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو انقلاب برپا ہوا تھا، اس کے تین بڑے مرکز تھے بصرہ کے کوفہ اور مصر اس انقلاب کے شعلوں کی لپیٹ میں بعض بڑے صحابہ تک آگئے تھے، بصرہ عامر کا وطن تھا، گو وہ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہوئے تاہم ان کا دامن اس سے پاک نہ رہ سکا اور وہ بھی مخالفین عثمان کے دام میں پھنس کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ ایک موقع پر اہل بصرہ نے انہیں حضرت عثمانؓ کے پاس اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا، انہوں نے مدینہ جا کر حضرت عثمانؓ کے سامنے برملا اپنے خیالات ظاہر کئے کہ

---

[1] اصابہ۔ جلد ۵۔ ص ۸۶ [2] ایضاً [3] ابن سعد۔ جلد ۷ ق ۱، ص ۷۶

''مسلمانوں کی ایک جماعت نے آپ کے اعمال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ سے بہت سے برے افعال سرزد ہوئے ہیں، اس لئے خدا کا خوف کیجئے اور اس کے سامنے آئندہ کے لئے توبہ کیجئے حضرت عثمانؓ ان کے حقیقی حالات سے اب تک ناواقف تھے، اس لئے ان کی باتیں سن کر فرمایا، لوگو! ذرا انہیں دیکھو یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گفتگو کرنے کے لئے آئے ہیں، لوگ انہیں قاری سمجھتے ہیں حالانکہ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ خدا ہے کہاں، عامر نے یہ کلمات سن کر قرآن کی اس آیت :

''اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَاد'' ''تمہارا رب تاک میں ہے''۔

کی طرف اشارہ کر کے کہا خدا کی قسم میں خوب جانتا ہوں وہ نافرمانوں کی تاک میں ہے[1]۔ اس گفتگو کے بعد عامر بصرہ واپس چلے آئے۔

بعض مذہبی الزامات :

خلیفہ وقت کے ساتھ اس سیاسی اختلاف کے علاوہ عامر پر بعض مذہبی الزام بھی تھے، یا ان کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ کہ وہ شادی نہیں کرتے، گوشت نہیں کھاتے، اپنے کو حضرت ابراہیم سے بہتر یا ان کا مثل سمجھتے ہیں۔

حکومت کے ساتھ ان کا اختلاف ہو ہی چکا تھا، اس لئے ان کے بعض مخالفین نے والی بصرہ کو ان باتوں کی خبر کر دی۔ اس نے حضرت عثمانؓ کو اطلاع دے دی، وہاں سے تحقیقات کا حکم آیا اور صحت کی صورت میں شام بھیج دیئے جانے کی ہدایت ملی۔ اس حکم پر والی بصرہ نے عامر کے سامنے ان الزاموں کو پیش کر کے ان کا جواب طلب کیا۔

انہوں نے جواب دیا کہ میں نے عورتوں کو اس لئے چھوڑا ہے کہ جب بیوی ہوگی تو اولاد بھی ہوگی اور اولاد ہوئی تو دنیا میرے دل میں بس جائے گی۔ گوشت اس لئے نہیں کھاتا کہ میں مجوسیوں کے ملک میں رہتا ہوں اور اسکی کوئی ضمانت و شہادت نہیں ہوتی کہ ذبیحہ صحیح ہے۔ اس لئے مجھے اس پر اطمینان نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ سے برتر ہونے کا سوال، میں اس کے علاوہ کوئی جواب نہ دوں گا کہ میری آرزو ہے کہ کاش میں ان کے پاؤں کی خاک ہوتا، جو ان کے قدموں سے لگ کر جنت میں جائے گی۔ ایک سیاسی الزام امراء و حکام دولت سے نہ ملنے کا تھا، اس کا جواب یہ دیا کہ تم لوگوں کے دروازوں پر حاجت مندوں کا ہجوم رہتا ہے ان کی حاجت روائی کیا کرو، اور بے غرض لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دو[2]۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۷ [2] یہ واقعات ابن سعد کی مختلف روایات سے ماخوذ ہیں

جلاوطنی : اگرچہ مذہبی الزامات تحقیقات کے بعد غلط نکلے لیکن سیاسی اور انتظامی حیثیت سے عامر بصرہ سے شام بھیج دیئے گئے۔ امیر معاویہ ؓ نے انہیں نہایت عزت واحترام کے ساتھ ٹھہرایا، ان کی خدمت کے لئے ایک لونڈی مقرر کر کے اس کو ہدایت کر دی کہ ان کے حالات ومشاغل دیکھ کر انہیں اطلاع دیتی رہے۔

شام آنے کے بعد بھی ان کے معمولات ومشاغل میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ چنانچہ وہ روزانہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتے تھے اور شام کی تاریکی میں واپس آتے۔ امیر معاویہ ؓ ان کے لئے کھانا بھیجتے تھے، عامر اس کو مطلق ہاتھ نہ لگاتے۔ کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر آتے اسی کو پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور وہی پانی اوپر سے پی کر عبادت میں مصروف ہو جاتے اور رات سے صبح تک مصروف رہتے۔ لونڈی نے امیر معاویہ کو یہ حالات بتائے۔ انہوں نے حضرت عثمان ؓ کو لکھ بھیجا۔

جب آپ کو عامر کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تو امیر معاویہ کو انہیں مقرب بنانے اور دس غلام اور دس سواریاں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ امیر معاویہ نے عامر کو اطلاع دی کہ امیر المومنین نے مجھے آپ کی خدمت میں دس غلام اور دس سواریاں پیش کرنے اور آپ کو مقرب بنانے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا،

ایک شیطان پہلے سے مسلط ہے اسی کا بار کیا کم ہے کہ دس غلاموں کا بار اٹھاؤں ایک خچر میرے پاس ہے، وہ سواری کے لئے کافی ہے۔ مجھ کو خوف ہے کہ قیامت کے دن خدا مجھ سے فاضل سواریوں سے متعلق بھی باز پرس کرے گا۔ رہی عزت وتقرب تو اس کی مجھ کو کوئی خواہش نہیں ہے[1]۔

واپسی سے انکار اور شام کی مستقل اقامت :

عامر کے اصل حالات معلوم ہونے کے بعد امیر معاویہ نے ان سے کہا اگر چاہیں تو آپ بصرہ واپس جا سکتے ہیں انہوں نے جواب دیا اب میں ایسے شہر میں واپس نہ جاؤں گا جہاں کے باشندوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا اور شام ہی میں قیام کیا، لیکن حکومت کی نگرانی ان پر سے اٹھ گئی اور وہ ساحلی علاقے کی طرف نکل گئے کبھی کبھی امیر معاویہ سے ملنے کو چلے آتے تھے امیر معاویہ ان سے ان کی ضروریات پوچھا کرتے، یہ ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے جب معاویہ کا اصرار بڑھا تو یہ فرمائش کی کہ ”شام کے سرد موسم کی وجہ سے روزہ کی شدت اور چاشنی کا لطف جاتا رہا اگر چہ ہو سکے تو بصرہ کی تھوڑی گرمی یہاں پیدا کر دو[2]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۔ [2] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۵

وطن سے بے تعلقی :

عامر جیسے بے نیاز شخص کے لئے وطن اور پردیس سب برابر تھے۔ وطن میں ان کے لئے کوئی خاص کشش نہ تھی، پھر شام جیسی مقدس اور انبیاء وصلحاء کا موطن ومدفن سرزمین مل گئی تھی، اس رہا سہا وطن سے جو تعلق باقی تھا وہ بھی منقطع کرلیا اور وطن اور اہلِ وطن سب کو بھلا کر یادالٰہی میں مصروف ہوگئے۔ بصرہ سے جو لوگ شام آتے تھے اور ملنے کے لئے ان کے پاس جاتے ان کی ملاقات بھی عامر کے لئے خوشگوار باقی نہ رہ گئی تھی۔

قاضی عبیداللہ بن حسن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شام گیا تو عامر سے ملاقات کے لئے انہیں تلاش کیا، معلوم ہوا کہ وہ ایک مقام پر ایک بوڑھی عورت کے یہاں آتے جاتے ہیں۔ میں اس عورت کے یہاں پہنچا، اس نے کہا کہ وہ شب وروز اس پہاڑ کے دامن میں روزہ نماز میں مشغول رہتے ہیں، اگر تم ان سے ملنا چاہتے ہو تو افطار کے وقت جاؤ اس وقت وہ ضرور ملیں گے۔

چنانچہ میں افطار کے وقت پہاڑ کے دامن میں پہنچا۔ عامر موجود تھے، میں نے سلام کیا انہوں نے صرف ایک شخص کا اور وہ بھی ایسے شخص کا حال پوچھا جس سے میں صرف ایک دن قبل مل چکا تھا۔ اپنے وطن اور اہلِ وطن کا کوئی حال نہیں دریافت کیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون زندہ ہے کون مر گیا۔ کھانے تک کا اخلاق نہیں کیا۔

یہ خلافِ امید باتیں دیکھ کر میں نے کہا میں آپ میں عجیب باتیں پاتا ہوں۔ فرمایا کیا؟ میں نے کہا کہ آپ کو ہم لوگوں سے جدا ہوئے مدت گزرگئی، لیکن آپ نے ان میں سے کسی کا حال نہیں پوچھا اور پوچھا بھی تو ایک ایسے شخص کا جس سے میں صرف ایک دن پہلے ملا تھا۔ فرمایا، میں نے تم کو صالح پایا، اس لئے تمہارے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ وطن سے تازہ وارد تھا، آپ نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کون مرگیا کون زندہ ہے۔ فرمایا، ایسے لوگوں کے متعلق کیا پوچھتا جو مر چکے وہ ختم ہو چکے اور جو نہیں مرے ہیں وہ عنقریب مرنے والے ہیں۔ میں نے کہا آپ نے شب کے کھانے کے متعلق بھی مجھ سے اخلاق نہیں کیا۔ فرمایا، میں جانتا تھا کہ تم عمدہ غذا کھاتے ہو اس لئے خشک اور روکھی سوکھی روٹی کے لئے کیا پوچھتا۔

مجاہدات ونفس کشی :

عامر عبادت وریاضت زہد وورع اور مجاہدہ نفس کشی کی اس معراج تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں کسی دنیاوی دل فریبی اور آرام وراحت کا گزر نہ تھا انہوں نے نفس کشی اور مجاہدات کو اپنا مقصد

حیات بنالیا تھا۔ ایک زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہو سکا تو زندگی کا صرف ایک مقصد بنالوں گا[1]۔

انہوں نے اس عزم کو اس کامیابی کے ساتھ پورا کیا کہ دنیا کی ان تمام نعمتوں اور لذتوں کو جن سے اس مقصد عظیم میں خلل پڑنے کا احتمال تھا چھوڑ دیا۔ وہ خدا سے دعا کیا کرتے تھے کہ میرے دل سے عورتوں کی خواہش دور کردے کہ یہ شے میرے دین کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اپنے ماسوا کا خوف دل سے نکال دے اور آنکھوں سے نیند اڑا دے کہ جس طرح چاہوں آزادی سے رات دن تیری عبادت کرسکوں[2]۔

خدا نے ان کی پہلی دعائیں قبول کیں، لیکن ایک عرصہ تک نیند پر پورا قابو حاصل نہ ہو سکا آپ فرماتے تھے کہ دنیا چار چیزوں کا نام ہے۔ خواب و خور، دولت اور عورت، دو چیزوں یعنی عورت اور مال سے میں نے نفس کو روک لیا ہے۔ مال کی مجھے حاجت نہیں اور عورت اور دیوار میرے نزدیک برابر ہیں البتہ نیند اور کھانے پر ابھی پورا قابو نہیں ہے لیکن خدا کی قسم میں ان دونوں خواہشوں کو مٹانے میں پوری کوشش صرف کردوں گا۔ چنانچہ نیند اڑانے اور بھوک کو بہلانے کی یہ تدبیر نکالی تھی کہ رات بھر جاگ کر عبادت کرتے تھے اور دن کو روزہ رکھ کر سوتے تھے[3]۔

شام کے زمانہ قیام میں سارا دن روزے میں گزرتا تھا اور پوری رات نماز میں بسر ہوتی تھی۔ غذا میں صرف روکھی روٹی ہوتی تھی جس کو پانی میں بھگو کر کھالیتے تھے۔ اس مجاہدہ و ریاضت نے جسم کو ایسا زار و نزار کردیا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا[4]۔

ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ اپنے اوپر آپ بڑا ظلم کرتے ہیں[5]۔ آپ نے اپنے ہاتھوں کا چمڑا پکڑ کر فرمایا، خدا کی قسم اگر ہو سکا تو اس کو ایسا بنادوں گا کہ زمین کو اس سے بہت کم نمی تری ملے[6]۔

ماسوا اللہ سے بے خوفی کا یہ حال تھا کہ وحشی حیوانوں تک سے نہیں ڈرتے تھے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ عامر جب غزوات میں شریک ہوتے تھے اور راستہ میں جھاڑیاں ملتی اور ان سے کہا جاتا کہ ان میں شیر کا ڈر ہے، تو جواب دیتے کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس کے سوا کسی کا خوف کروں[7]۔

عبادت میں اخفا:

عبادت میں ہمیشہ اخفا کا اہتمام رکھتے اور عام نگاہوں سے چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ ان کے ایک شریک سفر کا جو کسی جہاد میں ہمراہ تھے بیان ہے کہ ایک مہم میں میرا اور عامر کا ساتھ ہو گیا۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۷۸، ۷۹ [2] ایضاً۔ ص ۷۹ [3] ایضاً۔ ص ۷۵ [4] ایضاً۔ ص ۸۰
[5] ایضاً۔ ص ۷۷ [6] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۷۶ [7] ایضاً

ایک جھاڑی کے پاس منزل ہوئی، عامر نے اپنا سامان ایک جگہ جمع کیا اور گھوڑے کو باندھ کر اس کے سامنے چارہ ڈال کر جھاڑی میں گھس گئے۔ میں نے طے کیا کہ آج میں ان کو ضرور دیکھوں گا کہ وہ رات کو کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نگرانی شروع کی، وہ جا کر ایک ٹیلہ پر نماز میں مشغول ہو گئے اور صبح تک نماز پڑھتے رہے۔

طلوع صبح کے وقت انہوں نے یہ دعا مانگی، خدایا میں نے تجھ سے تین چیزیں مانگی تھیں دو تو نے عطا فرمائیں اور ایک نہیں دی، خدایا دے دے کہ میں حسب خواہش تیری عبادت کر سکوں۔ یہ دعا کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ اس وقت مجھ پر ان کی نظر پڑی، مجھے دیکھ کر کہا معلوم ہوتا ہے تم رات بھر میری نگرانی کرتے رہے، میں ابھی تم کو بتاتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ مجھ پر بڑے زور سے بگڑے۔ میں نے بھی ذرشت لہجہ میں جواب دیا کہ اس ہنگامہ آرائی کو جانے دیجئے، آپ نے دعا میں خدا سے جن باتوں کے چاہنے کا ذکر کیا ہے، ان کو بتائیے ورنہ رات کا سارا ماجرا لوگوں پر ظاہر کر دوں گا۔ انہوں نے کہا دیکھو ایسا نہ کرنا، میں نے کہا، نہیں ایسا ضرور کروں گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں باز آنے والا نہیں ہوں تو کہا اچھا میں بتائے دیتا ہوں، لیکن جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ میں نے خدا کو درمیان میں ڈال کر رازداری کا وعدہ کیا۔

اس وقت انہوں نے کہا، میں نے اپنے رب سے چاہا تھا کہ وہ میرے دل سے عورت کی خواہش نکال دے، جو میرے دین کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ خدا نے اسے قبول کر لیا، اور اب میرے نزدیک عورت اور دیوار دونوں برابر ہیں۔ دوسری دعا یہ تھی کہ میرے دل میں اس کے علاوہ اور کسی کا خوف باقی نہ رہے، چنانچہ اب میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ تیسری دعا یہ تھی کہ میری نیند اُڑ جائے تاکہ رات دن جب چاہوں عبادت کر سکوں، یہ دعا قبول نہ ہوئی[1]۔

بعض شکوک کا ازالہ:

اگرچہ بظاہر اس نفس کشی کی سرحد رہبانیت سے ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن مقربین بارگاہ کے لئے یہ منزل بھی ابتدائی ہے۔ "جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"۔ خود ان کے زمانہ میں لوگوں نے ان کے اس راہبانہ تقشف پر اعتراضات کئے تھے اور انہوں نے اس کے جو جوابات دیئے تھے ان سے بڑی حد تک ظاہری شکوک رفع ہو جاتے تھے۔ ایک شخص نے ان کی تجرد زندگی کے خلاف دلیل پیش کی:

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۷۵

" قَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً "۔

''ہم نے تمہارے پہلے بہت سے رسول بھیجے اوران کے جوڑے اور اولاد بنائی''۔

یعنی جب انبیاء علیہم السلام نے جو خدا کے سب سے بڑے عبادت گزار بندے تھے، ازدواج نہیں چھوڑیں تو ایک معمولی انسان کے لئے اس کا جواز کیوں کر ہوسکتا ہے ؟

عامر نے قرآن ہی سے اس کا جواب دیا۔

" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ "۔

''ہم نے جن اور انس کو صرف عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے''

ایک اور شخص نے کہا کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے۔انہوں نے اس کی یہ نفسیاتی توجیہ بیان کی کہ مجھے میں نہ نشاط و امنگ ہے اور نہ مال و دولت۔ایسی حالت میں میں کیوں کسی مسلمان عورت کو دھوکا دوں [1]۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ موقع پر کہہ رہے تھے کہ عامر گوشت اور چربی نہیں کھاتے، مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، شادی نہیں کرتے، آج تک ان کے جسم نے دوسرے جسم کو مس نہیں کیا ہے، اور وہ اپنے کو ابراہیم علیہ السلام کے مثل سمجھتے ہیں۔متوکل بن یسار نے یہ باتیں سنیں تو وہ اس کی تصدیق یا تردید کے لئے عامر کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ کے متعلق لوگ ایسا ایسا کہتے ہیں آپ کیا فرماتے ہیں۔

انہوں نے جواب دیا کہ جب مجھے گوشت کھانے کی خواہش ہوتی ہے تو خود بکری ذبح کر کے کھاتا ہوں، چربی بھی کھاتا ہوں مگر وہاں سے (بادیہ کی طرح اشارہ کر کے بتایا) آئی ہوئی روازنہ کی نماز میں مسجد میں نہیں پڑھتا لیکن جمعہ کی نماز با جماعت پڑھتا ہوں۔بقیہ نمازیں یہاں اپنے مقام پر ادا کرتا ہوں۔

شادی اس لئے نہیں کرتا کہ میرا ایک ہی نفس ہے، مجھے ڈر ہے کہ شادی کے بعد وہ مجھے مغلوب نہ کر لے۔میں یہ نہیں کہتا کہ میں ابراہیمؑ کے مثل ہوں، البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھ کو خدا سے امید ہے کہ وہ مجھے نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صلحاء کے ساتھ رکھے گا۔یہ لوگ بہترین رفیق ہیں [2]۔

ان اعتراضوں کے انہوں نے اور بھی جواب دیئے ہیں جو اوپر گزر چکے ہیں۔

---

[1] ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۷۷ [2] ایضاً۔۷۵

جہاد فی سبیل اللہ :

اگرچہ عامر گوشۂ عزلت کے خیال سے پہاڑوں کے دامنوں میں ویرانوں میں اور نامعلوم مقامات پر عبادت کیا کرتے تھے، لیکن اس عزلت نشینی نے انہیں محض حجرہ نشین زاہد نہ بنا دیا تھا، بلکہ ان کی رگوں میں جہاد کا خون دوڑتا رہتا تھا۔ چنانچہ بعض مہمات میں ان کی شرکت کے واقعات اوپر مختلف سلسلوں کے ماتحت گزر چکے ہیں۔

ان کا معمول تھا کہ جب وہ کسی جہاد میں جانے لگتے تو پہلے موافق مزاج رفیق تلاش کرتے۔ جب وہ مل جاتا تو اس سے کہتے کہ میں اس شرط پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں کہ تم تین باتوں کی مجھے اجازت دو۔ ایک یہ کہ میں تمہارا موذن رہوں، دوسرے یہ کہ خدمت گزاری کروں اور اس میں کوئی شخص خلل اندازی نہ کرے، تیسرے اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق تم پر صرف کروں اگر وہ ان باتوں کو مان لیتا تو عامر اس کے ساتھ ہو جاتے ورنہ اس کا ساتھ چھوڑ کر دوسرا ساتھی تلاش کرتے[1]۔ اپنی سواری پر دوسرے مجاہدین کو باری باری سے سوار کرتے تھے[2]۔

ان کا جہاد خالصۃً لوجہ اللہ ہوتا تھا، اسماء بن عبید کا بیان ہے کہ عامر عنبری ایک مہم میں تھے، جنگ میں ایک بڑے دشمن کی لڑکی ہاتھ آئی لوگوں نے عامر کے سامنے اس کے اوصاف بیان کیے، انہوں نے سن کر کہا میں بھی مرد ہوں مجھے یہ لڑکی دے دو، ان کی اس غیر متوقع خواہش پر لوگوں نے نہایت مسرت کے ساتھ لونڈی ان کے حوالے کر دی، جب وہ ان کے قبضہ میں آ گئی تو اس سے کہا تم لوجہ اللہ آزاد ہو، لوگوں نے ان سے کہا آپ اس کے بدلہ میں دوسری لونڈی آزاد کر سکتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنے رب سے ثواب چاہتا ہوں[3]۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر :

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جہاد میں بھی ان کی تیغ زبان بے نیام رہتی تھی اور خدا اور رسول کے احکام کی پامالی پر جوش غضب سے لبریز ہو جاتے تھے ایک مرتبہ حسنہ میں ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک ذمی کو لوگ پکڑے ہوئے اس پر ظلم کر رہے ہیں پہلے انہوں نے زبانی نصیحت کر کے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر جب وہ باز نہ آئے تو عامر کو غصہ آ گیا انہوں نے کہا تم لوگ جھوٹ کہتے ہو میں اپنی زندگی میں ذمۃ اللہ کے ساتھ بد عہدی نہیں دیکھ سکتا اور ذمی کو زبردستی چھڑا لیا[4]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۔　[2] ایضاً　[3] ایضاً ص ۷　[4] ایضاً

امراؤ سلاطین سے بے نیازی :

امراء اور ارباب دول سے ان کی بے نیازی بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی وہ ان سے ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے، ان پر جو الزام قائم کئے گئے تھے ان میں ایک الزام امراء اور حکام سے نہ ملنے کا بھی تھا جس کا انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ تم لوگوں کے یہاں خود ہی حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ہے ان کی حاجتیں پوری کیا کرو اور بے غرض لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو[1]۔ وہ خلفاء و سلاطین کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں انہوں نے جس جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، اسی طرح امیر معاویہ کے عہد خلافت میں بصرہ کے قراء کا ایک وفد شام بھیجا گیا اس میں ایک عامر بھی تھے مضارب بن حزن نے جو وفد بھیجنے والوں میں تھے امیر معاویہ سے پوچھا آپ نے ہمارے قراء کو جنہیں ہم نے وفد میں بھیجا تھا کیسا پایا انہوں نے کہا ایک شخص کے علاوہ باقی سب جھوٹی تعریفیں اور فضول گوئی کرتے ہیں جھوٹ لے کر آتے ہیں اور خیانت لے کر واپس جاتے ہیں صرف ایک شخص طبیعت کا مرد ہے۔ ہم لوگوں نے پوچھا امیر المومنین وہ کون شخص، جواب دیا عامر بن قیس[2]۔

اگر کبھی کوئی امیر یا عہدہ دار خود ان کے پاس آتا تو اس کے ساتھ بھی یہی طرز عمل رہتا۔ ایک مرتبہ کسی غزوہ میں گئے ہوئے تھے راستہ میں ایک مقام پر منزل ہوئی۔ عامر ایک کنیسہ کے احاطہ میں اترے اور ایک آدمی کو متعین کر دیا کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس شخص نے آکر اطلاع دی کہ امیر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ عامر نے اندر بلا لیا، جب وہ آیا تو اس سے کہا میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ تم مجھ کو دنیا کی ترغیب نہ دلانا، اور آخرت کو میری نگاہ سے نہ گرانا[3]۔

دو دوست :

حقیقت یہ ہے کہ عامر جس عالم میں تھے وہاں تعلقات و مراسم دنیاوی کا گزر ہی نہ تھا، چنانچہ ان کی نہ صرف امراء بلکہ کسی سے بھی رسم و راہ نہ تھی، ساری دنیا میں ان کی محبت صرف مطرف بصری کے حصہ میں آئی تھی، عورتوں میں ایک ادنیٰ درجہ کی بکری چرانے والی عورت سے اس کے اوصاف کی بنا پر ہمدردی ہوگئی تھی لیکن اس سے ربط بھی قائم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ مرگئی۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۹۷　[2] ایضاً ص ۸۷　[3] ایضاً ص ۸۷

مطرف کے ساتھ مجذوبانہ محبت تھی، چنانچہ بصرہ چھوڑتے وقت ان سے رخصت ہونے کے لئے ایک شب میں کئی مرتبہ مطرف کے گھر گئے اور ہر مرتبہ ان سے کہتے تھے کہ ''میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں خدا کی قسم تمہاری محبت مجھ کو بار بار تمہارے پاس لاتی ہے[1]۔

عورت کا قصہ یہ ہے کہ ایک مسکین اور عابدہ عورت چند بدویوں کی بکریاں چرایا کرتی تھی اور ان کی ہر قسم کی وحشیانہ سختیاں جھیلتی تھی۔ عامر کے ساتھ اس مصنوعی مماثلت کی وجہ سے بعض لوگوں نے عامر سے کہا کہ فلاں عورت تمہاری بیوی ہے اور جنتی ہے عامر اس کی تلاش میں نکلے۔

اس عورت کی زندگی یہ تھی کہ دن بھر وحشی اور بدخو بدویوں کی بکریاں چراتی تھی، شام کو جب بکریاں لے کر واپس آتی تو بدوی گالیوں کی بوچھاڑ سے اس کا استقبال کرتے اور اس کے سامنے روٹی کے دو ٹکڑے پھینک دیتے۔ یہ انہیں اٹھالیتی اور ان میں سے ایک لے جاکر اپنے گھر والوں کو دیتی تھی، خود دن روزے سے رہتی تھی، شام کو دوسرے ٹکڑے سے افطار کرتی۔

عامر تلاش کرکے اس کے پاس پہنچے۔ جب بکریاں چرانے کے لئے نکلی تو عامر بھی ساتھ ہوگئے۔ ایک مقام پر پہنچ کر اس عورت نے بکریوں کو چھوڑ دیا، اور نماز میں مصروف ہوگئی۔ عامر نے اس سے کہا کہ اگر تمہاری کوئی ضرورت ہو تو مجھ سے بیان کرو۔ اس نے کہا میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، جب عامر کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا میری یہ خواہش ہے کہ میرے پاس دو سپید کپڑے ہوتے جو میرے کفن کے کام آتے۔

عامر نے اس سے پوچھا وہ لوگ (بدوی) تم کو گالیاں کیوں دیتے ہیں؟ اس نے جواب دیا اس میں مجھے خدا سے اجرت کی توقع ہے۔

اس گفتگو کے بعد عامر اس کے آقاؤں کے پاس گئے اور ان سے کہا تم لوگ اپنی لونڈی کو گالیاں کیوں دیتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو وہ ہمارے کام کی نہ رہے۔ عامر نے کہا اچھا اس کو تم لوگ بیچو گے؟ انہوں نے کہا ہم کسی قیمت پر بھی اسے الگ نہ کریں گے۔

یہ جواب سن کر عامر لوٹ گئے اور لونڈی کی خواہش کے مطابق دو سپید کپڑے مہیا کرکے اس کے پاس گئے، لیکن یہ عجیب اتفاق کہ اس وقت لونڈی اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھی۔ عامر نے اس کے آقاؤں سے اجازت لے کر اس کی تجہیز و تکفین کی[1]۔ اس طرح دنیا میں انہیں ایک عورت سے ہمدردی بھی پیدا ہوئی تو یوں ختم ہوگئی۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۷۵

صدقات وخیرات :

عامر بڑے مخیر وفیاض تھے۔مجاہدین کی مالی خدمت کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔ان کو دو ہزار وظیفہ ملتا تھا۔جس وقت ملتا اسی وقت سے راستے میں انہیں جس قدر سائل ملتے انہیں تقسیم کرتے ہوئے گھر آتے[1]۔

دشمن کے لئے دعا :

ان کی زبان کسی کی بدی سے آلودہ نہ ہوئی اور نہ کسی کے لئے ان کی زبان سے کبھی بددعا نکلی اپنے دشمنوں کے لئے بھی دعا ہی کرتے تھے، چنانچہ جن لوگوں نے انہیں وطن سے نکلوایا تھا۔ان کے حق میں بھی دعا کرتے تھے کہ خدایا جن لوگوں نے میری چغلی کھائی ہے اور مجھ کو میرے وطن سے نکلوایا ہے اور میرے بھائیوں سے مجھ کو جدا کردیا ہے ان کے مال اور ان کی اولاد میں ترقی دے،انہیں تندرست رکھ اور ان کی عمر بڑھا[2]۔

ایک قابل ذکر خواب :

ان کے متعلق ایک شخص کا خواب لائق ذکر ہے،جس سے ان کے روحانی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے سعید جزری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کو خواب میں جمال نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا،اس شخص نے آپ سے التجا کی کہ حضور ﷺ میرے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے عامر دعا کررہے ہیں،اس شخص نے عامر سے یہ خواب بیان کیا،یہ لطف وکرم سن کر ان پر اتنی رقت طاری ہوئی کہ ہچکی بندھ گئی[3]۔

(۳۸) عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ

نام ونسب : عبداللہ نام ابوعبدالرحمٰن کنیت،مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بھتیجے تھے۔نسب نامہ یہ ہے،عبداللہ بن عتبہ بن مسعود بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل ہذلی۔

عبداللہ عہد رسالت میں پیدا ہو چکے تھے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات نبوی میں اتنا ہوش بھی ہو گیا تھا کہ آپ کو دیکھا تھا،اور آپ کے متعلق بعض واقعات ان کے حافظہ میں محفوظ تھے،اسی لئے عقیلی نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے وہ عہد رسالت میں پیدا

---

[1] ابن سعد جلد ۷۔ق اول۔ص ۷۵ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۸۰

ضرور ہوئے لیکن حیات نبوی میں بالکل بچہ تھے، اکثر ارباب سیر کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ تابعی ہیں، چنانچہ علامہ ابن سعد نے تابعین ہی کے زمرے میں ان کے حالات لکھے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے اگر چہ احتیاطاً استیعاب میں ان کے حالات لکھ دیئے ہیں، لیکن ان کے نزدیک بھی وہ صحابی نہیں ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ عقیلی نے صحابہ میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن یہ سراسر غلط ہے البتہ وہ کبار تابعین میں ہیں[1]۔ بعض لوگ ان کی صحابیت پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان کو والی بنایا تھا، اور وہ غیر صحابی کو کسی عہدہ پر مقرر نہیں کرتے تھے لیکن یہ کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

فضل وکمال : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ذات سے ان کا گھر علم وعمل کا گہوارہ تھا عبداللہ بن عتبہ نے اسی گہوارہ میں پرورش پائی تھی اس لئے گھر کی یہ دولت ان کے حصہ میں بھی آئی، چنانچہ وہ مدینہ کے ممتاز علماء میں تھے اور حدیث فقہ وغیرہ مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقة رفیعا، کثیر الحدیث والفتیاء فقیها[2]۔ حدیث میں انہوں نے اپنے چچا عبداللہ بن مسعودؓ، عمرؓ، عمار بن یاسرؓ ابوذرؓ ابو ہریرہؓ وغیرہ سے روایتیں کی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے لڑکے عبیداللہ، عون اور حمید بن عبدالرحمٰن، معاویہ ابن عبداللہ بن جعفر، ابو اسحاق سبیعی، عامر الشعبی۔ عبداللہ بن سعید زمانی اور محمد بن سیرین وغیرہ قابل ذکر ہیں[3]۔

وفات : عبدالملک کے عہد خلافت میں بشر بن مروان کی ولایت عراق کے زمانہ میں وفات پائی[4]۔

اولاد : عبداللہ اولاد کی جانب سے بڑے خوش قسمت تھے، ان کے ایک لڑکے مدینہ کے بڑے نامور عالم اور وہاں کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک تھے، ان کے حالات آئندہ آئیں گے اور عون زہد وورع میں مشہور تھے[5]۔

(۳۹) عبداللہ بن عونؒ

نام ونسب : عبداللہ نام، ابو عون کنیت عبداللہ بن درہ مزنی کے غلام تھے۔

پیدائش : سیل جارف کے تین سال قبل پیدا ہوئے[6]۔

فضل وکمال : علمی اعتبار سے کوفہ کے اکابر علماء میں تھے۔ امام ثوری کہتے تھے کہ میں نے ایوب یونس تیمی اور ابن عون جیسے فضلا کسی ایک شہر میں اکٹھے نہیں دیکھے[7]۔

۱۔ استیعاب۔ جلد اول۔ ص ۳۹۰ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۴۲ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۱۱
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۲ ۵۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۴۷۸ ۶۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۵
۷۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۷

حدیث : اگر چہ عبداللہ جملہ مذہبی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے لیکن حدیث نبوی سے ان کو خاص ذوق تھا اور اس میں امتیازی پایہ رکھتے تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقۃ کثیر الحدیث [۱]۔

انہوں نے اس عہد کے تمام اکابر محدثین کا علم اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ ابن مدائنی کا بیان ہے کہ ابن عون نے ایسی مستند احادیث محفوظ کی تھیں جو ان کے کسی ساتھی کے حصہ میں نہ آئی ہوں گی۔ مدینہ کے ممتاز محدثین میں انہوں نے سالم اور قاسم، بصرہ کے محدثین میں حسن بصری اور ابن سیرین اور کوفہ کے محدثین میں امام شعبی اور امام نخعی، مکہ کے محدثین میں عطاء اور مجاہد اور شام کے محدثین میں مکحول اور رجاء بن حیوۃ سے سماع حدیث کیا تھا [۲]۔ اس طرح اس عہد کے تمام مراکز حدیث کے اکابر محدثین کی حدیثیں انہوں نے حاصل کر لی تھیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے علماء سے بھی وہ مستفید ہوئے تھے، ان میں بعضوں کے نام یہ ہیں، ثمامہ بن عبداللہ، بن انس، انس بن سیرین، زیاد بن جبیر بن حیہ، عبدالرحمٰن ابن ابی بکرہ موسیٰ بن انس بن مالک، ہشام بن زید بن انس، سعید بن جبیر اور نافع وغیرہ [۳]۔

ان بزرگوں کے فیض نے ابن عون کا دامن علم نہایت وسیع کر دیا تھا، ابن مہدی کا بیان ہے کہ عراق میں ابن عون سے بڑا سنت کا عالم کوئی نہ تھا [۴]۔

ابن مبارک کہتے تھے کہ میں نے ملاقات سے پہلے جن جن لوگوں کا تذکرہ سنا تھا ان میں ابن عون، حیوہ اور سفیان کے علاوہ باقی سب کو ملنے کے بعد کم پایا، مگر ابن عون سے ملنے کے بعد دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے ان کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں اور مرتے دم تک جدا نہ ہوں [۵]۔

ایک مرتبہ ہشام بن حسان نے ایک حدیث بیان کی، کسی نے پوچھا یہ حدیث کس سے سنی جواب دیا، اس شخص سے جس کا مثل میری آنکھوں نے نہیں دیکھا انہوں نے حسن بصری اور ابن سیرین کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا [۶]۔

روایتِ حدیث میں خوف و احتیاط: اس وسعتِ علم کے باوجود حدیث بیان کرنے میں بڑے محتاط تھے۔ انہوں نے روایت حدیث کے خوف سے راستہ نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ ابن عون نے مجھ سے کہا کہ بھتیجے لوگوں نے میرا راستہ بند کر دیا، میں اپنی ضرورت کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بکار کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ لوگ ان سے حدیثیں پوچھتے تھے [۷]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۲ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۷ ۳؎ ایضاً
۴؎ ایضاً۔ ص ۳۴۸ ۵؎ ایضاً ۶؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۷ ۷؎ ایضاً۔ ص ۲۵

تاہم انہوں نے روایتِ حدیث کا دروازہ بالکل بند نہیں کر دیا تھا اور ماہر کی مصدقہ حدیثیں بیان کرتے تھے۔ بکار روایت کرتے ہیں کہ ابن عون نے کوفہ میں بڑا علم حاصل کیا اور اس کو محمد کے سامنے پیش کیا، محمد نے سن کر جس حدیث پر پسندیدگی ظاہر کی اس کو ابن عون نے بیان کیا باقی احادیث چھوڑ دیں[1]۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے آئمہ تھے۔ اعمش، سفیان ثوری، شعبہ اور ابن مبارک وغیرہ عام تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں، داؤد بن ابی ہند، یحییٰ القطان، عباد بن العوام، ہشیم، یزید بن زریع، ابن علیہ، بشر بن مفضل، معاذ بن معاذ، یزید بن ہارون، ابو عاصم اور محمد بن عبداللہ انصاری وغیرہ[2]۔

فضائل اخلاق:

علم سے زیادہ ان کا طغرائے کمال ان کا زہد و ورع اور ان کے اخلاقی و روحانی فضائل تھے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ ابن عون عبادت و ریاضت، زہد و ورع، فضل و کمال، پابندیٔ سنت اور اہلِ بدعت پر تشدد میں اپنے زمانہ کے سرداروں میں تھے[3]۔

عقیدہ میں تشدد:

عقائد میں صحابۂ کرام کے پاک اور صاف عقیدہ کے پابند تھے اور اس میں مبتدعانہ خیالات کی آمیزش کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ایسے لوگوں کو سلام تک نہ کرتے تھے[4]۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے قدر کا ذکر آیا انہوں نے کہا میری عمر اس عقیدہ کی عمر سے زیادہ ہے میں نے سعید جہنی اور سنبویہ کے علاوہ اسلاف میں کسی کو اس کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا یہ خیال شر ہے[5]۔

عبادت: ان کے زہد و ورع اور عبادت و ریاضت نے ابن سیرین کو بھلا دیا تھا۔ قرہ کا بیان ہے کہ ہم لوگوں کو ابن سیرین ہی کے ورع پر حیرت ہوتی تھی، ابن عون نے انہیں بھی بھلا دیا[1]۔ ان کا سب سے بڑا شغل عبادت تھا، نماز فجر کے بعد قبلہ رو بیٹھ کر ذکر کرتے تھے، طلوع آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھ کر لوگوں سے مخاطب ہوتے[7]۔ ہر رات کوئی سو رکعتیں پڑھتے تھے، اگر کسی شب کو ناغہ ہو جاتا تو دن کو پورا کرتے[8]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۷ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵ ص ۳۴۷ ۳؎ ایضاً۔ ص ۳۴۸
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۵ ۵؎ ایضاً۔ ص ۲۷ ۶؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۳۰
۷؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۵ ۸؎ ایضاً ص ۲۸

گھر کے احاطہ میں ایک خاص مسجد تھی، مغرب اور عشاء کے علاوہ باقی تین نمازیں اپنے لڑکوں، بھائیوں اور دوسرے حاضرین کے ساتھ اسی مسجد میں پڑھتے تھے، جمعہ اور عیدین میں بڑا اہتمام کرتے تھے، غسل کر کے بہترین لباس زیب تن کرتے، خوشبو لگاتے کبھی سواری پر اور کبھی پا پیادہ مسجد جاتے، جمعہ کی نماز پڑھ کر گھر لوٹ جاتے اور سنتیں وغیرہ گھر ہی پر پڑھتے، رمضان کے زمانہ میں عبادت بہت بڑھ جاتی تھی۔ فرض نماز وغیرہ با جماعت پڑھ کر گھر چلے آتے اور تنہائی میں عبادت کرتے تنہائی میں الحمد للہ ربنا کے ورد میں مشغول رہتے تھے[۱] ایک دن درمیان دے کر ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، اس معمول میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے لئے خاص طور سے ایک اونٹنی پال رکھی تھی جس کو بہت محبوب رکھتے تھے، بعض مہمات میں ان کی شرکت کی تصریح ملتی ہے[۲]۔ چنانچہ روم کی کسی جنگ میں شریک ہوئے تھے، اور ایک رومی سے مبارزطلبی کر کے اس کو قتل کیا تھا[۳]۔

اصلاح نفس:

اپنے نفس کی اصلاح کے علاوہ دنیا کے اور مشغلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بکار بن محمد روایت کرتے ہیں کہ ابن عون نہ کسی سے مذاق کرتے تھے، نہ کسی سے بحث و مناظرہ کرتے تھے، نہ شعر خوانی کرتے تھے بس انہیں اپنے نفس کی اصلاح سے کام تھا[۴]۔

احسان میں اخفاء:

کسی کے ساتھ احسان کر کے اس کا اظہار بُرا سمجھتے تھے، بکار بن محمد کا بیان ہے کہ ابن عون جب کسی کے ساتھ کوئی سلوک کرتے تو اس مخفی طریقہ سے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ دوسروں پر اس کا اظہار نہایت بُرا جانتے تھے[۵]۔

قسم سے احتراز:

قسم کھانا اچھا نہ سمجھتے تھے، چنانچہ کبھی سچی قسم بھی نہ کھاتے تھے، بکار بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں ایک زمانہ دراز بلکہ ان کی موت تک ان کے ساتھ رہا، اس طویل مدت میں میں نے کبھی ان کو جھوٹی سچی کسی قسم کی قسم کھاتے نہیں دیکھا[۶]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۶　۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۸　۳ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ق ۲۔ ص ۲۸
۴ ایضاً۔ ص ۲۵　۵ ایضاً ص ۲۶　۶ ایضاً

اخلاق: نہایت خوش اخلاق، حلیم الطبع اور نرم خو تھے، کسی موقع پر بھی ان کی زبان سے کوئی ناروا کلمہ نہیں نکلتا تھا، بکار کا بیان ہے کہ میں نے ابن عون سے زیادہ زبان پر قابو رکھنے والا آدمی نہیں دیکھا، وہ اپنے لونڈی غلاموں بلکہ بکری اور مرغی تک کو بھی گالی نہ دیتے تھے[۱]۔ جہاد کی جس اُونٹنی کو بہت محبوب رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک غلام کو اس پر پانی لاد کر لانے کا حکم دیا اس نے اس کو اتنی بے دردی کے ساتھ مارا کہ اس کی آنکھ بہہ گئی، لوگوں کو خیال ہوا کہ اگر انہیں کسی بات پر غصہ آسکتا ہے تو غلام کی اس حرکت پر ضرور آئے گا، لیکن جب ان کی نظر اونٹنی پر پڑی تو غلام سے صرف اس قدر کہا سبحان اللہ خدا تم کو برکت دے کیا تم کو مارنے کے لئے چہرہ کے علاوہ اور کوئی عضو نہ ملتا تھا، اور اس کو گھر سے نکال کر آزاد کر دیا[۲] ان کی انتہائی خفگی تھی ماپنے دشمنوں کو بھی جن کے ہاتھوں ایذا پہنچی تھی بُرا نہ کہتے تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے ایک عربی عورت سے شادی کی۔ بلال بن ابی بردہ نے اس عصبیت میں کہ ایک غلام نے ایک عربی عورت سے شادی کی انہیں کوڑوں سے پٹوایا۔ بکار کا بیان ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد بھی ابن عون کی زبان سے بلال کے متعلق ایک لفظ نہیں سنا، ایک مرتبہ بعض لوگوں نے کہا کہ بلال نے آپ کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا، فرمایا ایک آدمی مظلوم ہوتا ہے لیکن پھر وہی ظلم کی شکایت کر کے ظالم بن جاتا ہے تم میں سے کوئی بھی بلال کے لئے مجھ سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ (لیکن میں اس کی شکایت کر کے ظالم نہ بنوں گا)[۳]۔

حب رسول: ذات نبوی ﷺ کے ساتھ والہانہ شیفتگی رکھتے تھے، چنانچہ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ایک مرتبہ خواب ہی میں رُخ انور کی زیارت ہو جاتی، خدا نے ان کی یہ تمنا پوری کی وفات سے کچھ دنوں پہلے خواب میں دیدار جمال نبوی سے مشرف ہوئے اس شرف پر ایسے وارفتہ ہوئے کہ بالا خانہ سے اتر کر فوراً مسجد میں آئے اور انتہائی مسرت میں گر پڑے پیروں میں چوٹ آئی لیکن ایک بابرکت یادگار کی حیثیت سے اس چوٹ کا علاج نہ کیا کہ[۴]:

زخم دل مظہر مبادا بہ شود ہشیار باش کیں جراحت یادگار ناوکِ مژگاں دوست

وفات: بالآخر یہی چوٹ مرض الموت کا سبب بن گئی، لیکن ابن عون نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس مرض کی تکلیفوں کا مقابلہ کیا، بکار بن محمد کا بیان ہے کہ بیماری کی حالت میں وہ شیر سے زیادہ ضابط و صابر تھے۔ دوران علالت میں مطلق حرف شکایت زبان پر نہ لائے، ہوش و حواس

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ق ۲۔ ص ۲۵ ۲۔ ایضاً ص ۲۸ ۳۔ ایضاً جلد ۷۔ ص ۲۵ ۴۔ ایضاً ص ۲۹

آخر دم تک قائم رہے، اپنی پھوپھی ام محمد بنت عبداللہ کے کہنے پر میں نے ابن عون کی حالتِ نزع میں سورۂ یٰسین پڑھی تھی میں نے موت کے وقت ان سے زیادہ عاقل کسی کو نہیں دیکھا، جب تک آخری سانس آتی رہی اس وقت تک وہ قبلہ رو خدا کا ذکر کرتے رہے، بالآخر خدا نے ان کی مشکل آسان کی اور رجب ۱۵۱ھ میں وہ واصل بحق ہوگئے، جنازہ میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ مسجد کا صحن اور اس کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی، اور محراب میں جنازہ رکھ کر نماز پڑھائی گئی، جمیل بن محفوظ ازدی نے نماز جنازہ پڑھائی[1]۔

ترکہ : ابن عون کے پاس نقد روپیہ نہ تھا، ترکہ میں دو مکانات چھوڑے مرض الموت میں پانچویں حصہ کی وصیت اپنے اعزہ اقرباء کے لئے کرگئے تھے۔ دس ہزار سے کچھ اوپر قرض تھا۔ اس کو ادا کرنے کے بعد وصیت پوری کی گئی[2]۔

حلیہ : نہایت خوش جمال آدمی تھے، نصف کانوں تک پٹے تھے، مونچھیں زیادہ گھری نہیں کترواتے تھے[3]۔

نفاست : خوش جمالی کے ساتھ بڑے نفاست پسند، لطیف مزاج اور خوش لباس تھے، کپڑے نہایت نرم و باریک پہنتے تھے، خوشبو زیادہ لگاتے تھے، پورا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتے تھے، وضو اور کھانے کے وقت خادم رومال پیش کرتا تھا اس سے ہاتھ منہ صاف کرتے، لہسن وغیرہ بدبودار چیزوں سے سخت نفرت تھی، لہسن کھانے میں لہسن ہوتا تھا اس کو ہاتھ نہ لگاتے تھے ایک مرتبہ لونڈی نے کھانا پکایا سامنے لائی اس میں لہسن کی بو معلوم ہوئی لونڈی سے پوچھا اس نے اقرار کیا لیکن طبیعت میں ضبط و تحمل بہت تھا، اس لئے صرف اس قدر کہا خدا تمہیں برکت دے اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ[4]۔

(۲۰) عبیداللہ بن عبداللہؒ

نام و نسب : عبیداللہ نام، ابو عبداللہ کنیت، مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بھائی عتبہ کے پوتے تھے نسب نامہ یہ ہے۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود بن غافل بن حبیب بن سمخ بن فار بن مخزوم مخزومی۔

فضل و کمال : عبیداللہ کا گھر علم و عمل کا گہوارہ تھا، اس ماحول نے اس کو علم و عمل کا مجمع البحرین بنادیا، فضل و کمال کے لحاظ سے وہ ممتاز ترین تابعین میں شمار ہوتے تھے انہیں حدیث، فقہ، شعر و شاعری

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۲۔ ق ۲۔ ص ۲۹، ۳۰ ۲ ایضاً ص ۳۰ ۳ ایضاً ص ۲۷ ۴ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۶

اور دوسرے مروجہ علوم میں پورا درک تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : کان ثقة کثیر الحدیث العلم شاعر[1]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت امامت اور عظم منزلت پر سب کا اتفاق ہے[2]۔

حدیث : حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے، صحابہ میں انہوں نے ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو واقد لیثیؓ زید بن خالدؓ نعمان بن بشیرؓ عمار بن یاسرؓ ابوطلحہ انصاریؓ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور فاطمہ بنت قیسؓ اور تابعین میں ایک کثیر جماعت سے فیض اٹھایا تھا[3]۔

حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک مرتبہ جو حدیث سن لیتے تھے، وہ ہمیشہ کے لئے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی اس حافظہ نے ان کے علم کا دائرہ نہایت وسیع کر دیا تھا[4]۔ امام زہری کا بیان ہے کہ میں جن جن علماء کے پاس بیٹھا ان کے پاس جو کچھ تھا سب حاصل کر لیا لیکن عبید اللہ علم کا بحر بے پایاں تھے، ان کے پاس جب آتا تھا تو ہمیشہ تازہ علم حاصل ہوتا تھا[5]۔ میں نے بہت علم حاصل کیا، اور ایک حد پر پہنچنے کے بعد خیال ہوا کہ جو کچھ میں حاصل کر چکا ہوں وہ بہت کافی ہے لیکن جب عبید اللہ سے ملا تو معلوم ہوا کہ میرا علم کچھ بھی نہیں ہے[6]۔

تلامذہ : حدیث میں ان کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے بعض کے نام یہ ہیں عون، سعید بن ابراہیم، ابو الزناد، صالح بن کیسان عراک بن مالک، موسیٰ بن ابی عائشہ، ابوبکرہ بن ابی الجہم، عدوی ضمرہ بن سعید، طلحہ بن یحییٰ، عبید اللہ بن عبدہ بن عبدہ، عبدالمجید بن سہیل وغیرہ[7]۔ امام زہری ان کے حلقہ درس کے ممتاز طالب علم اور ان کے مخصوص تلامذہ میں تھے، ان سے ان کا استفادہ ہمیشہ جاری رہا، امام مالک کا بیان ہے کہ ابن شہاب زہری اس وقت بھی جب کہ وہ عالم ہو چکے تھے عبید اللہ کے پاس آتے جاتے تھے۔ عبید اللہ ان سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور وہ ان کے لئے کنوئیں سے پانی بھرتے تھے[8]۔

فقہ : فقہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کا پایہ نہایت بلند تھا[9]۔ امام ابو جعفر طبری کا بیان ہے کہ علم احکام اور حلال و حرام کی معرفت میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا ان کے تفقہ کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ وہ مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک تھے حافظ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ وہ مدینہ کے ان دس پھر ان کے بعد ان سات فقہاء میں سے تھے جو فقہ و فتاویٰ کا محور تھے وہ بڑے صاحب علم، فاضل اور فقہ میں بڑے بلند پایہ تھے[10]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۵ [2] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ق ا۔ ص ۳۱۲ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۲۳
[4] ایضاً۔ ص ۲۲۳ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ق ا۔ ص ۳۱۲ [6] ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۲۷۱
[7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۳ [8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۸ [9] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۴ بحوالہ طبری
[10] ایضاً بحوالہ ابن عبدالبر

شاعری : شاعر بھی تھے۔ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ وہ نہایت اچھے شاعر تھے، میرے علم میں دور صحابہ سے اس وقت تک فضلاء میں ان سے بڑا شاعر اور شاعروں میں اتنا بڑا فقیہ کوئی نہ تھا[1]۔

وہ حقیقی شاعر تھے، ان کی شاعری تفنن طبع کے لئے نہ ہوتی تھی بلکہ سوزِ قلب سے مجبور ہو کر شعر لکھتے تھے جب ان کی شعر گوئی پر کوئی اعتراض کرتا تو جواب دیتے کہ ایک دردمند اور دل کا بیمار اگر سانس نہ لے تو کیسے زندہ رہ سکتا ہے[2]۔ ابوتمام نے حماسہ میں ان کے اشعار نقل کئے ہیں :

شققت القلب ثم زردت فیه　　هواک فلیم فالتام الفتور

میں نے اپنا دل چیر کر اس میں تیری محبت کا بیج بویا، بونے کے بعد شگاف قلب برابر ہو گیا۔

تغلغل حب عثمة فی فوادی　　فبادیه مع المحافی یسیر

عثمہ کی محبت میرے قلب میں ساری اور پیوست ہو گئی، وہ محبت جو علانیہ نظر آتی ہے اس محبت سے کم ہے جو مخفی ہے۔

تغلغل حیث لم یبلغ شرابا　　ولا حزن ولم یبلغ سرور

وہ دل کی اس گہرائی میں پہنچ گئی ہے جہاں شراب، غم اور خوشی کوئی شے نہیں پہنچ سکتی۔

بعض لوگوں نے ان اشعار پر اعتراض کیا کہ آپ ایسے رنگین اور عاشقانہ اشعار کہتے ہیں فرمایا جو دل کے بیمار کو لدود (ایک تلخ دوا جو منہ میں لگائی جاتی ہے) سے راحت ہوتی ہے[3]۔

زہد و عبادت :

اس دردِ دل اور سوز باطن نے ان کو بڑا عابد و متورع بنا دیا تھا۔ امام نووی انہیں صلحائے تابعین میں اور ابن خلکان عبادت گزار لکھتے ہیں[4]۔ ان کی نمازیں بڑی طویل اور سکون و اطمینان کی ہوتی تھیں، امام مالک کا بیان ہے کہ عبیداللہ بڑی طویل نمازیں پڑھتے تھے اور کسی شخص کے لئے بھی اس میں جلدی نہ کرتے تھے[5]۔

ایک مرتبہ علی بن حسین (امام زین العابدین) ان کے پاس آئے، اس وقت عبیداللہ نماز پڑھ رہے تھے، وہ بدستور نماز میں مشغول رہے، علی دیر تک ان کا انتظار کرتے رہے، نماز تمام کرنے کے بعد لوگوں نے اعتراض کیا کہ تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے نواسہ آئے اور تم نے اتنی دیر تک ان کو انتظار کرایا، فرمایا خدا میری مغفرت فرما جس کو علم کی تلاش ہو اسے تکلیف اٹھانا چاہئے[6]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۴　[2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۴　[3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۷۲
[4] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۱۲　[5] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۷۱　[6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۸

اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو عبید اللہ کے اخلاقی فضائل و کمالات کا اندازہ کرنے کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز انہی کے تربیت یافتہ تھے، ان پر ان کے اخلاقی کمالات کا اتنا اثر تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ عبید اللہ کی ایک صحبت اور تھوڑی دیر ان کے ساتھ ہم نشینی مجھے دنیا و مافیہا سے عزیز ہے، خدا کی قسم ان کی ایک رات میں بیت المال کے ایک ہزار دینار سے خریدنے کو تیار ہوں۔ لوگوں نے کہا امیر المومنین بیت المال کے تحفظ میں شدت و اہتمام کے باوجود آپ ایسا فرماتے ہیں، جواب دیا خدا کی قسم میں ان کی رائے، ان کی نصیحت اور ان کی نصیحت کے وسیلہ سے ایک ہزار کے بجائے بیت المال میں ہزاروں ہزار داخل کروں گا، باہمی گفتگو سے عقل میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ قلب کو راحت ملتی ہے۔ غم دور ہوتا ہے اور ادب سدھر جاتا ہے[۱]۔

وفات : باختلاف روایت ۹۸ یا ۹۹ میں مدینہ میں وفات پائی[۲]۔

(۴۱) عبدالرحمٰن بن اسودؒ

نام و نسب : عبدالرحمٰن نام، ابو حفص کنیت، نسب نامہ یہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن اسود بن یزید بن قیس بن عبداللہ بن مالک بن علقمہ بن سلامان بن سہل بن بکر بن عوف بن نخع نخعی مدحجی۔ ان کے والد اسود بن یزید بڑے صاحب علم اور عابد و زاہد تابعی تھے۔ ان کے حالات اُوپر گذر چکے ہیں۔

فضل و کمال : اگر علم میں عبدالرحمٰن کا کوئی قابلِ ذکر پایہ نہ تھا لیکن وہ اس سے تہی دامن بھی نہ تھے۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ان کے والد کے عقیدت مندانہ مراسم تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھی حاضری کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ جب تک میں نابالغ تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بغیر حصولِ اجازت چلا جاتا، بلوغ کے بعد پھر اجازت لینے لگا[۳]۔

حدیث : ان تعلقات کی بناء پر ان کو حضرت عائشہؓ سے استفادہ کا موقع ملتا تھا چنانچہ حدیث میں انہوں نے حضرت عائشہؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور اپنے والد اور والد کے چچا علقمہ بن قیسؓ سے فیض اٹھایا تھا اور ان سے ابو اسحٰق سبیعی، ابو اسحٰق شیبانی، مالک بن مغول ہارون بن عنترہ، عاصم بن کلیب، لیث بن ابی مسلم اور محمد بن اسحٰق ابن یسار وغیرہ نے سماع حدیث کیا تھا[۴]۔

۱۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۲۷۱ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۶ ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۰۲
۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۱۴۰

فقہ : حدیث سے زیادہ ان کو فقہ میں درک تھا۔ حافظ ابن حجر ان کو فقیہ لکھتے ہیں[۱]۔

عبادت وریاضت :

گو علم میں اپنے والد کے برابر نہ تھے لیکن عمل میں ان کے خلف الصدق تھے، رات رات بھر عبادت کرتے تھے۔ محمد بن اسحٰق روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن حج کے سلسلہ میں ہمارے یہاں آئے ان کے ایک پاؤں میں کچھ تکلیف تھی مگر اس حالت میں بھی وہ صبح تک نمازیں پڑھتے رہے اور عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی[۲]۔ زندگی بھر میں علیحدہ علیحدہ اسّی حج اور اسّی عمرے کئے[۳]۔

رمضان میں اپنے قبیلہ کی امامت کرتے تھے اور اہل قبیلہ کے ساتھ بارہ تروتح پڑھتے تھے اور اس میں ایک تہائی قرآن سناتے تھے۔ ان کے علاوہ خود علیحدہ ایک ترویحہ میں بارہ بارہ رکعتیں پڑھتے تھے[۴]۔

بلاتفریق مذہب سلام :

سلام اسلام کی نشانی سمجھتے تھے اور بلا قید مذہب وملت مسلم اور غیر مسلم سب کو سلام کرتے تھے۔ سنان بن حبیب سلمی کا بیان ہے کہ میں عبدالرحمٰن بن اسود کے ساتھ پل کی طرف گیا۔ راستہ میں جو بھی یہودی اور نصرانی ملتا تھا، سب کو سلام کرتے تھے۔ میں نے کہا آپ ان مشرکوں کو سلام کرتے ہیں؟ جواب دیا سلام مسلم کی نشانی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ لوگ پہچان لیں کہ میں مسلمان ہوں[۵]۔

تعلقات کا لحاظ :

قدیم تعلقات اور بزرگوں کے مراسم وتعلقات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ ابی عنام بن طلق کا بیان ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ہم میں اور اسود بن یزید میں ہمسری کے تعلقات تھے۔ عبدالرحمٰن اس کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ جب کسی سفر میں جاتے یا سفر سے آتے تو ہم لوگوں کو آکر سلام کرتے تھے[۶]۔

وفات : سنہ وفات میں بڑا اختلاف ہے۔

حلیہ ولباس : حنا کا خضاب لگاتے تھے اور خز کی چادر اوڑھتے تھے۔

(۴۲) عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ؒ

نام ونسب : عبدالرحمٰن نام ہے۔ ابوعیسیٰ کنیت۔ والد کا نام یسار اور کنیت ابی لیلیٰ تھی۔ اس نے نام کی جگہ لے لی۔ نسب نامہ یہ ہے، عبدالرحمٰن بن یسار بن بلال بن بلیل بن احیحہ بن الجلاح بن

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶، ص ۱۴۰ ۲؎ ایضاً ۳؎ تہذیب الکمال۔ ص ۲۲۴ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۰۳
۵؎ ایضاً۔ ص ۲۰۳ ۶؎ ایضاً

الحریش ابن جحجبا بن کلفہ بن عوف بن عمرو بن عوف اوسی انصاری۔

ابن ابی لیلیٰ علمی اعتبار سے ممتاز تابعین میں تھے ان کے والد ابی لیلیٰ صحابی تھے اور متعدد غزوات میں آنحضرت ﷺ کی ہمرکابی اور جہاد کا شرف حاصل کیا تھا۔ کوفہ آباد ہونے کے بعد یہاں بود و باش اختیار کر لی تھی جنگ حنین میں حضرت علیؓ کی حمایت میں شہید ہوئے[1]۔

پیدائش : عبدالرحمٰن حضرت عمرؓ کے وسط عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے[2]۔

فضل وکمال :

علمی اعتبار سے عبدالرحمٰن بلند مرتبہ تھے خوش قسمتی سے انہوں نے زمانہ ایسا پایا تھا جب صحابۂ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک سو بیس انصار صحابی کو دیکھا تھا[3] اور ان میں بہتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے فیض و برکات نے عبدالرحمٰن کو دولت علم سے مالا مال کر دیا۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے انہیں قرآن و حدیث اور فقہ جملہ فنون میں درک تھا[4]۔

قرآن : قرآن کی قرأت کا خاص ذوق تھا، ان کے یہاں ہر وقت قراء کا مجمع لگا رہتا تھا۔ مجاہد کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن کے ایک خاص مکان میں بہت سے مصاحف رکھے رہتے تھے، یہاں ہر وقت قراء کا مجمع رہتا تھا صرف کھانے کے اوقات میں یہ لوگ یہاں سے ہٹتے تھے[5]۔

حدیث : حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے۔ حافظ ذہبی انہیں امام لکھتے ہیں[1]۔ صحابہ میں انہوں نے اپنے والد ابولیلیٰؓ، عمرؓ، علیؓ، سعدؓ، حذیفہؓ، معاذ بن جبلؓ، مقداد بن اسودؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوذر غفاریؓ، ابی بن کعبؓ، بلال بن رباحؓ، سہل بن حنیفؓ، ابن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، قیس بن سعدؓ، ابوایوب انصاریؓ، کعب بن عجرہؓ، عبداللہ بن زیدؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، انس بن مالکؓ، براء بن عازبؓ، زید بن ارقمؓ، سمرہ بن جندبؓ، صہیبؓ، عبدالرحمٰن بن سمرہؓ، عبداللہ بن حکم اور اسید بن حضیرؓ وغیرہ سے استفادہ کیا تھا، ان میں بعضوں سے سماع ثابت نہیں ہے[2]۔

حلقۂ درس : حدیث میں ان کا عالم اتنا وسیع اور مسلم تھا کہ صحابہ تک ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ان کی احادیث سنتے تھے۔ عبدالملک بن عمیر کا بیان ہے کہ میں نے عبدالرحمٰن کے

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۳۰۲　[2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۔ ص ۲۶۱
[3] ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص ۷۶　[4] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۳۰۲　[5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰
[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۶۱　[2] ایضاً ص ۲۶۱

حلقۂ درس میں متعدد صحابہ کو دیکھا جن میں ایک براءؓ تھے، یہ لوگ خاموشی کے ساتھ عبدالرحمٰن کی احادیث سنتے تھے[1]۔

مذکراۂ حدیث:

حفظ حدیث کے لئے مذاکراہ ضروری سمجھتے تھے چنانچہ خود ان کے یہاں برابر مذاکرہ حدیث جاری رہتا تھا اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ حدیث کی زندگی اس کے مذاکرہ میں ہے[2]۔

فقہ: فقہ میں بھی پوری دستگاہ حاصل تھی۔ حافظ ذہبی انہیں امام وفقیہ لکھتے ہیں[3]۔

عہدہ قضاء: ان کا فقہی کمال اتنا مسلم تھا کہ جب حجاج نے کوفہ کے عہدہ قضا کا انتظام کرنا چاہا تو اس کی نظر انہی پر پڑی اس کے پولیس افسر حوشب نے مخالفت بھی کی اور کہا کہ اگر آپ علی بن ابی طالب کو قاضی بنانا چاہتے ہیں تو انہیں بنایئے[4]۔ (یعنی وہ ان ہی کی طرح تمہاری مخالفت کریں گے) لیکن حجاج نے اس کے باوجود ان ہی کو قاضی بنایا پھر کچھ دنوں کے بعد اختلاف کی بناء پر جس کا تذکرہ آگے آئے گا معزول کر دیا[5]۔

احتیاط: فتاوی کے جوابات دینے میں بڑے محتاط تھے کہا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک سو بیس انصاری اصحاب کو دیکھا ہے کہ جب ان میں سے کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنا پہلو بچا کر چلتا تھا کہ دوسرا شخص جواب دے دے اور اب یہ حال ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں[6]۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ خاصہ وسیع تھا۔ ان میں ان کے لڑکے عیسیٰ، پوتے عبداللہ بن عمرو بن میمون شعبی ثابت البنانی، حکم بن عتبہ، حسین بن عبدالرحمٰن، عمرو بن مرہ، مجاہد بن جبیر، یحییٰ بن الجزار، ہلال الوزان، یزیدی بن ابی زیاد، ابواسحٰق شیبانی، نہال بن عمرو، عبدالملک بن عمیر، اعمش اور اسمٰعیل بن ابی خالد وغیرہ لائق ذکر ہیں[7]۔

سادگی: طبعاً نہایت سادہ مزاج تھے۔ تکلفات کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وضو کے بعد منہ پونچھنے کے لئے رومال پیش کیا۔ انہوں نے پھینک دیا[8]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۷	۲؎ ایضاً۔ ص ۶۷	۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۷	۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۵۰	۶؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۷
۷؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۶۱	۸؎ ابن سعد۔ جلد ص ۷۵

ہیبت: لیکن اس سادگی کے باوجود لوگوں کے دلوں میں ان کی اتنی عظمت ہیبت تھی کہ ان کے ساتھ امراء کی جیسی عظمت کرتے تھے[1]۔

ایک آزمائش:

ان کے دور قضاءت میں انہیں ایک سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا پورا گھر حضرت علی کے فدائیوں میں تھا۔ ان کے والد ابو لیلیٰ حضرت علی کی حمایت میں جنگ صفین میں مارے گئے تھے[2]۔ خود یہ جنگ جمل میں حضرت علی کے پر جوش حامیوں میں تھے اور ان کی فوج کا علم ان کے ہاتھ میں تھا[3]۔ خارجیوں کے مقابلہ میں نہروان کے معرکہ میں بھی حضرت علیؓ کے ساتھ تھے[4]۔ اس فدویت کی بنا پر حجاج نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ حضرت علیؓ پر تبرا کریں، تو یہ توریہ کرتے تھے صاف برانہ کہتے تھے اس لئے حجاج نے ان کو معزول کر کے انہیں مارا[5]۔

ایک بہترین اسوہ: عبدالرحمٰن علوی تھے۔ یعنی حضرت عثمان کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت کے قائل تھے۔ ان کے دوسرے معاصر عبداللہ بن حکیم عثمانی تھے۔ لیکن اس اختلاف عقیدہ کے باوجود دونوں ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ اور کبھی حضرت عثمانؓ اور علیؓ کی فضیلت پر بحث و مناظرہ نہ کرتے تھے[6]۔

وفات: حجاج کے ان مظالم سے تنگ آ کر اس کی مخالفت میں ابن اشعث کے ساتھ ہو گئے تھے، اور اسی جنگ میں وہ کام آئے یا ڈوب کر انتقال کیا[7]۔

(۴۳) عبدالرحمٰن بن غنمؓ

نام ونسب: عبدالرحمٰن نام ہے۔ والد کا نام غنم تھا۔ نسب نامہ یہ ہے، عبدالرحمٰن بن غنم بن کریب ابن ہانی بن ربیعہ۔ بن عامر بن عدی بن وائل بن ناجیہ بن الجفیل بن جماہر بن ادغم بن اشعر اشعری۔

بعض علماء انہیں صحابی بتاتے ہیں، اور اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ وہ ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ آئے تھے، لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے، وہ عہد رسالت میں موجود ضرور رہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰ [2] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۱ [3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۷۵
[4] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۰۰ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۵۰ [6] تاریخ خطیب بغدادی۔
جلد ۱۰۔ ص ۲۰۱ [7] ایضاً۔ ص ۲۰۱۔ ۲۰۲

اور اسی عہد میں مشرف بہ اسلام بھی ہوئے تھے لیکن آنحضرت ﷺ کے شرف زیارت سے محروم رہے۔ یہ روایت تقریباً متفق علیہ ہے[1]۔

فضل وکمال :

فضل وکمال کے لحاظ سے عبدالرحمٰن مختار تابعین میں تھے، ابومسہر غسانی انہیں راس التابعین کہتے تھے حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ کان کبیر القدر صادقا فاصلا[2]۔ ابن سعد نے انہیں شام کے تابعین طبقہ اول میں لکھا ہے عجلی کبار تابعین میں لکھتے ہیں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ صاحب جلالت اور ذی مرتبہ تھے[3]۔

حدیث : انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا، اس لئے انہیں صحابہ کبار کی ایک بڑی جماعت سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابوذر غفاریؓ، ابوداؤد، ابوعبیدہ بن جراحؓ، ابو مالک اشعریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابو ہریرہؓ، عبادہ بن صامتؓ، ثوبانؓ اور معاویہ وغیرہ سے انہوں نے سماع حدیث کیا تھا[4]۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی صحبت سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ مستفید ہوئے تھے ان کی ہم جلیسی اور صحبت کی وجہ سے صاحب معاذ ان کا لقب ہو گیا تھا[5]۔

خود ان سے فیض پانے والوں میں ان کے لڑکے محمد بن عبدالرحمٰن، عطیہ بن قیس ابوسلام الاسود، مکحول شامی، شہر بن حوشب، رجاء بن حیوۃ، عبادہ بن نسی، مالک بن ابی مریم اور صفوان بن سلیم وغیرہ لائق ذکر ہیں[6]۔

فقہ : عبدالرحمٰن کا خاص فن فقہ تھا، اس میں ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی، ان کے تفقہ کی بڑی سند یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو فقہ کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا، شام کے تمام تابعین نے فقہ ان ہی سے حاصل کی تھی[7]۔

وفات : ۷۸ھ میں شام ہی میں وفات پائی[8]۔

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھو تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۰　۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۴
۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۱　۴؎ ایضاً۔ ص ۲۵۰　۵؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۰۳
۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۰　۷؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۴ وتہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۰۳
۸؎ ایضاً

(۴۴) عبدالرحمٰن بن قاسمؒ

نام ونسب : قاسم نام ہے۔ ابومحمد کنیت۔ مشہور تابعی قاسم بن محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن قاسم بن ابی بکر بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ، ماں کا نام قریبہ تھا، یہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی صاحبزادی تھیں، اس طرح عبدالرحمٰن کی رگوں میں دادھیال اور نانہال دونوں جانب سے صدیقی خون تھا۔

پیدائش : حضرت عائشہؓ کی زندگی میں پیدا ہو چکے تھے[۱]۔

فضل وکمال :

عبدالرحمٰن کے والد قاسم بن محمد فضل وکمال اور زہد وورع کے لحاظ سے بڑے رتبہ کے تابعی تھے۔ اس لئے یہ دونوں کمالات گویا انہیں وارثۃً ملے تھے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت، امامت فضیلت اور صلاح پر سب کا اتفاق ہے[۲]۔ حافظ ذہبی انہیں ثقہ امام متورع اور بلند مرتبت لکھتے ہیں[۳]۔ ابن حبان انکو فقہ، علم، دیانت، حفظ اور اتقان میں سادات اہل مدینہ میں شمار کرتے ہیں[۴]۔

حدیث : مدینہ کے بڑے حفاظ میں تھے۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں، کان ورع کثیر الحدیث[۵]۔ حافظ ذہبی امام اور حجت لکھتے ہیں، حدیث میں انہوں نے اپنے والد قاسم، ابن مسیب عبداللہ بن عبداللہ بن عمر، سالم بن عبداللہ بن عمر، نافع اور محمد بن جعفر بن زبیر وغیرہ بڑے بڑے تابعین سے استفادہ کیا تھا[۶]۔ اور سماک بن حرب، امام زہری، عبیداللہ بن عمرو بن عجلان، ہشام بن عروہ، منصور بن زاذان، یحییٰ بن منصور، یحییٰ بن سعید انصاری، موسیٰ بن عقبہ، ایوب سختیانی، حمید الطویل، مالک، شعبہ، حماد بن سلمہ، ثوری، اوزاعی، ابن جریج اور لیث وغیرہ جیسے اکابر آپ کے فیض یافتہ تھے[۷]۔

فقہ : فقہ میں بھی ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ ابن حبان انہیں مدینہ کے سادات فقہا میں لکھتے ہیں۔ امام نووی رضی الرضی اور فقیہ ابن الفقیہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں[۸]۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۱۲ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۰۳ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۲
۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۴ ۵۔ تہذیب الاسماء بحوالہ ابن سعد ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۲
۷۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۵ ۸۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۰۳

زہد وورع: زہد وورع میں بھی ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ ابن سعد، حافظ ذہبی ابن حجر اور امام نووی تمام ارباب سیر وطبقات ان کے زہد وورع پر متفق البیان ہیں، مصعب خیار مسلمین میں لکھتے ہیں عروہ کا بیان ہے کہ مدینہ میں ان سے افضل کسی کو نہیں پایا[1] ابن عیینہ انہیں اس عہد کا افضل ترین شخص کہتے تھے[2]۔

وفات: ان کی جائے وفات اور سن وفات دونوں میں ارباب سیر کا اختلاف ہے، ابن سعد کا بیان ہے کہ شام میں ۱۲۶ھ میں وفات پائی، خلیفہ کی روایت کے مطابق سن یہی ہے لیکن جائے وفات مدینہ ہے بعض ۱۳۱ھ لکھتے ہیں[3]۔

(۴۵) عروہ بن زبیرؒ

نام ونسب: عروہ نام، ابوعبداللہ کنیت، مشہور صحابی حواری رسول حضرت زبیر بن عوامؓ کے فرزند تھے، ان کی ماں اسماء، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی صاحبزادی تھیں، اس طرح عروہ کی رگوں میں ایک جانب حواری رسول اور دوسری جانب صدیق رسول کا خون تھا۔

پیدائش: حضرت عمرؓ کے آخر یا حضرت عثمانؓ کے آغاز عہد خلافت میں پیدا ہوئے، پہلی روایت زیادہ مرجح ہے[4]۔

جنگ جمل وصفین:

جنگ جمل میں اپنی خالہ حضرت عائشہ کے ساتھ نکلنا چاہا، لیکن ان کی عمر اس وقت کل تیرہ سال کی تھی اس لئے شریک نہیں کئے گئے[5]۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ ؓ کی جنگ میں وہ کسی جانب نہ تھے۔

بھائی کی حمایت:

اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر اور عبدالملک کی معرکہ آرائیوں میں اپنے بھائی کے ساتھ تھے۔ عبداللہ کے مقتول ہونے کے بعد حجاج نے ان کی لاش سولی پر لٹکوادی تھی، اور تجہیز وتکفین کے لئے حوالہ نہ کرتا تھا۔ اس وقت عروہ ہی عبدالملک کے پاس شام گئے تھے۔ وہ بڑی محبت اور عزت سے پیش آیا۔ عروہ کو گلے لگا کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اس وقت تک اس کو عبداللہ بن زبیرؓ کے قتل ہونے کی

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۴۵۴ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۴ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۵۵ [4] ایضاً۔ ص ۱۸۳ [5] ایضاً

خبر نہ پہنچی تھی۔ عروہ ہی کی زبانی اسے معلوم ہوا یہ خبر سن کو اس نے سجدہ شکرادا کیا اور عروہ کی درخواست پر فوراً حجاج کے نام لاش حوالہ کرنے کا حکم جاری کر دیا، اور اس کی اس حرکت پر سخت ناپسندیدگی ظاہر کی[1]۔

عبدالملک کی بیعت :

ادھر مکہ میں عبداللہؓ کے قتل کے بعد حجاج عروہ کی تلاش میں تھا۔ جب ان کا پتہ نہ چلا تو اس نے عبدالملک کو لکھا کہ عروہ اپنے بھائی کے ساتھ تھے۔ ان کے قتل ہونے کے بعد خدا کا مال لے کر بھاگ گئے۔ اس وقت عروہ شام میں موجود تھے۔

اس لئے عبدالملک نے جواب دیا کہ وہ بھاگے نہیں ہیں، بلکہ میری بیعت کر لی ہے۔ میں نے ان کی خطاؤں کو معاف کر کے انہیں امان دے دی ہے۔ وہ مکہ واپس جاتے ہیں وہاں ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی جائے غرض وہ عبدالملک سے بیعت کر کے مکہ واپس آئے ان کی واپسی کے بعد ان کے بھائی کی لاش دفن کی گئی[2]۔

عقیق کا قیام :

اگرچہ عروہ نے عبدالملک کی بیعت کر لی تھی اور دونوں میں کوئی ناخوشگواری باقی نہ رہ گئی تھی، مگر وہ امویوں کی بے عنوانیوں اور جابرانہ طریق حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے، لیکن ان کا روکنا بھی ان کے بس میں نہ تھا، اس لئے انہوں نے شہر کا قیام ترک کر کے مدینہ کے قریب عقیق کے دیہات میں سکونت اختیار کر لی[3]۔

عبداللہ بن حسن کا بیان ہے کہ علی بن حسین (زین العابدین) اور عروہ روزانہ بعد عشاء مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں بیٹھتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ ایک دن گفتگو میں بنی اُمیہ کے مظالم کا تذکرہ آیا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ جب کسی میں ان مظالم کو روکنے کی طاقت نہیں ہے تو ان کے ساتھ رہنا کہاں تک مناسب ہے۔ خدا ان مظالم کی سزا میں ایک نہ ایک دن ان پر عذاب نازل کرے گا۔

عروہ نے علی بن حسین سے کہا کہ جو شخص ظالموں سے علیحدہ رہے گا اور خدا اس کی بیزاری سے واقف ہوگا۔ تو امید ہے کہ جب خدا اُن کو کسی مصیبت میں مبتلا کرے گا تو ظالموں سے علیحدہ رہنے والا شخص خواہ ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہو، اس مصیبت سے محفوظ رہے گا۔ اس گفتگو کے بعد

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۴۔ ص ۲۹۱ [2] ایضاً [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۵

عروہ مدینہ چھوڑ کر عقیق چلے گئے[1]۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا ان کی مسجدیں لہو ولعب اور ان کے بازار لغویات کا گہوارہ ہیں اور ان کے راستوں میں بے حیائی کی گرم بازاری ہے[2]۔

مصر کا قیام: ابن یونس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ سات سال تک مصر میں بھی رہے[3]۔

فضل وکمال: عروہ ان اسلاف اور ان بزرگوں کی یادگار تھے، جو علم وعمل کا مجمع البحرین تھے۔ ان کے والد زبیر بن عوام حواری رسول تھے۔ ان کے نانا صدیق خلیل رسول تھے۔ ان کی خالہ عائشہ اُم المومنین تھیں۔ ان کی ماں اسماء کو زبان رسالت سے ذات النطاقین کا خطاب ملا تھا۔ ان کے بڑے بھائی عبداللہ بڑے صاحب علم صحابی تھے۔

غرض ان کا سارا گھرانہ علم وعمل اور مذہبی اور اخلاقی فضائل وکمالات کا پیکر تھا۔ عروہؓ نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی میں پرورش پائی اس لئے یہ دولت انہیں وراثۃً ملی تھی اور ان کا دامن جملہ علمی اور اخلاقی فضائل سے معمور تھا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ان کی جلالت، علو مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی انہیں امام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں۔ انہیں حدیث اور فقہ دونوں میں یکساں کمال حاصل تھا۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں: کان ثقة کثیر الحدیث فقیها عالیا ماموناً ثبتاً[5]۔

حدیث: عروہ نے اپنے والد، بھائی، ماں، خالہ سب سے حدیث میں فیض اُٹھایا تھا[6]۔ حضرت عائشہؓ کے خرمن کمال سے خصوصیت کے ساتھ خوشہ چینی کی تھی۔

قبیصہ کا بیان ہے کہ عروہ حضرت عائشہؓ کے پاس ہم سب سے زیادہ آتے جاتے تھے، اور حضرت عائشہؓ اعلم الناس تھیں[7]۔ انہوں نے قریب قریب حضرت عائشہؓ کا پورا علمی ذخیرہ اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا۔

ان کا خود بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ کی وفات سے چار پانچ سال پہلے ان کی کل حدیث محفوظ کر لی تھیں۔ اگر ان کا انتقال اسی وقت ہو گیا ہوتا تو مجھے ان کی کسی حدیث کے باقی رہ جانے کا افسوس نہ ہوتا کیونکہ ان کی کل احادیث میرے سینہ میں محفوظ ہو چکی تھیں[8]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد۵۔ ص۱۳۷ [2] مختصر صفوۃ الصفوہ۔ ص۳۲ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد۷۔ ص۱۸۵
[4] تہذیب الاسماء۔ جلد۱۔ ص۳۳۲ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص۵۲ [6] ابن سعد۔ جلد۵۔ ص۱۳۳
[7] تہذیب التہذیب۔ جلد۷۔ ص۱۸۲ [8] ایضاً

حضرت عائشہؓ کے علاوہ اکابر صحابہ میں زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن عمرؓ ابن عمرو بن العاصؓ، اسامہ بن زیدؓ، ابوایوب انصاریؓ۔ ابوہریرہؓ، سعید بن زیدؓ، عمرو بن نفیلؓ، حکیم بن حزامؓ، ہشام بن حکیمؓ، جابر بن عبداللہؓ، مسور بن مخرمہؓ، حسن بن علیؓ، نعمان بن بشیرؓ، عمرو بن العاصؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، عمرو بن سلمہؓ، اُم المومنین اُم سلمہؓ، اور اُم حبیبہؓ وغیرہ تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت سے فیضیاب ہوئے تھے [۱]۔

ان بزرگوں کے فیض نے عروہ کا دامن علم نہایت وسیع کر دیا تھا، ابن شہاب زہری کہتے تھے کہ عروہ حدیث کا بحر ذخار تھے [۲]۔ عروہ کے صاحبزادے ہشام جو خود بڑے محدث تھے کہتے کہ ہم نے والد کی احادیث کے دو ہزار حصوں میں ایک حصہ بھی حاصل نہ کیا [۳]۔

فقہ : مگر ان کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا [۴]۔ اس فن کو بھی انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے حاصل کیا تھا، اور اس میں ان کو اتنا کمال تھا کہ مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک فقیہ مانے جاتے تھے۔ فقیہ المدینہ احد الفقہاء السبعۃ فقہا المدینۃ [۵]۔

فقہ میں تصانیف :

آپ نے فقہ میں کتابیں بھی تالیف کی تھیں۔ ان میں سے بعض حرہ کے ہنگامہ کے زمانہ میں جب یزیدی لشکر نے مدینۃ الرسول کو لوٹا تھا، خود جلا دیں۔ مگر بعد میں ان کے جلانے کا افسوس ہوا [۶]۔

چنانچہ فرماتے تھے کہ ہم لوگ کتاب اللہ کی موجودگی میں دوسری کتاب نہیں لکھتے تھے۔ اس لئے میں نے اپنی کتاب ضائع کر دیں۔ لیکن اب خدا کی قسم میری یہ خواہش ہے کہ میری کتابیں میرے پاس موجود ہوتیں اور خدا کی کتاب اپنی جگہ پر دائم وقائم رہتی [۷]۔

بعض اقوال :

فرماتے تھے کہ جس آدمی میں تم ایک اچھائی دیکھو تو اس سے محبت کرو اور یقین کرو کہ اس میں اور اچھائیاں بھی ہوں گی اور اگر کوئی برائی دیکھو تو اس سے نفرت کرو اور یقین رکھو کہ اس میں ایسی اور برائیاں بھی ہوں گی [۸]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۱۸۲ [۲] ایضاً [۳] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۳۲ [۴] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۲ [۵] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۳۳۱ [۶] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۳
[۷] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۱۸۳ [۸] مختصر صفوۃ الصفوہ۔ ص ۱۳۱

صحابہ کا استفادہ :

ان کا فقہی کمال اس قدر مسلم تھا کہ بڑے بڑے صحابہ رسول مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے[۱]۔

احتیاط: لیکن اس کمال کے باوجود عروہ اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ محض رائے سے نہ بیان کرتے تھے[۲]۔

ترغیب علم: یہ کہہ کر نوجوان کو تحصیل علم کی ترغیب دلاتے تھے کہ ہم لوگ بھی ایک زمانہ میں چھوٹے تھے، آج وہ دن آیا کہ ہمارا شمار بڑوں میں ہے تم بھی گو آج کم سن ہو لیکن ایک زمانہ آئے گا جب بڑے ہو گے اس لئے علم حاصل کر کے سردار بن جاؤ کہ لوگوں کو تمہاری احتیاج ہو[۳]۔

فضائل اخلاق: اس علم کے ساتھ عروہ عمل کے زیور سے بھی آراستہ تھے، وہ اپنے اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ عروہ صالح آدمی تھے[۴]۔ ابن شہاب زہری کا قول ہے کہ وہ علماء خیر میں تھے[۵]۔

عبادت وریاضت :

بڑے عابد وزاہد تھے۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں علم سیاست اور عبادت سب جمع تھیں[۶]۔ تہجد اس التزام کے ساتھ پڑھتے تھے کہ ایک شب کے سوا جب ایک مرض کے سلسلہ میں ان کا پاؤں کاٹا گیا اور کبھی ناغہ نہ ہوئی[۷]۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے ممنوعہ ایام کے علاوہ باقی بارہوں مہینے روزے رکھتے تھے سفر کی حالت میں بھی نہ چھوٹتا تھا۔ مرض الموت میں بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔ چنانچہ انتقال کے دن بھی روزے سے تھے[۸]۔

تلاوت قرآن محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ایک چوتھائی قرآن دن میں ناظرہ پڑھتے تھے، باقی رات کو تہجد میں تمام کرتے تھے[۹]۔

صبر واستقامت :

صبر واستقامت کا مجسم پیکر تھے۔ بڑی سے بڑی آزمائش اور تکلیف کے موقع پر زبان سے اُف نہ نکلتی تھی۔ ایک مرتبہ عبدالملک کے پاس شام گئے ہوئے تھے، ان کے لڑکے محمد بھی ساتھ تھے۔ وہ شاہی اصطبل دیکھنے گئے۔ ایک جانور نے ان کو بخ دیا، اس کے صدمہ سے وہ اسی وقت جان بحق

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۱۸۳ ۲ ایضاً ۳ ایضاً۔ ص ۱۸۲ ۴ ایضاً
۵ ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۵۴ ۶ شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۳ ۷ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۵۴
۸ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۲ ۹ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۱۸۳

ہو گئے۔ اس کے بعد ہی عروہ کے پاؤں میں ایک خراب قسم کا زہریلا زخم پیدا ہو گیا۔ اطباء نے پاؤں کاٹے جانے کا مشورہ دیا اور نہ کاٹے جانے کی صورت میں تمام جسم میں زہر پھیلا جانے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ عروہ اگرچہ اس وقت ضعیف ہو چکے تھے لیکن انہوں نے جوانوں سے زیادہ ہمت و استقلال سے کام لیا۔

پاؤں کاٹنے سے پہلے طبیب نے کہا، تھوڑی سی شراب پی لیجئے تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو۔ فرمایا، جس مرض میں مجھ کو صحت کی امید ہو اس میں بھی حرام شے سے مدد نہ لوں گا۔ اس نے کہا تو پھر غافل کر دینے والی دوا ہی استعمال کر لیجئے۔ فرمایا، میں یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ میرے جسم کا ایک عضو کاٹا جائے اور میں اس کی تکلیف محسوس نہ کروں۔

آپریشن کے وقت چند آدمی سنبھالنے کے لئے آئے، عروہ نے پوچھا تمہارا کیا کام ہے۔ انہوں نے کہا زیادہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اس لئے آپ کو سنبھالنے کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا، مجھ کو امید ہے کہ تمہاری امداد کی ضرورت نہ ہوگی، اور نہایت استقلال کے ساتھ پاؤں کٹوا دیا۔

جس وقت پاؤں ٹخنوں سے الگ کیا گیا۔ اس وقت زبان پر تسبیح و تہلیل تھی۔ جب خون بند کرنے کے لئے زخم کو داغا گیا، تو شدت تکلیف سے بے ہوش ہو گئے، لیکن جلد ہی ہوش آ گیا اور چہرہ کا پسینہ پونچھ کر کٹے ہوئے پاؤں کو منگا کر دیکھا اور اس کو اُلٹ پلٹ کر کے اس سے خطاب کر کے فرمایا، اس ذات کی قسم جس نے تجھ سے میرا بوجھ اُٹھوایا وہ خوب جانتا ہے کہ میں کسی حرام راستہ پر گامزن نہیں ہوا[1]۔

صبر و شکر: ان حوادث اور مصائب کے باوجود زبان شکر و شکایت سے آلودہ نہ ہوئی اور ہمیشہ خدا کا شکر ہی ادا کرتی رہی چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ میرے چار ہاتھ پاؤں میں سے تو نے ایک ہی کو لیا، اور تین باقی رکھے اور چار لڑکوں میں سے ایک ہی کو لیا اور تین باقی رکھے اگر تو نے کچھ لیا ہے تو بہت کچھ باقی رکھا ہے اگر کچھ مصیبت میں مبتلا کیا ہے تو بہت دنوں عافیت میں بھی رکھ چکا ہے[2]۔

دولتِ دنیا سے بے نیازی:

ان کی نگاہ میں دولت دنیا اور چند روزہ عیش و تنعم کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کے لئے انہوں نے خدا سے کبھی دنیا نہیں مانگی۔ ایک مرتبہ امیر معاویہ کے زمانہ میں یہ ان کے بھائی عبداللہؓ اور مصعب بن زبیرؓ اور عبدالملک چاروں آدمی مسجد حرام میں جمع تھے کسی نے تجویز پیش کی کہ ہم لوگ اس

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۱۶ [2] مختصر الصفوۃ الصفوۃ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۱

گھر میں خدا کے روبرو اپنی اپنی آرزوئیں پیش کریں۔ سب نے اسے پسند کیا سب سے پہلے عروہ کے بھائی عبداللہ نے کہا کہ میری آرزو یہ ہے کہ میں حرم کا بادشاہ ہو جاؤں اور مجھے تخت خلافت ملے ان کے بعد ان کے دوسرے بھائی مصعب نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ قریش کی دونوں حسین عورتیں سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ میرے عقد میں آجائیں ان کے بعد عبدالملک نے کہا میری آرزو ہے کہ میں کل روئے زمین کا بادشاہ ہو جاؤں اور امیر معاویہ کا جانشین بنوں سب سے آخر میں عروہ نے کہا کہ مجھے تم لوگوں کی خواہشات میں سے کچھ نہ چاہئے، میں دنیا میں زہد و آخرت میں کامیابی اور علم چاہتا ہوں[1]۔

خدا نے ان چاروں کی دعا قبول کی ابن زبیرؓ حرم کے سات برس تک خلیفہ رہے سکینہ اور عائشہ دونوں مصعب کے عقد میں آئیں۔ عبدالملک سندھ سے لے کر اسپین تک کا فرماں روا ہوا اور امیر معاویہ کی قائم کردہ سلطنت کا وارث بنا اور عروہ کو خاصان خدا کا مرتبہ ملا۔

تمول اور فارغ البالی :

اگرچہ عروہ دولت دنیا سے بے نیاز اور بے پرواہ تھے لیکن خدا نے ان کو اس سے وافر حصہ دیا تھا۔ وہ بڑے صاحب ثروت تھے۔ ان کے والد حضرت زبیر بن عوام بن عرب کے بڑے متمول لوگوں میں تھے۔ اپنے بعد کئی کروڑ دولت چھوڑی۔ یہ دولت ان کے بیٹوں کو ملی، جن میں ایک عروہ بھی تھے۔ حضرت زبیر کی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی چار بیویوں کو آٹھویں حصہ میں بارہ بارہ لاکھ ملا تھا[2]۔

فیاضی و سیر چشمی :

خدا نے عروہ کو جس طرح دولت عطا فرمائی تھی ویسے ہی وہ فیاض بھی تھے ان کے کھجوروں کے باغات تھے۔ کھجوروں کی فصل میں باغ کی دیوار توڑ وادیتے تھے اور ہر شخص کے لئے صدائے عام ہوتی تھی لوگ آ کر کھاتے تھے اور باندھ باندھ کر ساتھ لے جاتے تھے[3]۔

خوش لباسی اور نفاست :

حضرت عروہ اگرچہ بڑے عابد و زاہد تھے لیکن مزاج میں بڑی نفاست تھی روزانہ غسل کرتے تھے کپڑے نہایت بیش قیمت پہنتے تھے گرمیوں میں جسم پر سندس کی قبا ہوتی تھی جس میں حریر کا استر ہوتا تھا۔ خز کی چادر اوڑھتے تھے[4]۔

وفات : ۹۴ھ میں نواح مدینہ میں اپنے مکان میں انتقال کیا[5]۔

۱؎ ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۳۱۱ ۲؎ بخاری کتاب المغازی باب برکۃ الغازی فی مالہ
۳؎ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۱ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۴ ۵؎ ایضاً۔ ص ۱۳۵

(۴۶) عطاء بن ابی رباحؒ

نام ونسب: عطانام ہے۔ والد کانام اسلم اور ابو رباح کنیت۔ عطاء کی کنیت ابو محمد تھی۔ یمن کے مردم خیز قصبہ جند میں حضرت عثمان کے آغاز خلافت میں پیدا ہوئے اور مکہ میں نشو ونما پائی۔ میسرہ بن ابی خثیم فہری کے غلام تھے۔

فضل وکمال: فضل وکمال اور زہد وورع کے لحاظ سے عطاء بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ عطا فقہ، علم وورع اور فضل وکمال کے لحاظ سے سادات تابعین میں تھے۔ حجت امام اور کبیر الشان تھے[۱]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مفتی اور مشہور آئمہ میں تھے۔ بڑے بڑے آئمہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ علم کا خزانہ خدا اسی کو دیتا ہے، جسے محبوب رکھتا ہے۔ اگر علم کسی کے ساتھ مخصوص ہوتا تو عالی نسب اس کے زیادہ حقدار تھے، لیکن عطاء حبشی غلام تھے، یزید بن حبیب نوبی تھے۔ حسن بصری اور ابن سیرین غلام تھے[۲]۔

امام اوزاعی کہتے تھے کہ عطاء نے جس وقت انتقال کیا، اس وقت وہ لوگوں میں روئے زمین کے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے[۳]۔

قرآن: ان کو قرآن۔ حدیث۔ فقہ۔ جملہ مذہبی علوم میں پوری دستگاہ حاصل تھی[۴]۔ کان ثقة فقیها عالما کثیر الحدیث کان یعلم القرآن قرآن کا مستقل درس دیتے تھے۔

حدیث: کے مشہور حفاظ تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کے حالات طبقہ اوّل کے حفاظ میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعد کثیر الحدیث لکھتے ہیں۔ حدیث میں انہوں نے صحابہ میں عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابن زبیرؓ، معاویہؓ، اسامہ بن زید، جابر بن عبداللہؓ، زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن سائب مخزومیؓ، عقیل بن ابی طالبؓ، عمرو بن ابی سلمہؓ، رافع بن خدیجؓ، ابودرداءؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوہریرہؓ، اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اور اُم ہانیؓ کے خرمن سے خوشہ چینی کی تھی۔

عام علماء میں ابو صالح السمان، سالم بن شوال، صفوان بن یعلیٰ بن اُمیہ، عبید بن عمیر، عروہ بن زبیر، ابن ابی ملکیہ، محمد بن علی، عمار، ابو الزبیر، موسیٰ بن انس، حبیب بن ابی ثابت وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا[۵]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۰۲ [۲] تہذیب الاسماء نووی۔ جلد ۱۔ ص ۳۳۳ [۳] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۱
[۴] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۶ [۵] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۴

تلامذہ : حدیث میں ان سے فائدہ اُٹھانے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض کے نام یہ ہیں: ابواسحٰق سبیعی، زہری، مجاہدہ، ایوب سختیانی، اعمش، اوزاعی، ابن جریج، ابوالزبیر، حکم بن عتبہ، ابوحنیفہ وغیرہ[1]۔

آداب سماعِ حدیث :

حدیثِ رسول اللہ کا اتنا احترام تھا کہ تذکرۂ حدیث کے درمیان میں بولنا سخت ناپسند تھا اور اس پر برہم ہوتے تھے۔ معاذ بن سعید الاعور کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ عطاء کے پاس تھے، ایک شخص نے حدیث بیان کی۔ ایک دوسرا شخص درمیان میں بولا، عطاء سخت برہم ہوئے اور کہا یہ کون سا اخلاق اور کون سی طبیعت ہے۔ خدا کی قسم آدمی حدیث اس لئے بیان کرتا ہے کہ اس سے ہم کو علم حاصل ہو، اگر کوئی حدیث سناتا ہے تو خواہ وہ حدیث مجھ سے سُنی ہوئی ہو، میں اس کو خاموشی سے سنتا ہوں کہ بیان کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ میں نے اس سے پہلے نہیں سُنی تھی۔ عمرو بن عاصم کہتے ہیں کہ میں نے عطاء کی باتیں عبداللہ بن مبارک سے نقل کیں تو انہوں نے سُن کر کہا کہ میں اس وقت تک جوتا نہ اُتاروں گا جب تک خود جا کر اس مہدی سے نہ سنوں گا[2]۔

ان کی روایات کے بارے میں آئمہ کی رائے :

حضرت امام باقرؒ لوگوں کو ہدایت کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے عطاء سے حدیث لیا کرو[3]۔

فقہ : آپ کا خاص اور امتیازی فن فقہ تھا۔ آپ کے تفقہ پر تمام فقہائے محدثین اور آئمہ فن کا اتفاق ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ فقہ میں سادات تابعین میں تھے[4]۔ ربیعہ جو خود بہت بڑے فقیہ تھے، کہتے تھے کہ عطاء فتاویٰ میں تمام اہلِ مکہ پر فائق تھے۔ محمد بن عبداللہ الدیباج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے بہتر مفتی نہیں دیکھا۔ امام المفقہا حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا[5]۔ اکابر صحابہ تک ان کے تفقہ کے معترف تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ جب مکہ تشریف لاتے اور سائلین ان کی خدمت میں پہنچتے تو عبداللہ بن عباسؓ ان سے کہتے کہ عطاء تمہارے یہاں موجود ہیں اور تم میرے پاس آتے ہو[6]۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے کہ تم میں ابن ابی رباح موجود ہیں اور تم مجھ سے پوچھنے کے لئے مسائل اکھٹا رکھتے ہو[8]۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۱۹۹ ۲ ایضاً ۳ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۵ ۴ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۳۴ ۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۰۲ ۶ ایضاً ص ۲۰۱ ۷ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۶
۸ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۱

ان کے زمانہ میں صرف دو شخص مکہ کی مسندِ افتاء کی زینت تھے۔ ایک یہ اور دوسرے مجاہد۔ لیکن ان دونوں میں امتیاز انہی کو حاصل تھا[1]۔

احتیاط فی الفتویٰ: لیکن اس کمال کے باوجود وہ اتنے محتاط تھے کہ مسائل میں کبھی اپنی رائے نہ دیتے تھے۔ اگر اس کے متعلق کوئی سند نہ ہوتی تو صاف کہہ دیتے کہ مجھے نہیں معلوم۔ عبدالعزیز ابن رفیع کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عطاء سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم۔ لوگوں نے کہا اپنی رائے سے کیوں نہیں جواب دیتے؟ فرمایا، مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس کی زمین میں میری رائے کی اطاعت کی جائے[2]۔

لیکن ایک فقیہ اور مفتی کے لئے رائے سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اس لئے عطاء جب کبھی رائے سے کام لیتے تھے تو اس کو ظاہر کردیتے تھے۔ ابن جریج کا بیان ہے کہ عطاء جب کوئی بات بیان کرتے تھے تو میں ان سے پوچھتا تھا کہ یہ علم ہے یا رائے۔ اگر انہوں نے اثر کی سند پر کہا ہوتا تو کہہ دیتے اثر ہے اور اگر رائے ہوتی تو کہہ دیتے رائے ہے[3]۔

مناسکِ حج کا علم:

مناسکِ حج کے بڑے عالم تھے۔ امام باقرؒ فرماتے تھے کہ عطاء سے زیادہ مناسکِ حج کا جاننے والا کوئی باقی نہیں[4]۔ اُموی فرزند ان سے حج کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو مناسکِ حج بتائے[5]۔ اُمویوں کے زمانہ میں حج کے موقع پر منادی کردی جاتی تھی کہ حج کے مسائل میں عطاء کے علاوہ دوسرا شخص فتویٰ نہ دے[6]۔

معمولی معمولی درجہ کے لوگ جنہیں حج کے ایام میں انہیں دیکھنے کا، ان کے ساتھ رہنے کا یا ان کی خدمت کرنے کا موقع ملتا تھا، مسائل کے واقف کار بن جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ حکایت مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ حج کے موقعہ پر ایک حجام نے جس نے عطاء کو دیکھا تھا۔ مجھے پانچ موقعوں پر مناسکِ حج کی تعلیم دی۔

بال ترشوانے سے پہلے میں نے اس سے حجامت کی بنوائی طے کرنی چاہی۔ اس نے کہا، عبادت میں شرط نہیں کی جاتی، بیٹھ جاؤ بن جائے گی۔ میں قبلہ رُخ سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ اس نے

---

[1] تہذیب الاسماء نووی۔ جلد ۱۔ ص ۳۳۳ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۶ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۰۳
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۵ [5] ایضاً [6] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۹ [7] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۳۳

قبلہ رُخ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بائیں جانب سے سر منڈانا چاہا۔ اس نے کہا داہنی سمت پھیرو۔ میں نے پھیر دیا، وہ سر مونڈنے لگا۔ میں بالکل خاموش تھا۔ اس نے کہا تکبیر کہتے جاؤ۔

حجامت بنوانے کے بعد جب میں جانے لگا تو اس نے پوچھا، کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا اپنے قیام گاہ پر۔ اس نے کہا پہلے دو رکعتیں پڑھ لو، اس کے بعد جاؤ۔ میں نے خیال کیا کہ حجام خود اس قسم کے مسائل نہیں جان سکتا۔ جب تک اس نے کسی سے معلوم نہ کیا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا تم نے جن باتوں کی مجھ کو تعلیم دی ہے، وہ تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟ اس نے کہا میں عطاء بن ابی رباح کو ایسا کرتے دیکھا تھا[1]۔

علم میں للہیت :

عطاء اپنے علم سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کا علم خالصۃً لوجہ اللہ تھا۔ سلمہ کا بیان ہے کہ میں نے عطاء، طاؤس اور مجاہد کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا، جس کا مقصد علم سے خالص لوجہ اللہ ہو[2]۔

زہد و تقویٰ : علم کے ساتھ ان میں اسی درجہ کا عمل بھی تھا۔ زہد و ورع کے لحاظ سے وہ جماعت تابعین میں ممتاز تھے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ علم اور ورع میں سادات تابعین میں تھے[3]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ عطاء کے علم، زہد اور خدا پرستی کے مناقب بہت ہیں[4]۔

قوتِ ایمانی : عطاء ایمان کے جس درجہ پر تھے، اس کے متعلق عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ سارے اہلِ مکہ کا ایمان مل کر بھی عطاء کے ایمان کے برابر نہ تھا[5]۔

عبادت و ریاضت :

عبادت کا یہ حال تھا کہ کامل بیس سال تک مسجد کا فرش ان کا بستر رہا[6]۔ تہجد میں روزانہ دو سو یا اس سے زیادہ آیتیں پڑھتے تھے[7]۔ اکثر عبادت سے پیشانی پر نشان سجدہ تاباں تھا[8]۔ ان کا کوئی وقت ذکر الٰہی سے خالی نہ ہوتا تھا۔ عبداللہ بن عمرو بن عثمان بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے بہتر مفتی نہیں دیکھا۔ ان کی مجلس میں ہر وقت خدا کا ذکر ہوتا رہتا تھا، اور لوگ علمی مباحثہ کرتے تھے۔ عطاء جب کچھ بولتے، یا جب کوئی سوال کیا جاتا تو نہایت خوبی سے اس کا جواب دیتے[9]۔

۱۔ ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۳۱۹　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۵　۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۰۳　۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۶　۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۰۳　۶۔ ایضاً　۷۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۸　۸۔ ابن سعد۔ جلد ۔ ص ۳۴۶　۹۔ ایضاً۔ ص ۳۵۴

حج : آپ کا قیام مکہ ہی میں تھا۔اس لئے کسی سال حج ناغہ نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ستر (۷۰) حج کیے[1]۔

اتباع حدیث : اتباع حدیث میں بڑا اہتمام تھا۔ امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ تابعین میں عطاء سے زیادہ کوئی متبع حدیث نہ تھا[2]۔

عزلت گزینی : طبیعت میں عزلت پسندی تھی۔ لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہ تھا۔ دروازہ بند کیے گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ جب کوئی اندر آنے کی اجازت چاہتا تو پوچھتے، کس نیت سے آئے ہو۔ اگر آنے والا کہتا کہ آپ کی زیارت کے لئے، تو جواب دیتے کہ میرے جیسے شخص کی زیارت نہیں کی جاتی۔ پھر فرماتے وہ زمانہ کیسا خبیث ہے، جس میں میرے جیسے شخص کی زیارت کی جائے[3]۔ لیکن اچھی مجلسوں کو جن میں خدا کا ذکر ہوتا، پسند کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو شخص اس مجلس میں بیٹھتا ہے، جس میں خدا کا ذکر ہوتا ہے تو خدا اس مجلس کو دس باطل مجلسوں کا کفارہ بنا دیتا ہے[4]۔

خاموشی : جب مجمع میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تو زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ اسمٰعیل بن اُمیہ کا بیان ہے کہ عطاء عموماً خاموش رہتے تھے۔ جب کچھ بولتے تھے تو ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر الہام ہو رہا ہے[5]۔

وفات : بروایت صحیح ۱۱۴ھ میں وفات پائی[6]۔

(۴۷) عمرو بن شرحبیلؒ

نام ونسب : عمرو نام ہے۔ ابو میسرہ کنیت۔ نسباً قبیلہ ہمدان سے تعلق رکھتے تھے۔

فضل وکمال : علمی اعتبار سے فضلائے تابعین میں تھے۔ حافظ صفی الدین خزرجی ان الفاظ کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے ہیں **عمرو بن شرحبیل الهمدانی ابو میسرة الکوفی احد الفضلاء**، کوئی شخص ابو میسرہ کا مثل نہ تھا۔ کسی نے کہا مسروق ابو وائل نے جواب دیا مسروق بھی نہیں[7]۔

تفسیر : آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل پر پوری نظر تھی اور بعض آیات کی تفسیر میں ان کا خیال مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود سے متوارد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے ان سے پوچھا "الخنس الجوار الکنس" کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک نیل گاؤ مرہ ہے۔ ابن مسعودؓ نے کہا میری بھی یہی رائے ہے[8]۔

۱۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۸ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۳۲ ۳۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۸ ۴۔ ایضاً

۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۶ ۶۔ ایضاً ۷۔ تہذیب الکمال۔ ص ۲۹۰ ۸۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۷۲

حدیث : حفظ حدیث کے لحاظ سے اوسط درجہ کے حفاظ میں شمار تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ، سلمانؓ، قیس بن سعد بن عبادؓ، معقل بن مقرن مزنیؓ، نعمان ابن بشیرؓ اور اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ وغیرہ اکابر صحابہ سے سماع حدیث لیا تھا[۱]۔

ابووائل، ابواسحٰق سبیعی، ابوعمار ہمدانی، قاسم بن مخیمرہ، محمد بن منتشر اور مسروق وغیرہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں تھے[۲]۔

عبادات وریاضت :

علم کے ساتھ اسی درجہ کا عمل بھی تھا۔ بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ عبادت گزار لوگوں میں تھے۔ نمازوں کی کثرت سے (ان کے جوڑوں پر) اونٹوں کی طرح گٹے پڑ گئے تھے[۳]۔

عبادت میں طہارت کا لحاظ :

عبادت میں طہارت اور پاکی کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ خدا کا ذکر پاک ہی مقام پر کرنا چاہئے[۴]۔

صدقات : اپنی حیثیت کے مطابق مخیر اور فیاض بھی تھے۔ اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور خیرات کرتے تھے۔ یونس کا بیان ہے کہ جب ان کو وظیفہ ملتا تھا تو اس میں سے وہ خیرات کیا کرتے تھے[۵]۔

وفات : ۶۳ھ میں وفات پائی[۶]۔ مرض الموت میں لوگوں سے فرمایا، مرنے کے لئے بالکل آمادہ ہوں۔ پیش آنے والے مرحلہ کے علاوہ اور کسی شے کا خوف دل میں نہیں ہے، نہ میرے پاس مال ودولت ہے، (کہ اس کا افسوس ہو) اور نہ مجھ پر کسی کا قرض ہے، (کہ اس کی فکر ہو) نہ میرے پاس عیال ہیں، (کہ اپنے بعد ان کی فکر ہو)۔

میرے مرنے کی خبر کسی کو نہ دی جائے۔ جنازہ لے چلنے میں جلدی کرنا۔ قبر پر ہری شاخ رکھنا کہ مہاجرین اس کو مستحب سمجھتے تھے۔ قبر اونچی نہ کرنا کہ اس کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ آخر وقت لاالٰہ الا اللہ کی تلقین کرنا۔ ان ہدایات کے بعد وفات پائی۔ قاضی شریح نے نماز جنازہ پڑھائی[۷]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۷ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۷۲
[۵] ایضاً [۶] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۴۷ [۷] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۷۳

(۴۸) عمرو بن دینارؒ

نام ونسب : عمرو نام ہے۔ ابو محمد کنیت، باذان عجمی غلام تھے۔

پیدائش : ۴۶ھ میں پیدا ہوئے[1]۔

فضل وکمال : علمی اعتبار سے مکہ کے اکابر علماء میں تھے۔ حافظ ذہبی انہیں حافظ، امام اور عالم حرم لکھتے تھے[2]۔ امام نووی کا بیان ہے کہ ان کی جلالت، امامت اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ آئمہ تابعین میں تھے[3]۔

حدیث : حدیث کے بڑے حافظ تھے۔ علامہ سعد لکھتے ہیں کان عمر ثقة ثبتا کثیر الحدیث۔ صحابہ میں انہوں نے ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابو ہریرہؓ، جابر عبداللہ ابوالطفیلؓ، سائب بن یزید اور تابعین میں سعید بن مسیب سعید بن جبیر، سالم بن عبداللہ، طاؤس، عطاء محمد بن علی، مجاہد، ابن ابی ملیکہ، سلیمان بن یسار وہب بن عقبہ اور امام زہری وغیرہ ایک کثیر جماعت سے استفادہ کیا تھا[4]۔

وسعتِ علم : حدیث میں ان کا علم نہایت وسیع تھا۔ اس عہد کے تمام علماء کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ طاؤس اپنے لڑکے کو ہدایت کرتے تھے کہ جب مکہ جانا تو ابن دینار کے پاس ضرور جانا، ان کے کان علماء کا خریطہ تھے[5]۔

مرویات کا پایہ : ان کی روایات کا پایہ، ارباب فن کے نزدیک نہایت بلند تھا۔ امام زہری کہتے تھے کہ میں نے اعلیٰ درجہ کی حدیثوں میں اس شیخ سے زیادہ انص نہیں دیکھا۔ سفیان نے ایک مرتبہ سعد سے سوال کیا کہ تم نے حدیثوں میں سب سے زیادہ متقن کس کو دیکھا؟ انہوں نے کہا عمرو بن دینار اور قاسم بن عبدالرحمن کو، ابن عقبہ اور عمرو بن حریر انہیں ثقة ثبت صدوق اور کثیر الحدیث کہتے تھے[6]۔

روایت بالمعنیٰ :

روایت میں احتیاط کے باوجود احادیث کے الفاظ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے اور بالمعنیٰ حدیثیں روایت کرتے تھے[7]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۰　۲ ایضاً　۳ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۱۔ ص ۲۷
۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۵　۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۲۹　۶ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۵۳
۷ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ۳۰

محدثین کا مرجوعہ :

حدیث میں ان کے وسعت علم کی بناء پر ان کی ذات شائقین حدیث کا مرجع بن گئی تھی۔ لوگ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر ان کی مرویات لکھتے تھے۔ سفیان کا بیان ہے کہ ایوب مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ عمرو بن دینار نے فلاں شخص سے کون سی حدیث بیان کی ہیں۔ میں ان کو بتا کر پوچھتا کیا آپ لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہاں[1]۔

تلامذہ : ان کے فیض عام نے ان کے تلامذہ کا دائرہ خاصہ وسیع کر دیا تھا۔ اکابر علماء میں جعفر صادق ابوقتادہ، مسعر، ابن ابی نجیح، حماد اور سفیان وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ عام تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔

فقہ : فقہ میں بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ تفریع و استنباط مسائل میں انہیں درجہ امامت و اجتہاد حاصل تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب مذاہب کے مجتہدوں میں تھے[2]۔ مرکز علم مکہ کے ممتاز مفتی تھے[3]۔ بعض علماء انہیں طاؤس، عطاء اور مجاہد جیسے اکابر علماء پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی دینار ان کو تینوں سے بڑا فقیہ مانتے تھے[4]۔ ابن عیینہ کہتے تھے کہ ہم لوگوں کے نزدیک عمرو بن دینار سب سے بڑا فقیہ، ان سے بڑا عالم اور حافظ حدیث کوئی نہ تھا[5]۔

احتیاط : احتیاط کی بنا پر حدیث اور فقہی مسائل کی کتابت پسند نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ لوگ ہم سے سوالات کرتے ہیں۔ ہم انہیں بتاتے ہیں تو وہ اس کو لکھ کر پتھر پر نقش بنا لیتے ہیں۔ ممکن ہے کل کو ہم ان سے رجوع کر لیں، (اس وقت وہ غلط نقوش باقی رہ جائیں گے)۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ سفیان آپ سے جو کچھ سنتے ہیں، اس کو لکھ لیتے ہیں۔ یہ سن کر آپ رونے لگے، اور کہا جو شخص مجھ سے لکھتا ہے، وہ مجھ پر بڑی زیادتی کرتا ہے[6]۔

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے کسی چیز کے متعلق کچھ پوچھا۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سائل نے کہا، اس کے بارے میں میرے دل میں بعض شکوک ہیں۔ اس لئے جواب مرحمت ہو۔ آپ نے کہا خدا کی قسم تمہارے دل میں ابوقیس (پہاڑ) کے برابر شک ہونا مجھے اس کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے کہ میرے دل میں بال برابر بھی شک ہو[7]۔ (یعنی اس کے جواب میں)

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۵۳ [2] تہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۰ [3] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۲۷
[4] ایضاً۔ جلد ۱۔ ق ۱۔ ص ۲۷ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۰ [6] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۵۴
[7] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۵۴

عبادت وریاضت :

بڑے عبادت گزار تھے۔ رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ ایک تہائی شب سوتے تھے۔ ایک تہائی حدیثیں پڑھتے تھے اور تہائی نماز میں بسر ہوتی تھی[1]۔

جماعت کا اہتمام :

جماعت کی پابندی میں اتنا اہتمام تھا کہ عالم پیری میں بھی جب چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی، مسجد ہی میں جو ان کے گھر سے کافی فاصلہ پر تھی نماز پڑھتے تھے۔ سفیان کا بیان ہے کہ عمرو نے کسی زمانہ میں مسجد کا آنا نہیں چھوڑا۔

پیری کے زمانہ میں بھی جب وہ اُٹھا کر سواری پر بٹھائے جاتے تھے، میں نے ان کو ہمیشہ مسجد جانے کے انتظار ہی میں بیٹھا ہوا پایا ہے۔ صغرسنی میں انہیں اُٹھا کر سواری پر بٹھانے کے قابل نہ تھا لیکن پھر چند دنوں کے بعد ہو گیا تھا۔ ان کا گھر مسجد سے دور تھا[2]۔

مذہبی خدمات کا معاوضہ نہ لیتے تھے :

مذہبی خدمات پر معاوضہ لینا اچھا نہ سمجھتے تھے، اور انہیں حسبۃً للّٰہ انجام دیتے تھے۔ ابن ہشام نے آپ سے خواہش کی کہ میں آپ کا وظیفہ مقرر کئے دیتا ہوں۔ آپ اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر افتاء کی خدمت انجام دیجئے۔ آپ نے منظور نہ کیا۔ اور یوں ہی بلا معاوضہ جس طرح انجام دیتے چلے آرہے تھے، انجام دیتے رہے[3]۔

وفات : ۱۱۶ھ میں وفات پائی[4]۔

(۴۹) عکرمہ مولی ابن عباسؓ

نام ونسب : عکرمہ نسلاً بربری اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نامور غلام ہیں۔ ابتداء میں حصین بن الحر العنبری کی غلامی میں تھے۔ انہوں نے ان کو ابن عباسؓ کو دے دیا تھا۔ عکرمہ اس وقت بہت کم سن تھے، اس لئے ابن عباسؓ ہی کے دامن تربیت میں ان کی پرورش ہوئی۔ ان کی تعلیم وتربیت کے اثر سے وہ اس درجہ کو پہنچ گئے کہ ان کی شخصیت بڑے بڑے آزاد علماء کے لئے باعث رشک بن گئی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۰　[2] ابن سعد جلد ۵ ص ۳۵۳　[3] ایضاً　[4] ایضاً

تعلیم : عکرمہ میں تحصیل کی استعداد اور اس کا ذوق و شوق فطری تھا۔ وہ ہر شے سے سبق لیتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں بازار جاتا تھا اور کوئی بات سنتا تھا تو اس سے میرے لئے علم کے پچاسوں دروازے کھل جاتے تھے[۱]۔

اس مناسبت طبع کے ساتھ ان کو ابن عباسؓ جیسا حبر اور شفیق آقا مل گیا، جس نے بڑی محنت و جانفشانی سے ان کو تعلیم دی[۲]۔ عکرمہ کو علم کی اتنی پیاس تھی کہ وہ تا عمر اس سے سیر نہ ہوئے۔ مسلسل چالیس برس تک تعلیم حاصل کرتے رہے[۳]۔

فضل و کمال : ان کے ذاتی ذوق و شوق اور ابن عباسؓ کی توجہ نے ان کو علم کا دریا بنا دیا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ (علم) سمندروں میں سے ایک سمندر تھے[۴]۔ حافظ ذہبی ان کو حبر العالم کے لقب سے یاد کرتے ہیں[۵]۔ ان کے زمانہ میں غلاموں میں کیا بڑے بڑے شرفاء اور نجباء میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ جملہ علوم میں انہیں درجہ امامت حاصل تھا۔

تفسیر : حضرت عبداللہ بن عباسؓ تفسیر کے اتنے بڑے عالم تھے کہ کم صحابہ اس فن میں ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بڑی توجہ اور کوشش سے عکرمہ کو تفسیر پڑھائی تھی[۶]۔ اور اپنا سارا علم ان کے سینہ میں منتقل کر دیا تھا ابن عباسؓ کے تلامذہ میں تفسیر میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ عباسؓ بن مصعب مروزی کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ کے تلامذہ میں عکرمہ سب سے بڑے عالم تھے[۷]۔ قتادہ کہتے تھے کہ اعلم التابعین چار ہیں۔ عطاء سعید بن جبیر اور عکرمہ اور ان چاروں میں عکرمہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ امام شعبی کہتے تھے کہ عکرمہ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا اب باقی نہیں ہے۔ جب تک عکرمہ بصرہ میں رہتے تھے، اس وقت تک حسن بصری تفسیر نہیں بیان کرتے تھے[۸]۔

ابن عباسؓ کی زندگی میں عکرمہ بڑے مفسر ہو گئے تھے۔ ابن عباسؓ کبھی کبھی ان کا امتحان لیتے تھے اور ان کے عالمانہ جواب سن کر اظہار خوشنودی کرتے تھے ایک مرتبہ انہوں نے یہ آیت :

"لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیدا"۔

"تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے"۔

---

۱. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۲ ۲. ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۱۹ (ابن سعد حوالہ مذکور)
۳. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۴ ۴. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۶ ۵. تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۳
۶. ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۲ ۷. تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۵ ۸. ایضاً۔ ص ۲۶۶

پڑھ کر فرمایا کہ اس آیت میں جن لوگوں کی طرف اشارہ ہے معلوم نہیں انہوں نے نجات پائی یا ہلاک ہو گئے۔ عکرمہ نے نہایت وضاحت اور تشریح سے ثابت کر دیا کہ نجات پائی ابن عباس نے خوش ہو کر ان کو ایک حلہ پہنایا۔

تفسیر کا درس : مجاہد اور ابن جبیر جیسے فضلاء ان سے تفسیر میں استفادہ کرتے تھے۔ یہ دونوں ان سے سوالات کرتے تھے، عکرمہ ان کا جواب دیتے تھے۔ ان کے سوالات ختم ہونے کے بعد پھر اپنی جانب سے بہت سی آیات کی شان نزول بتاتے تھے[۲]۔ ان کے فیض سے مجاہد امام تفسیر بن گئے تھے۔

حدیث : ان کا خاص فن حدیث تھا۔ اس کے وہ بحر بیکراں تھے۔ حدیث میں انہوں نے زیادہ تر ابن عباسؓ سے فیض پایا تھا۔ ان کے علاوہ صحابہ میں حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عمر ابن عمرو بن العاصؓ، ابوسعید خدریؓ، عقبہ بن عامرؓ، حجاج بن عمرو بن غزیہ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، صفوان بن امیہؓ، یعلی بن امیہؓ، جابرؓ، ابوقتادہؓ، ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حمنہ بنت جحش وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[۳]۔

حدیث میں ان کی [illegible] علم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ابن عباسؓ کی مرویات جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے زیادہ تر انہی سے مروی ہیں۔ علامہ ابن سعد ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں[۴]۔

شہر بن حوشب کہتے تھے کہ ہر قوم کا ایک حبر ہوتا ہے، اس امت کا حبر ابن عباسؓ کا غلام ہے۔

طالبان حدیث کا مرجع : ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ طالبان حدیث دور دور سے ان سے استفادہ کے لئے آتے تھے۔ جدھر سے وہ گزر جاتے تھے، شائقین کا ٹھٹھ لگ جاتا تھا۔ ایوب کا بیان ہے کہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ عکرمہ دنیا کے جس حصہ میں بھی ہوں گے ان سے جا کر ملوں گا۔ اتفاق سے ایک دن بصرہ کے بازار میں مل گئے۔ ان کے گرد آدمیوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ میں قریب گیا لیکن ہجوم کی کثرت سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ یہ دیکھ کر میں ان کی سواری کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ لوگ ان سے جو کچھ پوچھتے تھے اور وہ جو جوابات دیتے تھے، میں ان کو یاد کرتا جاتا تھا[۵]۔ ایوب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عکرمہ ہمارے یہاں آئے، ان کے پاس لوگوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ انھیں مجبور ہو کر چھت پر چڑھ جانا پڑا[۶]۔

عکرمہ پر جرح : ان بیانات کے ساتھ ساتھ رجال کی کتابوں میں عکرمہ کے بارہ میں ایسی تنقیدیں بھی ملتی ہیں، جن سے ان کی روایات کی صداقت بہت کچھ مشکوک ہو جاتی ہے۔ وہ تنقیدیں یہ ہیں :

---

[۱] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۲۔　[۲] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۶۔　[۳] ایضاً۔　[۴] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۲۱۶۔　[۵] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۵۔　[۶] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۳۔　[۷] ایضاً۔

۱۔ ابوالاسود دؤیلی کہتے ہیں کہ عکرمہ میں فہم و دانائی کم تھی۔ جب ان سے کوئی حدیث پوچھی جاتی جس کو انہوں نے دو آدمیوں سے سنا ہوتا تو وہ اس کو کبھی ایک کی طرف منسوب کر دیتے کبھی دوسرے کی طرف لیکن یہ تنقید آپ اپنی تردید کرتی ہے۔ جب انھوں نے ایک روایت دو راویوں سے سنی تو انھیں اختیار ہے، جس کی جانب چاہیں منسوب کریں۔ اس سے ان کی فہم پر کس طرح حرف آسکتا ہے۔

۲۔ ابو خلف الخراز یحیٰ البکا ر سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن عمرؓ سے سنا تھا، وہ اپنے غلام نافع سے کہتے تھے، نافع خدا سے ڈرو اور مجھ پر اس طرح بہتان نہ باندھو، جس طرح عکرمہ ابن عباسؓ پر باندھتے تھے۔

۳۔ جریر بن عبدالحمید، یزید بن ابی زیاد سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے صاحبزادے عکرمہ کو ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھنے کے جرم میں سزا دیتے تھے۔

۴۔ ہشام بن سعد، عطاء خراسانی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے کہا کہ عکرمہ کا گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حالت احرام میں میمونہؓ کے ساتھ شادی کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے جھوٹ کہا۔

۵۔ فطر بن خلیفہ کا بیان ہے کہ میں نے عطاء سے کہا کہ عکرمہ کہتے ہیں کہ موزوں پر مسح کو قرآن کے احکام نے باطل اور منسوخ کر دیا ہے۔ عطاء نے کہا انہوں نے جھوٹ کہا۔ میں نے ابن عباسؓ سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ خفین پر مسح کرو۔ اگر چہ تم بیت الخلاء سے نکلو۔

۶۔ اسرائیل، عبدالکریم جرزی سے روایت کرتے ہیں کہ عکرمہ زمین کے لگان کو مکروہ سمجھتے تھے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے کہا عکرمہ نے جھوٹ کہا۔

۷۔ وہیب بن خالد، یحیٰ بن سعید انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ وہ انہیں جھوٹ کہتے تھے۔ ابراہیم بن منذر معن بن عیسیٰ سے روایت ہے کرتے ہیں کہ امام مالک، عکرمہ کو ثقہ نہیں سمجھتے تھے اور ان سے روایت کی ممانعت کرتے تھے، اور اس قبیل کے بعض بیانات ہیں[۱]۔

ان بیانات کی حیثیت : لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی لائق اعتماد نہیں، اس لئے کہ اولاً تو اس کی سندیں مسلسل نہیں ہیں، دوسرے ان کے راوی لائق اعتماد نہیں۔

ابوالاسود دؤلی میں شیعیت تھی[۲]۔ اگر چہ شیعہ ہونا بے اعتمادی کی دلیل نہیں۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا خارجیوں کے بعض خیالات عکرمہ کی جانب منسوب تھے، ایسی صورت میں ان کے

---

[۱] یہ تمام روایتیں تہذیب التہذیب۔ جلد ۷ تذکرہ عکرمہ میں ہیں۔ [۲] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ص ۱۱۔

بارے میں ایک شیعہ کا بیان لائق اعتبار نہیں رہ جاتا۔

دوسری روایت میں یحییٰ البکار باتفاق ارباب فن لائق اعتماد نہیں [۲]۔ تیسری روایت کا ایک راوی یزید شیعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے خود عکرمہ سے روایت کی ہے [۳]۔ ایسی صورت میں اس کا بیان خود اس کے عمل کے خلاف ہو جاتا ہے، پھر پہلا راوی جریر بن عبدالحمید بھی کچھ زیادہ لائق اعتماد نہیں [۵]۔ چوتھی روایت میں ہشام بن سعد کی روایات پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ محتاط محدثین ان سے روایت نہیں لیتے تھے [۶]۔

پانچویں روایت میں فطر بن خلیفہ بعض لوگوں کے نزدیک قابل اعتبار نہیں [۷]۔ چھٹی روایت کا راوی اسرائیل بالکل مجہول ہے، پھر اس میں جس بناء پر عکرمہ کی تکذیب کی گئی ہے۔ اس کی حیثیت یہ ہے کہ گو بروایت صحیحہ عہد رسالت میں زکان لیا جاتا تھا، لیکن بعض صحابہ کو لاعلمی یا غلط فہمی کی بناء پر اس کے جواز میں شک تھا،

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اگرچہ اس کا ذاتی علم تھا کہ عہد رسالت میں برابر زکان لیا جاتا تھا، لیکن بعض صحابہ کو لاعلمی یا غلط فہمی کی بنا پر اس کے جواز میں شک تھا، اس لئے ابن عمرؓ نے بھی اس خیال سے زکان لینا ترک کر دیا تھا کہ ممکن ہے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ممانعت نہ سنی ہو [۸]۔ ایسی حالت میں عکرمہ کا خیال بالکل بے بنیاد نہیں تھا۔ ساتویں روایت میں خالد ضعفاء میں ہے [۹]۔ آٹھویں روایت میں ابراہیم بن منذر کی روایت متکلم فیہ ہیں [۱۰]۔

غرض روایتی حیثیت سے یہ تمام بیانات اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔ پھر ان بیانات کے خلاف اتنی روایتیں ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے عکرمہ پر حرف رکھنا قیاس ہی میں نہیں آسکتا مثلاً:

علماء اور محدثین کا اتفاق:

اسحٰق بن عیسیٰ الطباع کا بیان ہے کہ میں نے مالک بن انسؒ سے پوچھا کہ آپ کو ابن عمرؓ کے اس قول کا علم ہے کہ "مجھ پر اس طرح کا جھوٹ نہ باندھو جس طرح عکرمہ ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھتے ہیں"۔ مالک نے کہا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں۔ البتہ سعید بن مسیب اپنے غلام برد سے ایسا کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سعید بن جبیر دوسروں کی زبانی سنی ہوئی عکرمہ کی بعض روایات میں شبہ ظاہر کرتے تھے، لیکن جب ان کو خود ان کی زبان سے سن لیتے تھے تو ان کا شبہ دور ہو جاتا تھا۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۲۷۹　۲ ایضاً۔ ص ۳۴۹　۳ ایضاً۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۶　۴ ایضاً۔ جلد ۷۔ ص ۲۱۳
۵ ایضاً۔ جلد ۸۔ ص ۳۰۲　۶ بخاری۔ جلد ا۔ ص ۳۱۶　۷ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۷۰　۸ ایضاً۔ جلد ا۔ ص ۱۴۷

ابواسحٰق کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابن جبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا، کہ تم لوگ عکرمہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو کہ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو شاید ان کو وہ نہ بیان کرتے۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی عکرمہ آ گئے اور انہوں نے وہی حدیثیں بیان کیں۔ تمام حاضرین خاموشی کے ساتھ سنا۔ سعید بھی کچھ نہ بولے۔ جب عکرمہ اُٹھ گئے تو لوگوں نے ابن جبیر سے پوچھا۔ ابوعبداللہ یہ کیا اب آپ کیوں خاموش رہے، انہوں نے کہا عکرمہ نے صحیح بیان کیں۔ تمام محدثین ان کی صداقت اور ان کے کمالات علمی کے معترف تھے۔ اور ان کی روایات قبول کرتے تھے۔ چنانچہ عطاء اور سعید دونوں ان کی حدیثیں بلا تکلف قبول کرتے تھے۔

حبیب ؒ کا بیان ہے ایک مرتبہ عکرمہ اور عطاء سعید کے یہاں گئے اور ان کو حدیثیں سنائیں۔ جب وہ حدیث بیان کر کے اُٹھ گئے تو میں نے دونوں سے پوچھا کہ عکرمہ نے جو کچھ بیان کیا ہے، اُس میں کسی چیز سے آپ کو انکار ہے؟ انہوں نے کہا نہیں[1]۔ ابن جبیر جو خود بہت بڑے عالم تھے، عکرمہ کو اپنے سے بڑا عالم مانتے تھے[2]۔ ابن جریج جو تبع تابعین میں نہایت بلند مرتبہ محدث تھے، عکرمہ کے اتنے معترف تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ یحییٰ بن ایوب مصری سے پوچھا کہ تم لوگوں نے عکرمہ سے کچھ لکھا، انہوں نے کہا نہیں۔ ابن جریج نے کہا تو تم نے دو تہائی علم ضائع کر دیا[3]۔

حضرت قتادہ چار آدمیوں کو بڑا عالم مانتے تھے۔ ان میں ایک عکرمہ تھے۔ ابن سیرین نے ابن عباسؓ کی تمام روایتیں عکرمہ ہی کے واسطہ سے لی ہیں۔ امام احمد بن حنبل ان کی روایات لائق احتجاج سمجھتے تھے۔ ابن معین ثقاہت میں عکرمہ کو ابن جبیر کے برابر سمجھتے تھے۔ ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے متعلق کسی قسم کا سوء ظن روا نہ رکھتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ جب میں کسی شخص کو عکرمہ اور حماد بن سلمہ کے بارے میں عیب چینی کرتے ہوئے سنتا ہوں تو مجھے اس کے اسلام میں شک ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن مدائنی کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ کے غلاموں میں عکرمہ سے زیادہ وسیع العلم دوسرا نہ تھا۔ عکرمہ اہل علم میں تھے۔ امام بخاری کہتے تھے کہ ہمارے تمام اصحاب عکرمہ سے احتجاج کرتے ہیں۔ امام نسائی انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد سے سوال کیا کہ عکرمہ کیسے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ثقہ ہیں۔ میں نے پوچھا ان کی احادیث لائق احتجاج ہیں؟ انہوں نے فرمایا، ہاں! جب وہ ثقات سے روایت کریں۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۳ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۶ [4] ایضاً

یحیٰ بن سعید اور امام مالک نے ان کی روایت کا نہیں بلکہ ان کی رائے کا انکار کیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا، ابن عباسؓ کے اور غلاموں کا کیا حال ہے، بفرمایا عکرمہ ان سب میں بلند مرتبہ ہیں۔ اس موقع پر ان کی کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ثقات ان سے جو روایت کرتے ہیں وہ سب روایات صحیح اور درست ہیں۔ ائمہ حدیث نے ان کی روایت سے منع نہیں کیا اور اصحابِ صحاح نے ان کی روایات کو صحاح میں داخل کیا ہے۔ ان کی شخصیت اس سے بلند ہے کہ میں ان کی احادیث کو ثبوت میں پیش کروں[1]۔

ابن مندہ کا بیان ہے کہ اکابر تابعین کی بڑی تعداد اور تبع تابعین نے عکرمہ کی تعدیل کی ہے۔ ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی منفرد روایتوں سے صفات سنن اور احکام میں احتجاج کیا ہے۔ ان سے تین سو (۳۰۰) سے زیادہ اشخاص نے روایتیں کی ہیں۔ جن میں سے ستر سے زیادہ بڑے اور خیار تابعین ہیں۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو کسی تابعی کو حاصل نہیں۔ جن آئمہ نے ان پر جرح کی ہے وہ بھی ان کی احادیث قبول کرنے سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ ان کی احادیث حسن قبول کے ساتھ لی جاتی ہیں۔ ابتداء یعنی تابعین کے دور سے لے کر آئمہ اربعہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی کے زمانہ تک آئمہ نے ان کی صحیح روایات لے کر ثابت وسقیم اور صحیح روایات میں امتیاز قائم کیا ہے اور ان کی روایات سے قرناً بعد قرن اور اماماً بعد امام احتجاج ہوتا چلا آیا ہے اور چاروں آئمہ نے ان کی روایات لی ہیں اور ان سے احتجاج کیا ہے امام مسلم ان کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان کی روایتیں لی ہیں اور جرح کے بعد تعدیل کی ہے[2]۔

ابو عبداللہ محمد بن نصر المروزی کا بیان ہے کہ عکرمہ احادیث سے احتجاج پر تمام علمائے حدیث کا اجماع ہے۔ ہمارے زمانہ کے تمام ممتاز محدثین، احمد بن حنبل، ابن راہویہ، یحیٰ ابن معین اور ابوثور وغیرہ کا اس پر اتفاق ہے۔ میں نے ابن راہویہ سے ان کی روایت سے احتجاج کے بارے میں پوچھا، انہوں نے میرے سوال پر متعجب ہو کر کہا: "عکرمہ ہمارے نزدیک ساری دنیا کے امام ہیں"۔ بعض اور لوگوں نے یحیٰ بن معین سے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی اس سوال پر تعجب کا اظہار کیا[3]۔

جابر بن زید کہتے ہیں کہ عکرمہ اعلم الناس ہیں، جو شخص ذرا بھی شمیم علم کا رائحہ شناس ہے، اس کو یزید بن ابی زیاد اس باب میں قابل احتجاج نہیں ہیں اور ایک مجروح کے قول سے ایک عدل

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۹۔ ۲۷۰ ۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۱
۳ ایضاً۔ ص ۲۷۲۔ ۲۷۳

مجروح نہیں ہوسکتا۔عکرمہ وہ شخص ہیں،جن کے سرچشمۂ علم سے اہل علم نے ساری دنیا میں حدیث اور فقہ پھیلائی ہے۔ مجھے ان میں سوائے تھوڑی سی ظرافت کے اور کسی برائی کا علم نہیں۔

غرض چند غیر مستند بیانات کے علاوہ جن کی حیثیت اُوپر ظاہر کی جاچکی ہے، تمام علماء ومحدثین کا عکرمہ کی جلالتِ شان اور ان کی صداقت پر اتفاق ہے۔ان کی صداقت کی نا قابل انکار شہادت یہ ہے کہ خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جن کے دامن میں عکرمہ نے تعلیم فرمائی کہا، مجھ سے جو روایت کریں اسے سچ سمجھو[1]۔ان تمام اقوال واسناد کے بعد عکرمہ کی علمی عظمت میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

تلامذہ: ان بیانات کے علاوہ ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ ان لاتعداد طالبان حدیث سے ہوسکتا ہے، جنہوں نے ان سے سماع حدیث کیا تھا اور اس میں بہت سے آئمہ تھے۔ان کی فہرست نہایت طویل ہے بعض ممتاز اور لائق ذکر نام یہ ہیں:

ابراہیم نخعی، جابر بن زید امام شعبی ابو اسحٰق سبیعی، ابوالزبیر، قتادہ، سماک بن حرب، عاصم الاحول، حصین بن عبدالرحمٰن، ایوب خالد الحذاء، داؤد بن ابی ہند، عاصم بن بہدلہ، عبدالکریم الجزری، حمید الطویل، موسیٰ بن عقبہ، عمرو بن دینار، عطاء بن سائب، یحیٰی بن سعید انصاری، یزید بن ابی حبیب، ابواسحٰق شیبانی، ہشام بن حسان یحیٰی بن کثیر، حکم بن عیینہ، خصیف الجزری، اور داؤد بن الحصین وغیرہ[2]۔

فقہ: عکرمہ کا اصل فن حدیث تھا،لیکن فقہ میں بھی وہ امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ابن حبان لکھتے ہیں کہ عکرمہ اپنے زمانہ کے فقہ اور قرآن کے بڑے علماء میں تھے[3]۔ان کے تفقہ کی بڑی سند یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنی زندگی ہی میں ان کو افتاء کا مجاز بنادیا تھا۔

ان کا خود بیان ہے کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے فتویٰ دینے کو کہا،میں نے دو مرتبہ معذرت کی کہ اگر اس زمانہ کے لوگ صالحین کی طرح ہوتے تو مجھے تامل نہ ہوتا۔ یہ عذر سننے کے بعد بھی انہوں نے اصرار کیا کہ جو شخص تم سے ضروری مسائل پوچھا کرے اس کو بتادیا کرو اور جو غیر ضروری سوالات کرے اس کا جواب نہ دیا کرو۔اس طریقہ عمل سے تمہارا تہائی بوجھ ہلکا ہو جائے گا[4]۔ان کا فقہی کمال اتنا مسلم تھا کہ جب وہ بصرہ جاتے اور جتنے دنوں رہتے اتنے دنوں تک حسن بصری فتویٰ دیتے تھے[5]۔ان کے

---

[1] تہذیب التہذیب۔جلد ۷۔۲۷۲ [2] ایضاً۔ص ۲۶۴ [3] ایضاً۔ص ۲۷۱
[4] ایضاً۔ص ۲۶۵ [5] تذکرہ۔ص ۱/۴

انتقال کے وقت خلق خدا کی زبان پر تھا کہ آج افقه الناس دنیا سے اُٹھ گیا[1]۔

ان کے معاصرین مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ عمرو بن دینار کا بیان ہے کہ جابر بن زید نے مجھ سے چند مسائل عکرمہ سے پوچھنے کے لئے کہا اور ہدایت کی کہ ابن عباس ؓ کا یہ غلام دریا ہے، اس سے پوچھا کرو[2]۔

مغازی : حدیث وفقہ کے علاوہ تاریخ میں بھی آپ کو درک تھا۔ مغازی کے ممتاز عالم تھے۔ اس پر اتنا عبور تھا کہ مغازی بیان کرتے وقت اپنی قوت گویائی سے میدان جنگ کا سماں باندھ دیتے تھے۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ عکرمہ جب مغازی بیان کرتے تھے تو سننے والے کو معلوم ہوتا کہ وہ مجاہدوں کے سامنے موجود ہیں اور ان کو دیکھ رہے ہیں[3]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں وفات پائی[4]۔ حافظ ذہبی کے نزدیک ۱۰۷ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا۔ ایک روایت قیروان (افریقہ) میں بھی ملتی ہے، لیکن یہ لائق اعتماد نہیں۔

بعض شکوک کا ازالہ :

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عکرمہ کا رجحان خارجی فرقہ صفریہ اور اباضیہ کی طرف تھا اور نجدہ خارجی کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم تھے۔ وہ ان کے پاس چھ مہینہ تک رہے بھی تھے۔ مغرب کے خارجیوں نے ان سے علمی استفادہ کیا تھا، لیکن ان بیانات کی صداقت بڑی حد تک مشکوک ہے۔

ابن سعد میں جو سب سے قدیم ماخذ ہے، صرف اس قدر ملتا ہے۔ یعنی گمان کیا جاتا ہے کہ خارجیوں کی رائے رکھتے تھے۔ اس بیان کی جو حیثیت ہے وہ ظن اور گمان کے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ بعض لوگ سرے سے اس بیان ہی کے منکر ہیں۔ چنانچہ عجلی کہتے ہیں کہ وہ مکی تابعی اور ثقہ ہیں اور خارجیت کی تہمت سے جو لوگ ان پر لگاتے ہیں بری ہیں[5]۔

ان بیانات کے علاوہ قرائن بھی اس کے خلاف ہیں۔ ان کی نشوونما حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ کے دامن میں ہوئی تھی، جو خارجیوں کے دشمن تھے۔ ان کا پہلا آقا حصین بن الحر العنبری بھی محب اہل بیت تھا۔ ایسی حالت میں خارجیت کی طرف ان کے میلان کا کم امکان ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر شیعیت کی طرف ان کا رجحان بیان کیا جاتا تو زیادہ قرین قیاس ہوسکتا تھا۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۶ ۲۔ ایضاً۔ ص ۲۱۳ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۶۶
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۸۴ ۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ۲۷۰

مختلف بیانات کے پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عکرمہ عام مسلمانوں کی طرح خوارج کے بارہ میں متشدد نہ تھے اور ان سے رسم وراہ رکھتے تھے اور چونکہ ان کا یہ طرز عمل عام مسلمانوں کے طریقہ کے خلاف تھا اور وہ اسے پسند کرتے تھے، اس لئے ان کی خارجیت کی شہرت ہوگئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص مسئلہ میں وہ خوارج کے ہم خیال رہے، اس لئے ان کو خارجی مشہور کر دیا گیا ہو ورنہ ان کو اس جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سیر وسیاحت: عکرمہ کو سیر وسیاحت کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ سیر وسیاحت میں مصروف رہتے تھے۔ مشرق میں ان کی سیاحت کا دائرہ سمرقند تک اور مغرب میں مصر وافریقہ تک وسیع تھا[1]۔

(۵۰) علی بن حسینؒ

نام ونسب: علی نام ہے، ابوالحسن کنیت، زین العابدین لقب۔ حضرت امام حسین ؓ کے فرزند اصغر اور ریاض بنوت کے گل تر تھے۔ کربلا کے میدان میں اہل بیت نبوی کا چمن اُجڑنے کے بعد یہی ایک پھول باقی رہ گیا تھا جس سے دنیا میں شمیم سیادت پھیلی اور حسینؓ کا نام باقی رہا۔

دادھالی شجرہ آفتاب سے زیادہ روشن اور ماہتاب سے زیادہ منور ہے۔ ننھیالی شجرہ بہت مختلف فیہ ہے۔ مشہور عام روایت یہ کہ آپ ایران کے آخری تاجدار یزدگرد کے نواسے تھے۔

اس کی تفصیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں یزدگرد کو شکست ہوئی تو اور قیدیوں کے ساتھ اس کی تین لڑکیاں بھی گرفتار ہوئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دوسرے قیدیوں کی طرح انہیں بھی بیچنے کا حکم دیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اختلاف کیا کہ شاہزادیوں کے ساتھ عام لڑکیوں کا سا سلوک نہ کرنا چاہئے اور یہ تجویز پیش کی کہ ان کی قیمت لگوائی جائے۔ جو قیمت لگے گی، جو شخص لے گا اسے اتنی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

چنانچہ قیمت لگوا کر تینوں لڑکیوں کو خود خرید لیا اور ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے محمد کو دیدی، دوسری حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند حضرت عبداللہ کو عطا فرمائی اور تیسری اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ کو۔ ان تینوں کے بطن سے حضرت قاسم بن محمد، حضرت سالم بن عبداللہ اور حضرت علی بن حسینؒ پیدا ہوئے۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۰

قدیم مورخ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ نے معارف میں لکھا ہے[1] کہ زین العابدین کی ماں سندھ کی تھیں اور ان کا نام سلافہ یا غزالہ تھا۔ ابن سعد نے غزالہ اختیار کیا ہے لیکن سلسلۂ نسب نہیں دیا ہے اور نہ یزدگرد کے شاہی نسب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلی روایت مختلف حیثیتوں سے غیر معتبر ہے۔ علامہ شبلیؒ نے الفاروق میں اس پر تفصیلی تنقید کی ہے۔ جس سے اس کی بے اعتباری واضح ہو جاتی ہے۔ مگر ان روایات سے اتنا بہر حال ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر قوم کی خاتون تھیں۔

ولادت : حضرت زین العابدینؒ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے[2]۔

واقعہ کربلا : اپنے جد امجد حضرت علیؓ کے عہد میں بچہ تھے۔ اس لئے اس عہد کا کوئی واقعہ لائق ذکر نہیں ہے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد کربلا کا واقعہ پیش آیا۔ اس سفر میں آپ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھے۔ مگر علالت کی وجہ سے شریک جنگ نہ ہو سکے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد شمر ذی الجوشن نے آپ کو قتل کرا دینا چاہا لیکن خود اس کے ایک ساتھی کے دل میں خدا نے رحم ڈال دیا۔ اس نے کہا، سبحان اللہ ہم اس نوخیز اور بیمار نوجوان کو جس نے جنگ میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا قتل نہیں کر سکتے۔ عمرو بن سعد بھی پہنچ گئے۔ اس نے شامیوں کو روک دیا کہ اس بیمار اور عورتوں سے کوئی شخص تعرض نہ کرے[3]۔

قید : اہل بیتؓ کا ایک عقیدت مند شامی آپ پر مہربان ہو گیا تھا۔ اس نے آپ کو چھپا لیا۔ وہ آپ کی خدمت کرتا تھا۔ اس درجہ آپ کے ساتھ تعلق خاطر تھا کہ آپ کے پاس روتا ہوا آتا تھا اور روتا ہوا واپس جاتا تھا۔ اس کے اس شریفانہ برتاؤ سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ لیکن شامیوں کی طرح دولت کے مقابلہ میں اس کی عقیدت بھی شقاوت سے بدل گئی۔ ابن زیاد نے آپ کی گرفتاری کے لئے اشرفی کا انعام مقرر کیا۔ اس کی طمع میں شامی نے آپ کو باندھ کر ابن زیاد کے آدمیوں کے حوالے کر دیا[4]۔

ابنِ زیاد سے مکالمہ :

گرفتاری کے بعد دوسرے حسینی قیدیوں کے ساتھ آپ بھی ابن زیاد کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا علی۔ نام سن کر اس نے کہا، کیا خدا نے علی کو قتل نہیں کر دیا؟ آپ نے خاموش رہے۔ ابن زیاد نے کہا جواب کیوں نہیں دیتے پھر فرمایا، میرے دوسرے بھائی کا نام علی تھا۔ ان کو لوگوں نے قتل کر دیا۔ ابن زیاد بولا، لوگوں نے نہیں، بلکہ خدا نے قتل کیا۔ حضرت امامؒ خاموش رہے۔ ابن زیاد نے پھر پوچھا، آپ نے جواب میں یہ دو آیتیں تلاوت فرمائیں :

---

[1] معارف ابن قتیبہ۔ ص ۹۴　[2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۲۱　[3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۷
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۷

" اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا ، وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ "۔
(آلِ عمران ۔ آیت ۱۵)

" اللہ ہی نفوس کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور کسی نفس کو بغیر خدا کے اذن کے مرنے کا اختیار نہیں ہے "۔

یہ جواب سن کر ابن زیاد نے کہا تم بھی انہی لوگوں میں ہو، اور آپ کے قتل کا حکم دیدیا۔ حکم سن کر حضرت زین العابدینؒ نے فرمایا، ان عورتوں کو کس کے سپرد کرو گے۔ آپ کی پھوپھی حضرت زینبؓ یہ ظالمانہ حکم سن کر تڑپ گئیں اور حضرت زین العابدینؒ سے چمٹ گئیں اور ابن زیاد سے کہا اگر تو انہیں بھی قتل کرنے پر آمادہ ہے تو ان کے ساتھ مجھے بھی قتل کردے۔ مگر حضرت امام زین العابدینؒ پر مطلق کوئی خوف وہراس طاری نہ ہوا۔ آپ نے نہایت سکون واطمینان کے ساتھ فرمایا کہ اگر مجھے قتل کرنا ہے تو کم از کم کسی آدمی کو ان عورتوں کے ساتھ کردو، جو انہیں حفاظت کے ساتھ وطن پہنچادے۔ ان کا یہ استقلال دیکھ کر ابن زیاد ان کا منہ تکنے لگا اور اس کے دل میں خدا نے رحم ڈال دیا۔ چنانچہ اس نے عورتوں کے ساتھ رہنے کے لئے آپ کو چھوڑ دیا[1]۔

شام کا سفر اور یزید سے مکالمہ :

اس کے بعد ابن زیاد نے اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کو یزید کے پاس شام بھجوادیا۔ شام پہنچنے کے بعد یہ لوگ یزید کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک دیکھ کر حضرت زین العابدینؒ سے کہا علی! جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ اس کا نتیجہ ہے کہ تمہارے باپ نے مجھ سے قطع رحم کیا۔ میرے حق میں غفلت کی اور حکومت میں جھگڑا کیا۔ امام ممدوح نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی :

" مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا " ۔

" تم کو زمین اور اپنی جانوں میں جو مصیبتیں پہنچیں، ان کو پیدا کرنے سے پہلے ہم نے لکھ رکھا ہے "۔

یزید نے اپنے لڑکے خالد سے جو پاس بیٹھا تھا کہا تم اس کا جواب دو۔ مگر وہ جواب نہ دے سکا، تو یزید نے کہا تم یہ آیت پڑھو[2]۔

---

[1] ابن سعد ۔ جلد ۵ ۔ ص ۱۵۷ و ابن اثیر ۔ جلد ۴ ۔ ص ۷۱　[2] طبری ۔ جلد ۷ ۔ ص ۳۷۶

"وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ" ۔

"اور تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ بہتوں سے معاف کر دیتا ہے"۔

اس مجلس میں ایک شامی نے کہا یہ قیدی ہمارے لئے حلال ہیں۔ حضرت علی بن حسینؓ نے فرمایا تو جھوٹ بکتا ہے۔ اگر تو مر بھی جائے تب بھی تیرے لئے یہ جائز نہیں، جب تک کہ تو ہمارے مذہب سے نکل نہ جائے، (یعنی اسلام پر قائم رہتے ہوئے کسی مسلمان کے لئے مسلمان قیدی عورت جائز نہیں ہے)۔ یزید نے شامی کو خاموش کر کے بٹھا دیا[۱]۔

اہل بیت کا معائنہ کرنے کے بعد یزید نے ان کو شاہی حرم سرا میں ٹھہرا دیا۔ یہ سب عورتیں عزیز ہی تھیں۔ اس لئے تین دن تک یزید کے محل میں ماتم بپا رہا۔ جب تک یہ لوگ رہے یزید ان کے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کرتا رہا۔ زین العابدینؒ کو اپنے ساتھ دستر خوان پر کھلاتا تھا[۲]۔

مدینہ سے واپسی اور یزید کے وعدے :

چند دنوں تک قیام کے بعد جب اہلِ بیت کو کسی قدر سکون ہوا تو یزید نے زین العابدینؒ سے کہا اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو یہیں رہو۔ میں صلہ رحمی سے پیش آؤں گا اور تمہارا پورا حق ادا کروں گا اور اگر واپس جانا چاہو تو واپس جا سکتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ سلوک کرتا رہوں گا۔ زین العابدینؒ نے واپس جانے کی خواہش کی[۳]۔

ان کی خواہش پر یزید نے سرکاری فوج کی نگرانی میں انہیں بحفاظت واپس کر دیا اور رخصت کرتے وقت زین العابدینؒ سے کہا ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں ہوتا تو حسینؓ جو کہتے مان لیتا اور ان کی جان نہ جانے دیتا۔ خواہ اس میں میری اولاد ہی کیوں نہ کام آ جاتی۔ بہر حال اب تو قضائے الٰہی پوری ہو چکی۔ آئندہ جب بھی تم کو کسی قسم کی ضرورت پیش آئے، مجھے فوراً لکھنا[۴]۔

مدینہ کا قیام اور عزلت گزینی :

اعزہ کی شہادت، گھر کی بربادی اور اپنی بے کسی پر زین العابدینؒ کا دل ایسا ٹوٹ گیا تھا کہ مدینہ آنے کے بعد انہوں نے عزلت نشینی اختیار کر لی اور آئندہ کسی تحریک میں حصہ نہ لیا، اور ہر فتنہ انگیز تحریک سے اپنا دامن بچاتے رہے۔ یزید نے بھی ہر موقع پر ان کا بڑا لحاظ رکھا۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۷ ۲ طبری۔ جلد ۳۔ ص ۳۷۸ ۳ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۷
۴ طبری۔ جلد ۳۔ ۳۷۹

ابن زبیرؓ کا ہنگامہ اور زین العابدینؒ کی کنارہ کشی:

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ہی عبداللہ بن زبیرؓ یزید کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اہل حجاز نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کرلی۔ مکہ اور مدینہ کے باشندوں نے اپنے یہاں سے اُموی عمال کو نکال دیا۔ یزید نے ان کی تنبیہ کے لئے مسلم بن عقبہ کو ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا اور امیر عسکر کو ہدایت کردی کہ زین العابدین کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔

اہل مدینہ مقابلہ پر آئے، لیکن شکست کھائی، ہزاروں آدمی مارے گئے اور یزیدی فوج کئی دن تک مدینۃ الرسول کو لوٹتی رہی۔ اس جنگ میں زین العابدینؒ اور ان کے اعزہ نے کوئی حصہ نہیں لیا اور مدینہ چھوڑ کر عقیق چلے گئے۔

مدینہ کو ویران کرنے کے بعد مسلم عقیق گیا اور زین العابدینؒ کو پوچھا، معلوم ہوا موجود ہیں۔ زین العابدینؒ کو خبر ہوئی تو وہ خود اس سے ملنے آئے اور اپنے ساتھ اپنے چچازاد بھائیوں ابو ہاشم، عبداللہ اور حسن بن محمد بن حنیفہ کو بھی لیتے آئے۔ مسلم بڑی عزت وتکریم کے ساتھ ان سے ملا۔ اپنے تخت پر بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ امیر المومنین نے مجھے آپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی تھی۔

آپ نے فرمایا، خدا ان کو اس کا صلہ دے۔ مسلم نے دونوں لڑکوں کے متعلق پوچھا، زین العابدینؒ نے کہا میرے چچیرے بھائی ہیں۔ یہ سن کر مسلم نے ان سے ملنے پر بھی مسرت ظاہر کی۔ اس خوش آئند ملاقات کے بعد زین العابدینؒ واپس گئے۔[1]

مختار کا خروج اور زین العابدین کی علیحدگی:

اسی زمانہ میں ایک حوصلہ مند ملحد مختار بن ابی عبید ثقفی حصول حکومت کے لئے محبت اہل بیت کے نام پر خونِ حسین کے انتقام کی دعوت لے کر اٹھا۔ ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس نے مقصد برآری کے لئے زین العابدینؒ کے پاس ایک گراں رقم نذر بھیج کر درخواست کی آپ ہمارے امام ہیں۔ ہم سے بیعت لے کر ہماری سرپرستی قبول فرمایئے۔ لیکن آپ اس کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ اس لئے اس کی درخواست ٹھکرادی اور مسجد نبوی میں جاکر اس کے فسق وفجور اور کفر والحاد کا پردہ فاش کرکے فرمایا کہ اس نے محض لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اہلِ بیت کو آڑ بنایا ہے۔ اس کے فریب میں نہ آنا چاہئے۔

---

[1] ابن سعد میں "مسرف" لیکن اور تمام تاریخوں میں مسلم نام ہے۔ [2] اخبار الطوال۔ ص ۲۷۵۔۲۷۶ و ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۹

ان سے مایوس ہوکر مختار نے محمد بن حنیفہ کی طرف رجوع کیا۔ یہ اس کے دام میں آ گئے۔ زین العابدینؒ نے انہیں بھی روکا، اور ان سے کہا کہ اہلِ بیت کی محبت میں اس کا مظاہر اس کے باطن سے مختلف ہے۔ وہ محض محبانِ اہلِ بیت کا مائل کرنے کے لئے محبت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے، حقیقت میں اس کو اہلِ بیت کی دوستی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ ان کا دشمن ہے۔ اس لئے میری طرح آپ کو بھی اس کا پردہ فاش کرنا چاہئے۔

ابن حنیفہ نے ابن عباسؓ سے اس کا تذکرہ کیا۔ لیکن حضرت حسینؓ کی دردناک شہادت سے تمام محبانِ اہلِ بیت خصوصاً اہل ہاشم کے دل زخمی ہو رہے تھے۔ اس لئے ابن عباسؓ نے بھی مختار کی حمایت کی اور ابن حنیفہ کو زین العابدینؒ کا کہنا ماننے سے روکا۔[1]

اس کے بعد بنی اُمیہ اور ابن زبیرؓ کے ساتھ مختار کی بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں، لیکن حضرت امام بالکل کنارہ کش رہے اور مختار کے قتل ہو جانے کے بعد بھی اس پر لعنت بھیجتے رہے۔ ابو جعفر کا بیان ہے کہ علی بن حسینؒ بابِ کعبہ پر کھڑے ہوکر مختار پر لعنت بھیجتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ خدا مجھے آپ پر فدا کرے۔ آپ ایسے شخص پر لعنت بھیجتے ہیں، جو آپ کے خاندان کی محبت میں مارا گیا۔ فرمایا، وہ کذاب تھا اور خدا اور رسول پر بہتان باندھتا تھا۔[2]

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس عزلت نشینی اور کنارہ کشی کے باوجود ابتداء میں عبدالملک کو آپ کی جانب سے دعویٰ خلافت کا خطرہ تھا۔ چنانچہ آپ کو مدینہ سے شام بجر بلوا لیا تھا۔ لیکن پھر امام زہریؒ نے آپ کی جانب سے صفائی پیش کی اور کہا، زین العابدینؒ کی جانب سے آپ کی بدگمانی غلط ہے۔ انہیں دن رات اپنی ذات اور خدا کی عبادت سے کام ہے۔ وہ کسی جھگڑے میں نہ پڑیں گے۔ زہریؒ کی اس سفارش پر اس نے رہا کر دیا۔[3]

لیکن غالباً یہ بالکل ابتداء کا واقعہ ہے۔ بعد میں دونوں کے تعلقات نہایت خوشگوار ہو گئے۔ مروان اور عبدالملک دونوں ان کو بہت مانتے تھے۔ امام زہریؒ کا بیان ہے کہ زین العابدینؒ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ سلامت رو اور مطیع تھے۔ مروان اور عبدالملک تمام اہلِ بیت ان کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔[4]

وفات: ۹۴ھ مدینۃ الرسول میں وفات پائی اور جنت البقیع میں اپنے بابا حسنؓ اور حضرت عباسؓ کے روضہ میں دفن کئے گئے۔[5]

---

۱ مروج الذہب مسعودی۔ جلد ۲۔ ص ۴۷۹۔ ۴۸۰　　۲ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۸

۳ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۵　　۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۹　　۵ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۲۱

فضل وکمال : آپ جس خانوادہ علم کے چشم وچراغ تھے،وہ علوم دینی کا سرچشمہ تھا۔آپ کے امجد علم وعمل کے مجمع البحرین تھے۔اس لئے علم آپ کے گھر کی دولت تھی۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا نے ایسا افسردہ خاطر اور دنیا کی ہر شے سے دل ایسا اُچاٹ کردیا تھا کہ علم وفن کی کتاب بھی آپ نے تہہ کردی تھی۔اس لئے آپ کے علمی کمالات ظاہر نہ ہوسکے۔لیکن آپ کا علمی پایہ مسلم تھا۔امام زہریؒ کہتے تھے کہ میں نے مدینہ میں ان سے افضل کسی کو نہیں پایا[1]۔امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ہر شے میں ان کی جلالت وعظمت پر سب کا اتفاق ہے[2]۔

حدیث : اگرچہ آپ کا شمار حفاظ حدیث میں نہیں ہوتا۔تاہم حفظ حدیث میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : " **كان ثقة مامونا كثير الحديث عالية فيعا** "[3]۔

حدیث میں اپنے والد بزرگوار حضرت حسینؓ،اپنے بابا حسنؓ،اپنے چچیرے دادا ابن عباسؓ۔اپنی دادی عائشہؓ،اُم سلمہؓ اور صفیہؓ اور اپنے خاندانی غلام ابورافعؓ (مولی رسول اللہ ﷺ) ان کے لڑکے عبیداللہ،حضرت عائشہؓ کے غلام ذکوانؓ اور دوسرے بزرگوں میں مسور بن مخرمہ اور سعید بن مسیب سے استفادہ کیا تھا[4]۔

روایت میں آپ کے والد اور جد امجد کا سلسلۃ الذہب سمجھا جاتا ہے۔ابوبکر شیبہ کا بیان ہے کہ زہری کی وہ روایات جو علی بن حسینؓ ان کے والد اور ان کے دادا کے سلسلہ سے مروی ہیں۔اصح الاسانید ہیں[5]۔

تلامذہ : خود آپ سے فیض اُٹھانے والوں کا دائرہ بھی خاصہ وسیع تھا۔آپ کے صاحبزادوں میں محمد،زید،عبداللہ،اور عمر عام رواۃ میں ابوسلمہ بن عبدالرحمن،طاؤس بن کیسان،امام زہری،ابوالزناد،عاصم بن عمر بن قتادہ،عاصم بن عبداللہ،قعقاع بن حکیم،زید بن اسلم،حکم بن عتبہ،حبیب بن ابی ثابت ،ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن۔مسلم البطین،یحییٰ بن سعید انصاری،ہشام بن عروہ،علی بن زید جدعان وغیرہ لائق ذکر ہیں[6]۔

فقہ : فقہ میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا۔امام زہریؒ کہتے تھے کہ میں نے علی بن حسینؓ سے زیادہ کسی کو فقیہ نہیں دیکھا[7]۔آپ کے فقہی کمال کی بڑی سند یہ ہے کہ مدینہ کے مشہور سات فقہاء کے بعد آپ ہی کا نمبر تھا[8]۔

---

[1] تہذیب الاسماء نووی۔جلد ۱۔ص ۳۴۳ [2] ایضاً [3] ابن سعد۔جلد ۵۔ص ۱۶۲ [4] تہذیب التہذیب۔جلد ۷۔ص ۳۰۴
[5] ایضاً۔ص ۳۰۵ [6] ایضاً۔ص ۳۰۵ [7] تذکرۃ الحفاظ۔جلد ۱۔ص ۶۵ [8] اعلام الموقعین۔جلد ۱۔ص ۳۶

حکیمانہ اقوال : آپ کے اقوال آپ کے علمی کمالات کا آئینہ اور پند و موعظت کے سبق ہیں۔

فرماتے تھے، مجھے اس مغرور اور فخر کرنے والے پر تعجب آتا ہے جو کل ایک حقیر نطفہ تھا اور کل مُردار ہو جائے گا اور اس شخص پر حیرت ہوتی ہے، جو خدا کی ہستی میں شک کرتا ہے۔ حالانکہ خود اس کی پیدائش اس کے سامنے ہے اور اس شخص پر تعجب آتا ہے جو قیامت کے دن دوبارہ پیدائش کا انکار کرتا ہے۔ جبکہ پہلی تخلیق اس کے سامنے ہے، اور اس شخص پر تعجب آتا ہے، جو ایک فانی مقام کے لئے عمل کرتا ہے اور دار بقا کو چھوڑ دیتا ہے۔ احباب کا کھودینا مسافرت ہے۔ خدایا میں تجھ سے اس امر کی پناہ مانگتا ہوں کہ تو لوگوں کی نگاہ میں میرے ظاہر کو تو اچھا دکھا، لیکن میری اندرونی حالت کو خراب کر دے۔ خدایا میں نے جب کوئی بُرائی کی تو تو نے میرے ساتھ بھلائی کی۔ آئندہ جب میں ایسا کروں تو تو بھی ایسا ہی کر۔

کچھ لوگ خوف سے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ کچھ (جنت کی) طمع میں عبادت کرتے ہیں۔ یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ کچھ خالص شکر الٰہی میں عبادت کرتے ہیں۔ یہی آزادوں کی عبادت ہے[۱]۔

آپ کے صاحبزادے محمد روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے وصیت کی تھی پانچ آدمیوں کے ساتھ کبھی نہ رہنا۔ میں نے عرض کیا کونسے؟ فرمایا، فاسق کے ساتھ، وہ تم کو ایک لقمہ بلکہ اس سے بھی کم میں بیچ دے گا۔ میں نے پوچھا، اس سے کم کیا چیز کیا ہو سکتی ہے؟ فرمایا، ایک لقمہ کی طمع کی جائے اور وہ بھی نہ ملے۔ میں نے پوچھا دوسرا کون؟ فرمایا، بخیل۔ وہ اس چیز کو جس کی تم کو زیادہ ضرورت ہوگی، تم سے علیحدہ کر دے گا۔ میں نے پوچھا، تیسرا کون؟ فرمایا، کذاب۔ وہ سراب کی طرح تم کو قریب سے دور اور دور سے قریب کر دے گا۔ میں نے عرض کیا چوتھا کون؟ فرمایا، احمق۔ وہ فائدہ پہنچانا چاہے گا، مگر اُلٹے نقصان پہنچائے گا۔ میں نے کہا، پانچواں کون؟ فرمایا قاطع رحم۔ میں نے اس کو کتاب اللہ میں تین مقام پر ملعون پایا[۲]۔

فرماتے ہیں، وہ شخص کس طرح تمہارا دوست ہو سکتا ہے کہ جب تم اس کی تھیلی سے اپنی ضرورت لے لینا چاہو تو اس کو خوشی نہ ہو[۳]۔

فضائل واخلاق :

آپ کی ذات گرامی فضائل اخلاق کی ایسی نورانی شمع تھی، جس سے دوسرے مستفیض ہوتے تھے۔ آپ خلقِ نبوی ﷺ کے مجسم تصویر تھے۔ خاندانِ بنی ہاشم میں آپ سے افضل کوئی نہ تھا[۴]۔

۱۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۲۔۱۳۳ ۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۵ ۳۔ ایضاً ۴۔ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۴۳

خشیت الٰہی :

آپ کا دل خشیت سے لبریز رہتا تھا، اور اکثر وہ اس خوف سے بیہوش ہو جاتے تھے۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ علی بن حسینؓ حج کو گئے۔ احرام باندھنے کے بعد جب سواری پر بیٹھے تو مارے خوف کے ان کا رنگ زرد پڑ گیا اور ایسا لرزہ طاری ہوا کہ زبان سے لبیک تک نہ نکل سکا۔ لوگوں نے کہا آپ لبیک کیوں نہیں کہتے؟ فرمایا ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ادھر سے جواب ملے "لا لبیک" تیری حاضری قبول نہیں۔

لوگوں نے کہا، مگر لبیک کہنا تو ضروری ہے۔ لوگوں کے اصرار سے کہا، مگر جیسے ہی زبان سے لبیک نکلا، بے ہوش ہو کر سواری سے گر پڑے[1]۔ اسی طرح جب زور سے ہوا چلتی تھی اور آندھی آتی تھی تو عذاب الٰہی کے خوف سے بے ہوش ہو جاتے تھے[2]۔

عبادت وریاضت :

آپ کی رگوں میں ان بزرگوں کا خون تھا، جن کی عبادت زیر شمشیر جفا بھی نہ چھوٹی۔ اس لئے آپ بھی زہد و عبادت کا پیکر تھے۔ سعید بن مسیب جو خود بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ فرماتے تھے کہ علی بن حسینؓ سے زیادہ ورع میری نظر سے نہیں گزرا۔ عبادت آپ کی زندگی کی مشغلہ تھی۔ اوقات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ شبانہ یوم میں ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے اور آخر دم تک اس معمول میں فرق نہ آیا۔ اس عبادت کی وجہ سے زین العابدین لقب ہو گیا تھا[3]۔ قیام لیل و حضر کسی حالت میں ناغہ نہ ہوتا تھا[4]۔

اخلاص فی العبادت کا یہ حال تھا کہ حضوری کے وقت سارے بدن میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ عبداللہ بن سلمان کا بیان ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سارے بدن میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا، آپ کو یہ کیا ہو جاتا ہے؟ فرمایا، تم لوگ کیا جانو میں کس کے حضور میں کھڑا ہوں اور کس سے سرگوشی کرتا ہوں[5]۔

محویت کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں کسی چیز کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ سجدہ میں تھے کہ کہیں پاس ہی آگ لگ گئی۔ لوگوں نے آپ کو بھی پکارا، یا ابن رسول اللہ! یا ابن رسول اللہ! آگ لگی ہے۔ لیکن آپ نے سجدہ سے سر نہ اُٹھایا، تا آنکہ آگ بجھ بھی گئی۔ لوگوں نے بعد میں پوچھا کہ آپ کو

۱۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۲ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۶۵
۴۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۷ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰

آگ کی جانب سے کس چیز نے اس قدر بے پرواہ کر دیا تھا۔ فرمایا، دوسری آگ (آتش دوزخ) نے[1]۔

آپ اور سلیمان بن یسار روزانہ مسجد نبوی میں قبر نبوی اور منبر نبوی کے درمیان دن چڑھے تک مذاکرۂ حدیث میں مشغول رہتے تھے۔ اٹھتے وقت عبداللہ بن ربی سلمہ قرآن کی ایک سورۃ سناتے تھے۔ قرآن سننے کے بعد دعا کرتے تھے[2]۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اتنا اہتمام تھا کہ اس غفلت کو کتاب اللہ سے غفلت شمار کرتے تھے۔ فرماتے تھے، کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تارک کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنے والے کی طرح ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے نہ چھوڑے۔ لوگوں نے بچاؤ کا مطلب پوچھا فرمایا، جب کسی ظالم اور سرکش کی زیادتی کا خوف ہو[3]۔

انفاق فی سبیل اللہ:

انفاق فی سبیل اللہ، فیاضی اور دریا دلی آپ کا خاص وصف تھا۔ خدا کی راہ میں بے دریغ صرف کرتے تھے۔ فقراء اور اہل حاجت کی دستگیری کے لئے ہمیشہ دست کرم دراز رہتا تھا۔ مدینہ کے معلوم نہیں کتنے گھرانے آپ کی ذات سے پرورش پاتے تھے اور کسی کو خبر تک نہ ہونے پائی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ خفیہ مستقل سو گھرانوں کی کفالت کرتے تھے[4]۔

اخفاء کے لئے بہ نفس نفیس خود راتوں کو جا کر ان کے گھروں پر صدقات پہنچاتے تھے۔ مدینہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے، جن کی معاش کا کوئی ظاہری وسیلہ نہ تھا۔ آپ کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ آپ رات کی تاریکی میں خود جا کر ان کے گھروں پر دے آتے تھے[5]۔

غلہ کے بورے اپنی پیٹھ پر لاد کر غریبوں کے گھر پہنچاتے تھے۔ وفات کے بعد جب غسل دیا جانے لگا تو جسم مبارک پر نیل کے داغ نظر آئے۔ معلوم ہوا آٹے کی بوریوں کے بوجھ کے داغ ہیں جنہیں آپ راتوں کو لاد کر غرباء کے گھر پہنچاتے تھے[6]۔

آپ کی وفات کے بعد اہل مدینہ کہتے تھے کہ خفیہ خیرات زین العابدینؒ کے دم سے تھی۔

سائلین کا بڑا احترام کرتے تھے، جب کوئی سائل آتا تو میرے توشہ کو آخرت کی طرف لے جانے والے مرحبا کہہ کر اس کا استقبال کرتے۔ سائل کو خود اٹھ کر دیتے اور فرماتے تھے۔ صدقات سائل کے ہاتھ میں

---

[1] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۳ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰ [3] ایضاً [4] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۳۴۴
[5] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۳ [6] ایضاً

جانے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتے ہیں[1]۔

عمر میں دو مرتبہ اپنا کل مال ومتاع آدھا آدھا خدا کی راہ میں دے دیا۔ پچاس پچاس دینار کی قیمت کا لباس صرف ایک موسم میں پہن کر فروخت کرتے اور اس کی قیمت خیرات کر دیتے تھے[2]۔

اکل حلال: اکل حلال میں اتنا اہتمام تھا کہ رسول اللہ کی نسبت یا نام سے ایک درہم کا فائدہ اٹھانا بھی پسند نہ کرتے تھے[3]۔

حلم وبردباری: تحمل اور بردباری میں اپنے بابا حضرت حسینؓ کے مشابہ تھے۔ زبان کے تیز سے تیز نشتروں کا بھی اثر نہ لیتے تھے۔ ناگوار اور تلخ سے تلخ باتیں سن کر پی جاتے تھے۔ آپ کے تحمل کا یہ اثر ہوتا تھا کہ جب مسجد سے اٹھ کر آنے لگتے تو گالی دینے والے روتے ہوئے آپ کے ساتھ ہو جاتے اور کہتے اب آئندہ آپ کبھی زبان سے ایسا کلمہ نہ سنیں گے جو آپ کو برا معلوم ہو۔

اکثر ایسا ہوتا کہ آپ بیہودہ بکنے والوں کی جانب متوجہ ہی نہ ہوتے۔ بعض گستاخ ایسے جری اور بے باک تھے کہ آپ کو جتلانے کے لئے کہتے کہ میں تم ہی کو کہہ رہا ہوں آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ چشم پوشی کرتا ہوں[4]۔

کبھی جواب بھی دیتے تو اس طرح کا کہ کہنے والا خود منفعل ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آپ مسجد سے نکلے راستہ میں ایک شخص نے آپ پر گالیاں برسانی شروع کر دیں۔ آپ کے غلام اور خدام اس کی طرف لپکے، آپ نے روک دیا اور اس شخص سے فرمایا، میرے جو حالات تم سے مخفی ہیں وہ اس سے زیادہ ہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ تمہاری کوئی ضرورت ہے جس میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ یہ جواب سن کر وہ شخص سخت شرمندہ ہوا۔ آپ نے اپنا کرتہ اتار کر اسے دے دیا اور ایک ہزار درہم سے زیادہ نقد عطا فرمائے اس شخص پر آپ کے اس حسن انتقام کا اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی اولاد سے ہیں[5]۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص آپ کو برا بھلا کہتا ہے۔ آپ اس کو لے کر اس شخص کے پاس پہنچے۔ یہ سمجھتا تھا کہ آپ نے اس کو مدد کے لئے ساتھ لیا ہے۔ برا کہنے والے شخص کے پاس پہنچ کر فرمایا تم نے جو کچھ میرے بارہ میں کہا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو خدا میری مغفرت فرمائے اور اگر جھوٹ ہے تو خدا تمہاری مغفرت فرمائے[6]۔

---

۱ مختصر صفوۃ الصفوۃ ۲ ایضاً ص ۱۶۳ ۳ مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۳۵ ۴ ایضاً ص ۱۳۷
۵ ایضاً ۶ ایضاً

عفو و درگذر : ان کینہ پرور دشمنوں سے بھی جن سے آپ کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچی تھیں، موقع ملنے کے بعد انتقام نہ لیتے تھے۔ ہشام بن اسمٰعیل والی مدینہ آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو سخت اذیت پہنچاتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر علانیہ سب و شتم کرتا تھا۔ ولید بن الملک نے اپنے زمانہ میں اسے معزول کر کے حکم دیا کہ مجمع عام میں اس کو کھڑا کیا جائے اور لوگ اس سے اپنا اپنا بدلہ لیں ہشام کا بیان ہے کہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ علی بن حسین کی جانب سے تھا مگر انہوں نے اپنے لڑکوں اور حامیوں کو منع کر دیا کہ کوئی شخص مجھ سے تعرض نہ کرے آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے عرض کیا خدا کی قسم اس نے ہمارے ساتھ بہت برائیاں کی ہیں ہم کو تو ایسے وقت کا انتظار ہی تھا فرمایا ہم اس کو خدا کے سپرد کرتے ہیں آپ کے اس ارشاد کے بعد ان میں سے کسی نے اس کے متعلق ایک لفظ منہ سے نہ نکالا ہشام پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس کو زین العابدین کے فضل کا اعتراف کرنا پڑا[1]۔

نرمی و ملاطفت : فطرۃً بڑے نرم خو تھے۔ درشتی اور سختی کا نام تک نہ تھا۔ جانوروں تک کو مارتے اور جھڑکتے نہ تھے۔ ہشام بن عروہؒ کا بیان ہے کہ علیؒ سواری پر مکہ جا کر واپس آتے تھے اور اس سفر میں کبھی اپنی سواری کو نہ مارتے تھے[2]۔

محبوبیت و جلالت :

اس تحمل، عفو و درگزر اور نرمی و ملاطفت کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کی محبت لوگوں کے دلوں میں اتنی جاگزیں ہو گئی تھی کہ جدھر نکل جاتے تھے آپ کو راستہ دینے کے لئے ہجوم چھٹ جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ اور ہشام بن عبدالملک کا ایک واقعہ لائق ذکر ہے۔

ہشام بن عبدالملک ایک دفعہ اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں عمائد شام کے ساتھ حج کو گیا۔ طواف کرنے کے بعد حجر الاسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھا۔ مگر ہجوم اتنا تھا کہ کوشش کے باوجود نہ پہنچ سکا۔ مجبوراً رک گیا اور اژدھام کا تماشہ دیکھنے کے لئے پاس ہی اس کے لئے ایک کرسی بچھا دی گئی۔ ابھی وہ تماشہ دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں امام زین العابدینؒ آ گئے اور طواف کر کے حجر اسود کی طرف بڑھے۔ انہیں دیکھ کر خود بخود بھیڑ چھٹ گئی اور انہوں نے آسانی کے ساتھ حجر اسود کا بوسہ لیا۔

یہ منظر دیکھ کر ایک شامی نے ہشام سے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ جس کی لوگوں کے دلوں میں اتنی ہیبت ہے؟ ہشام آپ کو پوری طرح پہچانتا تھا۔ مگر ان کی جانب سے شامیوں کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا میں نہیں پہچانتا۔ فرزدق شاعر بھی موجود تھا۔ یہ تجاہل عارفانہ سن کر اس کی شراب عقیدت

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۳　[2] ایضاً۔ ص ۱۶۰

جوش میں آ گئی۔ اس نے کہا میں ان کو جانتا ہوں۔ شامی نے پوچھا کون ہیں؟ فرزدق نے اسی وقت زین العابدینؒ کی شان میں ایک پُر زور مدحیہ قصیدہ پڑھا۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں[1]: ۔

هذاالذی تعرف البطحاء وطاتهٔ	والبیت یعرفه والحل والحرم
هذا ابن خیر عباد الله کلهم	هذا التقی النقی الطاهر العلم
اذاء اته قریش قال ئلها	الی مکارم هذا ینتهی الکرم
ولیس قولک من هذا بصائره	العرب تعرف من انکرت والعجم
ماقال لا قط الا فی تشهده	لولا التشهد کانت لاء ه نعم
یکا دیمسکم عرفان راحته	رکن الحطیم اذا اماجاء یستلم
مقدم بعد ذکر الله ذکر هم	فی کل امر ومختترم به الکلم
یغضی حیاء ویغضی من مهابته	ولا یکلم الا حین یتبسم
هذا ابن فاطمة ان کنت جاهله	یجد انبیاء الله قد ختموا

یہ قصیدہ سن کر ہشام فرزدق سے برہم ہو گیا اور اس کو قید کر دیا۔ امام زین العابدینؒ نے اس کے صلہ میں فرزدق کو بارہ ہزار درہم عطا فرمائے۔ اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ میں نے خدا اور رسول کی خوشنودی کے لئے مدح کی تھی، انعام کی طمع میں نہیں۔ امام زین العابدینؒ نے پھر اس کے پاس بھجوا دیئے اور کہلا بھیجا کہ "ہم اہل بیت جب کسی کو کچھ دیتے ہیں تو پھر واپس نہیں لیتے، خدا تمہاری نیت سے واقف ہے۔ وہ اس کا اجر علیحدہ دے گا، خدا تمہاری سعی مشکور فرمائے"۔ اس پیام کے بعد تعمیل ارشاد میں فرزدق نے وہ درہم لے لئے[2]۔

غرور سے نفرت: اس عظمت وجلالت کے باوجود بڑے متواضع اور منکسر تھے۔ غرور سے سخت نفرت کرتے تھے۔ فرماتے تھے، مجھے اس متکبر اور مغرور انسان پر تعجب آتا ہے جو کل ایک حقیر نطفہ اور کل پھر مُردار ہو جائے گا[3]۔ آپ کی چال ایسی خاکسارانہ تھی کہ چلنے میں دونوں ہاتھ رانوں سے آگے نہ بڑھنے پاتے تھے[3]۔

مساوات: غرور نسب کو مٹانے اور مساوات کی عملی مثال قائم کرنے کے لئے اپنی ایک لڑکی کی شادی اپنے ایک غلام سے کر دی تھی اور لونڈی کو آزاد کر کے اس کے ساتھ خود عقد کر لیا تھا۔ عبدالملک کو

---

[1] یہ واقعہ نہایت مشہور ہے اور بہت سی تاریخوں میں ہے۔ [2] مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۶ [3] ایضاً
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰

اس کی خبر ہوئی تو اس نے خط لکھ کر اس فعل پر ملامت کی۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات تمہارے لئے نمونہ ہے۔ آپ نے صفیہ بنت حیی کو (جو لونڈی تھیں) آزاد کر کے اپنے عقد میں لے لیا تھا اور اپنے غلام زید بن حارثہ کو آزاد کر کے ان سے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کی شادی کر دی تھی [۱]۔

محبت اہل بیت میں اعتدال کی ہدایت :

بعض مدعیان محبت اہل بیت شدت غلو میں اہل بیت کرام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، امام زین العابدینؒ اس قسم کی گمراہ کن اور غیر معتدل محبت کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور انہیں اس سے روکتے تھے۔ فرماتے تھے، کہ "تم لوگ ہمارے ساتھ اسلام کی بتائی ہوئی حد تک محبت کرو، خدا کی قسم لوگ ہمارے متعلق اتنا کچھ کہتے رہے کہ بہت سے لوگوں کی نظروں میں ہم کو مبغوض بنا دیا [۲]۔ کبھی فرماتے، ہمارے ساتھ خدا کے لئے اسلام کی بتائی ہوئی محبت کیا کرو تمہاری محبت تو ہمارے لئے عار بن گئی [۳]۔

خلفائے ثلثہ کے ساتھ حسن عقیدت :

اپنے حق پرست اسلاف کی طرح خلفائے ثلثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ امام زین العابدینؒ بھی سچی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی برائی سننا پسند نہ فرماتے تھے اور برائی کرنے والوں کو اپنے یہاں سے نکال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ چند عراقی آپ کے پاس آئے اور شاید اس غلط فہمی میں کہ آپ بھی ان کے گمراہ کن خیالات میں ان کے ہمنوا ہوں گے۔ آپ کے سامنے خلفائے ثلثہ کے متعلق کچھ نازیبا باتیں کہیں۔ آپ نے کلام اللہ کی ان آیات کی طرف :

" للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله اولئك هم الصادقون

''مال غنیمت میں ان محتاج مہاجرین کا بھی حق ہے جو اپنے وطن سے نکالے گئے اور اپنے مال سے محروم کئے گئے اور وہ خدا کے فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں''۔

جس میں مہاجرین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اشارہ فرما کر پوچھا کیا تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو، جو اپنے وطن سے نکالے گئے اور اپنی جائداد اور دولت سے محروم کئے گئے، اور خدا

---

[۱] طبقات ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۹ [۲] ایضاً۔ ص ۱۵۸ [۳] ایضاً

کے فضل اور اس کی رضامندی کے متلاشی ہیں اور اس کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔
عراقیوں نے کہا نہیں۔ پھر آپ نے اسی آیت کے دوسرے ٹکڑے کی طرف :

" والذین تبوؤ الدار و الایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم و لا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون " ۔

"اور ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے (مہاجرین) پہلے سے مدینہ میں رہتے ہیں اور اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جو ان کی طرف ہجرت کر کے آتا ہے، اس سے محبت کرتے ہیں اور (مال غنیمت) جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اپنے دل میں اس کی خواہش نہیں پاتے، اور خواہ ان پر تنگی کیوں نہ ہو۔ (مہاجرین) کو اپنے اُوپر مقدم رکھتے ہیں، جو اپنے نفس کو بخل سے بچائے گا وہی لوگ فلاح پائیں گے"۔

جو انصار کے فضائل میں ہے، اشارہ کر کے پوچھا کیا تم ان لوگوں میں ہو جو ان لوگوں (مہاجرین) کی ہجرت کے پہلے سے (مدینہ میں) گھر رکھتے ہیں اور ایمان لا چکے ہیں اور جو ان کے یہاں ہجرت کر کے جاتا ہے، اس سے محبت کرتے ہیں۔

عراقیوں نے کہا، ان میں سے بھی نہیں ہیں۔ فرمایا، تم کو خود اعتراف ہے کہ تم دونوں جماعتوں میں سے نہیں ہو۔ اب میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم اس جماعت میں بھی نہیں ہو، جن کے متعلق خدا فرماتا ہے :

" یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنا انک رؤوف رحیم " ۔

"اور وہ لوگ جو ان کے (مہاجرین) بعد آئے اور کہتے ہیں کہ ہمارے رب ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سب سے پہلے ایمان لا چکے ہیں، مغفرت فرما اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے کینہ نہ رکھ اے ہمارے رب تو رؤف و رحیم ہے"۔

جب تم ان تینوں اسلامی جماعتوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہو تو خدا تم کو غارت کرے، میرے یہاں سے نکل جاؤ[1]۔ حضرت عثمان غنیؓ کے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ خدا کی قسم وہ ناحق شہید کئے گئے ہیں[2]۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۳۲ [2] ابن سعد۔ ج ۵۔ ص ۱۲۰

حلیہ : صورۃ نہایت حسین وجمیل تھے۔ بدن سے خوشبو پھوٹتی تھی[1]۔ شانوں تک زلفیں تھیں۔ مانگ نکلی رہتی تھی[2]۔ خضاب کبھی سیاہ اور کبھی سرخ دونوں استعمال کرتے تھے۔

لباس : نہایت خوش لباس تھے۔ خز کا جو ایک بیش قیمت کپڑا ہے جبہ اور اسی کی چادر استعمال کرتے تھے۔ ایک ایک چادر کی قیمت پچاس پچاس اشرفی تک ہوتی تھی اور محض ایک موسم میں استعمال کرکے اس کو بیچ کر قیمت خیرات کردیتے تھے۔ سردیوں میں لومڑیوں کا سمور استعمال کرتے تھے۔ رنگوں میں سپید، سرخ، زرد اور سیاہ ہر قسم کا رنگ پسند تھا۔ گول سر کی جوتی پہنتے تھے[3]۔

نفاست : مزاج میں بڑی لطافت ونفاست تھی۔ گندگی کو مطلق برداشت نہ کرسکتے تھے۔ بہت چیزوں کو محض دوسروں کی خاطر انگیز کرتے تھے۔

حضرت ابوجعفر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ علی بن حسینؓ بیت الخلاء گئے۔ میں ہاتھ دھونے کے لئے پانی لئے ہوئے دروازے پر کھڑا تھا۔ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد فرمایا، میں نے بیت الخلاء میں ایسی شے دیکھی، جس نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا میں نے دیکھا مکھیاں غلاظت پر بیٹھتی ہیں، پھر اڑ جاتی ہیں اور آدمی کی جلد پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ بیت الخلاء جانے کے لئے ایک خاص لباس بناؤں۔ پھر سوچ کر فرمایا کہ جس چیز کو لوگوں کی استطاعت نہ ہو اسے مجھے بھی نہ کرنا چاہیے[4]۔

(۵۱) علیؒ بن عبداللہ بن عباسؓ

نام ونسب : علی نام ہے۔ ابومحمد کنیت، سجاد لقب۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے : علی بن عبداللہ بن عباسؓ بن عبدالمطلب قریشی ہاشمی۔ ماں کا نام زرعہ تھا۔ نھیالی شجرہ یہ ہے : زرعہ بنت مشرح بن معدیکرب بن ولیعہ ابن شرحبیل بن معاویہ بن شرحبیل بن معاویہ بن حجر القرد بن الحارث الولادہ بن عمرو بن معاویہ بن الحارث بن معاویہ بن ثور بن مرتع بن ثور۔ علی دولت عباسیہ کے بانی سفاح کے دادا تھے۔

پیدائش : حضرت علیؓ کی شب شہادت کو رمضان ۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اس لئے یادگار کے طور پر انہی کے نام پر علی نام اور ابوالحسن کنیت رکھی گئی۔ لیکن عبدالملک نے اپنے زمانہ میں کہا کہ

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۰ [3] ایضاً [4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۶۲

میں علی کا نام اور کنیت دونوں ایک ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ایک کو بدلو۔ اس لئے ابوالحسن چھوڑ کر ابو محمد کنیت اختیار کی[1]۔

فضل وکمال: علمی اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہ رکھتے تھے۔ درحقیقت ان کے عمل نے ان کے علم کو دبا دیا تھا۔ پھر بھی ابن عباس کے فرزند تھے۔ اس لئے علم کی دولت سے تہی دامن نہ تھے۔ احادیث نبوی کا ایک حصہ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ ابن سعد ان کو قلیل الحدیث تابعین لکھتے ہیں[2]۔

حدیث میں انہوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت عبداللہ بن عباسؓ ابوسعید خدریؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن جبیرؓ اور عبدالملک سے استفادہ کیا تھا اور ان کے صاحبزادے محمد، عیسیٰ، عبدالصمد، سلیمان، داؤد اور منہال بن عمرو سعد ابراہیم، امام زہری، حبیب بن ابی ثابت، آبان بن صالح، عبداللہ بن طاؤس اور منصور بن معتمر وغیرہ ان کے خوشہ چینوں میں تھے[3]۔

زہد وعبادت: ان کا میدانِ عمل حجرہ عبادت تھا۔ اپنے عہد کے بڑے عابد ومرتاض بزرگ تھے۔ کثرت عبادت کی وجہ سے سجاد لقب پڑ گیا تھا۔ شبانہ یوم میں ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے۔ عبادت کا یہ ذوق وانہماک آخر لمحہ حیات تک قائم رہا۔ زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ موت کے وقت تک ان کی عبادت وریاضت میں فرق نہ آیا[4]۔

کبھی کبھی معمولی واقعات زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ علی کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ابتداء میں وہ کوئی عابد وزاہد نہ تھے۔ ابان بن عثمان کے لڑکے عبدالرحمٰن کی عبادت وریاضت کو دیکھ کر ان کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے کہا میں ان سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کا قریب عزیز ہوں۔ اس لئے مجھے ان سے زیادہ عبادت کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے ہمہ تن عبادت کرنے لگ گئے[5]۔

قریش میں عظمت وعزت:

ان کے مذہبی کمالات کی وجہ سے قریش میں ان کی بڑی عظمت تھی۔ جب وہ مکہ جاتے تو ان کے احترام میں سارا خاندانِ قریش ان پر ٹوٹ پڑتا تھا[6]۔

ولید سے اختلاف:

انہوں نے عبدالملک کی مطلقہ لبابہ سے شادی کرلی تھی۔ اس لئے ولید ان کے سخت خلاف ہوگیا تھا۔ اس کی سزا میں اس نے ان کو کوڑے لگوا کر بلقاء جلاوطن کر دیا تھا[7]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ۲۴۲ ۲؎ ایضاً۔ ص ۲۳۰ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۳۵۷ ۴؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۲۹
۵؎ تہذیب الاسماء۔ جلد ۱، ق ۱۔ ص ۲۶۵ ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۳۵۸ ۷؎ شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ۱۳۹

ہشام سے تعلقات : لیکن ہشام کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے تھے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ان سے ملنے گئے تو ہشام نے اپنے ساتھ تخت شاہی پر بٹھایا اور تیس ہزار اشرفیاں نذر کیں[۱]۔

وفات : ابن سعد کی روایت کے مطابق ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ لیکن بعض روایات ۱۱۴ھ کی بھی ملتی ہیں۔

حلیہ : نہایت حسین وجمیل تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ روئے زمین پر ایسا حسین وجمیل قریشی نہ تھا۔ قد نہایت بلند وبالا تھا۔

اولاد : علی کی بہت سی اولادیں تھیں ۱۔ داؤد ۲۔ عیسیٰ ۳۔ محمد ۴۔ احمد ۵۔ بشر ۶۔ مبشر ۷۔ اسمٰعیل ۸۔ عبدالصمد ۹۔ عبداللہ الاکبر ۱۰۔ عبداللہ الاصغر ۱۱۔ عبید اللہ ۱۲۔ عبدالملک ۱۳۔ عثمان ۱۴۔ سلیمان ۱۵۔ صالح ۱۶۔ عبدالرحمٰن ۱۷۔ عبداللہ ۱۸۔ یحیٰی ۱۹۔ اسحاق ۲۰۔ فاطمہ ۲۱۔ اُم عیسیٰ کبریٰ ۲۲۔ اُم عیسیٰ صغریٰ۔ ۲۳۔ لبابہ ۲۴۔ بریہہ کبریٰ ۲۵۔ بریہہ صغریٰ ۲۶۔ میمونہ ۲۷۔ اُم علی ۲۸۔ عالیہ اور ۲۹۔ اُم حبیب۔

اس کثرت کے ساتھ علی کی اولاد پھلی پھولی بھی بہت۔ عباسی خلفاء انہی کی نسل سے تھے[۳]۔

(۵۶) عمرؒ بن عبدالعزیزؒ

نام ونسب : عمر نام ہے۔ ابو حفص کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم بن العاص بن اُمیہ بن عبد شمس اُموی۔ ماں کا نام اُم عاصم تھا۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند عاصم کی صاحبزادی تھیں۔

اس طرح عمر بن عبدالعزیز کی رگوں میں حضرت عمر فاروقؓ کا خون بھی شامل ہوگیا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مروان جیسے بدنام شخص کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز جیسا مجدد ملت پیدا ہوا، جو صدق میں ابوبکر صدیقؓ، عدل میں عمر فاروقؓ، حیاء میں عثمان غنیؓ اور زہد میں علی مرتضیٰؓ کا مثیل تھا جس نے اپنے مجددانہ کارناموں سے ملتِ اسلامیہ کی رُوح کو جو اُمویوں نے مُردہ کردی تھی، دوبارہ زندہ کردیا۔

۱۔ شذرات الذہب۔ جلد ۱۔ ص ۱۴۸　　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۱　　۳۔ ایضاً۔ ص ۲۳۰

عمر کے والد عبدالعزیز مروان کے چھوٹے لڑکے تھے۔ مروان نے عبدالملک کے بعد انہیں ولی عہد نامزد کیا تھا۔ لیکن وہ عبدالملک کی زندگی ہی میں وفات پا گئے [۱]۔

عبدالعزیز اپنے خاندانی اوصاف و کمالات کے پورے حاصل تھے، اور اپنے والد کی مہمات میں ان کے دستِ راست رہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کی وفات کے بعد مروان نے جب مصر پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کی تو عبدالعزیز کو ایلہ پر متعین کیا [۲]۔

مصر پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد مروان دو مہینہ یہاں مقیم رہا۔ دو مہینہ بعد عبدالعزیز کو یہاں کا گورنر بنا کر شام واپس ہوا [۳]۔

مروان کے بعد عبدالملک نے بھی عبدالعزیز کو مصر کی حکومت پر برقرار رکھا اور انہوں نے یہاں کامل اکیس سال حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ میں انتقال کیا۔ تاریخ اسلام میں اتنی طویل مدت کم کسی والی کو نصیب ہوئی ہوگی۔

عبدالعزیز نے مصر اور حلوان میں اپنی حکومت کی بہت سی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک زرنگار محل تعمیر کرایا، حلوان میں متعدد محلات اور مسجدیں بنوائیں۔ مصر کی جامع مسجد منہدم کرا کے اس کو ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ خلیج مصر پر پل بنوائے، انگور اور خرمے کے باغات لگوائے [۴]۔

علماء اور ارباب کمال کا بڑا قدردان تھا۔ قاضی عبدالرحمٰن بن حجیرہ خولانی کا ایک ہزار اشرفی سالانہ وظیفہ مقرر کیا [۵]۔ شعراء کے ساتھ اتنی داد و دہش کرتا تھا کہ بعض شعراء نے اس کے بعد شاعری چھوڑ دی۔ کثیر سے کسی نے پوچھا، اب شعر کیوں نہیں کہتے جواب دیا، عبدالعزیز کے بعد صلہ کی توقع کس سے کی جائے [۶]۔

پیدائش: اس نامور شخص کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے سنہ پیدائش کے بارہ میں بیانات مختلف ہیں۔ بروایت صحیح یزید کے عہد میں مدینہ میں پیدا ہوئے [۷]۔

تعلیم و تربیت:

عمر بن عبدالعزیز کا بچپن والد کے ساتھ مصر میں گذرا [۸]۔ اور غالباً ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ جب ہوش سنبھالا تو عبدالعزیز نے ان کو علمی تعلیم کے لئے مدینہ جو علم و علماء کا مرکز تھا، بھیج دیا۔ یہاں محدث صالح بن کیسان کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

۱؎ کتاب الولاۃ الکندی۔ ص ۵۳۔ ۵۸ ۲؎ ایضاً۔ ص ۴۲ ۳؎ ایضاً ص ۴۷ ۴؎ کتاب الولاۃ کندی۔ ص ۵۵

حسن المحاضرہ سیوطی۔ جلد ۲ ص ۳۴ ۵؎ ایضاً [illegible] ۶؎ [illegible] ۷؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱ ص ۱۰۵ ۸؎ ایضاً

صالح بن کیسان اس اہتمام کے ساتھ ان کی مذہبی اور اخلاقی نگرانی کرتے تھے کہ ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے نماز میں دیر کردی۔ صالح نے باز پرس کی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب دیا کہ بال سنوارنے میں دیر ہوگئی۔ صالح نے کہا، بالوں کی آرائش میں اتنا شغف ہوگیا ہے کہ اس کو نماز پر ترجیح دی جاتی ہے، اور عبدالعزیز کو یہ واقعہ لکھ بھیجا۔ انہوں نے فوراً ایک آدمی روانہ کیا، جس نے پہلے عمر کے بال مونڈھے۔ اس کے بعد کسی سے بات چیت کی[1]۔

اس اہتمام سے ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انہیں خود تحصیل علم کا ذوق تھا۔ ان کا بیان ہے کہ میں مدینہ کے عام لڑکوں کی طرح ایک لڑکا تھا۔ پھر عربی اور شعر کا شوق پیدا ہوا[2]۔ چنانچہ انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے تحصیل علم کی۔

ان کی تعلیم کا یہ دور ابتدائی تھا۔ وہ دور جس نے ان کو امام وقت بنایا۔ مدینہ کی گورنری کا عہد تھا، جس میں اکابر علماء سے ان کی صحبتیں اور علمی بحث و مباحثے رہتے تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ جب مدینہ سے نکلا ہوں، اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہ تھا[3]۔ ان کے علمی کمالات کے حالات آخر میں آئیں گے۔

شادی: ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا عبدالملک نے اپنی لڑکی فاطمہ کے ساتھ ان کی شادی کردی[4]۔

خناصرہ کی حکومت:

عمر بن عبدالعزیز درحقیقت مسند درس کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ لیکن شاہی خاندان کی رکنیت نے ان کو ایوانِ حکومت میں پہنچا دیا۔ چنانچہ سب سے اوّل وہ خناصرہ کے والی مقرر ہوئے۔

مدینہ کی گورنری:

امیر عبدالملک کے بعد ولید نے ان کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ انہیں اس کے قبول کرنے میں تامل ہوا۔ ولید نے حاجب سے پوچھا، عمر کیوں نہیں جاتے؟ اس نے کہا وہ کچھ شرائط کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ ولید نے بلا کر پوچھا۔ انہوں نے کہا، مجھے پہلے والیوں کی طرح ظلم پر مجبور نہ کیا جائے۔ ولید نے منظور کرلیا، اور یہ کہ تم حق پر عمل کرنا، خواہ ایک درہم بھی خزانے میں داخل نہ ہو[5]۔

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی۔ ص ۹ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۰۶
[4] تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۳۰ [5] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ۳۲۱۔ ۳۲۳

اس شرط کے ساتھ وہ مدینہ روانہ ہوئے۔ اس وقت کے عمر بن عبدالعزیز درویش ابن عبد العزیز نہ تھے، بلکہ شاہی خاندان کے رکن اور شان وشکوہ والے عمر بن عبدالعزیز تھے۔ چنانچہ تیس اونٹوں پر ان کا ذاتی ساز وسامان بار تھا[1]۔

علمائے مدینہ سے مشورہ :

لیکن فطرت سلیم تھی۔ اس لئے مدینہ پہنچنے کے بعد یہاں کے دس بڑے فضلاء کو بلا کر ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی کہ "میں نے آپ کو ایک ایسے کام کے لئے بلایا ہے، جس میں آپ کو ثواب ملے گا اور آپ حامی حق قرار پائیں گے۔ میں آپ لوگوں کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے جب آپ لوگ کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں یا آپ کو میرے کسی عامل کے ظلم کی اطلاع ہو تو آپ خدا کی قسم مجھ کو ضرور اس کی خبر کیجئے"۔ یہ تقریر سننے کے بعد فقہا ان کو دعائے خیر دیتے ہوئے واپس گئے[2]۔

تعمیر مسجد نبوی : مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیز نے یہاں بہت سی اصلاحیں اور مفید کام کئے۔ ان میں ان کا ناقابل فراموش کارنامہ مسجد نبوی کی تعمیر اور اس کی تزئین وآرائش ہے۔

ولید کے پیشتر خلفاء نے وقتاً فوقتاً مسجد نبوی میں ترمیمیں کرائی تھیں، لیکن ولید نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو نہایت عظیم الشان پیمانہ پر تعمیر کرانے کا ارادہ کیا اور ۸۸ھ میں عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ مسجد نئے سرے سے تعمیر کی جائے۔ اس سے متصل ازواج مطہرات کے حجرے اور دوسرے جو مکانات ہیں ان کا معاوضہ دے کر ان کو مسجد میں شامل کر لیا جائے جو لوگ قیمت لینے سے انکار کریں، ان کے مکانات زبردستی گرائے جائیں اور ان کی قیمت فقیروں کو خیرات کر دی جائے[3]۔

قیصر روم کو خط لکھ کر بہت سے رومی کاریگر، مزدور، مینا کاری اور پچہ کاری کا سامان کئی ہزار مثقال سونا منگایا گیا[4]۔ اور مختلف مقامات سے مختلف قسم کے تعمیری سامان جمع کئے اور فقہائے مدینہ کی موجودگی میں مسجد کی پرانی عمارت گرا کر ان بزرگوں کے متبرک ہاتھوں سے عمارت کی بنیاد ڈالی[5]۔

۱۔ یعقوبی۔ جلد ۲۔ ص ۳۳۹　　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۴۶　　۳۔ خلاصۃ الوفاء۔ ص ۱۳۷
۴۔ ایضاً۔ ص ۱۳۹　　۵۔ ایضاً

عمر بن عبدالعزیز کو اس عمارت سے ذاتی دلچسپی تھی۔ اس لئے بڑے انہماک اور حسنِ مذاق سے اس کو تعمیر کرایا۔ ساری عمارت نفیس پتھروں کی تھی۔ دیواریں اور چھتیں منقش مطلا اور مینا کار تھیں۔ جھاڑ کے ایک نقش پر کاریگروں کو ۳۰ درہم انعام دیئے تھے[1]۔

اس اہتمام سے تین سال میں عمارت بن کر تیار ہوئی۔ ۹۱ھ میں ولید نے مدینہ جا کر اس کا معائنہ کیا اور عمر بن عبدالعزیز کی کارگذاری پر خوشنودی ظاہر کی۔

اطرافِ مدینہ کی مساجد کی تعمیر :

مسجد نبوی کے علاوہ اپنے عہد گورنری میں اطراف مدینہ میں بہت سی مسجدیں بنوائیں۔ آنحضرت ﷺ نے اطراف مدینہ میں جہاں جہاں نمازیں پڑھیں تھیں، مسلمانوں نے یادگار کے طور پر وہاں معمولی مسجدیں بنالی تھیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس قسم کی تمام مسجدوں کو منقش پتھروں سے تعمیر کرایا[2]۔

کنوؤں اور راستوں کی تعمیر :

رفاہ عام کے سلسلہ میں ولید کے حکم سے مدینہ میں بہت سے کنوئیں کھدوائے، اور دشوار گزار پہاڑی راستے درست کرائے۔

معزولی : اگر چہ عمر بن عبدالعزیز نے تقرری کے وقت یہ شرط منظور کرالی تھی کہ وہ گذشتہ والیوں کی طرح ظلم نہ کریں گے۔ لیکن بنی اُمیہ کا نظام کچھ ایسا تھا کہ یہ شرط قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے ایک روایت یہ ہے کہ حجاج کی شکایت پر وہ معزول کر دیئے گئے[3]۔ دوسرا بیان ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے خبیب کو جو اُمیہ کے مخالفین میں تھے، ولید کے حکم سے مجبور ہو کر سزا دی، جس کے صدمہ سے وہ مر گئے۔ اس کی ندامت میں خود مستعفی ہو گئے[4]۔

سلیمان کے مزاج میں رسوخ :

عمر بن عبدالعزیز اپنے اوصاف اور حسن خلق کی بنا پر خاندان بھر میں محبوب تھے، خصوصاً سلیمان بن عبدالملک ان کو بہت مانتا تھا۔ انہیں اپنا وزیر و مشیر بنایا تھا اور امورِ خیر میں ان کے مشوروں پر عمل کرتا تھا[5]۔ اس لئے سلیمان کے عہد کی اصلاحات درحقیقت عمر بن عبدالعزیز ہی کے فیض کا نتیجہ تھیں۔

۱۔ خلاصۃ الوفاء۔ ص ۱۳۹　۲۔ فتح الباری۔ جلد ا۔ ص ۴۷۲　۳۔ طبری۔ ص ۱۲۵۴

۴۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز میں یہ واقعہ مفصل ہے　۵۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۳۶۶

سلیمان کی وفات اور خلافت:

۹۹ھ میں سلیمان مرض الموت میں مبتلا ہوا اور اپنے نابالغ لڑکے ایوب کو ولی عہد نامزد کیا۔ رجاء بن حیوۃ نے جو سلیمان کے ندیم خاص تھے، اس سے اختلاف کیا اور کہا، ''امیر المومنین خلیفہ ایسے صالح آدمی کو بنایئے جس سے آپ قبر میں محفوظ رہیں''۔ سلیمان نے کہا، ''یہ میرا قطعی فیصلہ نہیں ہے، میں اس پر غور کروں گا اور خدا سے استخارہ کروں گا''۔

چنانچہ دو دن غور کرنے کے بعد وصیت نامہ چاک کر ڈالا، اور رجاء بن حیوۃ سے پوچھا کہ میرے لڑکے داؤد کے بارے میں کیا رائے ہے؟ رجاء نے کہا وہ اس وقت قسطنطنیہ میں ہیں اور معلوم نہیں زندہ ہیں یا نہیں۔ سلیمان نے کہا، پھر کیا رائے دیتے ہو؟ رجاء نے کہا، اصل رائے تو آپ کی ہے۔ آپ نام لیجئے میں غور کروں گا[1]۔ سلیمان نے کہا، عمر بن عبدالعزیز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ رجاء نے کہ میرے نزدیک وہ نہایت فاضل اور برگزیدہ مسلمان ہیں۔ سلیمان نے کہا، خدا کی قسم وہ ایسے ہی ہیں۔

لیکن اگر میں عبدالملک کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر کے عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنا دوں تو ایک فتنہ بپا ہو جائے گا۔ جب تک ان کے بعد عبدالملک کی کسی اولاد کا نام نہ رکھوں گا، اس وقت تک وہ لوگ اُن کو خلافت پر قائم نہ رہنے دیں گے۔ اس لئے میں یزید کو ان کے بعد خلیفہ بنائے دیتا ہوں۔ اس سے وہ لوگ ٹھنڈے ہو جائیں گے اور راضی رہیں گے۔ رجاء نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد سلیمان نے خود اپنے قلم سے یہ وصیت نامہ لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

> ''یہ تحریر خدا کے بندے سلیمان امیر المومنین کی جانب سے عمر بن عبدالعزیز کے لئے ہے۔ میں نے اپنے بعد تم کو خلیفہ بنایا، اور تمہارے بعد یزید بن عبدالملک۔
>
> مسلمانو! ان کا کہنا سنو اور ان کی اطاعت کرو، خدا سے ڈرو، اختلاف نہ پیدا کرو کہ دوسرے تم پر حرص وطمع کی نگاہ ڈالیں''۔

اور اس پر مہر کر کے اپنے خاندان والوں کو بلا کر رجاء کو حکم دیا کہ اس وصیت نامہ کو لے جا کر خاندان والوں سے کہو کہ میں نے جس کو خلیفہ بنایا ہے، وہ لوگ اس کی بیعت کریں۔ رجاء نے اس کی

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ رجاء ہی نے عمر بن عبدالعزیز کا نام پیش کیا تھا۔

تعمیل کی۔ سب نے بالاتفاق "سمعنا واطعنا" کہا۔ پھر ان کی خواہش پر انہیں سلیمان کو دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ جب یہ لوگ اندر گئے تو سلیمان نے وصیت نامہ کی طرف جو رجاء کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں سے کہا: "اس میں میں نے جس کو خلیفہ بنایا ہے، اس کی بیعت کرو اور اس کے مطیع رہو۔ سلیمان کے کہنے پر دوبارہ سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ظن تھا کہ سلیمان نے ان کو خلافت کے لئے نامزد کیا ہے۔ وہ بارِ عظیم کو اُٹھانا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے رجاء سے جا کر کہا: "میرے اُوپر سلیمان کی جو شفقتیں اور مہربانیاں ہیں، ان سے مجھے اندیشہ ہے کہ انہوں نے خلافت کے لئے مجھے نامزد کیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو مجھے بتا دیجئے تاکہ قبل اس کے کہ میں مجبور ہو جاؤں ابھی اس سے استعفاء دے دوں"۔ لیکن رجاء نے بتانے سے انکار کر دیا۔

نامزدگی کے مرحلے سے فراغت کے بعد سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ رجاء نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ موت کی خبر مخفی رکھی اور شاہی خاندان کے ارکان کو جمع کر کے دوبارہ ان سے بیعت لی۔ بیعت کو موکد کرنے کے بعد سلیمان کی موت کا اعلان کیا اور وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔

عمر عبدالعزیز کا نام سُن کر عبدالملک کے لڑکے ہشام نے کہا ہم کبھی ان کی بیعت نہیں کر سکتے۔ رجاء نے کہا: "اُٹھ کر خاموشی کے ساتھ بیعت کر لو، ورنہ ابھی سر قلم کر دوں گا"۔ اور عمر بن عبدالعزیز کا ہاتھ پکڑ کر منبر پر بٹھا دیا۔ انہوں نے اس بارِ عظیم کی ذمہ داری پر اور ہشام نے اپنی محرومی قسمت پر اناللہ پڑھا۔ اس کے بعد سلیمان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور عمر بن عبدالعزیز نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

خلفائے راشدین کا پہلا اسوہ :

تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی عمر بن عبدالعزیز بالکل بدل گئے اور لب ناز پروردہ عمر نے ابوذر غفاریؓ اور ابوہریرہؓ کا قالب اختیار کر لیا۔ سلیمان کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد حسب معمول عمر بن عبدالعزیز کے سامنے شاہی سواریاں پیش کی گئیں۔ انہوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا، شاہی سواریاں۔ فرمایا، میرے لئے میرا خچر کافی ہے۔ اور کل سواریاں واپس کر دیں[1]۔

ابھی سلیمان کے اہل و عیال قصرِ خلافت میں تھے۔ اس لئے اپنے خیمہ میں فروکش ہوئے۔ گھر آئے تو اس بارِ عظیم کی ذمہ داری سے چہرہ پریشان تھا۔ لونڈی نے پوچھا، آپ شاید کچھ متفکر ہیں۔

---

[1] یہ تمام واقعات ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۴۷۔ ۲۴۹ سے ماخوذ ہیں

فرمایا، اس سے بڑھ کر تشویش کی بات کیا ہوگی کہ مشرق و مغرب میں اُمتِ محمدیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو۔ اور بغیر مطالبہ اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو [1]۔

خلافت سے دستبرداری کا اعلان اور مسلمانوں کا اصرار :

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلافت کی ذمہ داریوں کے بارگراں کا پورا احساس تھا۔ اگر نامزدگی کے وقت ان کو اس کا علم ہو گیا ہوتا تو وہ اسی وقت اپنا نام واپس لے لیتے۔ لیکن اب یہ بار پڑ چکا تھا۔ تاہم انہوں نے ایک مرتبہ اس سے سبکدوش ہونے کی کوشش کی اور لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی۔

''لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لئے ہوئے بغیر، مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس لئے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے، میں خود اس کو اُتار دیتا ہوں۔ تم جس کو چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو''۔

یہ خطبہ سن کر مجمع سے شور اٹھا۔

''ہم نے آپ کو خلیفہ منتخب کیا ہے اور آپ کی خلافت پر راضی ہیں، آپ خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیجئے''۔

پہلا خطبہ : جب اس کا یقین ہو گیا کہ آپ کی خلافت سے کسی کو اختلاف نہیں ہے تو آپ نے ایک تقریر کی جس میں لوگوں کو تقویٰ، فکرِ آخرت اور ذکرِ موت کی طرف توجہ دلائی۔ آخر میں بآواز بلند فرمایا :

''لوگو! جو شخص خدا کی اطاعت کرے اس کی اطاعت فرض ہے اور جو شخص خدا کی نافرمانی کرے، اس کی اطاعت واجب نہیں۔ جب تک میں خدا کی اطاعت کروں، اس وقت تک تم میری اطاعت کرو، اور جب میں خدا کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں'' [2]۔

طبقاتِ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں :

''امابعد تمہارے نبی کے بعد دوسرا نبی اور اس پر جو کتاب نازل ہوئی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نہیں ہے۔ خدا نے جو چیز حلال کر دی وہ قیامت تک کے لئے ہے اور جو حرام کر دی، وہ قیامت تک کے لئے حرام رہے گی۔ میں (اپنی جانب سے) کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۴۵ [2] ایضاً۔ ۵۳۔ ۵۴

بلکہ صرف (احکامِ الٰہی کو) نافذ کرنے والا ہوں۔ میں خود کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں۔ صرف پیرو ہوں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تمہاری جماعت کا بہتر آدمی بھی نہیں ہوں۔ بلکہ ایک معمولی فرد ہوں۔ البتہ خدا نے مجھ کو تم سے زیادہ گراں بار کر دیا ہے۔[1]

عبدالعزیز بن عبدالملک کی بیعت:

یہاں دمشق میں یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ لیکن عبدالعزیز بن عبدالملک کو جو کہیں باہر تھا۔ ان واقعات کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے سلیمان کی موت کی خبر سن کر اس نے اپنے ہمراہیوں سے اپنی بیعت لے لی اور دمشق کے ارادہ سے بڑھا۔ راستہ میں اسے سلیمان کی وصیت اور عمر بن عبدالعزیز کی بیعت کا حال معلوم ہوا۔

یہ سن کر وہ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ ان کو اس کے بیعت لینے کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس سے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنی بیعت لے کر دمشق میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ عبدالعزیز نے کہا، مجھے اس کا علم نہ تھا کہ سلیمان نے آپ کو خلیفہ نامزد کر دیا ہے۔ اس لئے مجھے خوف تھا کہ لوگ خزانہ نہ لوٹ لیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا، اگر لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور تم بارِ خلافت کو سنبھال لیتے تو میں تم سے جھگڑا نہ کرتا اور اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیز نے کہا آپ کے ہوتے ہوئے میں دوسرے کا خلیفہ ہونا پسند ہی نہیں کرتا اور آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔[2]

خلافتِ راشدہ کا احیاء

ان مراحل سے فراغت کے بعد امورِ خلافت کی طرف متوجہ ہوئے۔ خلافت کے باب میں عمر بن عبدالعزیز کا نقطۂ نظر گذشتہ خلفاء سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے پیشِ نظر خلافت میں عظیم الشان انقلاب برپا کرنا تھا۔ وہ سلطنت کی ظاہری ترقیوں یعنی فتوحات اور عمارتوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے، اُموی حکومت کو "خلافتِ راشدہ" میں بدل دینا چاہتے تھے۔ یہ اقدام ایسا اہم اور خطرناک تھا، جس میں ہر طرف مخالفتوں کی طوفان کا مقابلہ تھا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر نہایت جرأت سے انقلاب شروع کر دیا۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۵۰۔ ۲۵۱ [2] ایضاً

غصب کردہ مال وجائداد کی واپسی :

اسی سلسلہ میں سب سے اہم اور نازک کام رعایا کی املاک کی واپسی تھی، جس کو شاہی خاندان نے اپنی جاگیر بنالیا تھا۔ اس میں سارے خاندان کی مخالفت کا مقابلہ کرنا تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے یہی کارِ خیر کیا اور سب سے اول اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کیا۔ جس وقت آپ نے اس کا ارادہ ظاہر فرمایا، اس وقت بعض ہوا خواہوں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ اگر آپ جاگیریں واپس کردیں گے تو اپنی اولاد کے لئے کیا انتظام کریں گے؟ فرمایا، ان کو خدا کے سپرد کرتا ہوں [۱]۔

اس عزم راسخ کے بعد خاندان والوں کو جمع کرکے فرمایا :

"بنی مروان تم کو شرف اور دولت کا بڑا حصہ ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُمت مسلمہ کا نصف یا دو تہائی تمہارے قبضہ میں ہے"۔

یہ لوگ اشارہ سمجھ گئے اور جواب میں کہا :

"خدا کی قسم جب تک ہمارے سرتن سے جدا نہ ہوں گے، اس وقت تک یہ نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم نہ ہم اپنے آباؤ اجداد کو کافر بناسکتے ہیں (عمر بن عبدالعزیز اپنے اسلاف کے افعال کو حرام کہتے تھے) اور نہ اپنی اولاد کو مفلس بنائیں گے"۔

عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا :

"خدا کی قسم اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تم لوگوں کو ذلیل اور رسوا کرڈالوں گا۔ تم لوگ میرے پاس سے چلے جاؤ" [۲]۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مسجد میں جمع کرکے تقریر کی :

"ان لوگوں (بنی اُمیہ) نے ہم کو عطایا اور جاگیریں دیں۔ خدا کی قسم نہ انہیں ان کو دینے کا حق تھا اور نہ ہمیں لینے کا۔ اب میں ان سب میں ان کے اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں اور اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اسنادِ شاہی کا خریطہ منگایا، مزاحم سب کو پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے تھے اور عمر بن عبدالعزیز ان کو لے لے کر قینچی سے کاٹتے جاتے تھے۔ صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہا [۳]۔

---

[۱] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی۔ ص ۱۰۹ [۲] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی۔ ص ۱۱۵ [۳] ایضاً۔ ص ۲۰۸

اس طرح اپنی اور اپنے پورے خاندان کی کل جاگیریں واپس کردیں اور اپنے ایک نگینہ تک باقی نہ رہنے دیا[1]۔ ان کی بیوی فاطمہ کو ان کے باپ عبدالملک نے ایک قیمتی پتھر دیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنی بیوی سے کہا، اس کو بیت المال میں داخل کردیا جائے[2]۔

سب سے اہم معاملہ فدک کا تھا، جو مدتوں سے خلفاء اور اہل بیت کے درمیان متنازعہ فیہ چلا آتا تھا اور اب عمر بن عبدالعزیز کے قبضہ میں تھا اور اسی پر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی معاش کا دارومدار تھا۔ اس کے متعلق انہوں نے رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے طرزِ عمل کی تحقیقات کرکے آلِ مروان سے کہا، "فدک رسول اللہ ﷺ کا خاصہ تھا۔ جس کی آمدنی آپ ﷺ اپنی اور بنی ہاشم کی ضروریات میں صرف فرماتے تھے۔ خود فاطمہ الزہرہؓ نے آپ ﷺ سے اس کو مانگا تھا، لیکن آپ ﷺ نے دینے سے انکار فرمایا"۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ تک اسی پر عمل ہوتا رہا۔ آخر میں مروان نے اس کو اپنی جاگیر بنالیا اور اب و ورثۃً میرے قبضہ میں ہے، لیکن جو چیز رسول اللہ نے فاطمۃ الزہرہؓ کو نہیں دی، اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔" اس لئے تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو صورت رسول اللہ کے زمانہ میں تھی اس کو اسی حالت پر لوٹاتا ہوں"[3]۔

اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں کو واپس کرنے کے بعد عام غصب شدہ مال کی طرف متوجہ ہوئے اور امیر معاویہ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک ظالمانہ طریقوں سے جس قدر غصب کردہ مال و جائداد تھی۔ سب ایک ایک کرکے واپس کرادی اور معاویہ اور یزید کے وارثوں سے لے کر ان کے اصل مالکوں کے حوالہ کی[4]۔

شام کے علاوہ سارے ممالک محروسہ کے عمال کے پاس غصب شدہ مال کی واپسی کے متعلق تاکیدی احکام بھیجے۔ عراق میں اس کثرت سے مال واپس کیا گیا کہ صوبہ کی حکومت کا خزانہ خالی ہوگیا اور عمر بن عبدالعزیز کو وہاں کے اخراجات کے لئے دمشق سے روپیہ بھیجنا پڑا[5]۔

مال کی واپسی کے لئے ہر طرح کی آسانیوں کا لحاظ رکھا گیا۔ ملکیت کے ثبوت کے لئے کوئی بڑی شہادت کی ضرورت نہ تھی۔ معمولی شہادت پر مل جاتا تھا[6]۔ جو لوگ مرچکے تھے، ان کے ورثاء کو واپس کیا گیا[7]۔ اور یہ سلسلہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات تک برابر قائم رہا[8]۔

---

۱ ابن سعد جلد ۵۔ ص ۲۵۲ ۲ تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۳۲ ۳ ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی صفایا رسول اللہ ﷺ و طبقات ابن سعد تذکرہ عمر بن عبدالعزیز ۴ ابن سعد، جلد ۵۔ ص ۲۵۲ ۵ ایضاً ۶ ایضاً

۷ تہذیب الاسماء، جلد ۱۔ ص ۲۰ ۸ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ۱۵۱

اہلِ خاندان کی برہمی :

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے نہ صرف علاقے اور جاگیریں چھین کر بنی اُمیہ کو تہی دست کر دیا، بلکہ ان کے سارے امتیازات مٹا کران کی نخوت اور غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اس لئے خاندان میں ان کے خلاف سخت برہمی پھیل گئی اور انہوں نے ان کو ہر طریقہ سے اس عادلانہ طریقے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

عمرو بن ولید نے نہایت غضب آلود خط لکھا : کہ

''تم نے گذشتہ خلفاء پر عیب لگایا ہے۔ اُن کی اور ان کی اولاد کی دشمنی میں ان کے خلاف روش اختیار کی، تم نے قریش کی دولت اور ان کی میراث ظلم وجور سے بیت المال میں داخل کر کے قطع رحم کیا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز خدا سے ڈرو اور اس کا خیال کرو کہ تم نے زیادتی کی ہے۔ تم ابھی منبر پر اچھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ اپنے خاندان والوں کو جور وظلم کا نشانہ بنا دیا۔ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو بہت سی خصوصیت کے ساتھ مختص فرمایا، تم اس حکومت میں جس کو تم اپنے لئے آزمائش اور مصیبت کہتے ہو، خدا سے بہت دور ہو گئے ہو۔ اس لئے اپنی خواہشوں کو روکو اور اس کا یقین رکھو کہ تم ایک جبار کی نگاہ کے سامنے اور اس کے قبضہ میں ہو اور اس حالت میں چھوڑے نہیں جا سکتے''۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بھی اس کا نہایت سخت جواب دیا[1]۔

آلِ مروان نے ہشام کو اپنا وکیل بنا کران کے پاس بھیجا، اس نے ان کی جانب سے کہا : کہ ''آلِ مروان کہتے ہیں کہ ان امور میں جن کا تعلق آپ کی ذات سے ہے، جو چاہے کیجئے۔ لیکن گذشتہ خلفاء جو کچھ کر گئے ہیں، اس کو اسی حالت پر رہنے دیجئے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس کے جواب میں پوچھا، اگر ایک ہی معاملہ کے متعلق تمہارے پاس دو دستاویزیں ہوں، ایک امیر معاویہؓ کی دوسری عبدالملک کی، تو تم کسے قبول کرو گے؟ ہشام نے کہا جو قدیم ہوگی۔

حضرت عمر بن عبداللہ العزیزؒ نے کہا تو میں نے کتاب اللہ کو قدیم دستاویز پایا، اس لئے میں ہر اس چیز میں جو میرے اختیار میں ہے، خواہ وہ میرے زمانہ کی ہو یا گزشتہ زمانے سے متعلق ہو اسی کے مطابق عمل کروں گا۔ یہ سن کر سعید بن خالد نے کہا، امیر المومنین جو چیز آپ کی ولایت میں ہے اس میں آپ حق وانصاف کے ساتھ اپنی رائے سے فیصلہ کیجئے، لیکن گزشتہ خلفاء اور ان کی بھلائیوں اور برائیوں کو

---

[1] یہ خط اور اس کا جواب دونوں سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز ص ۱۱۲ میں ہے۔

ان کے حال پر رہنے دیجئے، اس قدر آپ کے لئے کافی ہے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے کہا میں خدا کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک شخص چھوٹے بڑے لڑکوں کو چھوڑ کر مر جائے، اس کے بعد بڑے لڑکے اپنی قوت سے چھوٹے لڑکوں کے مال پر قبضہ کر کے کھا جائیں اور وہ تمہارے پاس مدد کے لئے آئیں تو تم کیا کرو گے۔ سعید نے کہا ان کے حقوق واپس دلاؤں گا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے کہا یہی تو میں بھی کر رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے خلفاء نے ان لوگوں کو اپنی قوت سے دبایا۔ ان کے ماتحتوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ اب جب میں خلیفہ ہوا، تو یہ کمزور لوگ میرے پاس آئے، اس لئے میرے پاس اس کے سوا چارہ کار کیا ہے کہ طاقتور سے کمزور کا اور اعلیٰ سے ادنیٰ کا حق دلاؤں[1]۔

ایک مرتبہ تمام آلِ مروان نے آپ کے دروازہ پر جمع ہو کر آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ "یا ہم لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دلواؤ یا اپنے باپ کو جا کر پیام دو کہ ان سے پہلے جو خلفاء تھے وہ ہم کو لیتے دیتے تھے، ہمارے مراتب کا لحاظ رکھتے تھے اور تمہارے باپ نے ہم کو بالکل محروم کر دیا۔ عبدالملک نے جا کر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کو یہ پیام سنایا۔ انہوں نے کہا جا کر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو عذاب قیامت سے ڈرتا ہوں[2]۔

خود آپ کے گھر والوں کو آپ سے شکایت ہو گئی۔

اوزاعی کا بیان ہے کہ جب عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے گھر والوں کے گزارے بند کر دیئے تو عنبسہ بن سعد نے آپ سے شکایت کی کہ امیر المومنین آپ پر ہم لوگوں کا حق قرابت ہے۔ آپ نے جواب دیا، میرے ذاتی مال میں تمہارے لئے گنجائش نہیں ہے اور اس مال (بیت المال) میں تمہارا اس سے زیادہ حق نہیں ہے، جتنا برک غماد کے آخری حدود کے رہنے والے کا بخدا اگر ساری دنیا تم لوگوں کی رائے کی ہو جائے تو ان پر خدا کا عذاب نازل ہو[3]۔

اس قبیل کے اور بہت سے واقعات ہیں، مگر ان میں سے کوئی شے عمرؒ بن عبدالعزیز کو قیامِ عدل سے نہ روک سکی۔

ظالم عہدہ داروں کا تدارک :

مال مغصوبہ کی واپسی کے بعد دوسری اہم اصلاح عمّال کے ظلم و جور کا تدارک تھا، جس کے وہ خوگر ہو رہے تھے۔ اگرچہ آپ کے مشورہ سے سلیمان ہی کے زمانہ میں بڑی حد تک اس کا تدارک ہو چکا تھا۔ پھر بھی کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ اُموی حکومت میں سب سے زیادہ جفا کار حجاج کے

---

[1] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۱۸۔۱۱۹　[2] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۱۷　[3] ایضاً۔ ص ۱۱۴۔۱۱۵

خاندان والے اور اس کے ماتحت عہدہ دار تھے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حجاج کے پورے خاندان کو یمن کی طرف جلاوطن کر دیا اور وہاں کے عامل کو لکھا کہ میں تمہارے پاس آل عقیل کو بھیج رہا ہوں جو عرب میں بدترین خاندان ہے۔ اس کو اپنی حکومت میں ادھر اُدھر منتشر کر دو [1]۔ جو لوگ حجاج کے ہم قبیلہ یا اس کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے ان کو ہر قسم کے ملکی حقوق سے محروم کر دیا۔

مظالم کا انسداد : اُموی دور میں بدگمانی اور سوئے ظن پر دار و گیر اور سزا عام تھی، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اسے بالکل بند کر دیا۔ موصل میں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں بکثرت ہوتی تھیں۔ یہاں کے والی یحییٰ غسانی نے لکھا ہے، جب تک لوگوں کو شبہہ پر پکڑا نہ جائیگا اور سزا نہ دی جائے گی اس وقت تک یہ وارداتیں بند نہ ہوں گی۔ آپ نے لکھا کہ صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ کرو، اگر حق کی اصلاح نہیں کر سکتا تو خدا ان کی اصلاح نہ کرے [2]۔

اسی طرح سے جراح بن عبداللہ بن حکمی والی خراسان نے لکھا کہ اہل خراسان کی روش نہایت خراب ہے۔ ان کو کوڑے اور تلوار کے علاوہ اور کوئی چیز درست نہیں کر سکتی۔ اگر امیر المومنین مناسب سمجھیں تو اس کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ نے جواب میں لکھا تھا۔ تمہارا خط پہنچا تمہارا یہ لکھنا کہ اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے سوا کوئی شے درست نہیں کر سکتی بالکل غلط ہے۔ ان کو عدل وحق درست کر سکتا ہے اسی کو عام کرو [3]۔

عمال کو رعایا کا مال کم قیمت پر خریدنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ عدی بن ارطاط والی فارس کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے عمال پھلوں کا تخمینہ کر کے عام نرخ سے کم قیمت لگا کر اس کو خریدتے ہیں اور کردوں کے قبیلے مسافروں سے عشر وصول کرتے ہیں، اگر یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارے ایما سے ہوتا ہے یا اسے تم پسند کرتے ہو تو میں تم کو مہلت نہ دوں گا۔ میں بشر بن صفوان، عبداللہ بن عجلان اور خالد بن سالم کو اس کی تحقیقات کے لئے بھیجتا ہوں۔ اگر وہ اس خبر کو صحیح پائیں گے تو پھلوں کو ان کے مالکوں کو واپس کر دیں گے۔ اس کے علاوہ جن جن باتوں کی مجھے اطلاع ملی ہے، سب کی تحقیقات کریں گے تم ان لوگوں سے کوئی مزاحمت نہ کرنا [4]۔

وقتاً فوقتاً عمال کو قیام عدل اور انسداد مظالم کے احکام بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک گشتی فرمان تمام امراء کے نام بھیجا کہ "لوگ برے عمال کی وجہ سے جنہوں نے برے دستور قائم کئے اور کبھی

۱۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۱۴-۱۱۵ ۲۔ تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۸ ۳۔ ایضاً ص ۲۴۳
۴۔ ابن سعد، جلد ۵، ص ۲۰۹، ۲۶۹

انصاف، نرمی اور احسان کا ارادہ نہیں کیا۔ احکام الٰہی میں سخت مصیبت سختی اور ظلم و جور میں مبتلا ہو گئے [۱]۔

ایک والی عبدالحمید کو پہلا خط لکھا کہ "وسوسہ شیطانی اور حکومت کے بعد انسان کی بقا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب تم کو میرا خط ملے، اس وقت ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو، جس قدر ناجائز ٹیکس تھے سب موقوف کر دیئے [۲]۔ ان کے علاوہ اور تمام ظالمانہ طریقوں کو روکا۔

بیت المال کی آمدنی کی اصلاح :

اُموی دور میں بیت المال کے مداخل اور مخارج میں بڑی بے عنوانیاں تھیں۔ جائز اور ناجائز آمدنی میں کوئی تفریق نہ تھی۔ ہر طرح کی ناجائز آمدنیوں سے خزانہ بھرا جاتا تھا۔ پھر اسی بے عنوانی سے اسے خرچ کیا جاتا تھا۔ بیت المال جو ایک قومی امانت ہے، ذاتی خزانہ بن گیا تھا اور اس کا بڑا حصہ خلفاء کے ذاتی مصارف اور ان کے تعیش میں صرف ہوتا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے دونوں بے عنوانیوں کا تدارک کیا [۳]۔

شاہی خاندان کے تمام مخصوص وظیفے بند کر دیئے۔ خلافت کے شکوہ و تجمل کے مصارف بالکل ختم کر دیئے۔ ان کی تخت نشینی کے بعد جب شاہی اصطبل کے داروغہ نے سواریوں کے اخراجات طلب کئے تو حکم دیا کہ انہیں بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ میرے لئے میرا خچر کافی ہے [۴]۔

بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لئے حجاج نومسلموں سے بھی جزیہ لیتا تھا۔ آپ نے حکم جاری کر دیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ ساقط کر دیا جائے۔ اس حکم پر اتنے آدمی مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی۔ حیان بن شریح نے شکایت لکھ بھیجی کہ اس کثرت کے ساتھ لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ مجھے قرض لے کر مسلمانوں کے وظیفے دینے پڑے۔ آپ نے ان کو نہایت سخت خط لکھا کہ جزیہ بہر حال موقوف کرو، رسول اللہ ﷺ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل خراج بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے [۵]۔

اور اس سلسلہ میں یہ فرمانِ عام جاری کر دیا کہ اگر جزیہ ترازو میں رکھا جا چکا ہو اور اس حالت میں بھی ذمی اسلام قبول کر لے یا آغاز سال سے ایک دن پہلے جبکہ پورے سال کا جزیہ عائد ہو جاتا ہے اسلام لے آئے تو بھی جزیہ نہ لیا جائے [۶]۔

۱۔ یعقوبی۔ جلد ۲۔ ص ۳۶۲　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۷۱　۳۔ ایضاً۔ ص ۲۸۳　۴۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۳۱
۵۔ مقریزی۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۵　۶۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۶

خراج کی اصلاح کے متعلق عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو فرمان لکھا:

''زمین کا معائنہ کرو، بنجر زمین کا بار آباد زمین پر، اور آباد زمین کا بار بنجر زمین پر نہ ڈالو۔ بنجر زمین کا معائنہ کرو، اگر اس میں صلاحیت ہو تو بقدر گنجائش خراج لو اور ان کی اصلاح کرو کہ وہ آباد ہو جائیں۔ جن آباد زمینوں میں پیداوار نہیں ہوتی، ان سے خراج نہ لو اور جو زمینیں قحط زدہ ہو جائیں، ان کے مالکوں سے نہایت نرمی سے خراج وصول کرو۔ خراج میں صرف وزن سبعہ لو، جن میں سونا نہ ہو، ٹکسال اور چاندی پگھلانے والوں سے۔ نوروز اور مہرجان کے ہدیئے، عرائض نویسی اور شادی کا ٹیکس، گھروں کا ٹیکس اور نکاحانہ نہ لو۔ جو ذمی مسلمان ہو جائیں، ان پر خراج نہیں ہے[1]۔ اس طرح انہوں نے بیت المال سے ہر قسم کی ناجائز آمدنیاں بند کر دیں''۔

بیت المال کی حفاظت کا انتظام:

اس کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا۔ ایک مرتبہ یمن کے بیت المال سے ایک دینار گم ہو گیا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے یہاں کے افسر خزانہ کو لکھا کہ میں تمہاری امانت کو متہم نہیں کرتا، لیکن تمہاری لاپرواہی کو جرم قرار دیتا ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا مدعی ہوں۔ تم پر فرض ہے کہ تم شرعی قسم کھاؤ[2]۔

یزید بن مہلب بن ابی صفرہ والیٔ خراسان کو خیانت کے جرم میں معزول کر کے قید کر دیا[3]۔

ابوبکرہ بن حزم نے سلیمان کے آخری عہد میں، کاغذ، دوات اور روشنائی کے دفتری اخراجات کے اضافہ کے لئے لکھا تھا۔ ابھی اس کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا کہ عمرؒ بن عبدالعزیز خلیفہ ہو گئے۔ انہوں نے ابوبکرہ کو لکھا: ''وہ دن یاد کرو جب تم اندھیری رات میں بغیر روشنی کے کیچڑ میں اپنے گھر سے مسجد نبوی ﷺ جاتے تھے اور آج بحمداللہ تمہاری حالت اس سے کہیں بہتر ہے۔ قلم باریک کرا لو اور سطریں قریب قریب لکھا کرو، اپنی ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لو، میں مسلمانوں کے خزانہ سے ایسی رقم صرف کرنا پسند نہیں کرتا، جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے''۔ دوسرے عمال کو بھی ہدایت لکھی کہ کوئی عامل بڑے کاغذ پر جلی قلم سے نہ لکھے۔ خود آپ کے فرامین ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوتے تھے[4]۔

۱۔ کتاب الخراج۔ ص ۴۹ ۲۔ سیرۃ عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۸۵ ۳۔ یعقوبی۔ جلد ۲۔ ص ۳۱۲

بیت المال کی آمدنیوں اور مصارف کی علیحدہ علیحدہ مدیں قائم کیں۔ صدقہ کی علیحدہ، خمس کی علیحدہ، مالِ غنیمت کی علیحدہ[۱]۔ گذشتہ خلفا خمس کے مقررہ مصارف کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے خمس کو اس کے صحیح مصارف میں لگایا[۲]۔

بیت المال کے مصارف :

بیت المال کو پھر مسلمانوں کی امانت بنادیا اور اس کو ان کی ضروریات کے لئے مخصوص کردیا۔ چنانچہ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ خالص رعایا کے مفاد کے کاموں میں صرف کیا جانے لگا۔ ملک میں جتنے اپاہج تھے، سب کے نام درجِ رجسٹر تھے، ان کو وظیفہ ملتا تھا[۳]۔ جو عمال اس میں ذرا بھی غفلت یا ترمیم کرتے تھے، ان کو تنبیہ کی جاتی تھی۔ دمشق کے بیت المال سے ایک اپاہج کے وظیفہ کے تقرر کے سلسلہ میں میمون بن مہران نے کہا، ان لوگوں کے ساتھ سلوک تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو صحیح و تندرست آدمی کے برابر وظیفہ نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو اس کی اطلاع ہوئی تو نہایت غضب آلود خط لکھا[۴]۔

بہتوں کو نقد کے بجائے جنس ملتی ہے اور فی کس ساڑھے چار اردب کے حساب سے غلہ دیا جاتا تھا۔ قرضداروں[۵] کی قرض کی ادائگی کے لئے بھی ایک مد تھی[۶]۔ شیر خوار بچوں کے وظائف مقرر تھے[۷]۔ ایک عام لنگر خانہ تھا۔ جس سے فقراء و مساکین کو کھانا ملتا تھا[۸]۔

عام مستحقین میں صدقات و خیرات تقسیم ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو تقسیم مال کے لئے رقہ بھیجا، اس نے عذر کیا کہ آپ مجھے ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں میں کسی کو نہیں پہچانتا، ان میں امیر و غریب سب ہیں۔ فرمایا، جو شخص تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دو[۹]۔ اس کے علاوہ اور سینکڑوں قسم کے مفید مصارف میں صرف کرتے تھے، اس فیاضانہ داد و دہش کا بیت المال پر بہت بار پڑتا تھا۔ بعض عمال نے اس کی طرف توجہ دلائی، تو جواب میں لکھا گیا کہ جب تک ہے دیتے چلے جاؤ۔ جب خالی ہوجائے تو کوڑا کرکٹ بھردو[۱۰]۔

ذمیوں کے حقوق :

کسی حکومت کے عدل و انصاف اور ظلم و جور کا ایک بڑا معیار دوسری اقوام اور مذہب کے ساتھ اس کا سلوک اور طرزِ عمل ہے۔ اس معیار سے بھی عمرؒ بن عبدالعزیز کا دور سراپا عدل تھا۔ انہوں نے

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ۲۹۵　۲؎ ایضاً۔ ص ۲۵۷　۳؎ اصابہ۔ جلد ۵۔ ص ۸۰　۴؎ طبقات ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۱
۵؎ ایضاً۔ ص ۲۵۵　۶؎ ایضاً۔ ۲۵۷　۷؎ ایضاً۔ ۲۵۵　۸؎ ایضاً۔ ص ۲۷۹　۹؎ ایضاً۔ ص ۲۷۲　۱۰؎ ایضاً۔

جس طرح ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی اور ان کے ساتھ نرمی برتی اس کی مثال عہد فاروقی کے علاوہ اور کسی دور میں نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں کی طرح ان کی جان اور مال کی حفاظت کی، ان کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی۔ جزیہ کی وصولی میں نرمی اور آسانیاں پیدا کیں۔ اس کا اندازہ ذمیوں کے ساتھ ان کے طرز عمل اور احکام سے ہوگا جو عمال کو بھیجتے رہتے تھے۔

عدی بن ارطاط کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی کرو، ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے، اس کی کفالت کرو۔ اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو اس کی کفالت کا حکم دو۔ جس طرح تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے تو اسے آزاد کرنا پڑے گا یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی۔

ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر قرار دی۔ ایک بار حیرہ کے ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے وہاں کے عامل کو لکھا کہ قاتل کو ورثہ کے حوالہ کر دو، وہ چاہیں قتل کریں، چاہیں معاف کر دیں۔ چنانچہ قاتل حوالہ کیا گیا اور ذمیوں نے اسے قتل کر دیا[۲]۔

کوئی مسلمان ان کے مال پر دست اندازی نہیں کر سکتا تھا، جو شخص ایسا کرتا تھا اسے پوری سزا ملتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شعوذی نے ایک سرکاری کام کے لئے ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی، عمر بن عبدالعزیز نے اس کو چالیس کوڑے لگوائے[۱]۔

مال مغصوبہ کے وقت شاہی خاندان سے ذمیوں کی زمینیں بھی واپس دلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک ذمی نے دعویٰ دائر کیا کہ عباس بن ولید نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عباس سے فرمایا، تم اس کا کیا جواب دیتے ہو؟ انہوں نے کہا ولید نے مجھے جاگیر میں دے دیا ہے اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے۔ ذمی نے عمر بن عبدالعزیز سے کہا آپ سے کتاب اللہ کے موافق اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، خدا کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے اور ذمی کو زمین واپس دلا دی[۳]۔

ان کے مذہبی حقوق کو جو سابق خلفاء کے زمانے میں ختم ہو گئے تھے، از سر نو قائم کیا۔ دمشق میں ایک گرجا تھا جسے ایک مسلمان نے ان کی جاگیر [illegible] تھا۔ عیسائیوں نے عمر بن عبدالعزیز سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے واپس دلا دیا۔ ایک [illegible] بہت ذکر کیا

---

۱ زرقانی شرح موطا جلد ۲ ص ۲۳۳ ۲ [illegible] ص ۱۰۸ ۳ ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۱
۴ فتوح البلدان ص ۳۰ ۵ ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۱ ۶ [illegible] ص ۱۰۲

اس کی جاگیر میں ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے فرمایا، اگر یہ عیسائیوں کے معاہدہ میں ہے تم اس کو نہیں پا سکتے[1]۔

جزیہ کی وصولی میں آسانیاں پیدا کیں اور اس سلسلہ میں جتنی بے عنوانیاں پیدا ہوئی تھیں سب کو بند کر دیا۔ حجاج نے ابن اشعث کی حمایت کے الزام میں عراق کے ذمیوں کے جزیہ کی مقدار بڑھا دی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کو گھٹا دیا[2]۔

آپ کے زمانہ میں ذمیوں کے ساتھ اتنی نرمی برتی گئی کہ اس کا عام لوگوں کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ چنانچہ غلہ کا نرخ گراں ہو گیا۔ ایک شخص نے آپ سے اس کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا، پہلے خلفاء ذمیوں کو جزیہ کی وصولی میں ناقابل برداشت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ جس نرخ پر بھی ہو سکتا تھا، فروخت کر ڈالتے تھے، اور میں ہر شخص وہی قدر تکلیف دیتا ہوں جس قدر وہ متحمل ہو سکے، اس لئے ہر شخص جس طرح چاہتا ہے فروخت کرتا ہے[3]۔

شاہی خاندان کے ارکان اور ذمیوں میں مساوات قائم کی۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ایک عیسائی پر مقدمہ دائر کیا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے دونوں کو برابر کھڑا کیا۔ ہشام نے غرور و تمکنت میں عیسائی سے سخت کلامی کی۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کو ڈانٹا اور سزا دینے کی دھمکی دی[4]۔

محاصل میں اضافہ :

یہ عمرؒ بن عبدالعزیز کی برکت تھی کہ ناجائز آمدنیوں کے سد باب اور مصارف خیر کی کثرت کے باوجود بیت المال پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا، بلکہ بعض بعض ملکوں کے محاصل میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ عراق کی آمدنی حجاج کے ظالمانہ دور سے بھی بڑھ گئی۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ خدا حجاج پر لعنت کرے، اس کو نہ دین کا سلیقہ تھا نہ دنیا کا۔ حجاج کے زمانہ میں باوجود ظالمانہ طریقوں کے عراق سے صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم وصول ہوتے تھے۔ اس نے کاشتکاروں کو بیس لاکھ درہم زمین کی آبادی کے لئے بطور قرض دیئے تو ایک کروڑ سات لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس ویرانی کے بعد جب عراق میرے قبضہ میں آیا تو میں نے بغیر جبر کے بارہ کروڑ چالیس لاکھ درہم وصول کئے اور اگر زندہ رہا تو عمر بن الخطاب کے زمانہ سے بھی زیادہ وصول کروں گا[5]۔

---

۱ فتوح البلدان ص ۱۳۰ ۲ ایضاً ص ۱۳۰ ۳ کتاب الخراج ص ۷۱ ۴ [illegible]
۵ فتوح البلدان ذکر سواد

رعایا کی خوشحالی : مظالم کے انسداد، ناجائز ٹیکسوں کی منسوخی، ذمیوں کے ساتھ مراعات اور عام داد ودہش کی وجہ سے ملک نہایت فارغ البال اور رعایا آسودہ حال تھی۔ ملک کے طول وعرض میں افلاس کا نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ مہاجرین یزید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ تقسیم کرتے تھے۔ ایک سال کے بعد دوسرے سال وہ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دوسروں کو صدقہ دینے لگتے تھے [1]۔

عمرؒ بن عبدالعزیز نے صرف ڈھائی سال حکومت کی۔ اس مختصر مدت میں یہ حالت ہوگئی کہ لوگ ان کے عمال کے پاس فقراء میں تقسیم کرنے کے لئے صدقہ کا مال لے کر آتے تھے، لیکن کوئی صاحبِ حاجت نہ ملتا تھا اور مال واپس لے جانا پڑتا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے سب کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ کوئی حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا [2]۔

آپ کے زمانہ میں رعایا کی خوش حالی اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس کے نشہ میں کبر ونخوت میں اس کے مبتلا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عدی بن ارطاط نے آپ کو لکھا کہ اہل بصرہ اس قدر خوشحال ہوگئے ہیں کہ مجھے خوف ہے کہ وہ فخر وغرور نہ کرنے لگیں۔ آپ نے جواب دیا کہ خدا جب اہل جنت کو جنت میں داخل کرے گا کہ وہ الحمد للہ کہیں اس لئے تم بھی لوگوں کو حکم دو کہ وہ خدا کا شکر بجالائیں [3]۔

رفاہ عام کے کام ۔ آپ نے جس قدر اصلاحیں کیں، وہ سب درحقیقت رفاہ عام ہی کے کام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ مروجہ اصلاح میں بھی آپ نے بہت رفاہ عام کے کام کیے۔

سارے ممالک محروسہ میں نہایت کثرت سے سرائیں بنوائیں، خراسان کے عامل کو لکھا کہ وہاں کے تمام راستوں میں سرائیں تعمیر کرائی جائیں [4]۔ سمرقند کے والی سلیمان بن ابی السری کے پاس بھیجا کہ وہاں کے شہروں میں سرائیں تعمیر کراؤ، جو مسلمان ادھر سے گزریں ایک شبانہ یوم ان کی مہمان نوازی کرو، ان کی سواریوں کی حفاظت کرو، جو مسافر مریض ہو، اس کو دو دن اور دو رات مقیم رکھو۔ اگر کسی کے پاس گھر تک پہنچنے کا سامان نہ ہو تو وطن تک پہنچنے کا سامان کر دو [5]۔ ایک عام لنگر خانہ قائم کیا، جس میں فقراء اور مساکین کو کھانا ملتا تھا [6]۔

مذہبی خدمات : گو یہ تمام اصلاحات درحقیقت مذہب پرستی ہی کا نتیجہ تھیں۔ ایک حیثیت سے وہ سب مذہبی خدمات کے دائرہ میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی خالص مذہبی خدمات

۱۔ ابن سعد۔ جلد۔ ص ۲۵۶　۲۔ فتح الباری۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۱　۳۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۴　۴۔ ایضاً
۵۔ طبری۔ ص ۱۳۶۴　۶۔ طبری۔ ص ۲۷۹

بھی انجام دیں اور شریعتِ اسلامی میں جو اموی خلفاء کی غفلت شعاری سے بالکل مردہ ہو چکی تھیں، دوبارہ جان ڈالی۔ امویوں کے زمانہ میں کوئی شے جادہ شریعت پر نہ رہ گئی تھی۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے سب کو پھر صراطِ مستقیم پر لگایا۔ اعمال کے نام جو فرامین جاتے تھے، ان سب میں احیائے شریعت استیصالِ بدعت کی تاکید ہوتی تھی [۱]۔

عدی بن ارطاۃ کو ایک فرمان لکھا کہ "ایمان چند فرائض، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے۔ جس نے ان اجزاء کی تکمیل کرلی، اس نے ایمان کو مکمل کر دیا اور جس نے اس کی تکمیل نہیں کی اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ اگر میں زندہ رہا تو ان تمام اجزاء کو تمہارے سامنے واضح کر دوں گا تاکہ تم لوگ اس پر عمل کرو، اور اگر مر گیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی حرص بھی نہیں ہے" [۲]۔

آپ نے جس طرح ان اجزاء کا تحفظ کیا اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں جیسی جدوجہد کی اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کی تفصیلات نہایت طویل ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ مذہبی روح آپ کے عہد کی امتیازی خصوصیت بن گئی تھی۔ طبری کا بیان ہے کہ

> "ولید عمارتوں کا بانی تھا، اس لئے اس کے زمانہ میں یہی عام مذاق ہو گیا تھا اور لوگ آپس میں صرف عمارتوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ سلیمان کو عورتوں اور نکاح کا شوق تھا۔ اس لئے اس کے زمانہ میں لوگ لونڈیوں اور شادیوں کا چرچا کرتے تھے۔ لیکن جب عمرؒ بن عبدالعزیز نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو لوگوں کا موضوع بدل کر مذہب و عبادت کی تفصیلات ہو گئیں" [۳]۔

مذہبی تعلیم کی اشاعت :

احیائے شریعت کے لئے عمر بن عبدالعزیزؒ نے مذہبی تعلیم کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا۔ قاضی ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ لوگوں کو چاہئے کہ عام طور پر علم (علم شریعت) کی اشاعت کریں، تعلیم کے لئے حلقہ درس میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں۔

ایک اور عامل کو لکھا کہ لوگوں کو حکم دو کہ وہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں، کیونکہ سنت مُردہ ہو چکی ہے [۴]۔

جو علماء اس مقدس کام میں مصروف تھے، ان کو فکرِ معاش سے مطمئن کر دیا۔ حمص کے گورنر کو لکھا۔ "جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے کو فقہ کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے، بیت المال سے سو سو

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۵۲ ۲؎ بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس
۳؎ طبری۔ ص ۱۲۷۲، ۱۲۷۳ ۴؎ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز ص ۴۲

دیناران کا وظیفہ مقرر کرو، تا کہ وہ اس حالت کو قائم رکھ سکیں [1]۔ علماء کے علاوہ طلباء کے وظائف مقرر کئے [2]۔

دور افتادہ ممالک میں تعلیم کی اشاعت کے لئے علماء بھیجے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام نافع کو جو بڑے نامور عالم تھے، تعلیم حدیث کے لئے مصر بھیجا [3]۔ قاری جعثل بن عامان کو قرأت کی تعلیم دینے کے لئے مصر و مغرب بھیجا [4]۔ یزید بن ابی مالک دمشقی اور حارث بن یجمد الاشعری کو بدوؤں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا [5]۔ یہ صرف چند نام ہیں، ورنہ جن جن مقامات پر ضرورت تھی، سب جگہ علماء بھیجے۔

اشاعت اسلام : سلطنت میں توسیع کے بجائے اسلام کی توسیع و اشاعت کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس کے لئے ہر قسم کے مادی اور اخلاقی ذرائع اختیار کئے۔

امرائے فوج کو خاص طور سے ہدایت تھی کہ ''رومیوں کے کسی حلقہ اور ان کی کسی جماعت سے اس وقت تک جنگ نہ کرو، جب تک اسلام کی دعوت نہ دیدو [6]''۔

تمام عمال کو حکم دیا کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دی جائے، جو ذمی اسلام قبول کرلیں ان کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اس طریقہ سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔ تنہا جراح بن عبداللہ حکمی والی خراسان کے ہاتھوں چار ہزار ذمی مسلمان ہوئے [7]۔ اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر والی مغرب کی تبلیغ سے سارے مغرب میں اسلام پھیل گیا [8]۔ اور مختلف ملکوں میں اس کثرت سے ذمی مسلمان ہوئے کہ متعدد والیوں نے خراج کی آمدنی گھٹ جانے کی شکایت کی۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مطلق اس کی پرواہ نہ کی۔ بعضوں کو جواب دیا کہ ''رسول اللہ ﷺ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے'' [9]۔ بعض کو لکھا کہ ''میں یہ پسند کرتا ہوں کہ سارے ذمی مسلمان ہو جائیں اور ہماری تمہاری حیثیت صرف ایک کاشتکار کی رہ جائے کہ اپنے ہاتھوں سے کمائیں کھائیں'' [10]۔ بعض عمال نے تجویز پیش کی کہ ذمی جزیہ کے خوف سے مسلمان ہوتے ہیں، اس لئے ختنہ کر کے ان کا امتحان لیا جائے۔ آپ نے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہادی و رہنما تھے، ختان نہ تھے'' [11]۔

آپ کے محاسن اخلاق کی شہرت اور تبلیغ اسلام سے آپ کا شغف سن کر بعض ممالک نے خود اپنے یہاں مبلغ اسلام بھیجنے کی درخواست کی۔ چنانچہ تبت کے وفد کی درخواست پر آپ نے سلیط بن

1۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۹۵ 2۔ جامع بیان العلم۔ ص ۸۸ 3۔ حسن المحاضرہ سیوطی۔ جلد اول۔ ص ۱۱۹

4۔ ایضا 5۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۴۴ 6۔ ابن سعد۔ ترجمہ عمر بن عبدالعزیز

7۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۵ 8۔ فتوح البلدان۔ ص ۲۳۷ 9۔ مقریزی۔ جلد اول۔ ص ۱۲۵

10۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۹۹ 11۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۵

عبداللہ حنفی کو تبت روانہ کیا[1]۔ اس طرح آپ کے زمانہ میں اسلام کی غیر معمولی اشاعت ہوئی۔

خلافت کو جمہوری بنانا چاہتے تھے:

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کا دلی منشا خلافت کو جمہوری شکل میں تبدیل کرنا تھا۔ لیکن یہ مستقل تغیر ان کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے کہ اب شاہی خاندان میں موروثی بادشاہت اصولی حیثیت سے مسلم ہو چکی تھی اور عام مسلمان بھی اس کے خوگر ہو گئے تھے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے بعض مواقع پر اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا کہ "اگر خلافت کا معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں قاسم بن عبداللہ کو خلیفہ بنا دیتا"[2]۔ بلکہ ایک مرتبہ آل مروان کو اس کی دھمکی بھی دی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جمع ہو کر آپ سے کہا کہ گذشتہ خلفاء ہمارے ساتھ جو کچھ کرتے تھے، وہ سب آپ نے ختم کر دیا اور اس پر بڑی برہمی ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "اگر آئندہ پھر تم نے میرے سامنے اس قسم کی باتیں کیں تو میں چھوڑ کر مدینہ چلا جاؤں گا اور خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دوں گا۔ میں اس کے اہل (قاسم بن عبداللہ) کو پہچانتا ہوں"[3]۔

بادشاہت کے امتیازات کا استیصال:

لیکن سلیمان آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو نامزد کر گیا تھا۔ اس لئے یہ انقلاب آپ کے اختیار میں نہ تھا۔ تاہم جہاں تک ہو سکا آپ نے شاہنشاہیت کا زور توڑنے اور اس مفاسد کو دور کرنے کی پوری کوشش کی اور ہر شعبہ سے ملوکیت کے اثرات کو بالکل مٹا دیا۔

خلفاء کے ساتھ نقیب وعلمبردار چلتے تھے۔ نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرح ان پر درود وسلام بھیجا جاتا تھا۔ اسلام میں خاص امتیاز برتا جاتا تھا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان تمام امتیازات کو مٹا دیا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ جب کوتوال نے حسب دستور نیزہ لے کر آپ کے ساتھ چلنا چاہا تو آپ نے روک دیا کہ مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں[4]۔ سلام کے متعلق ہدایت فرمائی کہ عام طریقہ سے سلام کیا جائے[5]۔ عمال کو فرمان لکھا کہ پیشہ ور واعظ خلفاء پر درود وسلام بھیجتے ہیں، انہیں روک دو اور حکم دو کہ وہ عام مسلمانوں کے لئے دعا کریں، باقی چھوڑ دیں[6]۔ مخصوص میرے لئے کوئی دعا نہ کرو۔ بلکہ تمام مسلمانوں، مردوں اور عورتوں کے لئے دعا کرو۔ اگر میں ان میں ہوں گا تو میں بھی شامل ہو جاؤں گا[7]۔

---

۱ یعقوبی۔ جلد ۲۔ ص ۳۶۲ ۲ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۵۲ ۳ ایضاً۔ ص ۲۵۳ ۴ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۵۳
۵ طبقات ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۳ ۶ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۲۳۶ ۷ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ۲۷۸

شاہی خاندان کے متعلق ابوبکر بن محمد کو لکھا کہ کسی کو صرف اس لئے ترجیح نہ دو کہ وہ خاندانِ خلافت سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے نزدیک یہ لوگ عام مسلمانوں کے برابر ہیں[1]۔ اور اسے عملاً کر کے دکھایا۔

ایک مرتبہ مسلمہ بن عبدالملک ایک مقدمہ میں فریق کی حیثیت سے آپ کے اجلاس میں آیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ "اپنے فریق کی موجودگی میں تم فرش پر نہیں بیٹھ سکتے۔ یا تو عام لوگوں کے برابر بیٹھو یا کسی دوسرے کو اپنا وکیل مقرر کردو"[2]۔ شاہی خاندان کے وظائف عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے۔ غرض ملوکیت کے کنگرے کو پست کر کے عام سطح کے برابر کر دیا۔

فتوحات : حکومت اور سلطنت کے باب میں آپ کا نقطۂ نظر دوسرے خلفاء سے بالکل جداگانہ تھا۔ آپ کا مقصد اس کی توسیع نہیں بلکہ اس کی اصلاح تھی۔ اس لئے آپ کے زمانہ میں جو چیز سب سے آخری درجہ پر نظر آتی ہے، وہ فوجی سرگرمی ہے۔ چنانچہ سلطنت کی بقا، تحفظ اور قیامِ امن کی ضروریات کے علاوہ جارحانہ اقدام بہت کم ہوا۔ صرف اندلس کے بعض علاقوں کی بعض فتوحات کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر فتوحات نہیں ہوئیں۔

خوارج کا مقابلہ : حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت سے لے کر اس وقت تک کی تاریخ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھی۔ اس لئے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس میں اتنی احتیاط برتی کہ مفسدہ پرواز فتنہ پرست اسلامی فرقوں کے خلاف بھی تلوار نہ اُٹھائی۔ خوارج اُمویوں کے پرانے دشمن تھے۔ ان کی مخالفانہ روش حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد میں بھی قائم رہی۔ اپنے ہر ممکن طریقہ سے ان کو سمجھا بجھا کر باز رکھنے کی کوشش کی۔ عبدالحمید والی کوفہ جو خوارج کے مقابلہ میں تھے لکھا کہ "جب تک یہ لوگ خون ریزی اور فساد نہ کریں ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ ایک دوراندیش اور مستقل مزاج آدمی کو میرا یہ حکم سنا کر تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیج دو"۔ اس حکم کے مطابق عبدالحمید نے محمد بن جریر بجلی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اس سے زیادہ احتیاط یہ فرمائی کہ خوارج کے سردار بسطام کو خط لکھ کر اصلاح و مناظرہ کی دعوت دی کہ "آؤ ہم تم مناظرہ کرلیں۔ اگر ہم حق پر ہوں تو تم عام لوگوں کی طرح حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔ اگر تم حق ہو تو ہم اپنے معاملہ پر غور کریں۔ اس دعوت پر بسطام نے دو شخصوں کو مناظرہ کے لئے بھیجا اور فریقین میں مناظرہ ہوا۔ اس کی تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے

---

[1] ابن سعد۔ ص ۲۵۱ [2] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۴۲

انہیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ان پر افہام وتفہیم کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنی مفسدانہ روش سے باز نہ آئے۔ اس لئے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو آخر میں مجبور ہو کر ان شرائط کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کی اجازت دینا پڑی کہ

۱۔ عورت، بچے اور قیدی قتل نہ کئے جائیں، زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔

۲۔ فتح کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آئے، وہ ان کے اہل وعیال کو واپس کر دیا جائے۔

۳۔ قیدی اس وقت تک مقید رہیں جب تک راہ راست پر نہ آجائیں۔

ان پابندیوں کے ساتھ عبدالحمید نے ان پر حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو اس کی اطلاع ہوئی تو مسلمہ بن عبدالملک کو روانہ کیا۔ انہوں نے چند دنوں میں قابو حاصل کر لیا[۱]۔

خصوصیاتِ حکومت پر اجمالی تبصرہ:

اُوپر کے حالات سے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی خلافت کی خصوصیات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کی بنیادی خصوصیت پر اجمالی تبصرہ کیا جاتا ہے۔ آپ کی خلافت کی بنیاد کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ اور خدا کی اطاعت پر تھی۔ ان بنیادی اصولوں اور اپنی حیثیت کو اپنی پہلی تقریر میں ان الفاظ میں واضح فرمایا:

"اما بعد لوگو! تمہارے نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے اور اس پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نہیں ہے۔ خدا نے جو چیز حلال کر دی، وہ قیامت تک حلال رہے گی، اور جو چیز حرام کر دی، وہ قیامت تک حرام رہے گی۔ میں (اپنی جانب سے) کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں۔ بلکہ (احکام الٰہی کو) نافذ کرنے والا ہوں۔ میں خود کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ محض پیرو ہوں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں سے بہتر آدمی نہیں ہوں، البتہ خدا نے مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زیادہ گراں بار کیا ہے"[۲]۔

امورِ خلافت میں خلافتِ فاروقی کو اپنے لئے نمونہ عمل بنایا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے سالم بن عبداللہؒ بن عمر کو لکھا:

---

[۱] تاریخوں میں ان کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ ہم نے مختصر خلاصہ نقل کیا ہے۔ طبری اور ابن اثیر وغیرہ سب میں یہ حالات ہیں۔ [۲] ابن سعد، طبقات ج ۵، ص ۲۵۰، ۲۵۱

''میں چاہتا ہوں کہ اگر خدا کو منظور ہو اور مجھ میں اس کی استطاعت ہو تو رعایا کے معاملہ میں عمرؓ بن خطاب کی روش اختیار کروں۔ اس لئے تم میرے پاس عمرؓ کی تحریریں اور ان کے فیصلے جو انہوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کے بارے میں کئے ہیں بھیج دو۔ اگر خدا کو منظور ہوگا تو ان کے نقش قدم پر چلوں گا''۔

لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ عہد رسالت پر مدت گزر چلی تھی صحابہؓ اُٹھ چکے تھے۔ بنی اُمیہ کی حکومت نے اسلامی حکومت کے بارے میں عام مسلمانوں کا نقطۂ نظر بدل دیا تھا۔ اس لئے اس زمانہ میں عہد فاروقی کو زندہ کرنا بہت مشکل تھا۔ سالمؒ نے بھی ان دشواریوں کو محسوس کیا اور آپ کو لکھا کہ

''عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ دوسرے زمانہ میں اور دوسرے آدمیوں کے ذریعہ سے۔ اگر تم نے اس زمانہ میں اور ان آدمیوں کے ذریعہ سے عمرؓ بن الخطاب کی پیروی کی تو تم ان سے افضل ہوگئے''[1]۔

لیکن حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس تغیر حالات اور ہر طرح کے موانع و مشکلات کے باوجود ایک مرتبہ پھر فاروقی خلافت کا نمونہ دنیا کو دکھا دیا۔ اسی لئے بعض محدثین آپ کو پانچواں خلیفہ راشد مانتے ہیں[2]۔

علالت : لیکن افسوس مسلمانوں کو ڈھائی سال سے زیادہ اس سراپا خیر و برکت ہستی سے مستفیض ہونے کا موقع نہ ملا۔ اور جب ۱۰۱ھ میں مجدد خلافت نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کے سبب وفات کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی موت طبعی تھی۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ بنی اُمیہ نے جب محسوس کیا کہ اگر آپ کی خلافت کا زمانہ زیادہ بڑھا تو اُموی خاندان کی قوت ہمیشہ کے لئے توڑ دیں گے، تو انہوں نے آپ کے ایک غلام کو ایک ہزار اشرفی دے کر خفیہ زہر دلوا دیا۔ آپ کو اس کا علم ہو گیا۔ لیکن غلام پر کوئی سختی نہیں کی، بلکہ اشرفیاں واپس لے کر بیت المال میں داخل کرادیں اور غلام کو آزاد کر دیا[3]۔

طبیب نے بھی زہر تجویز کیا مگر آپ نے علاج کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا اگر مجھے یہ بھی یقین ہو جاتا کہ میرے کان کی لو کے پاس میری شفا ہے تو بھی میں ہاتھ نہ بڑھاتا[4]۔

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۱۳۱۔۱۳۲ ملخصاً و ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۹۲

[2] ابوداؤد کتاب السنن باب فی التفضیل [3] تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۴۲ [4] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۲۷۶

یزید بن عبدالملک کو وصیت نامہ :

زندگی سے مایوس کے بعد اپنے بعد ہونے والے خلیفہ یزید بن عبدالملک کو یہ وصیت نامہ لکھا :

میں تم کو یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھ رہا ہوں کہ مرض سے لاغر ہو گیا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ امورِ خلافت کے متعلق مجھ سے سوال کیا جائے گا اور خدا مجھ سے اس کا حساب لے گا اور میں اس سے اپنا کوئی کام نہ چھپا سکوں گا۔ خدا خود فرماتا ہے :

'' فلنقصن علیهم بعلم وما کنا غائبین ''۔

''ہم ان کو علم سے قصہ سناتے ہیں اور ہم غیر حاضر نہ تھے''۔

''اگر خدا مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب ہوا اور ایک طویل عذاب سے نجات پائی اور اگر مجھ سے ناراض ہوا تو افسوس ہے میرے انجام پر۔ میں اس خدا سے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، دعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی رحمت سے دوزخ سے نجات دے اور اپنی رضامندی سے جنت عطا کرے، تم کو تقویٰ اختیار کرنا چاہئے اور رعایا کا خیال رکھنا چاہئے۔ کیونکہ میرے بعد تم بھی تھوڑے ہی دن زندہ رہو گے۔ تم کو اس سے بچنا چاہئے کہ تم سے غفلت میں ایسی لغزش سرزد ہو جائے جس کی تلافی نہ کر سکو''۔

''سلیمان بن عبدالملک خدا کا بندہ تھا۔ خدا نے اسے وفات دی اور اس نے مجھ کو خلیفہ بنایا اور میرے بعد تم کو ولی عہد مقرر کیا۔ میں جس حالت میں تھا اگر وہ اس لئے ہوتی کہ میں بہت سی بیویوں کا انتخاب کروں اور مال و دولت جمع کروں تو خدا نے مجھ کو اس سے بہتر سامان دیئے تھے جو کسی بندہ کو دے سکتا تھا، لیکن میں سخت اور نازک سوال سے ڈرتا ہوں، بجز اس کے خدا میری دستگیری فرمائے[1]۔

اپنی اولاد کے متعلق ارشاد :

آپ کے اہل و عیال کے متعلق مسلمہ نے آپ سے کہا : ''امیر المومنین آپ نے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ اس مال و دولت سے خشک رکھا اور ان کو ایسی حالت میں چھوڑے جاتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ کاش آپ ان کے متعلق مجھے یا اپنے خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کرتے جاتے''۔ یہ سن کر فرمایا، مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو، پھر فرمایا : ''تمہارا یہ کہنا کہ اس مال سے میں نے ہمیشہ

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۲۸۰

اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا تو خدا کی قسم میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جس میں ان کا حق نہیں تھا وہ ان کو نہیں دیا۔ تمہارا یہ کہنا کہ میں تم کو یا کسی اور اہل خاندان کو وصیت کرتا جاؤں، تو اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی صرف خدا ہے، جو صلحاء کا ولی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے خدا سے ڈریں گے تو خدا ان کے لئے کوئی سبیل نکال دے گا اور گناہ میں مبتلا ہوں گے تو میں ان کو گناہ کرنے کے لئے قوی بناؤں گا''۔

اس کے بعد لڑکوں کو بلا کر باچشم پرنم فرمایا:

> ''میری جان تم پر قربان جن کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا، میرے بچو! تم کسی ایسے عرب اور ذمی سے نہ ملو گے جس کا تم پر حق ہو، بچو دو باتوں میں سے ایک بات تمہارے باپ کے اختیار میں تھی، ایک یہ تم دولت مند ہو جاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں جائے۔ دوسرے یہ کہ تم محتاج رہو اور تمہارا باپ جنت میں داخل ہو۔ ان دونوں میں اس کو یہ زیادہ پسند تھا کہ تم محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے۔ اچھا اب جاؤ، خدا تم کو حفظ وامان میں رکھے''[1]۔

آخری وصیتیں اور وفات:

بعض لوگوں نے عرض کیا، آپ مدینہ منتقل ہو جاتے اور روضہ نبوی ﷺ میں جو چوتھی جگہ خالی ہے اس میں رسول اللہ ﷺ، ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ دفن ہوتے۔ یہ سن کر فرمایا: خدا کی قسم آگ کے سوا اگر خدا مجھے ہر قسم کے عذاب دے تو میں انھیں بخوشی منظور کرلوں گا۔ لیکن یہ گوارا نہیں کہ خدا کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کے قابل سمجھتا ہوں''[2]۔

اس کے بعد ایک ذمی سے قبر کے لئے زمین خریدی۔ اس نے قیمت لینے میں عذر کیا، اور کہا یہ میرے لئے خیر و برکت کا باعث ہے کہ آپ میری مملوکہ زمین میں دفن ہوں۔ لیکن آپ نے اسے منظور نہ کیا اور باصرار قیمت حوالہ کی[3]۔ پھر کفن اور دفن کے متعلق ضروری وصیتیں کیں اور آنحضرت ﷺ کے ناخن اور موئے مبارک منگا کر انہیں کفن میں رکھنے کی ہدایت کی[4]۔

دم آخر زبان پر یہ آیت تھی:

"تلک الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فى الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين"۔

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۵۳　[2] طبقات ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۳　[3] سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۲۳۶
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ۸ ۲۸　[5] ایضاً ص ۲۵۲

"یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تو برتری چاہتے ہیں اور نہ فساد کرتے ہیں اور عاقبت پرہیزگاروں کے لئے ہے"۔

یہی آیت تلاوت کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1]۔ یہ رجب کا مہینہ اور ۱۰۱ھ تھا۔ تاریخوں میں اختلاف ہے۔ وفات کے وقت انتالیس یا چالیس سال عمر تھی، دیر سمعان میں دفن کئے گئے۔

ازواج واولاد : حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی چار بیویاں تھیں اوران سب سے اولادیں ہوئیں۔ لمیس بنت علی: ان سے تین لڑکے تھے۔ عبداللہ، بکر اور ام عمار۔ ام عثمان بنت شعیب : ان سے ایک لڑکا ابراہیم تھا۔ فاطمہ بنت عبدالملک : ان سے تین لڑکے تھے، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ۔ ام ولید سے نو اولادیں تھیں، عبداللہ، ولید، عاصم، یزید، عبداللہ، عبدالعزیز، زبانا، امیۃ اور ام عبداللہ۔

حلیہ : صورۃً شکیل تھے۔ رنگ گورا اور چہرہ نازک تھا۔ خلافت سے پہلے عیش و تنعم کی زندگی کی وجہ سے جسم نہایت تروتازہ تھا۔ ازار بند پیٹ کے بلوں میں غائب ہوجاتا تھا، لیکن خلافت کے بعد زاہدانہ زندگی نے رنگ روپ بالکل بدل دیا تھا۔ سوکھ کر لاغر ہوگئے تھے۔ پسلیاں بغیر چھوئے گنی جاسکتی تھیں[2]۔

فضل وکمال : حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو اگر سیاسی حالات تخت خلافت پر نہ بٹھادیتے تو وہ مسند درس کی زینت ہوتے۔ علمی اعتبار سے وہ آئمہ کبار میں تھے، تمام علماء ومصنفین کا ان کی جلالت علمی پر اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، "كان فقيها مجتهدا عارفا بالسنن و كبيرا الشان ثبتا حجة حافظا قانتاً لله او مأمنيا"۔ ترجمہ : "عمر بن عبدالعزیز امام فقیہ، مجتہد، عالم سنت، کبیر الشان، ثبت، حجت، حافظ (حدیث) خدا کے فرماں بردار، نرم دل اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت فضیلت، وفور علم، صلاح، زہد وورع، عدل، شفقت علی المسلمین، حسن سیرت، خدا کی راہ میں ان تھک کوشش، سنت نبوی اور آثار نبوی کے اتباع اور خلفاء راشدین کی اقتداء میں سب کا اتفاق تھا[3]۔

معاصر علماء میں درجہ :

اس عہد کے اکابر علماء ان کے علمی کمالات کے مقابلہ میں طفل دبستان تھے[4]۔ میمون بن مہران کہتے تھے کہ علماء عمرؒ بن عبدالعزیز کے سامنے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔ ایک دوسری روایت کے

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۷۱　۲۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۳۴　۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول ص ۱۲
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۶

الفاظ ہیں کہ وہ علماء کے معلم تھے۔ چنانچہ جو علماء انہیں تعلیم دینے کے خیال سے ان کے پاس آتے تھے، وہ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مجاہد کا جو بڑے جلیل القدر تابعی عالم تھے، بیان ہے کہ ہم لوگ ان کے پاس تعلیم دینے کے لئے جاتے، لیکن کچھ دنوں بعد ہم خود ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے[۱]۔

تفسیر: تفسیر قرآن میں نہایت وسیع نظر تھی۔ بڑے بڑے علماء قرآنی مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حجاز اور شام کے کچھ علماء نے آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ اپنے والد سے قرآن کی اس آیت :

"انی لھم التناوش من مکانٍ بعید"۔

''وہ دُور سے کیوں کر پا سکتے ہیں''۔

کے متعلق پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے جواب دیا، اس سے مراد توبہ ہے۔ جس کی خواہش اس وقت کی جائے، جس وقت انسان اس پر قادر نہ ہو[۲]۔

حدیث: حدیث کے اجل حفاظ میں تھے۔ حافظ ذہبی ان کو امام، عارف سنت، حجت اور حافظ لکھتے ہیں[۳]۔ امام مالک اور ابن عیینہ آپ کو امام وقت کہتے ہیں[۴]۔

جتنی مرفوع حدیثیں ان کے حافظہ میں محفوظ تھیں اتنی کسی تابعی کے علم میں نہ تھیں۔ ایوب سختیانی کہتے تھے کہ میں جن جن لوگوں سے ملا، ان میں سے کسی کو عمرؒ بن عبدالعزیز سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے والا نہیں دیکھا[۵]۔

احادیثِ نبوی کا تحفظ :

حدیث نبوی کی انہوں نے بڑی خدمت کی۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کی اشاعت کی اور اس کو محفوظ کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ احادیث نبوی کی تدوین اور اس کا تحفظ ہے۔ اگر آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو احادیث نبوی ﷺ کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔

آپ کے زمانہ میں مرور زمانہ کے ساتھ اکابر علماء اور حفاظ حدیث اُٹھتے جاتے تھے۔ جب آپ نے دیکھا کہ یہ بہار آخری ہو رہی ہے، اگر احادیث کی حفاظت نہ کی گئی تو اس کا بڑا حصہ علماء کے ساتھ دفن ہو جائے گا، تو قاضی ابو بکر بن حزم گورنر مدینہ کو لکھا کہ احادیث نبوی تلاش و جستجو کر کے ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف ہے۔ لیکن صرف رسول اللہ ﷺ کی احادیث قبول کی جائیں[۶]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ - جلد اول - ص ۱۰۶   ۲ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز - ص ۴۸   ۳ تذکرۃ الحفاظ - جلد اول - ص ۱۰۵   ۴ تہذیب الاسماء - جلد اول - ص ۱۸   ۵ بخاری کتاب العلم باب کیف یقبض العلم

حافظ ابن حجرؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صوبوں کے گورنروں کے نام اسی مضمون کا فرمان بھیجا تھا[1]۔

اس حکم کی تعمیل ہوئی اور جمع شدہ احادیث کے مجموعے تیار کرا کے تمام ممالک محروسہ میں بھیجے گئے۔ سعد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم کو عمرؒ بن عبدالعزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھیں اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی بھیجا[2]۔

فقہ: فقہ میں امامت واجتہاد کا درجہ رکھتے تھے حافظ ذہبی لکھتے ہیں، "**کان اماماً فقیہا مجتہدا**" انہوں نے حضرت عمرؓ کے ان تمام فقہی فیصلوں کو جو انہوں نے رعایا کے متعلق جمع کئے تھے جمع کرایا تھا۔

شاعری: حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو اگرچہ مروجہ رسمی شاعری سے ذوق نہ تھا، لیکن اخلاقی اشعار پسند کرتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی اس رنگ کے اشعار کہتے تھے۔ ابن جوزیؒ نے سیرت میں ان کے اشعار نقل کئے ہیں[3]۔ ایک راگ بھی جو مدینہ میں بہت مقبول تھا، آپ کی جانب منسوب تھا۔ ممکن ہے مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں جب کہ آپ کی طبیعت عیش وتنعم کی طرف راغب تھی یہ راگ ایجاد کیا ہو۔

خطابت: اگرچہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بحیثیت خطیب کے کوئی شہرت حاصل نہیں کی، لیکن آپ کے خطبات نہایت موثر اور دل پذیر ہوتے تھے۔ ابن جوزی نے آپ کے متعدد خطبات لکھے ہیں۔ جاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں جو بلیغ خطبات کا بہترین مجموعہ ہے، آپ کے ایک دو خطبے نمونۃً نقل کئے ہیں[4]۔

علماء کی قدردانی: گذشتہ خلفاء کی بزم طرب کی زینت شعراء، خطباء اور ادیبوں سے تھی، لیکن عمرؒ بن عبدالعزیز کا ذوق ان سے مختلف تھا۔ اس لئے ان کے زمانہ میں شعراء کا ہجوم چھٹ گیا اور اس کی جگہ علمائے دین نے لے لی۔

ان کی تخت نشینی کے بعد حسب معمول حجاز اور عراق کے مشہور شعراء میں نصیب، جریر، فرزدق، احوص، کثیر اور اخطل قصیدے لے لے کر پہنچے اور عرصہ تک ٹھہرے رہے۔ لیکن کسی کو باریابی کی اجازت نہیں ملی۔ ان کے بجائے علماء وفقہا کو بار ملتے تھے اور ان کی قدردانی کرتے تھے۔ شعراء کی یہ کسمپرسی دیکھ

---

[1] فتح الباری۔ جلد اول۔ ص ۱۷۴ [2] جامع بیان العلم۔ ص ۳۸ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۵
[4] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز [5] ایضاً۔ ص ۲۳۶ [6] کتاب البیان والتبیین۔ جلد اول۔ ص ۱۹۲

کر ایک دن جریر نے عون بن عبداللہ کے ذریعہ جو ایک ممتاز فقیہ تھے، یہ اشعار کہہ کر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجے [۱]:

یایها القاری المرخی عمامته	هذا زمانک انی ندمضی زمنی
اے وہ قاری جس کے عمامہ کا شملہ لٹک رہا ہے	یہ تیرا زمانہ ہے، میرا زمانہ گزر گیا
ابلغ خلیفتنا ان کنت لاقیه	انی لدی الباب کالمصور فی قرن
اگر تجھ سے خلیفہ سے ملاقات ہو تو میرا پیغام پہنچا دے	کہ میں دروازہ پر بیڑیوں میں جکڑا ہوں

عون بن عبداللہ نے عمرؒ بن عبدالعزیز سے کہا کہ جریر نے میری آبرو بچائیے۔ آپ نے جریر کو باریابی کی اجازت دی۔ اس نے قصیدہ سنایا، جس میں اہل مدینہ کے مصائب و مشکلات کا حال تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کے لئے کپڑا، غلہ اور نقد روپیہ بھیجا اور جریر سے پوچھا بتاؤ، ''تم کس جماعت سے میں سے ہو، مہاجرین میں، انصار میں۔ ان کے اعزہ میں، مجاہدین میں؟''۔ اس نے کہا کسی میں نہیں۔ فرمایا: ''پھر مسلمانوں کے مال میں تمہارا کیا حق ہے''۔

اس نے کہا خدا نے میرا حق مقرر کیا ہے، بشرطیکہ آپ اس کو نہ روکیں، میں ابن سبیل (مسافر) ہوں، دور دراز کا سفر کر کے آپ کے آستانہ پر ٹھہرا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تم میرے پاس آئے ہو تو میں اپنی جیب سے تم کو بیس درہم دیتا ہوں، اس حقیر رقم پر خواہ میری تعریف کرو یا مذمت''۔ جریر نے اسے بھی غنیمت سمجھا اور اسے لے کر باہر آیا۔ دوسرے شعراء نے لپک کر پوچھا، کہو ابوحرزہ کیا معاملہ رہا۔ اس نے جواب دیا اپنا اپنا راستہ لو، یہ شخص شاعروں کو نہیں بلکہ گداگروں کو دیتا ہے۔

مگر علماء، فقہاء اور قراء کی بڑی قدردانی تھی۔ ان کو دور دور سے بلا کر خواص میں داخل کرتے تھے [۲]۔

زمام خلافت ہاتھوں میں لینے کے بعد سالم بن عبداللہ بن عمر محمد بن کعب قرظی اور رجاء بن حیوۃ، ریاح ابن عبیدہ سے امور خلافت میں مشورہ لیتے تھے [۳]۔ میمون بن مہران، رجاء بن حیوۃ، ریاح ابن عبیدہ آپ کے ندیم خاص تھے۔ ان کے علاوہ اور متعدد علماء آپ کے ہم جلیس تھے [۴]۔

فضائل اخلاق: اگرچہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے مجددانہ کارناموں کے بعد ان کے فضائل اخلاق لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس گلستان سے اس بہار کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے،

۱۔ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۶۷۔ ۱۶۸ ۲۔ ایضاً۔ ۱۶۲ ۳۔ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۶۲
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۹۲

تاہم اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

خلافت سے پہلے آپ فطرۃً صالح اور سعید تھے۔ اس لئے زندگی کے کسی دور میں بھی آپ کا دامن اخلاق داغدار نہ تھا۔ لیکن خلافت سے پہلے آپ کی زندگی بڑے عیش و تنعم اور شان وشکوہ کی تھی۔

ان کا خود بیان ہے کہ مجھے لباس، عیش پرستی اور عطریات کا جب شوق ہوا، تو میں نے اسے اس قدر پورا کیا کہ میرے علم میں میرے خاندان بلکہ دوسرے خاندانوں میں بھی ایسی زندگی کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی[1]۔

ان کے شوق اور نفاستِ مزاج کا یہ حال تھا کہ جب ان کے کپڑوں پر ایک مرتبہ دوسروں کی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر انہیں وہ پرانا سمجھتے تھے[2]۔ ولید کے زمانہ میں ان کو چار چار سو درہم کی قیمت کا کپڑا سخت وکرخت معلوم ہوتا تھا، لیکن پھر چودو درہم کا کپڑا بھی نرم وملیح معلوم ہونے لگا تھا[3]۔ خوشبو کے لئے ڈاڑھی پر عنبر چھڑکتے تھے[4]۔ رجاء بن حَیْوۃ کا بیان ہے کہ عمرؒ بن عبدالعزیز سب سے زیادہ خوش لباس، سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ تبختر کی چال چلنے والے تھے[5]۔

لیکن تختِ خلافت پر قدم رکھنے کے بعد زندگی یکسر بدل گئی۔ عیش و تنعم کے سارے سامان چھوٹ گئے اور عیش پروردہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوذر غفاریؓ اور حسن بصری کا قالب اختیار کرلیا۔

انہوں نے جس طرح دنیا سے دامن جھاڑا، اس کے کچھ حالات اوپر گزر چکے ہیں۔ ساری املاک بیت المال کو واپس کردی۔ لونڈی غلام، فرش فروش، لباس وعطریات عیش وتجمل کے جملہ سامانوں کو بیچ کر اس کی قیمت بیت المال میں داخل کردی[6]۔ بیت المال سے گزارہ کے لئے چار سو دینار سالانہ لیتے تھے اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ لیتے تھے[7]۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لایموت سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

لباس : لباس میں عموماً صرف ایک جوڑا رہتا تھا، اسی کو دھو دھو کر پہنتے تھے[8]۔ مرض الموت میں ایک قمیض کے علاوہ دوسری قمیض نہ تھی۔ آپ کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ قمیض میلی ہوگئی ہے، لوگ عیادت کے لئے آتے ہیں، اس لئے دوسری بدلوادو۔

۱؎ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۵۶۶ ۲؎ ایضاً۔ ص ۱۴۶ ۳؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۰
۴؎ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۵۱ ۵؎ ایضاً ۵؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۱
۶؎ ابن سعد۔ ص ۲۹۶ ۷؎ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۲۷۲ ۸؎ ایضاً۔ ص ۱۹۷

وہ خاموش رہیں۔ مسلمہ نے دوبارہ کہا۔ فاطمہ نے جواب دیا، خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے[1]۔ پھر ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا تھا، اس میں بھی پیوند لگے ہوتے تھے[2]۔ بچے بھی اسی تنگی سے بسر کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کی بچی کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ آپ کی بہن کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک تھان بھجوا دیا اور منع کر دیا کہ عمر سے نہ مانگنا[3]۔

ایک مرتبہ آپ کے صاحبزادے نے کپڑے مانگے۔ آپ نے فرمایا میرے کپڑے خیار بن ریاح کے پاس رکھے ہیں، ان سے جا کر لے لو۔ وہ ان کے پاس گئے، انہوں نے گاڑھے کے کپڑے نکال کر دیئے۔ عبیداللہ نے کہا یہ تو ہمارے پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ خیار نے کہا میرے پاس تو امیر المومنین کے بھی کپڑے ہیں۔ عبیداللہ نے واپس جا کر حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی وہی عذر کیا۔ آپ نے فرمایا، میرے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ واپس جانے لگے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے واپس بلا کر کہا کہ اگر اپنے وظیفہ سے پیشگی لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ چنانچہ سو درہم دلوا دیئے، اور وظیفہ تقسیم ہونے کے وقت کاٹ لئے گئے[4]۔

غذا: غذا نہایت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ روٹی اور روغن زیتون یا دال روٹی کھاتے تھے۔ آپ کے غلاموں کو بھی یہی ملتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک غلام نے شکایت کی کہ روز روز دال روٹی ملتی ہے۔ آپ کی بیوی نے جواب دیا، امیر المومنین کی یہی غذا ہے اور یہ غذا بھی پیٹ بھر کر نہ کھاتے تھے۔ آپ کے غلام کا بیان ہے کہ جب سے آپ خلیفہ ہوئے اس وقت سے وفات تک کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا[5]۔

اگر کبھی کوئی اچھی چیز کھانے کی خواہش بھی ہوتی تھی تو اس کی مقدرت نہ تھی۔ ایک مرتبہ انگور کھانے کو دل چاہا۔ بیوی سے پوچھا، تمہارے پاس ایک درہم ہے، میں انگور کھانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جھلا کر جواب دیا، امیر المومنین ہو کر تم کو ایک درہم کی استطاعت نہیں۔ فرمایا، یہ جہنم کی زنجیروں سے میرے لئے زیادہ آسان ہے[6]۔

ان کی یہ زندگی دیکھ کر ان کی بیوی فاطمہ نے (جنہوں نے امارت کے گہوارے میں پرورش پائی تھی) بھی اسی رنگ میں اپنے کو رنگ لیا تھا اور بناؤ سنگار بالکل ترک کر دیا تھا۔

۱۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۸۰ ۲۔ ایضاً ص ۵۷ ۳۔ ایضاً ص ۲۹۸ ۴۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۳ ۵۔ طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۰۰ ۶۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۵۱

ایک مرتبہ ایک دولت مند گھرانے کی خاتون نے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میرے شوہر کی یہی پسند ہے۔[1]

ذمہ داری کا احساس اور خشیتِ الٰہی:

حکومت اور سلطنت دلوں کو سخت اور مواخذہ سے بے خوف بنا دیتی ہے۔ لیکن عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کے دل کو اس نے خشیتِ الٰہی سے لبریز کر دیا تھا۔ وہ خلافت کی ذمہ داریوں کے احساس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔

آپ کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد تنہائی میں مسجد میں بیٹھ کر رو رو کر دعائیں کرتے تھے اور اسی حالت میں آنکھ لگ جاتی تھی۔ آنکھ کھلتی تو پھر یہی مشغلہ جاری ہو جاتا۔ اسی طرح روتے دعائیں کرتے اور جاگتے سوتے ساری رات گزر جاتی تھی۔

یہ مشغلہ کبھی گھر میں بھی تنہائی میں ہوتا تھا۔ ایک دن بیوی نے دیکھ لیا، اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے ٹالنا چاہا، مگر بیوی نے اصرار کیا اور کہا میں بھی اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اس وقت آپ نے بتایا کہ

"میں نے اپنے بارے میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں اس اُمت کے چھوٹے بڑے اور سیاہ سپید جملہ امور کا ذمہ دار ہوں، اس لئے جب میں بیکس، غریب محتاج، فقیر، گم شدہ قیدی اور اس قبیل کے دوسرے آدمیوں کو یاد کرتا ہوں جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، جن کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور خدا ان کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا اور رسول اللہ ﷺ ان کے متعلق مجھ پر دعویٰ کریں گے، اگر میں خدا کے سامنے کوئی عذر اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کر سکا تو مجھے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور میرے آنسو نکل آتے ہیں اور جس قدر میں ان چیزوں پر غور کرتا ہوں اسی قدر میرا دل خوفزدہ ہوتا ہے۔"[2]

بعض لوگ آپ کے گریہ و بکا پر ملامت کرتے۔ آپ جواب دیتے تم لوگ مجھے رونے پر ملامت کرتے ہو، حالانکہ اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو عمر اس کے بدلہ میں پکڑا جائے گا۔[3]

۱۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۵۶　　۲۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔۱۸۹، بحوالہ تاریخ الخلفاء، تذکرہ عمر بن عبدالعزیز

۳۔ ایضاً، ص ۲۹۱۔۲۹۲

ایک مرتبہ آپ نے ایک فوجی افسر سلیمان بن ابی کریمہ کو لکھا:

''خدا کی تعظیم وخشیت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے، جس کو اس نے اس آزمائش میں ڈالا، جس میں میں ہوں۔ خدا کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت حساب دینے والا اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی حالت سے سخت دل گرفتہ ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میرے یہ حالات مجھے ہلاک نہ کردیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے تم جہاد فی سبیل اللہ کے لئے جانے والے ہو، تو برادر من جب تم میدانِ جہاد میں پہنچ جاؤ تو خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے۔ اس لئے کہ میری حالت نہایت سخت اور میرا خطرہ بہت بڑا ہے''۔[۱]

موت اور قیامت کا خوف:

سلاطین کی بزم طرب میں موت اور قیامت کے ذکر اور خوف کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ لیکن عمرؒ بن عبدالعزیز کی مجلس بزم عزا ہوتی تھی۔ رات کو علماء جمع ہو کر موت اور قیامت کا ذکر کر کے اس طرح روتے تھے جیسے ان کے سامنے جنازہ رکھا ہے۔[۲]

رات رات بھر جاگ کر موت پر غور وفکر کیا کرتے تھے اور قبر کی ہولناکیوں کا ذکر کر کے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ایک ہم جلیس سے فرمایا، میں رات بھر غور وفکر میں جاگتا رہا۔ اس نے پوچھا کس چیز کے متعلق؟ فرمایا، قبر اور اہلِ قبر کے متعلق۔ اگر تم مردے کو تین دن بعد قبر میں دیکھو تو انس ومحبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے خوفزدہ ہو گے۔ تم ایسا گھر دیکھو گے جس میں خوش لباس اور خوشبو کے بجائے کیڑے رینگ رہے ہوں گے۔ پیپ بہہ رہی ہوگی اور اس میں کیڑے تیر رہے ہوں گے، بدبو پھیلی ہوگی، کفن بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ یہ کہہ کر ہچکی بندھ گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی بیوی پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔[۳]

یزید بن حوشب کا بیان ہے کہ میں نے حسن بصری اور عمرؒ بن عبدالعزیز سے زیادہ کسی شخص کو قیامت سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا، گویا دوزخ ان ہی کے لئے بنائی گئی ہے۔[۴]

آیاتِ قرآنی سے تاثر:

قرآن مجید کی موعظت آیات پڑھ کر بے حال ہو جاتے، ایک شب کو یہ آیت:

---

۱ ابن سعد، جلد ۵، ص ۲۹۲　۲ تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۷　۳ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز، ص ۱۸۷

۴ ابن سعد، جلد ۵، ص ۲۹۴

"یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعھن المنفوش"۔

"جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کے ہوں گے اور پہاڑ مثل دھنکے ہوئے اون کے ہوں گے"۔

تلاوت کر کے زور سے چیخے واسوء صباحاہ اور اچھل کر اس طرح گرے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دم نکل جائے گا، پھر اس طرح ساکن ہو گئے کہ معلوم ہوتا تھا ختم ہو گئے، پھر ہوش میں آ گئے[1]۔

ایک دن نماز میں یہ آیت :

"وقفوا ھم انھم مسئولون"۔

"ان کو بتا دو کہ ان سے باز پرس کی جائے گی"۔

پڑھی تو اتنے متاثر ہوئے کہ اسی کو بار بار دہراتے رہے، اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے[2]۔

دیانت : آپ کے فضائل اخلاق میں دیانت کا وصف سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ مسلمانوں کے مال کی حفاظت میں آپ نے دیانت کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی مثال کسی قوم کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

بیت المال سے کبھی معمولی فائدہ اٹھانا بھی گوارا نہ کیا۔ رات کو جب تک خلافت کے کام انجام دیتے تھے، اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے تھے، اس کے بعد گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلواتے تھے[3]۔

بیت المال کی جانب سے فقراء اور مساکین کے لئے جو مہمان خانہ تھا، اس کے باورچی خانہ سے اپنے لئے پانی بھی گرم نہ کراتے تھے۔ ایک مرتبہ غفلت میں آپ کا ملازم ایک مہینہ تک اس مطبخ سے آپ کے وضو کا پانی گرم کرتا رہا۔ آپ کو معلوم ہوا تو اتنی لکڑی خرید کر باورچی خانہ میں داخل کرا دیں[4]۔

ایک بار غلام کو گوشت کا ٹکڑا بھوننے کا حکم دیا، وہ اسی مطبخ سے لایا آپ نے اسے ہاتھ نہ لگایا، اور غلام سے فرمایا تم ہی کھا لو، میری قسمت کا نہ تھا[5]۔

خلافت کے کاموں کے سلسلہ میں جو لوگ آتے تھے وہ اسی مہمان خانہ میں ٹھہرتے تھے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ان کے ساتھ کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ چند مہمانوں نے کھانے سے

---

[1] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۹۰ [2] ایضاً۔ ۱۹۱ [3] تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۲۷ و ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۹۵
[4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۹۵ [5] سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۶

انکار کردیا کہ جب تک آپ نہ کھائیں گے ہم بھی نہ کھائیں گے۔ اس دن مجبور ہو کر مہمانوں کے ساتھ کھانے لگے، مگر اس کا معاوضہ دے دیتے تھے[۱]۔

ایک مرتبہ بہت سے سیب آئے۔ آپ انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرمارہے تھے۔ آپ کا چھوٹا بچہ ایک سیب اُٹھا کر کھانے لگا، آپ نے اس کے منہ سے چھین لیا۔ وہ روتے لگا اور جا کر اپنی ماں سے شکایت کی۔ ماں نے بازار سے سیب منگا کر دیئے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز گھر آئے تو انہیں سیب کی خوشبو معلوم ہوئی۔ پوچھا فاطمہ کوئی سرکاری سیب تو تمہارے پاس نہیں ہے۔ انہوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا، ''خدا کی قسم اس کے منہ سے نہیں چھینا تھا، اپنے دل سے چھینا تھا۔ لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں مسلمانوں کے حصہ کے ایک سیب کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے نفس کو برباد کروں[۲]۔

آپ کو لبنان کا شہد بہت مرغوب تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی خواہش ظاہر کی۔ آپ کی بیوی نے وہاں کے حاکم ابن معدیکرب کے پاس کہلا بھیجا، انہوں نے بہت سا بھجوا دیا۔ فاطمہ نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے شہد دیکھ کر فرمایا، معلوم ہوتا ہے تم نے ابن معدیکرب کے پاس کہلا بھیجا تھا، ان ہی نے بھیجا ہے۔ چنانچہ کل شہد بکوا کر اس کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی، اور ابن معدیکرب کو لکھ بھیجا کہ تم نے فاطمہ کے کہلانے پر شہد بھیجا ہے، خدا کی قسم اگر آئندہ ایسا کیا تو اپنے عہدے پر نہ رہو گے، اور تمہارے چہرے پر نظر نہ ڈالوں گا[۳]۔

ایک مرتبہ آپ کی حاملہ بیوی کے لئے تھوڑے سے دودھ کی ضرورت تھی۔ لونڈی مہمان خانہ سے ایک پیالہ دودھ لے آئی۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا بی بی کے لئے دودھ کی ضرورت تھی، اگر اس وقت دودھ نہ دیا جائے گا تو اسقاط کا اندیشہ ہے۔ اس لئے یہ دودھ دارالضیافہ سے لے آئی ہوں۔ یہ سن کر لونڈی کا ہاتھ پکڑا اور چلاتے ہوئے بیوی کے پاس لائے اور کہا، اگر حمل فقراء و مساکین کے کھانے کے علاوہ اور کسی چیز سے قائم نہیں رہ سکتا تو خدا اس کو قائم نہ رکھے۔ یہ برہمی دیکھ کر بیوی نے دودھ واپس کرا دیا[۴]۔

احتیاط کا آخری نمونہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ بیت المال کا مشک آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے ناک بند کر لی کہ اس کی خوشبو نہ آنے پائے۔ لوگوں نے عرض کیا امیر المؤمنین اس کی خوشبو سونگھ لینے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا، مشک کا انتفاع بھی ہے[۵]۔

---

۱ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۶۲   ۲ ایضا   ۳ ایضا۔ ص ۵۸   ۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۷۹

۵ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۶۰

تخت خلافت پر قدم رکھنے کے بعد ہدایا و تحائف کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو سیب اور دوسرے میوے ہدیہ میں بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیئے۔ بھیجنے والے نے آپ سے کہا ہدیہ تو رسول اللہ ﷺ قبول فرماتے تھے۔ آپ نے جواب دیا لیکن ہمارے لئے اور ہمارے بعد والوں کے لئے وہ رشوت ہے[۱]۔ ابن جوزی نے اس قبیل کے اور بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

توکل : توکل اور اعتماد علی اللہ نے تمام خطرات سے بے پرواہ کر دیا تھا۔ جس زمانہ سے امیر معاویہ پر حملہ ہوا تھا، اس زمانہ سے خلفاء کی حفاظت کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ سینکڑوں سپاہی پہرہ پر متعین رہتے تھے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے دوسرے سامان تجمل اس کو بھی ختم کر دیا۔

ایک مرتبہ بعض ہواخواہوں نے عرض کیا کہ گذشتہ خلفاء کی طرح آپ بھی دیکھ بھال کر کھایا کیجئے اور حملہ کی حفاظت کے لئے نماز میں پہرہ کا انتظام رکھا کیجئے۔ طاعون میں ہٹ جایا کریں۔ یہ سن کر فرمایا، اس حفاظت کے باوجود آخر وہ لوگ کیا ہوئے۔ جب لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، خدایا اگر میں تیرے علم میں روز قیامت کے علاوہ اور کسی دن سے ڈروں تو تو میرے خوف کو اطمینان نہ دلانا[۲]۔

تواضع ومساوات :

ترفع، کبر، خودنمائی اور عدم مساوات وغیرہ امارت کے لوازم میں ہیں۔ خود حضرت عمرؒ بن عبد العزیز میں خلافت سے پہلے بڑی تمکنت تھی۔ لیکن خلافت کے بعد سراپا عجز وانکساری اور مساوات کا نمونہ بن گئے تھے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ خلافت کے بعد انہوں نے تمام شاہی امتیازات مٹا دیئے تھے اور فرمایا تھا کہ "میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں"۔ سرکاری پہرداروں کو تعظیم کے لئے اٹھنے کی ممانعت کر دی اور خود ان کے ساتھ برابر بیٹھتے تھے[۳]۔

لونڈی غلاموں کے ساتھ برتاؤ اتنا مساویانہ تھا کہ کبھی کبھی آپ خود بھی ملازمین کی خدمت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پنکھا جھلتے جھلتے ایک لونڈی کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے پنکھا لے کر اس کو جھلنا شروع کر دیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر چلائی۔ آپ نے فرمایا، آخر تم بھی میری طرح انسان ہو، تم کو بھی گرمی لگتی ہوگی، جس طرح تم مجھے پنکھا جھل رہی تھیں، میں نے تم کو جھلنا مناسب سمجھا[۴]۔

۱۔ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۲۰　۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۹۲　۳۔ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز　۴۔ ایضاً۔ ص ۵۷

جنازہ میں شرکت کے وقت خلفاء کے لئے علیحدہ چادر بچھائی جاتی تھی۔ چنانچہ حسب معمول جب آپ کے لئے پہلی مرتبہ بچھائی گئی تو آپ نے اس کو پیروں سے ہٹادیا[۱]۔

ملازموں کے آرام میں خلل نہ ڈالتے تھے اور ان کے آرام کے اوقات میں خود اپنے ہاتھ سے کام کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ رجاء بن حیوۃ سے گفتگو میں رات گزر گئی اور چراغ جھلملانے لگا۔ پاس ہی ملازم سویا ہوا تھا۔ رجاء نے کہا اسے جگادوں۔ فرمایا سونے دو۔

رجاء نے خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے روک دیا کہ مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے اور خود اٹھ کر زیتون کا تیل لیا اور چراغ ٹھیک کر کے پلٹ کر فرمایا، جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور اب بھی عمرؒ بن عبدالعزیز ہوں[۲]۔

اس تواضع اور مساوات کی وجہ سے ان لوگوں کو جو خلیفہ میں جاہ وجلال دیکھنے کے عادی تھے، آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی تھی۔ حکم بن عمر والرعینی کا بیان ہے کہ عمرؒ بن عبدالعزیز ایک حلقہ سے اٹھ کر دوسرے حلقہ میں بیٹھ جاتے تھے اور وہ اجنبی جو آپ کو پہچانتے نہ تھے، انہیں جب تک اشارہ سے بتایا نہ جاتا، اس وقت تک وہ پہچان نہ سکتے تھے[۳]۔

اس مختصر تذکرہ میں ان کے اخلاق کمال کا احاطہ مشکل ہے۔ اس لئے صرف چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

(۵۳) عمرو بن مرہؒ

نام ونسب: عمرو نام ہے۔ ابو عبداللہ کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے: عمرو بن مرہ بن عبداللہ بن طارق بن الحارث ابن سلمہ بن کعب بن وائل بن جمل بن کنانہ بن ناجیہ بن مراد جملی مرادی۔

فضل وکمال: علمی اعتبار سے کوفہ کے ممتاز علماء میں تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، کان ثقۃ ثبتا اماما مسعر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کسی کو نہیں پایا[۴]۔

حدیث: حفظ حدیث کے لئے یہ سند کافی ہے کہ حافظ ذہبی ان کو حافظ کا لقب دیتے ہیں۔ عبدالرحمن بن مہدی انہیں حفاظ کوفہ میں شمار کرتے تھے[۵]۔

۱۔ سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ص ۱۷۲ ۲۔ ایضاً۔ ص ۱۷۳ ۳۔ ایضاً۔ ص ۱۷۳۔۱۷۴
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۸ ۵۔ ایضاً

حفص بن غیاث کا بیان ہے کہ میں نے اعمش سے عمرو بن مرہ کے علاوہ کسی کی تعریف نہیں سنی۔ وہ کہتے تھے کہ ابن مرہ اپنی روایات میں مامون تھے۔ شعبہ کہتے تھے کہ تمام راویان حدیث سے حدیثوں میں کچھ نہ کچھ ردو بدل ہو جاتا ہے۔ صرف ابن عون اور عمرو بن مرہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مسعر کہتے ہیں کہ وہ صدق کی کان ہیں[۱]۔

حدیث میں انہوں نے عبداللہ بن اوفی، ابو وائل، مرۃ الطیب، سعید بن مسیب، عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، عبداللہ بن حارث نجرانی، عمرو بن میمون اودی، عبداللہ بن سلمہ، حسن بن مسلم، خیثمہ بن عبدالرحمٰن، سعد بن عبیدہ، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی جیسے علماء سے استفادہ کیا تھا۔ ابو اسحٰق سبیعی اعمش، منصور، زید بن ابی انیسہ، مسعر، علاء بن مسیب، اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، شعبہ وغیرہ آپ کے زمرہ تلامذہ میں تھے[۲]۔

نماز میں اخلاص :

اس علم کے ساتھ وہ عمل کے زیور سے آراستہ تھے۔ نماز اس خضوع سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا پڑھتے ہی مغفرت ہو جائے گی۔ شعبہ بیان کرتے ہیں کہ جب جب میں نے عمرو بن مرہ کو نماز پڑھتے دیکھا، ہمیشہ یہی خیال ہوا کہ نماز سے لوٹنے سے قبل ہی ان کی قبولیت ہو جائے گی[۳]۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی مغفرت ہو جائے گی[۴]۔

وفات : ۱۱۶ھ میں وفات پائی۔ جنازہ میں عبدالملک بن میسرہ کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ وہ خیر البشر تھے[۵]۔

(۵۴) علقمہ بن قیسؒ

نام ونسب : علقمہ نام ہے۔ ابوشبل کنیت، مشہور محدث ابراہیم نخعی کے ماموں اور اسود بن یزید کے چچا تھے۔ نسب نامہ یہ ہے : علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک بن علقمہ بن سلامان بن کہیل بن بکر بن عوف بن نخع نخعی۔

پیدائش : آنحضرت ﷺ کے عہد میں پیدا ہوئے۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۱۲۔۱۳ ۲ ایضاً ص ۱۰۲ ۳ ابن سعد جلد ۶۔ ص ۲۲۰
۴ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۸ ۵ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۲۰

فضل وکمال: فضل وکمال اور زہد وورع کے لحاظ سے ممتاز تابعین میں تھے۔

انہوں نے زمانہ ایسا پایا کہ بہت سے اکابر صحابہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ، سلمان فارسی، ابی مسعود بدریؓ، ابودرداء انصاری وغیرہ اکابر صحابہؓ موجود تھے۔ ان سے انہوں نے روایتیں کی ہیں۔ لیکن فقیہ الامت عبداللہ بن مسعودؓ کے سرچشمہ فیض سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ مستفید ہوئے تھے[1]۔ انہوں نے ان کو ابتداء سے انتہا تک تعلیم دی۔

اسود کا بیان ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ علقمہ کو جس طرح قرآن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرح تشہد کی تعلیم دیتے تھے[2]۔ ان کی اس توجہ اور فیض بخشی سے علقمہ، ابن مسعودؓ کا مثنیٰ بن گئے تھے۔ ابن مسعودؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کچھ پڑھتا اور جانتا ہوں وہ سب علقمہ پڑھتے اور جانتے ہیں[3]۔ ان کے علمی کمالات پر تمام علماء ومحدثین کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ اور امام بارع تھے[4]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ علقمہ بلند مرتبہ جلیل القدر اور صاحب کمال فقیہ تھے[5]۔

قرآن: علقمہ کو قرآن، حدیث اور فقہ جملہ علوم میں یکساں کمال حاصل تھا۔ قرآن کی تعلیم مسعودؓ سے حاصل کی تھی۔ کان جود القرآن علی مسعود[6] ابن مسعودؓ کبھی کبھی اپنے قرأت کی صحت کے لئے خود علقمہ کو قرآن پڑھ کر سناتے تھے۔

علقمہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے مجھ سے کہا کہ تم سورۂ بقرہ میں میری گرفت کرو، چنانچہ اسے سنا کر مجھ سے پوچھا، میں نے کچھ چھوڑا تو نہیں۔ میں نے کہا ایک حرف چھوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ہی کہا فلاں حرف، میں نے کہا ہاں[7]۔

نہایت خوش گلو اور شیریں آواز تھے۔ اس لئے ابن مسعودؓ انہیں ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ خدا نے مجھے خوش آوازی عطا فرمائی ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ مجھ سے قرآن پڑھوا کر سنتے اور فرماتے، میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، خوش آوازی کے ساتھ پڑھا کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ حسن صوت قرآن کی زینت ہے[8]۔

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز، ۲۰۱۳ء، ص۱۱۱　[2] طبقات ابن سعد، جلد ۶، ص ۵۹　[3] تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۱۴۱
[4] ایضاً، ص ۱۴۲　[5] تہذیب الاسماء، جلد اول، ص ۳۴۲　[6] تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۱۴۱
[7] ابن سعد، جلد ۶، ص ۶۰　[8] ایضاً

حدیث : حدیث کے وہ نہایت ممتاز حفاظ میں تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ جو چیز ایک دفعہ یاد کر لی وہ گویا کتاب میں محفوظ ہو گئی۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے جو چیز جوانی کے زمانہ میں یاد کی اس کو اس طرح پڑھتا ہوں گویا ورق میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھتا ہوں۔ اس حافظہ کے ساتھ انہیں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، سعدؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابو درداءؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے اکابر اور علماء صحابہ سے استفادہ کا موقع ملا [1]۔

ان بزرگوں کے فیض نے انہیں حدیث کا بڑا حافظ بنا دیا۔ علامہ ابن سعد ان کو کثیر الحدیث [2] اور حافظ ذہبی امام بارع لکھتے ہیں [3]۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث کو بیشتر حصہ بلکہ قریب قریب کل علقمہ کے سینہ میں محفوظ تھا [4]۔

روایتِ حدیث میں احتیاط :

لیکن اس وسعتِ علم کے باوجود وہ محدث بننا اور اس کے ذریعہ عظمت و جاہ حاصل کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ ابن مسعودؓ کے انتقال کے بعد لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ اب آپ سنت کی تعلیم کے لئے بیٹھئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم لوگ چاہتے ہو کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے چلیں [5]۔

تلامذہ : حدیث میں ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ عبدالرحمن بن یزید، ابراہیم ابن سعد، امام شعبی، ابو وائل نخعی، شقیق بن سلمہ بن کہیل، قیس رومی، قاسم بن مخیمرہ، ابو اسحٰق سبیعی وغیرہ ان کے تلامذہ میں ہیں۔ ان میں ان کے بھانجے ابراہیم نخعی اور بھتیجے اسود بن یزید خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں [6]۔

فقہ : فقہ کا فن بھی انہوں نے فقیہ الامت ابن مسعودؓ سے حاصل کیا تھا۔ اس لئے اس میں امامت واجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ کان فقیہا اماما بارعا [7]۔ امام نووی صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں [8]۔

وسعت علم : وسعتِ علم کے اعتبار سے علقمہ ابن مسعودؓ کے ممتاز اصحاب میں سے تھے۔ ابن مدائنی کا بیان ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علم کے بڑے حاملین علقمہ، اسود، عبیدہ اور حارث تھے [9]۔ ان میں علقمہ سب پر فائق تھے۔ ابراہیم کا بیان ہے کہ ابن مسعود کے چھ اصحاب لوگوں کو درس اور

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۲ ۲۔ ایضاً ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۱ ۴۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۰
۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۷ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۱ ۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۳۴۲
۸۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۷

سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ ان میں دو علقمہ اور اسود تھے۔ ابو الہذیل نے پوچھا، ان دونوں میں کون افضل تھا۔ انہوں نے علقمہ کا نام لیا[1]۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ سند کہ جو کچھ میں پڑھتا ہوں اور جانتا ہوں، وہ سب علقمہ پڑھتے اور جانتے ہیں۔ ان کے وسعتِ علم کے لئے کافی ہے۔

صحابہ کا استفادہ :

ان کا علمی کمال اتنا مسلم تھا کہ صحابہ رسول ﷺ تک ان سے استفادہ کرتے تھے۔ جو ایک تابعی کے لئے بہت بڑا طغراء امتیاز ہے[2]۔ ابو ظبیان کا بیان ہے کہ میں نے متعدد صحابہ رسول ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ علقمہ سے مسائل پوچھتے تھے اور استفادہ کرتے تھے[3]۔

فضائل اخلاق :

عادات و خصائل اور اخلاق میں علقمہ ذاتِ نبوی کا نمونہ تھے۔ ابراہیم کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ طور طریق اور عادات و خصائل میں نبی کریم ﷺ کے مشابہ تھے، اور علقمہ عبد اللہ بن مسعودؓ کے مشابہ تھے۔ اس طرح گویا علقمہ رسول اللہ ﷺ کے مشابہ تھے[4]۔ علقمہ عادت و خصائل میں ابن مسعودؓ سے اس درجہ مشابہ تھے کہ جن لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا وہ علقمہ کو آئینۂ عمل میں ان کی تصویر دیکھ سکتے تھے[5]۔

زہد و عبادت : یہ مشابہت محض علم اور ظاہری خصائل تک محدود نہ تھی۔ بلکہ عمل میں بھی وہ ابن مسعودؓ کے ساتھ کامل مشابہت رکھتے تھے۔ ان کا شمار علمائے ربانیین میں تھا[6]۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ صاحب خیر و ورع تھے[7]۔

تلاوتِ قرآن : قرآن کے ساتھ ان کو غیر معمولی شغف و انہماک تھا۔ معمولاً چھ دن میں ایک قرآن ختم کرتے تھے[8]۔ کبھی کبھی ایک رات میں پورا قرآن پڑھ ڈالتے تھے۔

ابراہیم کا بیان ہے کہ علقمہ ایک مرتبہ مکہ گئے۔ شب کے وقت انہوں نے طواف شروع کیا۔ پہلے سات پھیروں میں انہوں نے طوال ختم کیں، دوسرے سات پھیروں میں مئین، تیسرے سات پھیروں میں مثانی اور چوتھے میں بقیہ سورتیں ختم کیں۔ اس طرح انہوں نے ایک شب میں طواف کی حالت میں پورا قرآن تمام کر دیا[9]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۷ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول ص ۴۱ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۸ [4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۸ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۷۔ ص ۲۷۷ [6] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۱ [7] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۲ [8] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۰ [9] ایضاً۔ ص ۵۹

قرآن کے ساتھ اس شیفتگی کا یہ نتیجہ تھا کہ آیات قرآنی ان کی زبان پر اس قدر جاری ہوگئی تھیں کہ عموماً ہر کام آیت قرآنی کے اشارے سے شروع کرتے تھے۔ کھانے کے وقت قرآن کی اس آیت فان طبن لکم عن شی منه نفساً فکلوه هنیئا مرئیا کی طرف اشارہ کرکے بیوی سے کھانا مانگتے کہ مجھے ان لذیذ اور خوشگوار کھانوں میں سے کھلاؤ[1]۔

رکاب پر پاؤں رکھتے ہوئے پڑھتے، **الحمد لله سبحان الذی سخرلنا هذا وما کنا له مقرنین و انا الی ربنا لمنقلبون**[2]۔

جہاد فی سبیل اللہ :

اس علم کے ساتھ جہاد کا بھی ولولہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ۳۲ھ میں امیر معاویہؓ کے ساتھ قسطنطنیہ کی مہم میں شریک ہوئے۔ اس مہم کے اکثر شرکاء آنحضرت ﷺ کی ایک پیشن گوئی کا مصداق بننے کے لئے جذبۂ شہادت سے مخمور تھے۔ ایک مجاہد معضد نے ایک برج پر حملہ کرتے وقت سر پر باندھنے کے لئے علقمہ سے چادر مستعار لی تھی۔ وہ خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ علقمہ کی چادر ان کے خون سے تربتر تھی۔ اس چادر کو بہت متبرک سمجھتے تھے اور اس کو اوڑھ کر جمعہ میں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے اس کو اس لئے اوڑھتا ہوں کہ اس میں معضد کا خون ہے[3]۔

شہرت سے نفرت : شہرت سے بہت گھبراتے تھے۔ اس سے بچنے کے لئے تعلیم و تعلم کے سلسلے میں کسی خاص مقام میں بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے۔ عبدالرحمن بن زبیر کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے علقمہ سے درخواست کی کہ آپ مسجد میں نماز پڑھتے اور بعد نماز وہاں بیٹھتے، تا کہ لوگ آپ سے مسائل پوچھا کرتے۔ فرمایا، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اشارہ کریں کہ یہ علقمہ ہے[4]۔

امرائے دولت سے دامن کشی :

امراء اور ارباب دول سے نہ صرف بے نیاز تھے اور ان سے دامن بچاتے تھے۔ بلکہ ان سے میل جول اور آمد و رفت رکھنا، اخلاقی نقصان تصور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ آپ امراء کے یہاں جایا کیجئے کہ وہ آپ کی حقیقت سے آگاہ ہوں اور آپ کا مرتبہ پہچانیں۔ فرمایا میں ان سے جتنی باتیں دور کروں گا اور جتنی چیزیں کم کروں گا، اس سے زیادہ چیزیں وہ مجھ سے گھٹا دیں گے[5]۔ یعنی میں جتنی ان کی برائیاں دور کروں گا، اتنی وہ میری بھلائیاں دور

---

[1] ابن سعد۔ ایضاً۔ ص ۵۸ [2] ایضاً۔ ۵۹ [3] ابن اثیر۔ جلد ۳ ص ۱۰۳ [4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۹
[5] ایضاً

کردیں گے۔ وہ نہ صرف خود امراء سے نہیں ملتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے تھے۔

ابو وائل کا بیان ہے کہ جب کوفہ اور بصرہ دونوں کی ولایت ابن زیاد سے متعلق ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ میں نے جا کر علقمہ سے پوچھا، انہوں نے کہا، ان لوگوں (امراء) سے تم کو جو حاصل ہوگا، اس سے زیادہ بہتر چیز وہ تم سے لیں گے[1] وفود وغیرہ کے سلسلے میں بھی وہ امراء کے دربار میں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک وفد میں جو امیر معاویہ کے پاس جانے والا تھا، ان کا نام لکھ دیا گیا۔ انہیں معلوم ہوا تو فوراً ابو بردہ کو لکھا کہ میرا نام کاٹ دو[2]

وفات: ۶۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ مرض الموت میں وصیت کی تھی کہ دم آخر کلمہ طیبہ کی تلقین کی جائے تاکہ میری زبان سے آخر کلمہ لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ نکلے۔ کسی کو موت کی خبر نہ دی جائے، ورنہ وہ زمانہ جاہلیت کا اشتہار بن جائے گی۔ دفن کرنے میں جلدی کی جائے۔ بین کرنے کرانے والی عورتیں ساتھ نہ ہوں[3]

(۵۵) قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ

نام و نسب: قاسم نام ہے۔ ابو محمد کنیت۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے محمد بن ابی بکرؓ کے فرزند ہیں۔ ان کی ماں سودہ ام ولد تھیں۔ قاسم اپنے علمی اور اخلاقی لحاظ سے مدینہ کے ممتاز ترین بزرگوں میں تھے۔

یتیمی اور پھوپھی کی آغوش میں پرورش:

حضرت عثمان غنیؓ کی مخالفت اور شہادت کے سلسلہ میں محمد بن ابی بکرؓ کا نام تاریخ اسلام میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ وہ حضرت عثمان غنیؓ کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔ بلکہ قاتلین عثمان کے سرغنہ ان ہی کو بتایا جاتا ہے[1]

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ کے ساتھ ہو گئے، اور ان کے اور امیر معاویہ کے اختلافات میں حضرت علی مرتضیٰ کے پرجوش حامیوں میں رہے۔ ان کی ان خدمات کے صلہ میں حضرت علی نے ان کو مصر کا والی بنا دیا۔ جب امیر معاویہؓ کی جانب سے عمرو بن العاصؓ نے مصر پر فوج کشی کی، اس وقت محمد بن ابی بکر کام آ گئے۔

۱؎ ابن سعد، جلد ۶، ص ۶۱ ۲؎ ایضاً ۳؎ تہذیب ص ۵۹-۶۲ ۴؎ ایضاً ص ۶۲

قاسم اس وقت بہت کم سن تھے۔ اس لئے ان کی پھوپھی اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کو اپنے آغوش شفقت میں لے لیا اور بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ قاسم اس زمانہ کے بعض واقعات جو ان کے حافظہ میں رہ گئے تھے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ ہماری پھوپھی عائشہؓ عرفہ کی شب کو ہم لوگوں کے سر منڈواتی تھیں اور ہمیں ٹوپی پہنا کر مسجد بھیجتی تھیں اور دوسرے دن صبح کو ہم لوگوں کی طرف سے قربانی کرتی تھیں[1]۔

فضل وکمال: حضرت عائشہ صدیقہؓ وہ مخدومہ علم تھیں، جن کے ادنیٰ ترین خدام مسند علم وعمل کے وارث ہوئے، قاسم تو گویا محبوب فرزند تھے۔ ان کی تربیت نے ان کو علم وعمل کا مجمع البحرین بنادیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت وعالی مرتبت فقیہ، امام اور بڑے حافظ حدیث اور متورع تھے[2]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت توثیق اور امامت پر سب کا اتفاق ہے[3]۔

تفسیر: انہیں جملہ علوم میں پورا درک تھا، لیکن کلام الٰہی کی تفسیر میں بڑے محتاط تھے۔ اس لئے انہوں نے بحیثیت مفسر کے کوئی شہرت حاصل نہیں کی۔ وہ غایت احتیاط میں تفسیر ہی نہ بیان کرتے تھے[4]۔

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ذات سرچشمہ حدیث تھی۔ قاسم زیادہ تر اسی سرچشمہ سے سیراب ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ انہوں نے دوسرے سامعین حدیث میں ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ سے بھی پورا استفادہ کیا تھا۔ ان کا خود بیان ہے کہ میں بحر ابن عباسؓ کے پاس بیٹھتا تھا۔ ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ کے پاس بیٹھتا تھا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ ابن عمرؓ کے پاس ایسا علم وورع تھا اور ایسی نادر معلومات تھیں جو اور کہیں نہیں حاصل ہو سکتی تھیں[5]۔

ان بزرگوں کے علاوہ ابن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، معاویہؓ، عبداللہ بن جناب، رافع بن خدیجؓ، اسلم مولیٰ عمر وغیرہ سے بھی سماع حدیث کیا تھا[6]۔ ان بزرگوں کے فیض نے ان کو ممتاز حافظ حدیث بنادیا تھا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ کثیر الحدیث تھے[7]۔ حافظ ذہبی انہیں حفاظ حدیث میں امام اور قدوہ لکھتے ہیں[8]۔ ابو الزناد کہتے تھے کہ میں نے قاسم سے زیادہ سنت کا عالم نہیں دیکھا[9]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۹ ۲۔ ایضاً ۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۵۵ ۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۹
۵۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۵۵ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۳ ۷۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۹
۸۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۴ ۹۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد اول۔ ص ۸۴

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی احادیث کے خصوصیت کے ساتھ بڑے حافظ تھے۔ خالد بن بزاز کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ کی احادیث کے تین بڑے واقف کار تھے۔ قاسم، عروہ اور عمرہ[1]۔

ان کی روایات کا درجہ :

محدثین اور ارباب فن کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ان کی روایات طلائے خالص کا حکم رکھتی ہیں۔ ابن معین کا بیان ہے کہ عبید اللہ بن عمر عن قاسم عن عائشہؓ کا سلسلہ روایت طلائے خالص ہے[2]۔

مذاکرۂ حدیث :

روزانہ شب کو بعد عشاء وہ اور ان کے ساتھی مل کر حدیث خوانی کرتے تھے[3]۔

روایت حدیث میں احتیاط :

روایت حدیث کے باب میں اتنے محتاط تھے کہ روایت میں الفاظ کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔ اسی احتیاط کی بناء پر وہ حدیثوں کو قلم بند کرنا پسند نہ کرتے تھے[4]۔

تلامذہ : حدیث میں ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے ممتاز آئمہ تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ عبد الرحمن بن قاسم، امام شعبی، سالم بن عبداللہ بن عمر، سعید انصاری کے لڑکے یحیٰی سعید بن ابی ملیکہ، نافع مولیٰ ابن عمر، امام زہری، عبید اللہ بن عمر، ایوب ابن جون اور مالک بن دینار وغیرہ[5]۔

فقہ : قاسم کا خاص فن فقہ تھا۔ اس میں ان کو درجۂ امامت و اجتہاد حاصل تھا۔ ان کے فقہی کمال کی سب سے بڑی سند ہے کہ وہ مدینہ کے سات مشہور اور ممتاز فقہاء میں سے ایک تھے[6]۔

فقہ بھی انہوں نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ صدیقہؓ، ابن عمرؓ، اور ابن عباسؓ سے حاصل کی تھی۔ فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ مستقل فتویٰ دیتی تھیں اور میں ان کے ساتھ رہتا تھا[7]۔ اس عہد کے تمام علماء ان کے تفقہ کے معترف تھے۔ ابی الزناد کہتے تھے کہ میں نے قاسم سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔ امام مالک فرماتے تھے کہ قاسم اس امت کے فقہاء میں تھے[8]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۴ [2] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۵۵ [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۰
[4] ایضاً [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۳ [6] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۵۵
[7] ایضاً۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۵۵ [8] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۵

فتاویٰ میں احتیاط :

اس فقہی کمال کے باوجود وہ حدیث کی طرح فقہ میں بھی بڑے محتاط تھے اور بغیر علم کے کوئی بات کہنا یا کسی مسئلہ کا جواب دینا نہایت بُرا سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ خدا کے فرض احکام جان لینے کے بعد انسان کا جاہل رہنا، اس سے بہتر ہے کہ وہ بغیر علم کے کوئی بات کہے۔ جو مسئلہ ان کے علم میں نہ ہوتا اس کے جواب میں بلا تکلف لاعلمی ظاہر کر دیتے۔

ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا، مجھے اس کے متعلق کوئی واقفیت نہیں ہے۔ صرف عیاں اور کھلے ہوئے مسائل کا جواب دیتے تھے۔ جن مسائل کا اپنی رائے سے جواب دیتے، اس میں یہ صراحت کر دیتے کہ یہ میری رائے ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ یہ حق ہے[1]۔

حلقۂ درس : مسجد نبوی میں قاسم کا حلقۂ درس تھا۔ ان کی اور سالم بن عبداللہ بن عمر کی مجلس ایک ہی تھی۔ ان کے بعد ان کے لڑکے عبدالرحمن سالم کے بھائی عبیداللہ بن عمرؓ اس مجلس میں بیٹھتے تھے۔ پھر ان دونوں کے بعد اس مقام پر امام مالک کی مسند بچھتی۔ یہ جگہ روضۂ نبوی اور منبر نبوی کے درمیان خوخہ عمر کے سامنے تھی[2]۔ قاسم صبح سویرے درس و افتاء کے لئے مسجد میں آجاتے تھے اور دو رکعتیں پڑھ کر مجلس میں بیٹھتے تھے، اس وقت لوگوں کو جو کچھ پوچھنا ہوتا پیش کرتے[3]۔

معاصرین کا اعتراف کمال :

اس عہد کے تمام علماء اور ارباب کمال قاسم کے کمالات علمی کے معترف تھے۔ یحییٰ بن سعید انصاری کہتے تھے کہ ہم نے مدینہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں پایا، جس کو قاسم پر فضیلت دی جا سکے۔ ابوالزناد کہتے تھے کہ قاسم اپنے زمانہ کے سب سے بڑے جاننے والے تھے۔ ایوب سختیانی کہتے تھے کہ میں نے قاسم سے افضل آدمی کسی کو نہیں دیکھا[5]۔

علمی انکساری اور معاصرین کا احترام :

اس علمی علوئے مرتبت کے باوجود انہیں اپنی برتری کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ اپنے سے کم پایہ معاصرین کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ کسی موقع پر بھی ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہ نکلنے پاتا جس سے ان کے کسی معاصر کی خفیف سی سبکی کا بھی احتمال ہو سکتا ہو۔ اس احتیاط کی وجہ سے وہ بعض مواقع پر عجب نازک صورتِ حال میں پھنس جاتے تھے۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۴ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۹ [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۰
[4] ایضاً۔ ص ۱۴۱ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۵

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ان سے سوال کیا، آپ بڑے عالم ہیں یا سالم۔ اس سوال کے جواب دینے میں بڑی کشمکش پیش آئی۔ اگر اظہار واقعہ کرتے تھے تو اپنی زبان سے اپنی تعریف ہوتی تھی اور اگر سالم کو کہتے تو جھوٹ ہوتا تھا۔ اس لئے پہلے تو انہوں نے سبحان اللہ کہہ کر ٹالا۔ لیکن جب اعرابی نے دوبارہ پوچھا تو آپ نے کہا سالم موجود ہیں ان سے جا کر پوچھ لو [۱]۔

فضائل اخلاق : قاسم میں جس پایہ کا علم تھا، اسی درجہ کا عمل بھی تھا۔ اُن کی ذات جملہ فضائل کی جامع تھی۔ وہ اپنے جدِ بزرگوار حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا مثنیٰ تھے۔ زبیر کہتے تھے کہ ابوبکر ؓ کی اولاد میں میں نے اس نوجوان (قاسم) سے زیادہ ان سے مشابہ کسی کو نہیں پایا [۲]۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ان کے علمی اور اخلاقی کمالات کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے، کاش خلافت قاسم کے لئے ہوتی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر خلافت کا فیصلہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں قاسم کو خلیفہ بنا دیتا [۳]۔ عمرؒ بن عبدالعزیز کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے۔ قاسم بہت کم گو، کم سخن اور خاموش طبیعت تھے۔ جب عمرؒ بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو اہلِ مدینہ نے کہا اب کنواری (قاسم) بولے گی [۴]۔

زہد وورع : زہد وورع کے اعتبار سے بھی ممتاز ترین تابعین میں تھے۔ علامہ ابن سعد ان کو ورع عجلی خیار تابعین میں اور رجل صالح لکھتے ہیں۔ ابن حبان ان کو سادات تابعین میں اور افضل زمانہ میں شمار کرتے ہیں [۵]۔

عالم پیری میں بھی رمی جمار کے لئے پاپیادہ جاتے تھے۔ ربیعہ بن ابی عبدالرحمن کا بیان ہے کہ قاسم جب زیادہ ضعیف ہو گئے تھے، اس وقت وہ اپنی اقامت گاہ سے منیٰ تک سواری پر آتے، پھر یہاں سے جمار تک پاپیادہ جاتے تھے۔ رمی کرنے کے بعد مسجد تک پیدل واپس آتے تھے، پھر یہاں سے سوار ہو کر گھر واپس جاتے [۶]۔

دولت سے بے نیازی :

دولت دنیا سے وہ اتنے بے نیاز تھے کہ اس کے لئے کسی عزیز کا احسان بھی لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ سلیمان بن قتیبہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عمر بن عبید اللہ نے عبداللہ بن عمرؓ اور قاسم بن محمد کے پاس میرے ہاتھ ایک ہزار دینار بھیجے۔ ابن عمرؓ نے لے لئے اور شکریہ ادا کیا کہ عمر بن عبید نے

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۴ ۲؎ ایضاً ۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۵
۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۳۵ ۵؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۱ ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔
ص ۳۳۵ و تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۵۵

صلہ رحم سے کام لیا۔ اس وقت مجھ کو اس کی ضرورت تھی۔ لیکن قاسم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی بیوی کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ عمر بن عبید اللہ کے ساتھ ہم دونوں کا رشتہ برابر کا ہے اگر قاسم ان کے چچیرے بھائی ہیں تو میں ان کی پھوپھیری بہن ہوں، ان کے اس کہنے پر میں نے ان کو روپیہ دے دیا[1]۔

اعتراف حق : حق پرست ایسے تھے کہ اپنے باپ کی غلطی کو بھی غلطی سمجھتے تھے اور ان کی مغفرت کے لئے خدا سے دعا کرتے تھے۔ یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے والد محمد بن ابی بکرؓ حضرت عثمان غنیؓ کے شدید مخالفین میں تھے اور باغیوں کے ساتھ کاشانۂ خلافت میں گھس گئے تھے۔ قاسم ان کی اس غلطی کو مانتے تھے اور ان کے لئے سجدہ میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے تھے کہ خدایا عثمان کے معاملہ میں میرے والد کے گناہ بخش دے[2]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۰۲ھ یا ۱۰۸ھ میں انتقال کیا۔ مرض الموت میں کاتب کو بلا کر وصیت لکھنے کو کہا۔ اس نے بغیر بتائے ہوئے لکھ دیا کہ قاسم بن محمد وصیت کرتے ہیں کہ "سوائے خدا کوئی معبود نہیں"۔ قاسم نے سنا تو کہا کہ اگر آج کے دن سے پہلے ہم نے اس کی شہادت نہیں دی تو کتنے بد قسمت ہیں۔ کفن کے متعلق وصیت کی کہ میں جن کپڑوں میں نماز پڑھتا ہوں، اسی میں کفنایا جاؤں۔ اس میں قمیض، ازار بند اور چادر وغیرہ کفن کے تمام کپڑے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے نے کہا کیا آپ دو نئے کپڑے پسند نہیں کرتے۔ فرمایا، ابو بکرؓ بھی تین کپڑوں میں کفنائے گئے تھے۔ مُردوں کے مقابلہ میں زندوں کو نئے کپڑوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان وصایا کے بعد قدید میں انتقال کیا اور اس سے تین میل فاصلہ پر مقام مشلل میں سپرد خاک کئے گئے۔ انتقال کے وقت ستر یا بہتر سال کی عمر تھی[3]۔

ترکہ : وفات کے وقت ایک لاکھ نقد چھوڑا۔ جس میں ناجائز آمدنی کا ایک حبہ بھی نہ تھا[4]۔

حلیہ ولباس : آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ سر اور ڈاڑھی میں حنا کا خضاب کرتے تھے۔ چاندی کی انگوٹھی پہنتے تھے، جس پر ان کا نام کندہ تھا۔ لباس نفیس اور خوش رنگ استعمال کرتے تھے۔ جبہ، عمامہ اور رداء وغیرہ سارے کپڑے عموماً خز کے ہوتے تھے۔ خز کے علاوہ قیمتی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ چادر بوٹے دار اور رنگین ہوتی تھی۔ عمامہ سپید ہوتا تھا۔ زعفرانی رنگ زیادہ پسند خاطر تھا۔ کبھی کبھی سبز بھی استعمال کرتے تھے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۱ [2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۱۸ [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۴۳
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۵

(۵۶) قبیصہ بن ذویبؒ

نام ونسب : قبیصہ نام ہے۔ابواسحٰق کنیت۔نسب نامہ یہ ہے : قبیصہ بن ذویب بن حلحلہ بن عمرو ابن کلیب بن حرام بن عبداللہ بن قمیر بن حبیشہ بن سلول بن کعب بن عمرو خزاعی۔

پیدائش : فتح مکہ کے سال پیدا ہوئے۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہجرت کے سال ولادت ہوئی،لیکن پہلی روایت زیادہ مشہور ہے [۱]۔

عبدالملک کا عہد : شروع میں مدینہ میں رہتے تھے،پھر شام میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ عبدالملک کے زمانہ میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔خاتم برداری اور برید دو[۲] دو[۲] عہدے ان سے متعلق تھے۔ممالک محروسہ سے جو خطوط اور خبریں موصول ہوتی تھیں،ان کو پڑھ کر عبدالملک کے سامنے پیش کرتے تھے [۲]۔

فضل وکمال : قبیصہ مدتوں مدینہ میں رہے تھے۔ان کے زمانہ میں وہاں صحابہ کی بڑی جماعت موجود تھی۔اس کے فیض سے محروم نہ رہے۔ان کا شمار علمائے تابعین میں ہے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور علمی جلالت پر سب کا اتفاق ہے [۳]۔بڑے بڑے ہمعصر علماء ان کے علمی کمالات کے معترف تھے۔مکحول شامی کہتے تھے کہ میں نے قبیصہ سے بڑا جاننے والا نہیں دیکھا [۴]۔ابن شہاب زہری کہتے تھے کہ وہ اس اُمت کے علماء میں تھے [۵]۔

حدیث : حدیث میں علامہ ابن سعد ثقة مامون اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں [۶]۔ حدیث میں انہوں نے بلالؓ، عثمانؓ بن عفان، حذیفہ بن یمانؓ، عبدالرحمٰن بن عوف، زیدؓ بن ثابت، عبادہ بن صامت، عمرو بن العاصؓ، محمد بن سلمہؓ، تمیم داریؓ، ابو درداءؓ انصاری، مغیرہ بن شعبہؓ، ابو ہریرہؓ، اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اور اُم سلمہؓ وغیرہ سے استفادہ کیا تھا۔

ان سے استفادہ کرنے والوں میں امام زہری، رجاء بن حیوۃ، عبداللہ بن ابی مریم، مکحول اور ابو قلابہ جرمی وغیرہ لائق ذکر ہیں [۷]۔

---

۱ تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ص ۶۵ ۲ ابن سعد،جلد ۵۔ص ۱۳۱ ۳ تہذیب الاسماء۔جلد ۵۔ص ۱۳۱
۴ ایضاً ۵ تہذیب التہذیب۔جلد ۸۔ص ۳۴۶ ۶ ابن سعد۔جلد ۵۔ص ۱۳۱
۷ تہذیب التہذیب۔جلد ۸۔ص ۳۴۶

فقہ : فقہ میں بھی درک رکھتے تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ مدینہ کے فقہاء اور صالحین میں تھے[۱]۔ ابوالزناد انہیں فقہاء میں شمار کرتے تھے[۲]۔ زید بن ثابتؓ کے فیصلوں کے بڑے عالم تھے، شعبی کا بیان ہے، کہ وہ زید بن ثابتؓ کے سب سے بڑے عالم تھے[۳]۔

وفات : ابن سعد کے بیان کے مطابق ۸۶ھ میں وفات پائی[۴]۔

(۵۷) قتادہ بن دعامہ سدوسیؒ

نام ونسب : قتادہ نام ہے۔ ابوالخطاب کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : قتادہ بن دعامہ بن قتادہ بن عزیز بن عمرو بن ربیعہ بن عمرو بن حارث بن سدوس سدوسی۔

قتادہ علمی اعتبار سے اجلۂ تابعین میں تھے۔

پیدائش : ۶۱ھ میں پیدا ہوئے[۵]۔

ذوقِ علم : قتادہ کو علم کے ساتھ فطری مناسبت تھی۔ حصول علوم کا ذوق بچپن سے لے کر بڑھاپے تک یکساں رہا۔ مطر الوراق کا بیان ہے کہ قتادہ مرتے دم تک طالب العلم رہے۔

قوت حافظہ : اس ذوق وشوق کے ساتھ انہوں نے حافظہ نہایت قوی پایا تھا۔ ایک مرتبہ جو چیز سن لیتے تھے، وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حدیث سننے کے بعد کبھی کسی محدث سے دوبارہ اس کو سننے کی خواہش نہیں کی۔ ایک مرتبہ جو بات کانوں میں پڑ گئی، وہ ہمیشہ کے لئے قلب کے خزانہ میں محفوظ ہو گئی۔ ان کے حافظہ کی نہایت حیرت انگیز واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ لائق ذکر ہے۔

عمران بن عبداللہ کا بیان ہے کہ قتادہ ایک مرتبہ سعید بن مسیب کے پاس آئے اور چند دنوں قیام کر کے ان سے دل کھول کر اچھی طرح حدیثیں پوچھتے اور بکثرت سوالات کرتے رہے۔ ایک دن ابن مسیب نے ان سے پوچھا کہ تم نے جو باتیں مجھ سے پوچھیں ہیں کیا وہ سب تم کو یاد ہیں۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور پوچھے ہوئے مسائل کو دہرانا شروع کیا کہ میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا، آپ نے یہ جواب دیا تھا۔ میں نے یہ سوال کیا تھا، آپ نے یہ بتایا تھا

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۲۷ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۲ ۳ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۳۱
۴ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۰ ۵ ایضاً ص ۳۵۳ ۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹

اور حسن بصری نے یہ جواب دیا تھا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ان حدیثوں کا بیشتر حصہ جوان سے سنا تھا دہرا دیا۔ ابن مسیب کو اس وقت قوت حافظہ پر سخت حیرت ہوئی۔ فرمایا میں نہیں گمان کر سکتا تھا کہ خدا نے تمہارے جیسا شخص بھی پیدا کیا ہے[1]۔

فضل و کمال : اس ذوق وشوق، تلاش وجستجو اور قوتِ حافظہ نے ان کو قرآن، حدیث فقہ، زبان، لغت، ایام عرب اور نسب وغیرہ، اس عہد کے جملہ مذہبی اور غیر مذہبی علوم کا دریا بنا دیا تھا[2]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت شان اور فضیلت علمی پر سب کا اتفاق ہے۔

قرآن : قرآن کے حافظ تھے اور نہایت اچھا یاد تھا۔ بڑی بڑی سورتوں میں ایک لفظ کی غلطی نہ ہوتی تھی۔ معمر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قتادہ نے سعد بن ابی عروبہ کو قرآن دے کر سورہ بقرہ سنائی اور اس میں ایک حرف کی غلطی نہیں کی۔ سنانے کے بعد ان سے پوچھا، کیوں میں نے ٹھیک یاد کیا۔ انہوں نے کہا۔ ہاں[3]۔

تفسیر : تفسیر قرآن کے وہ بہت بڑے عالم تھے۔ آیات قرآنی کی تفسیر وتاویل میں ان کی نظر نہایت وسیع تھی[4]۔ وہ خود کہتے تھے کہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے، جس کے متعلق میں نے کچھ نہ کچھ نہ سنا ہو۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ تفسیر کے بڑے عالم تھے[5]۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ قرآن کے سب سے بڑے جاننے والے تھے[6]۔ ابن ناصر الدین ان کو مفسر الکتاب لکھتے ہیں[7]۔

حدیث : قتادہ کا اصل فن حدیث تھا۔ اس میں وہ نہایت بلند پایہ رکھتے تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ حدیث میں وہ ثقہ مامون اور حجت تھے[8]۔ حافظ ذہبی انہیں حافظ وعلامہ کے نام سے یاد کرتے ہیں[9]۔ عراق کے سب سے بڑے حافظ مانے جاتے تھے۔

ابن مسیب کہتے تھے کہ ہمارے ہاں قتادہ سے بڑا عراق کا کوئی حافظ نہیں آیا۔ سفیان کہتے تھے کہ دنیا میں قتادہ کا مثل نہ تھا۔ بکر بن عبداللہ کہتے تھے کہ جو شخص سب سے بڑے حافظ اور ایسے شخص کو دیکھنا چاہے جو حدیث کو بعینہ اسی طرح جس طرح اس نے سنا ہے، روایت کرتا ہو تو اسے قتادہ دیکھنا چاہئے۔

۱۔ ابن سعد جلد ۶۔ ق ۲۔ ص ۲　۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹　۳۔ ابن سعد، جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱
۴۔ تذکرہ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹　۵۔ ایضاً　۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۵　۷۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳　۸۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱　۹۔ تذکرہ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹

عبدالرحمن بن مہدی کہتے تھے کہ قتادہ حمید کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ ہیں[1]۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ باشندگانِ بصرہ میں سب سے بڑے حافظ تھے جو چیز بھی سنتے تھے، اس کو یاد کر لیتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے سامنے جابر کا صحیفہ پڑھا گیا۔ ایک ہی مرتبہ سن کر اس کو یاد کر لیا[2]۔ ابن حبان ان کو ان کے عہد کا سب سے بڑا حافظ حدیث شمار کرتے ہیں۔ سلیمان تیمی اور ایوب سختیانی جیسے محدثین ان کی احادیث کے محتاج تھے، اور ان سے پوچھا کرتے تھے[3]۔

شیوخ: قتادہ کے اصل شیخ حسن بصری تھے۔ زیادہ تر وہ انہیں کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے تھے۔ بارہ سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں بارہ برس تک حسن بصری کی خدمت میں بیٹھا اور تین برس تک نماز فجر ان کے ساتھ پڑھی۔ میرے جیسے شخص نے ان کے جیسے شخص سے علم حاصل کیا ہے۔ حسب بصری کے سب سے ممتاز تلامذہ میں یہی تھے۔ ابو حاتم کہتے تھے کہ حسن کے سب سے بڑے اصحاب میں قتادہ تھے[4]۔

حضرت حسن بصری کے علاوہ اس عہد کے تمام ممتاز محدثین انس بن مالک، ابو سعید خدریؓ، عمران ابن حصینؓ، سعید بن مسیب، عکرمہ، ابو بردہ بن ابی موسیٰ، شعبی، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، مطرف بن شخیرہ وغیرہ صحابہ اور تابعین کی ایک کثیر جماعت سے سماع حدیث کیا تھا[5]۔

ان کا یہ خاص کمال تھا کہ جس محدث کے پاس پہنچ جاتے تھے، چند ہی دنوں میں اس کا علم پی لیتے تھے۔ ایک مرتبہ سعید بن مسیب کے پاس جا کر چند دنوں کے لئے قیام کیا اور ان سے اس قدر سوالات کئے کہ انہوں نے آٹھ ہی دن کے اندر گھبرا کر ان سے کہا کہ اب جاؤ تم نے میرا سارا علم خالی کر لیا[6]۔

تلامذہ: ان کے کمالات کی وجہ سے ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی تھی۔ سینکڑوں تشنگان علم ان کے حلقہ درس سے سیراب ہوئے۔ ان کی فہرست نہایت طویل ہے۔ بعض قابلِ ذکر نام یہ ہیں: ایوب سختیانی، سلیمان تیمی، جریر بن حازم، شعبہ، مسعر، ابو بلال راسبی، مطر الوراق، ہمام بن یحییٰ، عمرو بن حارث المصری، شیبان نحوی، سلام بن ابی المطیع، سعید بن ابی عروبہ ابان، ابن یزید العطار، حصین بن ذکوان، حماد بن سلمہ، اوزاعی، عمرو بن ابراہیم عبدی اور عمران القطان وغیرہ[7]۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۵۷۔ ۵۸ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۱ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۳ [4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۱ [6] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲ [7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۲

فقہ : فقہ میں بھی امتیازی پایہ رکھتے تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ قرآن اور فقہ کے بڑے علماء میں تھے[۱]۔ امام احمد بن حنبل[۲] ان کے تفسیر و حدیث کے کمال کے ساتھ ان کے فقہی کمال کے بھی معترف تھے[۳]۔ بصرہ کی جماعتِ افتاء کے ایک معزز رکن تھے[۴]۔

رائے سے احتراز : ان کے کمالات کے باوجود فتویٰ دینے میں بڑے محتاط تھے۔ جو مسئلہ نہ معلوم ہوتا نہایت صفائی کے ساتھ اپنی لاعلمی ظاہر کر دیتے۔ اپنی رائے سے کبھی جواب نہ دیتے۔ ابو ہلال کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ قتادہ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا اپنی رائے بتا دیجئے، جواب دیا کہ "میں نے چالیس سال سے اپنی رائے سے کوئی جواب نہیں دیا ہے[۵]۔

جامعیت : قتادہ کی جیسی جامعیت کم تابعین میں تھی۔ وہ تنہا مذہبی علوم کے عالم نہ تھے بلکہ اس عہد کے دوسرے مروجہ فنون مثلاً عربی، لغت، ایام عرب اور نسابی کے بھی بڑے ماہر تھے۔ ابو عمر کا بیان ہے کہ وہ بڑے نساب تھے۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ بنی اُمیہ کے پاس سے روزانہ کوئی نہ کوئی آدمی قتادہ کے پاس خبر، نسب یا شعر کے متعلق کچھ نہ کچھ پوچھنے کے لئے آتا تھا۔ ابن ناصر الدین ان الفاظ میں ان کی جامعیت پر تبصرہ کرتے تھے[۶]۔

"ابو الخطاب الضریر الاکمه مفسر الکتاب اية في الحفظ اما ما في النسب راسا في العربية واللغة وايام العرب"[۷]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں وفات پائی[۸]۔

(۵۸) کعب احبارؒ

نام و نسب : کعب نام ہے۔ ابو اسحٰق کنیت۔ نسباً یمن کے مشہور حمیری خاندان کی شاخ آل ذی رعین سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے: کعب بن ماتع بن ہینوع بن قیس معن بن حشم بن عبد شمس بن وائل بن عوف بن حمیر بن عوف بن زہیر بن ایمن بن حمیر بن سبا حمیری۔

اسلام اور ورودِ مدینہ : کعب مشہور تابعی ہیں۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ یہود کے جید علماء میں تھے۔ عہد رسالت میں موجود تھے۔ بروایت صحیح اس زمانہ میں اسلام کی سعادت سے محروم رہے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۳۵۵　[۲] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹　[۳] ایضاً
[۴] اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۷　[۵] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱　[۶] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹
[۷] شذرات الذہب۔ جلد اول ص ۱۹۳　[۸] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۳

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی عہد میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ بروایت کعب شامی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ جب یمن آئے تو میں نے ان کے پاس جا کر رسول اللہ ﷺ کے اوصاف پوچھے۔ انہوں نے بتائے۔ میں سن کر مسکرایا۔ علیؓ نے مجھ سے مسکرانے کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا، ہمارے یہاں (نبی آخر الزمان کے) جو علامات بتائے گئے ہیں (رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ اس کی مطابقت پر مسکرایا۔ یہ سننے کے بعد میں مسلمان ہو گیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگا۔ لیکن قیامِ یمن ہی میں رہا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے عہد میں ہجرت کر کے مدینہ گیا۔ کاش میں نے اس سے پہلے ہجرت کی ہوتی[1]۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں اسلام کے شرف سے مشرف ہوئے[2]۔

لیکن دونوں روایتیں نہایت کمزور ہیں۔ اس باب میں صحیح ترین روایت وہ ہے جو ابن سعد میں کعب کے حلیف حضرت عباسؓ سے مروی ہے۔ جس سے خود کعب کی زبان سے عہدِ فاروقی میں ان کا اسلام لانا ثابت ہے۔

سعد بن مسیب کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ نے کعب کے اسلام کے بعد ان سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں قبولِ اسلام سے تمہارے لئے کیا چیز مانع تھی کہ اب عمر فاروق ؓ کے زمانہ میں اسلام لائے؟ انہوں نے جواب دیا، میرے والد نے مجھ کو تورات سے ایک تحریر لکھ کر دی تھی اور ہدایت کر دی تھی کہ اس پر عمل کرنا، اور اپنی جملہ مذہبی کتابوں پر مہر لگا کر حق ابوت کا واسطہ دلا کر مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ مہر کو کبھی نہ توڑوں۔ اس لئے میں نے اُن کو نہیں توڑا اور والد جو تحریر دے گئے تھے اس کے مطابق عمل کرتا رہا۔

جب اسلام کی اشاعت اور اس کا غلبہ ہونے لگا اور کسی قسم کا خوف باقی نہیں رہ گیا، اس وقت میں نے دل میں خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے والد نے کچھ علم چھپایا ہے۔ مجھے ان کتابوں کو کھول کر دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ مہر توڑ کر کتابیں پڑھیں تو اُن میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کی اُمت کے اوصاف نظر آئے۔ اُس وقت مجھ پر اصل حقیقت روشن ہوئی۔ اس لئے اب آ کر میں مسلمان ہوا[3]۔

قبولِ اسلام کے بعد وہ آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے حلیف بن گئے تھے۔

---

[1] اصابہ۔ جلد ۵۔ ص ۳۲۲　[2] ایضاً　[3] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵۶

فضل وکمال : کعب یہود کے بڑے ممتاز اور نامور علماء میں تھے۔ یہودی مذہب کے متعلق ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف اور اہل کتاب کے علمائے کبار میں تھے[1]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کے وفورِ علم اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ اپنی وسعت علم کی وجہ سے "کعب الحبر" کہے جاتے تھے۔ ان کے مناقب بکثرت ہیں اور ان کے اقوال وحکمت بہت مشہور ہیں[2]۔ اکابر صحابہ ان کی وسعت نظری کے معترف تھے۔

حضرت ابو درداء انصاریؓ جن کا حمص میں کعب کا بڑا ساتھ رہا تھا، فرماتے تھے کہ ابن حمیریہ کے پاس بڑا علم ہے۔ امیر معاویہ کہتے تھے کہ ابو درداء حکماء میں ہیں اور کعب علماء میں ان کے پاس سمندر جیسا بے تھاہ علم تھا[3]۔

چونکہ ایک مذہب کے وہ بڑے عالم تھے[4]۔ اس لئے اسلامی علوم کے ساتھ بھی انہیں خاص مناسبت تھی۔ انہوں نے کتاب وسنت کی تعلیم صحابہ سے مدینہ میں حاصل کی تھی اور صحابہ نے ان سے اہلِ کتاب کے علوم سیکھے تھے[5]۔

کتاب وسنت میں انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے استفادہ کیا تھا، اور اسرائیلیات میں صحابہ میں ابو ہریرہؓ، معاویہ، ابن عباسؓ اور تابعین میں مالک بن ابی عامر اصبحی، عطاء بن ابی رباح، عبداللہ بن رباح انصاری، عبداللہ بن حمزہ سلول، ابورافع، صائغ، عبدالرحمن بن شعیب ایک کثیر جماعت ان سے فیضیاب ہوئی تھی[6]۔

علم وعلماء اور زوالِ علم :

ایک مرتبہ عبداللہ بن سلام نے ان سے پوچھا کہ کعب، علماء کون لوگ ہیں؟ جواب دیا جو علم جانتے ہیں۔ ابن سلام نے پوچھا کہ کون سی شے علماء کے دلوں سے علم زائل کر دے گی؟ فرمایا، طمع حرص اور لوگوں کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا تم نے سچ کہا[7]۔

شام کا قیام : کعب کا آبائی مذہب یہود تھا۔ اس لئے پہلے سے ان کو ارض شام کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ اسلام کے نزدیک بھی یہ سرزمین مقدس ومحترم ہے۔ اس لئے چند دنوں مدینہ میں قیام کرنے کے بعد شام چلے گئے تھے اور حمص میں سکونت اختیار کر لی تھی[8]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۵ ۲ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۹ ۳ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵۶
۴ اصابہ۔ جلد ۵۔ ص ۳۲۳ ۵ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۵ ۶ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۴۳۸
۷ اصابہ۔ ص ۳۲۴ ۸ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵۶

مواعظ: شام کے زمانہ قیام میں ان کا مشغلہ زیادہ تر اسرائیلی قصص کے مواعظ تھے۔ ایک مرتبہ عوف بن مالک نے دورانِ وعظ میں ان سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ امیر ماموراور مکلف کے علاوہ لوگوں کے سامنے اور کسی کو مواعظ و قصص نہ بیان کرنے چاہئیں، یہ سن کر کعب نے وعظ چھوڑ دیا۔ لیکن پھر امیر کے حکم سے کہنے لگے [۱]۔

اسلامی روایات میں اسرائیلیات کا شمول :

کعب کی علمی جلالت میں کوئی شک نہیں۔ وہ یہودی مذہب کے بڑے نامور عالم تھے، لیکن خود یہودیوں کا سرمایہ علم زیادہ تر قصص و حکایات تھیں۔ اس لئے کعب کا سرمایۂ معلومات بھی اسی پر مشتمل تھا۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ بہت سی بے سروپا اسرائیلی روایات اسلامی لٹریچر میں بھی سرایت کر گئیں۔ اسی بناء پر بعض آئمہ کعب کی روایات ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔

وفات : حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت ۳۲ھ میں شام میں وفات پائی [۲]۔

(۵۹) کعب بن ثورؒ

نام ونسب : کعب نام ہے۔ نسب نامہ یہ ہے : کعب بن سور بن بکر بن عبد بن ثعلبہ بن سلیم ابن ذہل بن لقیط بن حارث بن مالک بن فہیم بن غنم بن اوس بن عدنان بن عبداللہ ابن زہران بن کعب بن عبداللہ بن مالک بن نصر۔

قضاءت بصرہ : کعب سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ اس لئے ارباب رجال نے ان کے حالات نہیں لکھے ہیں۔ لیکن وہ ایک ممتاز تابعی ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ہم صحبت و ہم جلیس اور نہایت ذہین اور طباع تھے۔ ان کی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو عہدۂ قضاء پر مامور کیا تھا۔

ان کے تقرر کا واقعہ یہ ہے کہ کعب ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ میں آپ کے پاس دنیا کے ایک بہترین آدمی کی شکایت لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ کوئی آدمی عمل میں اس پر سبقت نہیں لے جا سکتا، اور اس کے جیسا عمل نہیں کر سکتا۔ وہ قیام لیل میں صبح کر دیتا ہے۔ روزے میں سارا دن گزار دیتا ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس

---

[۱] اصابہ۔ جلد ۵۔ ۳۲۳ [۲] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۵۶

عورت کو شرم دامنگیر ہوئی، اور اس کے آگے وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی کہ امیر المومنین مجھے معاف فرمایئے۔ آپ نے فرمایا، خدا تم کو جزائے خیر دے۔ تم نے اچھی تعریف کی، میں نے تم کو معاف کیا۔ اس کے بعد وہ عورت چلی گئی۔

اس کے واپس جانے کے بعد کعب نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ امیر المومنین، اس عورت نے آپ کے سامنے نہایت بلیغ پیرایہ میں شکایت پیش کی ہے۔ فرمایا، کیسی شکایت۔ کعب نے کہا اپنے شوہر کی (یعنی وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتا ہے، اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا) یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عورت کو بلوا کر کعب سے کہا، تم دونوں کا فیصلہ کر دو۔

کعب نے عرض کیا آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ فرمایا، جس چیز کو تم نے سمجھ لیا میں نہ سمجھ سکا، اس کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہئے۔ چنانچہ کعب نے کلام پاک کی اس آیت،

"فانکحوا ما طاب لکم من النساء"۔

"تم کو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو دو۲ تین۳ اور چار۴ تک"۔

سے اس استدلال پر کہ جب قرآن میں چار بیویوں کی اجازت ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر چار شبانہ یوم میں ایک شبانہ یوم ہر بیوی کا حق ہوا، تو تنہا ایک بیوی کا کم سے کم یہی حق ہوگا۔ اس عورت کے شوہر کو تین دن روزہ رکھنے اور ایک دن بیوی کے لئے افطار کرنے، اور تین رات عبادت کرنے اور ایک رات بیوی کے پاس رہنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ یہ استدلال سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ یہ (استدلال) میرے لئے پہلے (ذہانت) سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ چنانچہ اسی وقت ان کو بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا[1]۔

فتنہ سے اجتناب:

کعب بصرہ جانے کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ میں اختلاف رونما ہوئے، اور حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے مقابلہ کی تیاری کے لئے طلحہؓ اور زبیرؓ کے ساتھ بصرہ آئیں تو کعب اس خانہ جنگی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک گھر میں خلوت نشین ہو گئے، اور کھانے پینے کا سامان لینے کے لئے اس میں ایک سوراخ بنا لیا، لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ اگر کعب آپ کے ساتھ ہو جائیں تو پورا قبیلہ ازد آپ کے ساتھ ہو جائے گا۔ یہ سن کر آپ

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۵

کعب کے پاس تشریف لے گئیں، اور باہر سے پکار کر کعب سے گفتگو کرنی چاہی، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا، کعب کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تم پر میرا حق نہیں ہے یہ سن کر کعب جواب دینے پر مجبور ہو گئے، اور حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی۔ انہوں نے فرمایا، میں چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کو سمجھا کر اصلاح کی کوشش کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں کعب کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ قرآن لے کر لوگوں کو سمجھانے کے لئے نکلے، اور جب دونوں فوجیں بالمقابل ہوئیں تو وہ صفوں کے درمیان گھس کر قرآن کھول کر فریقین کو سمجھاتے تھے اور قرآن کی طرف بلاتے تھے۔

شہادت : لیکن یہ معاملہ افہام و تفہیم کے حدود سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ اس لئے ان کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، اور جنگ شروع ہو گئی، اور یہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کسی شقی کے تیر سے ہلاک ہو گئے[۱]۔

فضائل و اخلاق : ان کے حالات کتابوں میں بہت کم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے نیک سیرت اور نیکوکار لوگوں میں تھے۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ خیر اور صلاح میں مشہور تھے[۲]۔

(۶۰) مجاہد بن جبیرؒ

نام و نسب : مجاہد نام ہے۔ ابوالحجاج کنیت۔ قیس بن مخزومی کے غلام تھے۔

فضل و کمال : اگرچہ مجاہد غلام تھے، لیکن اقلیم علم کے تاجدار تھے۔ علمی اعتبار سے وہ امامِ وقت تھے۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں۔ کان فقیہا عالما ثقة کثیر الحدیث۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ علم کا ظرف تھے[۳]۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے[۴]۔ ان کو تفسیر، حدیث اور فقہ جملہ علوم میں درجۂ امامت حاصل تھا۔

قرأت و تفسیر : قرأت اور تفسیر کے اس عہد کے نہایت نامور عالم تھے۔ تفسیر انہوں نے حبر الامۃ ابن عباسؓ سے حاصل کی تھی، اور پورے تیس مرتبہ ان سے قرآن کا دورہ کیا تھا[۵]۔ اور اس محنت اور تحقیق کے ساتھ کہ ہر ایک سورہ پر رک کر اس کی شان نزول اور اس کے جملہ متعلقات پوچھتے جاتے تھے[۶]۔

---

[۱] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۶۴ و ۶۵ [۲] ایضاً۔ ص ۶۶ [۳] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۰
[۴] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۸۳ [۵] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۴۴
[۶] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۳

اس محنت اور ابن عباسؓ جیسے مفسر قرآن کی تعلیم نے ان کو بہت بڑا مفسر بنادیا۔ خصیف کا بیان ہے کہ مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے[1]۔ قتادہ کہتے تھے کہ اس وقت کے باقیات صالحات میں مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں[2]۔ قرآن کے قاری بھی تھے۔

حدیث: حدیث کے بھی وہ نہایت مشہور حافظ تھے۔ امام ذہبی ان کو مفسر اور حافظ حدیث، ابن سعد کثیر الحدیث اور امام نووی امام حدیث لکھتے ہیں[3]۔ حبر الامۃ عبداللہ بن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافع کا حفظ بھی تمہاری طرح ہوتا[4]۔

اکابر صحابہ میں انہوں نے حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ابوسعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، رافع بن خدیجؓ، عائشہؓ صدیقہ جویریہ بنت حارثؓ، ام ہانیؓ اور تابعین میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، طاؤس، عبداللہ بن سائب، عبداللہ بن سنجرہ، عبدالرحمٰن بن صفوان، عمر بن اسود، مورق العجلی، ابوعیاش الزرقی اور ابوعبیدہ ابن عبداللہ بن مسعود وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[5]۔

ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی خاصہ وسیع تھا[6]۔ ایوب سختیانی، عطاء، عکرمہ بن عون، عمرو بن دینار، ابو اسحٰق سبیعی، ابوالزبیر مکی، قتادہ حبیب بن ابی ثابت، حسن بن عمرو، سلمہ بن کہیل، سلیمان الاحول، سلیمان الاعمش، مسلم البطین، طلحہ بن مصرف اور عبداللہ بن کثیر قاری وغیرہ لائق ذکر ہیں[7]۔

فقہ: فقہ میں انہیں امامت واجتہاد کا درجہ حاصل تھا[8]۔ حافظ ذہبی، ابن حجر اور امام نووی سب ان کے تفقہ پر متفق البیان ہیں۔ ان کے فقہی کمال کے لئے یہ سند کافی ہے کہ مخزن علوم مکہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے[9]۔

اخلاص فی العلم:

علم کا مقصد کسی نہ کسی دنیاوی منفعت سے کم خالی ہوتا ہے لیکن مجاہد کا دامن ان تمام آمیزشوں سے بالکل پاک تھا۔ مسلمہ بن کہیل کا بیان ہے کہ عطاء طاؤس اور مجاہد کے علاوہ میں نے کسی کو نہیں پایا، جس کا مقصد علم سے خالصۃً لوجہ اللہ رہا ہو[10]۔

۱؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۸۳   ۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۰   ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۴
۴؎ دیکھو کتب مذکور حالات مجاہد   ۵؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۲۵   ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۲
۷؎ ایضاً   ۸؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۸۳   ۹؎ اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۶
۱۰؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۳

زہد و ورع : علم کے ساتھ ان میں زہد و ورع بھی اسی درجہ کا تھا۔ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ مجاہد فقیہ متورع اور عابد و زاہد تھے[1]۔

دنیا سے بے تعلق :

وہ دنیا سے ہمیشہ بے تعلق اور بیگانہ رہے۔اس سے ان کا دل اس قدر برداشتہ تھا کہ کسی دنیاوی چیز سے دلچسپی نہ لیتے تھے۔ہمیشہ مغموم رہا کرتے۔اعمش کا بیان ہے کہ مجاہد کو جب ہم دیکھتے مغموم پاتے۔ان سے کسی نے اس کا سبب پوچھا،جواب دیا کہ عبداللہ بن عباسؓ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا کہ عبداللہ دنیا میں اس طرح رہو کہ معلوم ہو کہ مسافر یا راہ رو ہو[2]۔

سادگی : ظاہری زیب وزینت سے اتنے بے پرواہ تھے کہ ان میں اور ادنی درجہ کے آدمیوں میں امتیاز مشکل تھا۔اعمشؒ کا بیان ہے کہ جب میں مجاہد کو دیکھتا تھا تو (ان کی ظاہری حالت سے) ان کو نہایت حقیر سمجھتا تھا۔وہ اپنی ظاہری وضع سے سائیس معلوم ہوتے تھے،جس کا گدھا گم ہو گیا ہو،اور وہ حالت پریشانی میں اس کو تلاش کر رہا ہو[3]۔لیکن اس سے ان کی علمی عظمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔جب وہ بولتے تھے تو منہ سے موتی ٹپکتے تھے[4]۔بڑے بڑے صحابہ ان کی عظمت ووقعت کرتے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ ان کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے[5]۔

سیر و سیاحت : مجاہد کو سیر و سیاحت اور عجائبات عالم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔انہوں نے آس پاس کے تمام عجائبات دیکھے تھے[6]۔

وفات : سنہ وفات کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔باختلاف روایت ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ میں وفات پائی۔عین سجدہ کی حالت میں سفر آخرت کیا۔وفات کے وقت ستر اسی سال کی عمر تھی[7]۔

(۶۱) محمد بن اسحٰقؒ

نام ونسب : محمد نام ہے۔ابوعبداللہ کنیت۔والد کا نام اسحٰق تھا۔ان کے دادا یسار عین التمر کے قیدیوں میں تھے اور غالباً اسی تعلق سے ابن اسحاق بھی غلامی کے سلسلہ میں منسلک تھے۔چنانچہ وہ قیس بن مخرمہ بن مطلب بن عبد مناف کے غلام تھے۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔جلد ۱۰۔ص ۴۴　　۲ شذرات الذہب۔جلد اول ص ۱۲۵　　۳ ایضاً
۴ تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول۔ص ۸۰　　۵ ایضاً　　۶ ایضاً　　۷ ایضاً

فضل و کمال: علمی اعتبار سے ابن اسحاق ممتاز تابعین میں تھے۔ خصوصاً فن مغازی اور سیرت کے امام تھے۔

حدیث میں ان کا پایہ:

حدیث کے اکابر حفاظ میں تھے۔ اگرچہ امام مالک اور بعض دوسرے علماء نے ان پر جرح کی ہے، لیکن ایک دو کے علاوہ اور باقی تمام آئمہ اور ارباب کمال کا ان کے حفظ پر اتفاق ہے۔ ابوزرعہ عبدالرحمن بن عمرو النصری روایت کرتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق ایسے شخص ہیں، جن سے اخذ حدیث میں تمام بڑے بڑے اہل علم سفیان ثوری، شعبہ، ابن عیینہ، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابن مبارک اور ابراہیم بن سعد وغیرہ کا اتفاق ہے۔ اکابر میں یزید بن ابی حبیب نے ان سے روایت کی ہے۔ اہل حدیث نے ان کا امتحان لیا تو انہیں سچا اور خیر پایا[1]۔

علماء کا اعتراف: شعبہ ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" اور امیر المحدثین کہتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ جواب دیا ان کے حفظ کی وجہ سے[2]۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں حکومت ہوتی تو محمد بن اسحٰق کو محدثین کا سردار بناتا۔ ابومعاویہ انہیں حفظ الناس اور یحییٰ بن معین انہیں ثقہ اور حسن الحدیث کہتے تھے[3]۔ علی بن مدائنی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا مدار چھ شخصوں پر تھا۔ پھر ان چھ آدمیوں کا علم بارہ میں منتقل ہوگیا تھا، ان میں ایک ابن اسحٰق تھے[4]۔

امام زہریؒ کا طرز عمل:

خود ان کے استاد امام زہری کو ان کے علم پر اس قدر اعتماد تھا کہ فرماتے تھے، جب تک محمد بن اسحٰق موجود ہیں، اس وقت تک اہل مدینہ میں علم رہے گا[5]۔ چنانچہ جب وہ مدینہ کے باہر جاتے تھے، تو ان کو اپنا قائم مقام بنا جاتے تھے۔ ایک مرتبہ باہر جارہے تھے، بعض شائقین علم نے بھی ساتھ جانا چاہا۔ زہری نے ان سے کہا کہ احول غلام، (ابن اسحاق) کو تم میں چھوڑے جاتا ہوں[6]۔ ان کی یہ جانشینی زہری کے تلامذہ میں مسلم تھی۔ چنانچہ ان کے بعد وہ لوگ ان کی روایات کی تصدیق کے لئے ابن اسحٰق کی طرف رجوع کرتے تھے[7]۔

امام زہری انہیں اس قدر مانتے تھے کہ دربانوں کو خاص ہدایت دے رکھی تھی کہ ابن اسحٰق جس وقت بھی آئیں آنے دیا جائے۔ ایک مرتبہ ابن اسحٰق نے آنے میں معمول سے دیر کی۔ زہری نے پوچھا

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد اول۔ ص ۲۲۴ [2] ایضاً۔ ص ۲۲۸ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۶
[4] تاریخ خطیب بغداد۔ جلد اول۔ ص ۲۱۸ و ص ۲۴ [5] ایضاً۔ ص ۲۱۹ [6] ایضاً
[7] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۸۳

کہاں تھے؟ انہوں نے کہا، حاجیوں اور دربانوں کی وجہ سے کوئی شخص آپ تک پہنچ سکتا ہے؟ زہری نے اسی وقت دربان کو بلا کر حکم دیا کہ ابن اسحٰق جس وقت بھی آئیں، انہیں روکا نہ جائے [1]۔

مالک اور ہشام کی جرح اور اس کے اسباب :

ان محامد اور کمالات کے ساتھ ابن اسحٰق پر امام مالک اور ہشام کی جرح بھی ملتی ہے۔ خصوصاً امام مالک کی رائے ان کے بارے میں زیادہ سخت تھی، اور وہ ان کے متعلق نا ملائم الفاظ تک استعمال کر جاتے تھے۔

حضرت ہشام بھی انہیں لائق اعتماد نہ سمجھتے تھے۔ لیکن محدثین نے خود ان دونوں کی جرح کے اسباب بیان کر دیئے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام مالک اتنے متشدد تھے اور ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ اگر کسی میں ادنیٰ خامی بھی ہوتی تھی تو وہ اس کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا بیان ہے کہ امام مالک کے ہمعصر علماء نے ان لوگوں پر جو صلاح، تقویٰ، دینداری، ثقاہت اور امامت میں مشہور تھے امام مالک کی درشتی زبان پر نکتہ چینی کی ہے [2]۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ابن اسحٰق خود امام مالک پر طعن کیا کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ مالک کی حدیثیں مجھے سنایا کرو، میں ان کے امراض کا طبیب ہوں [3]۔ ایسی حالت میں اگر امام مالک نے ان کے متعلق درشت الفاظ استعمال کیے تو اس سے ابن اسحٰق کی ثقاہت مجروح نہیں ہو سکتی۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ ابن اسحٰق غزوات کی روایت قبول کرنے میں محتاط نہ تھے۔ اس لئے امام مالک ان کے مغازی پر طعن کرتے تھے۔ ان کی احادیث کو اس جرح سے کوئی تعلق نہ تھا۔

علامہ ابن حبان لکھتے ہیں کہ مالک نے صرف ایک مرتبہ محمد بن اسحٰق کے بارے میں کہا تھا، پھر ان کے رتبہ کے مطابق ان سے برتاؤ کرتے تھے۔ مالک ان کی احادیث کی وجہ سے نہیں، بلکہ مغازی کی وجہ سے ان پر جرح کرتے تھے۔ کیونکہ ابن اسحٰق غزوۂ خیبر وغیرہ کے حالات یہودیوں کی نومسلم اولادوں سے سنتے تھے، جن کو وہ اپنے بزرگوں سے سن کر بیان کرتے تھے۔ گو ابن اسحٰق ان بیانات سے حجت نہیں لاتے تھے، لیکن امام مالک متقن کے علاوہ کسی دوسرے سے روایت لینا جائز ہی نہ سمجھتے تھے [4]۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد اول۔ ص ۲۱۹　[2] ایضاً۔ ص ۲۲۳　[3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۸۳
[4] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۵

بعض علماء کا بیان ہے کہ مالک کی جرح مغازی کی بناء پر بھی نہ تھی بلکہ بعض عقائد کی بناء پر تھی۔ عبدالرحمن بن عمرو النصری کا بیان ہے کہ میں نے دحیم کے سامنے ابن اسحٰق کے بارے میں مالک کی جرح کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا، یہ احادیث کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس لئے تھی کہ امام مالک انہیں قدر کے عقیدے سے متہم سمجھتے تھے [۱]۔

بہر حال ان تمام روایات سے اتنا معلوم ہوگیا کہ امام مالک کی جرح کا سبب ابن اسحٰق کی بے اعتباری اور ان کا ضعف نہ تھا، بلکہ اس کے اسباب دوسرے تھے۔ اس لئے اس جرح سے ان کی مرویہ احادیث پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ اسی لئے امام مالک کے علاوہ اور آئمہ اور علماء ان کی روایت قبول کرتے تھے۔ خود امام ابن حنبل جو عقیدہ کے تشدد میں امام مالک سے کم نہ تھے، ابن اسحٰق کی روایات قبول کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے ایک شخص کے جواب میں۔ جس نے ابن اسحٰق کے بارے میں ان سے پوچھا تھا کہ میرے والد ان کی روایات جانچ کر قبول کرتے تھے اور مسند میں لیتے تھے۔ لیکن سنن میں ان سے احتجاج نہیں کرتے تھے [۲]۔

امام مالک کے بعد ابن اسحٰق پر جرح کرنے والوں میں دوسرا نام ابن ہشام کا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہشام کو محض اس لئے لائق اعتماد نہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ان کی بیوی فاطمہ بنت منذر سے بعض روایتیں کی ہیں۔ ہشام کہتے تھے کہ انہوں نے میرے بیوی سے جو ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور جن پر نو سال کی عمر سے موت تک کسی مرد کی نظر نہیں پڑی، کیسے احادیث سنیں۔ لیکن جیسا کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ محض اس دلیل پر ابن اسحٰق کی روایات کو غلط کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ پردہ کی آڑ سے سن سکتے تھے۔

ابن حبان لکھتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کے بارے میں ہشام اور مالک دو آدمیوں نے کلام کیا ہے۔ لیکن ہشام کے قول سے کوئی انسان بھی مجروح نہیں ہوسکتا۔ تابعین بغیر چہرے پر نظر ڈالے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ سے احادیث سنا کرتے تھے۔ اسی طریقہ سے ابن اسحٰق نے فاطمہ سے سنا ہوگا۔ درمیان میں پردہ حائل رہا ہوگا [۳]۔

شیوخ : ابن اسحٰق خاص شاگرد تو امام زہری کے تھے، لیکن ان کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کے شیوخ میں عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر و ابن مالک، محمد بن ابراہیم تیمی، قاسم بن محمد بن ابی بکر، محمد بن جعفر بن زبیر، عاصم بن عمرو بن قتادہ، عباس بن سہل بن سعد،

۱۔ تاریخ خطیب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۴ ۲۔ ایضاً۔ ص ۲۳۰ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۵

ابن منکدر، مکحول، ابراہیم بن عقبہ، حمید الطویل، سالم ابی النضر، سعید مقبری، سعید بن ابی ہند، ابی الزناد، عبدالرحمن بن اسود نخعی، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ ابن خالد، علاء بن عبدالرحمن وغیرہ جیسے اکابر علماء تھے[1]۔

تلامذہ: خود ابن اسحٰق سے فیض اٹھانے والوں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ ان میں بعض ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں، جریر بن حازم، عبداللہ بن سعید، ابن عون، ابراہیم بن سعد شعبہ سفیان، زہیر بن معاویہ، ابن ادریس، ابوعوانہ، عبدالاعلیٰ، عبدہ بن سلیمان، جریر بن عبدالحمید اور زیاد البکائی وغیرہ[2]۔

سیرت و مغازی: ابن اسحٰق کا اصل فن مغازی و سیرت تھا۔ اس کے وہ امام تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ مغازی اور سیرت کی معرفت میں حبر تھے[3]۔

امام شافعی کہتے تھے کہ جو شخص مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ ابن اسحٰق کا دست نگر ہے[4]۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس علم کی طرف توجہ کی اور اس کو اتنا بڑھایا کہ ان کے بعد پھر کوئی اس پر اضافہ نہ کرسکا اور سلاطین اور امراء کی توجہ بے نتیجہ اور لایعنی قصص وحکایت سے تاریخ کی طرف پھیر دی۔

اس طرح انہوں نے سب سے پہلے تاریخ کا مذاق پیدا کیا۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ اگر اس فضیلت کے علاوہ ابن اسحٰق میں اور کوئی فضیلت نہ ہوتی کہ انہوں نے سلاطین کا مذاق بدل کر ان کی توجہ اور مشغولیت لاحاصل کتابوں سے رسول اللہ ﷺ کے مغازی آپ کی سنت اور آغاز عالم کی تاریخ کی جانب پھیر دی، تو تنہا یہی کارنامہ اور اولیت کا یہ فخر ہی ان کی فضیلت کے لئے کافی تھا۔

ان کے بعد بہت سے لوگوں نے اس فن پر کتابیں لکھیں، لیکن کوئی ان کے درجہ کو نہ پہنچ سکا[5]۔ خود امام زہری جن سے انہوں نے اس فن کو حاصل کیا، اس میں ان کی وسعت علم کے معترف تھے[6]۔

تاریخ: اگرچہ مغازی اور سیرت تاریخ ہی کی ایک شاخ ہے، لیکن اس کے علاوہ ابن اسحٰق تاریخ عام کے بھی عالم تھے۔ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ سیرت، مغازی، ایام ناس، آغاز خلق اور قصص انبیاء کے عالم تھے[7]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۸ [2] ایضاً۔ ص ۳۹ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۲
[4] تاریخ خطیب۔ جلد اول۔ ص ۲۱۹ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴ [6] تاریخ خطیب۔ جلد اول۔ ص ۲۱۹ [7] ایضاً۔ ص ۲۵

تصانیف : انہوں نے تاریخ اور سیرت پر متعدد و مستقل تصانیف کی تھیں۔ ابن ندیم لکھتے ہیں :

" وله من الكتب الخلفا رواه عنه الا مرى كتاب السيرة والمبتداء والمغازى " [۱]

ان کی سب سے مشہور اور قدیم ترین کتاب سیرت ابن اسحٰق ہے۔ یہ کتاب صدیوں سے ناپید ہوگئی ہے، لیکن اس لحاظ سے اس کی روایات اب تک محفوظ ہیں کہ ابن ہشام کی سیرت کا سب سے بڑا ماخذ یہی ہے۔ اس لئے اس کی تمام روایتیں اس میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ موجودہ سیرت ابن ہشام درحقیقت ابن اسحٰق کی سیرت کا مثنیٰ ہے۔

علامہ ابن اسحٰق نے یہ کتاب خلیفہ مہدی عباسی کے کسی لڑکے کے لئے لکھی تھی۔ اس کی تالیف کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ مہدی کے دربار میں گئے۔ اس وقت مہدی کا لڑکا بھی موجود تھا۔ مہدی نے ابن اسحٰق سے پوچھا، اس کو جانتے ہو؟ انہوں نے کہا امیر المومنین کے صاحبزادے ہیں۔ مہدی نے فرمائش کی کہ ان کے لئے ایک ایسی کتاب لکھو جس میں خلق آدم سے لے کر اس وقت تک کے حالات ہوں۔ اس حکم کے مطابق انہوں نے کتاب لکھ کر پیش کی۔ مہدی نے دیکھ کر کہا یہ تو بہت طویل ہے۔ اس کو مختصر کرو، چنانچہ انہوں نے دوبارہ اس کو مختصر کیا اور پہلی کتاب مہدی کے کتب خانہ میں رکھ دی [۲]۔

عقیدۂ قدر : بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق قدری تھے، لیکن کچھ روایات اس کے خلاف بھی ہیں۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر کا بیان ہے کہ ابن اسحٰق قدر سے متہم کئے جاتے تھے۔ حالانکہ ان کو اس سے دور کا لگاؤ بھی نہ تھا [۳]۔

وفات : ابتداء میں وہ مدینہ میں رہتے تھے، پھر یہاں کا قیام ترک کر کے کوفہ، جزیرہ اور رے وغیرہ مختلف مقامات میں پھرتے رہے۔ آخر میں بغداد چلے گئے تھے اور یہیں ۱۵۱ھ میں وفات پائی اور ہارون رشید کی ماں خیزران کے قبرستان میں دفن ہوئے [۴]۔

(۶۲) محمد بن حنفیہؒ

نام ونسب : محمد نام ہے۔ ابوالقاسم کنیت۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے فرزند اور حضرت حسنینؓ کے سوتیلے بھائی تھے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے حضرت فاطمۃ الزہرہ کے انتقال کے بعد کئی شادیاں کیں۔

۱؎ فہرست ابن ندیم۔ ص ۱۳۶ طبع مصر ۲؎ تاریخ خطیب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۱ ۳؎ ایضاً۔ ص ۲۲۲

۴؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۶۷

ان بیویوں میں ایک خاتون خولہ المعروف بہ حنفیہ تھیں۔ خولہ کے نسب کے بارے میں مورخین کے بیانات مختلف ہیں۔ بعض انہیں جنگ یمامہ کے قیدیوں میں لکھتے ہیں، بعض سندھی النسل بتاتے ہیں، بعض بنی حنیفہ کی لونڈی بتاتے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ بنی حنیفہ کی معزز خاتون تھیں۔ محمد انہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ خولہ کا نسب نامہ یہ ہے، خولہ بنت جعفر بن قیس بن سلمہ بن ثعلبہ ابن یربوع بن ثعلبہ بن الاول بن حنیفہ بن لجیم بن صعب بن علی بن بکر بن وائل، محمد بن حنیفہ علم تقویٰ کے اعتبار سے کبار تابعین میں تھے۔

پیدائش : عہد فاروقی کے اختتام کے دو سال پہلے پیدا ہوئے[1]۔ اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۲۱ ھ کے آخر یا ۲۲ ھ کے شروع میں ہوئی ہوگی۔

جنگِ جمل : ان کے بچپن کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ جنگ جمل سے ان کا پتہ چلتا ہے۔ شجاعت و بہادری پدر بزرگوار سے وراثۃً ملی تھی۔ اس لئے وہ بچپن ہی سے نہایت جری بہادر اور شجاع تھے۔ جنگ جمل میں جب ان کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ سال کی تھی، حضرت علی مرتضیٰؓ نے ان کو فوج کا نشان مرحمت فرمایا تھا[2]۔

جنگ کے ابتدائی انتظامات کے بعد حضرت علیؓ نے انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور بے محابہ علم لے کر آگے بڑھے۔ اہلِ بصرہ نیزے اور تلواریں سنبھال کر ان کی طرف لپکے، ابھی وہ کم سن تھے، اس لئے زیادہ بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت علیؓ نے ان کے ہاتھوں سے علم لے کر خود حملہ کیا۔ دوسرے سرفروشوں نے بھی آپ کا ساتھ دیا اور جنگ شروع ہوگئی۔ آغازِ جنگ کے بعد حضرت علیؓ نے پھر محمد بن حنیفہ کو علم دے دیا[3]۔

یہ واقعہ خود محمد بن حنفیہ کی زبانی بھی منقول ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جنگِ جمل میں ہماری فوجیں صف آراء ہوئیں تو والد نے علم مجھے مرحمت فرمایا، پھر جب دونوں فوجیں بالمقابل ہوئیں اور ایک دوسرے کی طرف بڑھیں اور والد نے مجھ میں پسپائی کے آثار دیکھے تو علم میرے ہاتھ سے لے کر جنگ شروع کردی۔ میں نے بڑھ کر ایک بصری پر حملہ کیا۔ جب وہ زد پر آگیا تو پکارا کہ میں ابی طالب کے مذہب پر ہوں۔ یہ سن کر میں رک گیا۔ ان لوگوں کے شکست کھانے کے بعد والد نے منادی کرادی کہ کوئی شخص زخمیوں کو پامال نہ کرے، میدان چھوڑنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ اختتام جنگ کے بعد وہ گھوڑے اور اسلحہ جو دشمنوں نے جنگ میں استعمال کئے تھے، والد نے بطور غنیمت کے تقسیم کر دیئے[4]۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۰ [2] اخبار الطوال۔ ص ۱۵۶ [3] ایضاً۔ ص ۱۵۸ [4] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۶۷

جنگِ صفین: جنگِ جمل کے بعد ہی جنگِ صفین کے مقدمات شروع ہو گئے تھے۔ محمد بن حنفیہ اس جنگ میں شروع سے آخر تک اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہے۔ چنانچہ صفین کے ابتدائی حالات ان سے اس طرح منقول ہیں کہ میرے والد معاویہ اور اہلِ شام سے جنگ کرنے کا ارادہ کرتے تھے، اور جنگی علم تیار کر کے قسم کھاتے کہ جب تک یہ میدان جنگ میں نہ آئے گا، اس وقت تک اس کو نہ کھولوں گا۔ لیکن ان کے آدمی ان کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کی رائیں مختلف ہو جاتی تھیں، اور وہ جنگ سے پہلو تہی کرنے لگتے۔ ان کی مخالفت دیکھ کر والد علم کھول دیتے اور قسم کا کفارہ ادا کرتے۔

اس طریقہ سے انہوں نے چار مرتبہ علم تیار کیا اور چار مرتبہ کھولا۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی۔ میں نے مسور بن مخرمہ سے کہا کہ آپ والد سے کہتے ہیں کہ ان حالات میں وہ کہاں کا قصد کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم مجھے ان لوگوں سے کسی فائدہ کی اُمید نظر نہیں آتی۔ مسور نے کہا، انہوں نے جس کام کا ارادہ کر لیا ہے، وہ یقینی اور طے شدہ ہے۔ میں نے ان سے گفتگو کی تھی، وہ جانے کا تہیہ کر چکے ہیں[1]۔

بہر حال جب جنگ کسی طرح نہ ٹلی اور حضرت علی مرتضیٰؓ امیر معاویہؓ سے لڑنے کے لئے صفین روانہ ہوئے تو محمد بھی ان کے ہمرکاب تھے، اور حضرت علیؓ نے جنگ جمل کی طرح صفین میں بھی علم مرحمت فرمایا۔

جنگ صفین کا سلسلہ مدتوں قائم رہا تھا۔ ابتداء میں تو عرصہ تک متحدہ اور فیصلہ کن جنگ کے بجائے فریقین کے ایک ایک دو دو دستے میدان میں آتے تھے۔ ایک دن محمد بن حنفیہ ایک دستہ کو لے کر نکلے۔ شامی فوج سے عبید اللہ بن عمران کے مقابلہ میں آئے اور محمد بن حنفیہ کو للکارا۔ انہوں نے کہا گھوڑے سے اُترو۔ اس للکار پر دونوں گھوڑے سے اُتر پڑے۔

حضرت علیؓ نے دیکھا تو گھوڑا بڑھا کر ابن حنفیہ کے پاس پہنچے اور گھوڑا انہیں دے کر خود عبید اللہ کے مقابلہ کے لئے بڑھے۔ وہ انہیں دیکھ کر ہٹ گئے اور کہا، میں آپ سے نہیں بلکہ آپ کے لڑکے سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

عبید اللہ کے چلے جانے کے بعد ابن حنفیہ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اگر آپ نے مجھے مقابلہ کرنے دیا ہوتا تو مجھے امید تھی کہ میں ان کو قتل کر دیتا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، امید تو مجھے بھی یہی تھی، لیکن خطرہ سے خالی نہ تھی۔ مجھے خوف تھا کہ تمہاری جان کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد فریقین کے سوار دوپہر تک لڑتے رہے، لیکن کوئی ایک دوسرے کو مغلوب نہ کر سکا[2]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۶۷ [2] ایضاً۔ ۶۸

ایک موقع پر حضرت علیؓ نے ان کو شامیوں کے ایک دستہ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ ان کے سینوں میں نیزے پیوست کرنے کے بعد ہاتھ روک لینا اور میرے دوسرے حکم کا انتظار کرنا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حضرت علیؓ نے ایک اور دستہ ان کی مدد کے لئے بھیجا۔ اس نے ابن حنفیہ کی قیادت میں شامی دستے کو مار کر اس کی جگہ سے ہٹا دیا[1]۔

جنگِ صفین میں بہت سے نازک مواقع پر ابن حنفیہ اپنے والد بزرگوار کی حفاظت میں اپنے برادرانِ محترم (حسن و حسین) کے دوش بدوش سینہ سپر ہوئے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور تیر آپ کے کانوں اور شانے کے پاس سے اڑتے ہوئے گزر جاتے تھے، محمد بن حنفیہ اور حسنینؓ ان تیروں کو اپنے جسم سے روکتے تھے[2]۔

ابنِ حنفیہ کے متعلق حضرت علیؓ کی آخری وصیت :

جنگِ صفین کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت علیؓ کی شہادت کا حادثہ پیش آ گیا۔ دمِ آخر آپ نے جب حضرت حسنینؓ کو وصیتیں فرمائیں تو محمد بن حنفیہ سے ارشاد ہوا کہ میں نے تمہارے بھائیوں کو جو وصیتیں کی ہیں وہی تمہارے لئے بھی ہیں۔ میرے بعد تم دونوں بھائیوں کی جن کا تم پر بڑا حق ہے۔ پوری عظمت و توقیر کرنا، ان کے کاموں کو سنوارنا، ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرنا۔ پھر حسنینؓ سے فرمایا کہ ان کے (محمد بن حنفیہ) بارے میں میری یہ وصیت ہے کہ وہ تمہارے حقیقی بھائی کے برابر اور تمہارے باپ کے لڑکے ہیں۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہارے باپ ان سے محبت کرتے تھے[3]۔

حضرت حسنینؓ کی وصیت :

حضرت حسنینؓ نے اس وصیت کو پورے طور پر ملحوظ رکھا، اور کسی موقع پر بھی ابن حنفیہ کو نظر انداز نہ ہونے دیا۔ چنانچہ جب حضرت حسنؓ کا وقت آخر ہوا تو حضرت حسینؓ سے فرمایا کہ میں تم کو تمہارے بھائی محمد کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ دونوں آنکھوں کے درمیان چمڑے کی طرح عزیز ہیں۔ پھر محمد بن حنفیہ سے فرمایا کہ تم کو بھی یہ وصیت کرتا ہوں کہ ضرورت کے وقت حسینؓ کے گرد جمع ہو کر ان کی مدد کرنا[4]۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۲۶۲ [2] اخبار الطوال۔ ص ۱۹۴ [3] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۳۲۹
[4] اخبار الطوال۔ ص ۲۲۵

یزید کے مطالبہ بیعت پر حضرت حسین کو مشورہ:

حضرت حسینؓ کے بعد محمد بن حنفیہ حضرت حسینؓ کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے رہے، اور ان کی مشکلات میں ایک وفادار بھائی کی حیثیت سے ان کے مخلص وغمگسار رہے۔ امیر معاویہ کی وفات کے بعد یزید کے حکم پر ولید حاکم مدینہ نے حضرت حسینؓ سے بیعت کا مطالبہ کیا، اور اس کے رد وقبول کے بارے میں کشمکش میں مبتلا ہوئے، اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مدینہ چھوڑ دینا چاہا تو اس وقت محمد بن حنفیہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ بھائی آپ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب و عزیز ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے، جس کا میں آپ سے زیادہ خیر خواہ ہوں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس موقع پر جہاں تک آپ سے ہوسکے یزید کی بیعت اور کسی خاص شہر میں جانے کے ارادہ سے بالکل الگ رہئے اور اپنے دُعاۃ بھیج کر لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دیجئے۔

اگر وہ بیعت کرلیں تو ہمارے لئے موجب شکر ہوگا اور اگر آپ کے علاوہ کسی اور شخص پر مسلمانوں کا اتفاق ہوجائے تو اس سے آپ کے مذہب اور آپ کی عقل میں کوئی کمی نہ آئے گی اور آپ کے فضائل پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا اور اگر آپ کسی متعین شہر اور متعین مقام پر جائیں گے تو مجھے ڈر ہے کہ وہاں کے لوگوں میں اختلاف ہوجائے گا۔

ان میں ایک جماعت تو آپ کا ساتھ دے گی، لیکن ایک جماعت آپ کے خلاف ہوجائے گی۔ پھر یہ کہ دونوں جماعتیں باہم لڑیں گی اور درمیان میں آپ کی ذات ان کے تیروں کا نشانہ بنے گی۔ اگر یہ صورت پیدا ہوگئی تو نسب اور ذاتی اوصاف کے اعتبار سے اس اُمت کا معزز اور بلند ترین شخص سب سے زیادہ ذلیل اور پست ہوجائے گا اور اس کا خون سب سے زیادہ ارزاں ہوگا۔

یہ مشورہ سن کر حضرت حسینؓ نے فرمایا، پھر کہاں جاؤں؟ ابن حنفیہ نے کہا مکہ جایئے، اگر وہاں آپ کو اطمینان سے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو خود ہی کوئی سبیل نکل آئے گی اور اگر حالات خلاف ہوئے تو ریگستان اور پہاڑی علاقوں میں نکل جایئے گا اور جب تک ملک کوئی فیصلہ نہ کرلے اس وقت تک برابر ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہئے۔ اس دوران میں آپ کی کوئی نہ کوئی رائے قائم ہوجائے گی اور آپ کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ جب حالات کا سامنا ہوجاتا ہے، اس وقت آپ کی رائے نہایت صائب اور آپ کا عمل نہایت محتاط ہوجاتا ہے۔ یہ باتیں سن کر حضرت حسینؓ نے فرمایا تم نے بہت محبت آمیز نصیحت کی ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ تمہاری رائے صائب ہوگی[1]۔

---

[1] ابن اثیر۔ جلد ۴۔ ص ۱۲

حضرت حسینؓ نے ایک حد تک ان کے مشورہ پر عمل بھی کیا۔ چنانچہ مدینہ سے مکہ چلے گئے، پھر کوفیوں کی پیہم دعوت پر چند دنوں کے بعد کوفہ روانہ ہو گئے۔ لیکن تقدیر الٰہی کچھ اور ہی تھی۔ اس لئے آپ کی شہادت کا حادثہ عظمیٰ پیش آ گیا۔ محمد بن حنفیہ اس حادثہ میں آپ کے ساتھ نہ تھے[1]۔

مختار بن ابی عبید ثقفی کا خروج اور ابن حنفیہ کی سرپرستی :

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنی اُمیہ کے مقابلہ میں خلافت کا دعویٰ کیا اور اس سلسلہ میں برسوں دونوں میں جنگ جاری رہی۔

عین اسی زمانہ میں بنی ثقیف کا ایک نہایت معمولی اور گمنام شخص مختار بن ابی عبید جو کسی وقت اُموی عمال کے ہاتھوں سزایاب ہو چکا تھا۔ وجاہت دنیاوی کی طمع میں ابن زبیرؓ کے ساتھ ہو گیا اور چند دنوں تک ان کے ساتھ رہا، لیکن جب اس کو یہاں امید پوری ہوتی ہوئی نظر نہ آئی تو اس نے ان سے الگ ہو کر قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے جیسے فرومایہ شخص کے لئے بغیر کسی امداد و سہارے کے اپنے ارادہ میں کامیاب ہونا مشکل تھا۔ اس لئے اس نے حضرت حسینؓ کے خونِ بے گناہی کے انتقام کو آڑ بنایا۔ چونکہ یہ حادثہ ابھی تازہ تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس سے متاثر تھی۔ اس لئے بہت سے لوگ اس کے دام میں آ گئے۔

اس دعوت کے ساتھ ہی اس نے حضرت امام حسینؓ کے جانشین امام زین العابدینؒ کے پاس نذرانہ بھیج کر ان سے سرپرستی کی درخواست کی کہ آپ ہمارے امام ہیں۔ ہم سے بیعت لے کر ہماری سرپرستی قبول فرمائیے۔ لیکن امام موصوف اس کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ اس لئے اس کے فریب میں نہ آئے اور نہایت حقارت سے اس کی درخواست ٹھکرا دی اور مسجد نبوی ﷺ میں علی الاعلان اس کے فسق و فجور کا پردہ چاک کر کے فرمایا کہ یہ شخص محض لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے اہل بیت کو آڑ بنانا چاہتا ہے۔ حقیقت میں اس کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مطالبۂ بیعت کے سلسلہ میں ابن زبیرؓ اور محمد بن حنفیہ میں ناخوشگواری پیدا ہو چکی تھی۔ مختار نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور امام زین العابدین سے مایوس ہو کر ابن حنفیہ کے پاس پہنچا۔ امام زین العابدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو بھی روکا اور فرمایا کہ مختار اہل بیعت کی محبت کا دعویٰ محض لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے کرتا ہے، حقیقت میں اس کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وہ ان کا دشمن ہے۔ میری طرح آپ کو بھی اس کا پردہ فاش کرنا چاہئے۔ محمد بن حنفیہ نے ابن عباسؓ سے اس کا

---

[1] یعنی خلافت کا فیصلہ

تذکرہ کیا۔ ان کو ابن زبیرؓ کی جانب سے خطرہ تھا۔ اس لئے انہوں نے ابن حنفیہ سے کہا کہ اس معاملہ میں تم زین العابدینؒ کا کہنا نہ مانو[1]

محمد بن حنفیہ بھی مختار کو اچھا آدمی نہ سمجھتے تھے اور انہیں اس پر مطلق اعتماد نہ تھا، لیکن ابن زبیرؓ کے مقابلہ میں اس کی امداد و اعانت حاصل کرنے کے لئے (ابن زبیرؓ محمد بن حنفیہ کو اپنی بیعت کے لئے مجبور کر رہے تھے) اس کی سرپرستی قبول کر لی۔

محبان اہل بیعت کا اصل مرکز عراق تھا۔ اس لئے محمد بن حنفیہ کو سرپرست بنانے کے بعد مختار ان سے اجازت لے کر عراق روانہ ہو گیا، لیکن چونکہ ابن حنفیہ کو اس پر اعتماد نہ تھا اور وہ اس کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنا ایک آدمی عبداللہ بن کامل ہمدانی اس کے ساتھ کر دیا اور اس کو خفیہ ہدایت کر دی کہ مختار زیادہ لائق اعتماد نہیں ہے اس سے بچتے رہنا۔ اب تک ابن زبیرؓ کو اس سازباز کا علم نہ ہوا تھا اور وہ بدستور مختار کو اپنا خیر خواہ سمجھ رہے تھے۔ اس نے جا کر ان سے کہا کہ میرا قیام مکہ سے زیادہ آپ کے لئے عراق میں مفید ہوگا۔ اس لئے میں وہاں جا رہا ہوں۔ ابن زبیرؓ نے بخوشی اجازت دے دی اور مختار، عبداللہ بن کامل کے ساتھ عراق روانہ ہو گیا۔ مقام غدیب میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس سے مختار نے پوچھا، عراق میں لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا وہ بغیر ملاح کی کشتی کی طرح جھولے لے رہے ہیں۔ مختار نے کہا میں ان کا ملاح بنوں گا۔[2]

عراق میں ورود اور ابن حنفیہ کی دعوت :

محبان اہل بیت کی سب سے بڑی تعداد کوفہ میں تھی۔ اس لئے مختار سیدھا کوفہ پہنچا اور اپنے کو محمد بن حنفیہ کا داعی ظاہر کر کے ان کے زہد و ورع کی تبلیغ اور ابن زبیرؓ کی مذمت اور ان کی تشہیر شروع کر دی کہ ابن زبیرؓ درحقیقت محمد بن حنفیہ کے کارکن تھے اور ابتداء میں وہ ان ہی کے لئے کوشش کرتے تھے، لیکن پھر خود اس پر غاصبانہ قابض ہو گئے۔ اس لئے ابن حنفیہ نے مجھے اپنا داعی بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے دست قلم کی لکھی ہوئی سند بھی میرے پاس موجود ہے۔ جن لوگوں پر اسے اعتماد ہوتا تھا، انہیں یہ تحریر پڑھ کر بھی سنا دیتا تھا۔

غرض اس چالاکی سے بہت سے محبانِ اہلِ بیت اس کے فریب میں آ گئے اور ایک اچھی خاصی جماعت نے اس کے ہاتھوں پر بیعت کر لی، لیکن کچھ لوگوں کو شک ہوا۔ وہ ابن حنفیہ کے پاس مکہ پہنچے اور ان سے مختار کے بیانات کی تصدیق چاہی۔ یہ نہ صاف اقرار ہی کر سکتے تھے اور نہ انکار۔

---

[1] مروج الذہب مسعودی۔ جلد ۲۔ ص ۹۰۔ ۲۷۹ [2] ابن اثیر۔ جلد ۵۔ ص ۱۷۱

اقرار اس لئے نہیں کر سکتے تھے کہ مختار کے بیانات بہت کچھ مبالغہ آمیز بلکہ جھوٹ تھے، لیکن اس حد تک صحیح تھا کہ ابن حنفیہ نے اس کی سرپرستی قبول کر لی تھی، لیکن ان کو اس کی صداقت پر خود اعتماد نہ تھا۔ اس لئے جواب دیا کہ "تم لوگ خود دیکھتے ہو کہ ہم لوگ (اہلِ بیعت) صابر و شاکر بیٹھے ہیں۔ میں کسی مسلمان کا خون گرا کر دنیاوی حکومت نہیں چاہتا، لیکن اسے ہم پسند کرتے ہیں کہ اللہ نے جس بندے سے چاہا ہماری مدد کی۔ البتہ تم لوگ کذابین سے ڈرتے رہو اور اپنی جان اور دین کی حفاظت کرو"۔ یہ سن کر یہ لوگ عراق لوٹ گئے۔ کوفہ میں ابراہیم بن اشتر نخعی بڑے بااثر محبانِ اہلِ بیت میں تھے۔ مختار نے محمد بن حنفیہ کی جانب سے ان کو ایک فرضی خط دے کر انہیں اپنا حامی و مددگار بنالیا[1]۔

کوفہ پر قبضہ اور قاتلین حسین کا قتل :

ابراہیم نخعی کی حمایت سے مختار کی قوت بہت بڑھ گئی اور وہ اعلانیہ میدان میں آگیا۔ ابن زبیرؓ کے پولیس افسر یاس بن فضار نے روک ٹوک شروع کی تو ابراہیم بن اشتر نے اُسے قتل کر دیا۔ عبداللہ بن مطیع کو جو ابن زبیر کی جانب سے کوفہ کے والی تھے خبر ہوئی تو انہوں نے مختار کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے اور مختار اور ابراہیم دونوں نے اس کو نہایت فاش شکست دی۔ ابن مطیع نے ان سے اپنی جان بخشی کرا کے کوفہ چھوڑ دیا۔ اور یہاں مختار کی حکومت قائم ہوگئی[2]۔

کوفہ پر قابض ہونے کے بعد مختار کی وقعت بڑھ گئی۔ اس وقت اسے اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس نے حضرت حسینؓ کے قاتلوں اور ان کے معاونوں کو قتل کرنا شروع کیا اور چند دنوں کے اندر ان سب کا صفایا کر دیا۔ ابن زیاد کا سر قلم کر کے محمد بن حنفیہ اور امام زین العابدین کی خدمت میں بھیجا۔ مختار کے مکر و فریب کے باوجود اس کی یہ کارگزاری ایسی تھی کہ قدرۃً یہ بزرگوار اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی زبان نے بے ساختہ اس کی خدمات کا اعتراف کیا[3]۔

ابن حنفیہ کی قید و رہائی :

ابن زبیرؓ نے ابتداء میں ابن حنفیہ پر اپنی بیعت کے لئے زیادہ زور نہ ڈالا تھا۔ مگر جب کوفہ وغیرہ پر مختار کا قبضہ ہو گیا اور اس کی قوت میں اضافہ کے ساتھ عراق میں ابن حنفیہ کے بیعت کرنے والوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا تو ابن زبیرؓ کو ان کی جانب سے خطرات بڑھ گئے۔ اس وقت انہوں نے ابن حنفیہ اور ان کے ساتھ ابن عباسؓ پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ لیکن یہ لوگ بیعت کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ آخر میں

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۲ [2] اخبار الطوال ص ۲۹۷، ۳۰۰ ملخصاً [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۳

انہوں نے ان کے تمام اہل خاندان کو مکہ کی ایک گھاٹی میں نظر بند کر دیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ابن حنفیہ کو چاہ زمزم کی چار دیواری میں قید کر کے لکڑیوں کا انبار لگوا دیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ بیعت نہ کریں گے تو انہیں پھونک دیا جائے گا۔

یہ نازک صورت پیدا ہونے کے بعد ابن حنفیہ نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ اب کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ ہرگز ہرگز اطاعت نہ کرنا، اپنی بات پر قائم رہنا۔ لیکن مکہ میں رہتے ہوئے انکار پر قائم رہنا مشکل تھا۔ اس لئے ابن حنفیہ نے مکہ چھوڑ کر کوفہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔

مختار کو اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو اسے بہت گراں گزرا کہ ابن حنفیہ کے عراق پہنچ جانے کے بعد اس کی ہستی ختم ہوئی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ محض آپ کا نام استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کو روکنے کے لئے اہل کوفہ سے کہنا شروع کیا کہ مہدی کی نشانی یہ ہے کہ جب وہ تمہارے یہاں آئیں گے تو ایک شخص بازار میں ان پر وار کرے گا۔ لیکن اس سے مہدی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا۔ ابن حنفیہ کو اپنے متعلق اس کرامت کی خبر ہوئی تو انہوں نے کوفہ جانے کا عزم ترک کر دیا اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ کی زبانی اپنے عراقی متبعین کے پاس اپنے حالات کہلا بھیجے۔ عامر نے وہاں پہنچ کر تفصیلی حالات سنائے۔ یہ حالات سُن کر مختار نے ابوعبداللہ جدلی کو چار ہزار فوج کے ساتھ محمد بن حنفیہ کو چھڑانے کے لئے بھیجا اور ہدایت کردی کہ اگر بنی ہاشم زندہ مل جائیں تو ان کی ہر قسم کی مدد اور ان کے احکام کی تعمیل کرنا اور اگر قتل کئے جا چکے ہوں تو جس طرح بھی ممکن ہو آل زبیرؓ کا خاتمہ کر دینا۔

حضرت ابن زبیرؓ میں مختار کے فرستادہ دستہ کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے ایک بیان یہ ہے کہ اس کے ورود مکہ کے وقت وہ دارالندوہ چلے گئے اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں پناہ لی اور عراقی دستہ نے مکہ پہنچ کر ابن حنفیہ اور ابن عباسؓ کو لکڑیوں کے انبار سے نکالا۔ اس دوران میں ابن زبیرؓ کے آدمی پہنچ گئے، لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ عراقیوں نے ابن عباسؓ سے کہا اگر اجازت ملے تو ہم ابن زبیرؓ کا خاتمہ کر کے لوگوں کو ان کی مصیبت سے نجات دلادیں۔ لیکن ابن عباسؓ نے کہا نہیں اس شہر کو خدا نے حرمت دی ہے۔ صرف نبی ﷺ کی خاطر چند ساعتوں کے لئے اس کی حرمت اُٹھ گئی تھی ورنہ نہ اس سے پہلے کسی کے لئے اُٹھی تھی نہ اس کے بعد اُٹھے گی۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہمیں بچا کر نکال لے چلو۔ چنانچہ عراقی ان لوگوں کو قید سے نکال کر منیٰ لے آئے۔ چند دن یہاں ٹھہرنے کے بعد یہ لوگ ابن زبیرؓ کے جبر سے بچنے کے لئے طائف چلے گئے[1]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۳۔ ۷۵ ملخصاً

امارتِ حج: یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ متعدد اشخاص خلافت کے مدعی تھے۔ چنانچہ اس سال حج چار امراء کے زیرِ امارت ہوا۔

محمد بن حنفیہ اہلِ طائف کے ساتھ۔ ابن زبیرؓ اپنے متبعین کے ساتھ، نجدہ بن عامر حروری خوارج کے ساتھ اور بنی اُمیہ اہلِ شام کے ساتھ حج کے لئے آئے۔ ایک ساتھ چاروں کا اجتماع خطرہ سے خالی نہ تھا اور ارضِ حرم میں خونریزی کا اندیشہ تھا۔ اس لئے محمد بن جبیر نے چاروں جتھوں کے امراء کے پاس جا کر انہیں سمجھایا۔

سب سے پہلے ابن حنفیہ کے پاس گئے اور ان سے کہا: ''ابوالقاسم خدا کا خوف کرو۔ ہم لوگ مشعرِ حرام اور بلدِ حرام میں ہیں۔ حجاج خانہ کعبہ میں خدا کے وفود اور اس کے مہمان ہیں۔ اس لئے ان کا حج نہ خراب کرو''۔ انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم میں خود یہ نہیں چاہتا اور میں کسی مسلمان کو بیت اللہ سے نہ روکوں گا اور نہ میری جماعت کا کوئی حاجی جائے گا۔ میں تو اپنی مدافعت کرتا ہوں، اور صرف اس صورت میں خلافت کا خواہاں ہوں، جب دو آدمیوں کو بھی میری خلافت سے اختلاف نہ ہو۔ میری طرف سے پورا اطمینان رکھئے۔ میرے بجائے ابن زبیرؓ اور نجدہ حروری سے جا کر گفتگو کیجئے''۔

ان کا جواب سننے کے بعد ابن جبیرؒ ابن زبیرؓ کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی کہا جو ابن حنفیہ سے کہہ چکے تھے۔ انہوں نے جواب دیا: ''میری خلافت پر مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے۔ سب نے میری بیعت کر لی ہے۔ صرف یہ لوگ (بنی ہاشم) میری مخالفت کر رہے ہیں''۔ ابن جبیرؒ نے کہا جو کچھ بھی ہو، ہر حال میں اس وقت آپ کے لئے ہاتھ روکے رکھنا مناسب ہے۔ انہوں نے کہا بہتر ہے، میں اس پر عمل کروں گا۔

ان کے بعد وہ نجدہ حروری کے پاس پہنچے۔ اس نے کہا: ''میں اپنی جانب سے ابتداء نہ کروں گا۔ لیکن جو شخص ہم لوگوں سے لڑے گا ہم بھی اس کا مقابلہ کریں گے''۔

اس کے بعد ابن جبیرؒ بنی اُمیہ کے پاس گئے۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ''ہم تو اپنے علم کے پاس ہیں۔ جب تک خود کوئی ہم سے نہ لڑے گا اس وقت تک ہم ابتداء نہ کریں گے''۔

حضرت ابن جبیرؒ کا بیان ہے کہ ان چاروں جماعتوں کے پرچموں میں سب سے زیادہ پُر امن و پُر سکون پرچم ابن حنفیہ کا تھا[1]۔ اس طرح ابن جبیرؒ کی کوششوں سے ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۵۔ ۷۶ ملخصاً

مختار کا خاتمہ اور ابن حنفیہ کے پاس ابن زبیرؓ کا پیام :

اسی سنہ یعنی ۶۸ھ میں ابن زبیرؓ کے بھائی مصعب نے بڑی معرکہ آرائیوں کے بعد مختار کا خاتمہ کر دیا۔ ان تمام معرکوں میں ابن حنفیہ نے عملاً کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ان کو اس سے کسی قسم کا تعلق تھا۔ اس لئے ان کی تفصیلات کی ضرورت نہیں۔

مختار کے خاتمہ کے بعد ابن حنفیہ کا کوئی سہارا باقی نہ رہ گیا اور وہ بے یار و مددگار ہو گئے۔ اس لئے ابن زبیرؓ نے پھر ان سے بیعت کا مطالبہ شروع کیا اور اپنے بھائی عروہ کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جا کر ان کی جانب سے ابن حنفیہ کو یہ پیام دیا کہ میں تم کو بغیر بیعت لئے ہوئے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اگر بیعت نہ کرو گے تو پھر قید کر دوں گا۔ جس کذاب کی امداد و اعانت کا تم کو سہارا تھا، اس کو خدا نے قتل کر دیا اور اب عرب و عراق کا میری خلافت پر اتفاق ہو گیا ہے۔ اس لئے تم بھی میری بیعت کر لو۔ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

ابن حنفیہ نے اس تہدیدی پیام کا یہ جواب دیا کہ تمہارے بھائی (ابن زبیرؓ) قطع رحم اور استخفافِ حق میں کتنے تیز اور خدا کی عقوبت سے کتنے غافل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں پیشتر (جب تک مختار ان کا حامی تھا) وہ مختار اور اس کی روش کے مجھ سے زیادہ مداح و معترف تھے۔ خدا کی قسم نہ مختار کو میں نے اپنا داعی بنایا تھا اور نہ مددگار۔ ابھی کچھ ہی دنوں کا ذکر ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ خود ان کی طرف مائل تھا اور ان کے ساتھ تھا۔ اس لئے اگر وہ کذاب تھا تو انہوں نے مدتوں تک اس کذاب کو اپنے ساتھ رکھا اور اگر وہ کذاب نہیں تھا تو ابن زبیرؓ مجھ سے زیادہ اس سے واقف ہیں کہ میں ان کا (ابن زبیرؓ) کا مخالف نہیں ہوں۔ اگر مخالف ہوتا تو ان کے قریب نہ رہتا اور جو لوگ مجھے بلاتے ہیں ان کے یہاں چلا جاتا لیکن میں نے کسی کی دعوت قبول نہیں کی۔

تمہارے بھائی کا ایک اور حریف عبدالملک ہے، جو تمہارے بھائی کی طرح دنیا کا طالب ہے۔ اس نے اپنی قوتوں سے تمہارے بھائی کی گردن پکڑ لی ہے۔ میرے نزدیک عبدالملک کا جوار تمہارے بھائی کے جوار سے میرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ عبدالملک نے مجھے خط لکھ کر اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ سن کر عروہ نے کہا، پھر اس کے پاس جانے سے کون امر مانع ہے۔ ابن حنفیہ نے جواب دیا، میں اس بارہ میں عنقریب خدا سے استخارہ کروں گا۔ یہ صورت (یعنی میرا یہاں سے چلا جانا) تمہارے بھائی کے لئے زیادہ پسندیدہ اور خوش آئند ہوگا۔ عروہ نے کہا، میں بھائی سے اس کا تذکرہ کروں گا۔ اس گفتگو کے بعد عروہ لوٹ گئے۔

ابن حنفیہ کے بعض آدمی عروہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کو روک دیا تھا۔ عروہ کے واپس جانے کے بعد ان لوگوں کو بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے ابن حنفیہ سے کہا، اگر آپ نے ہمارا کہنا مانا ہوتا تو ہم ان کی گردن اڑا دیئے ہوتے۔ ابن حنفیہ نے کہا۔

آخر کس قصور میں، وہ تو محض اپنے بھائی کے قاصد بن کر آئے تھے اور ہمارے جوار میں تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان میں گفتگو ہوئی، گفتگو کے بعد ان کو ان کے بھائی کے پاس واپس کر دیا۔ تم لوگ جو کچھ کہتے ہو، وہ فریب ہے اور فریب میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ اگر میں تمہارے کہنے پر عمل کرتا تو مکہ میں خون ریزی ہوتی اور اس بارے میں تم لوگ میرے خیالات سے واقف ہو۔ اگر سارے مسلمان میری خلافت پر متفق ہو جائیں اور صرف ایک شخص کا اختلاف باقی رہے تو بھی میں اس ایک شخص سے لڑنا پسند نہ کروں گا۔

حضرت عروہ نے واپس جا کر اپنے بھائی کو ابن حنفیہ کا جواب سنایا اور انہیں مشورہ دیا کہ میری رائے میں آپ ان سے کوئی تعرض نہ کیجئے۔ ان کو آزاد کر دیجئے۔ تاکہ وہ ہمارے یہاں سے نکل جائیں۔ اور ہم سے دور ہو جائیں۔ عبدالملک بغیر ان سے بیعت لئے ہوئے کبھی ان کو شام میں نکلنے نہ دے گا اور وہ جب تک عبدالملک پر اجماع نہ ہو جائے کبھی اس کی بیعت نہ کریں گے۔ ایسی صورت میں عبدالملک یا انہیں قتل کر دے گا یا قید کر لے گا، اس طرح آپ کا کام اس کے ہاتھوں میں انجام پا جائے گا اور آپ کا دامن بالکل محفوظ رہے گا۔ ابن زبیرؓ نے عروہ کا مشورہ قبول کر لیا، اور پھر محمد بن حنفیہ سے کوئی تعرض نہیں کیا[1]۔

عبدالملک کی دعوت اور ابن حنفیہ کا سفر شام اور واپسی :

عبدالملک ابن زبیرؓ کے مقابلہ میں ابن حنفیہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے ان کو اپنے یہاں شام چلے آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ محمد بن حنفیہ کے یہاں سے عروہ واپسی کے بعد پھر ابن حنفیہ کے پاس عبدالملک کا بلاوے کا خط پہنچا کہ مجھے معلوم ہوا کہ ابن زبیرؓ بیعت لینے کے لئے آپ کو تنگ اور پاس عزیز داری کو چھوڑ کر آپ کے حقوق پامال کر رہے ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ اپنی جان اور اپنے مذہب کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے۔ شام کا ملک آپ کے لئے موجود ہے۔ یہاں آپ جس جگہ چاہیں قیام فرمائیں، ہم لوگ آپ کی بزرگداشت اور عزیز داری کا پورا خیال رکھیں گے اور آپ کے حقوق ادا کریں گے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۷۔ ۷۸

یہ خط پاکر ابن حنفیہ شام روانہ ہوگئے اور شب سے پہلے ایلہ میں اُترے ۔ یہاں کے باشندوں نے ان کے ہمراہیوں کا بڑے جوش سے استقبال کیا اور ابن حنفیہ کے ساتھ بڑی عقیدت ظاہر کی وہ نہایت عزت وتوقیر کے ساتھ یہاں ٹھہر گئے اور دوہی چار دن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ واشاعت شروع کردی کہ ان کے لواحقین پر اور ان کی نگاہوں کے سامنے کسی پر ظلم نہ کیا جائے ۔

عبد الملک کو محمد بن حنفیہ کی پذیرائی اور مقبولیت کی خبر ہوئی اور اس پر سخت گراں گزرا، اور اس نے اپنے اہل الرائے مشیر کار قبیصہ بن ذویب اور روح بن زنباع جذامی سے اس کا تذکرہ کیا۔ ان دونوں نے کہا کہ بغیر بیعت لئے ہوئے انہیں اتنے قریب اس طرح آزاد نہ چھوڑنا چاہیے ، یا تو وہ بیعت کریں، ورنہ حجاز واپس کردیجئے ۔

اس مشورہ کے بعد عبد الملک نے ابن حنفیہ کو پھر خط لکھا کہ آپ ہمارے ملک میں آکر ٹھہرے ہیں۔ ہم میں اور ابن زبیرؓ میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ آپ کا ایک خاص مرتبہ اور اعزاز ہے، اس لئے میرے ملک میں بغیر میری بیعت کے آپ کا قیام میرے مصالح کے خلاف ہے۔ اگر آپ بیعت کے لئے تیار ہیں تو آپ کی خدمت میں سو کشتیاں مع ساز وسامان کے جو ابھی بحر قلزم سے آئی ہیں اور بیس لاکھ درہم نذر کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے پانچ لاکھ فوراً پیش کردیئے جائیں گے اور پندرہ لاکھ بعد میں بھجوادیئے جائیں گے۔ اس نذرانے کے علاوہ آپ جس قدر فرمائیں گے، آپ کی اولاد، آپ کے اعزہ اور آپ کے موالی اور آپ کے ساتھیوں کا وظیفہ مقرر کردیا جائے گا۔ اور اگر بیعت نہیں کرتے تو فوراً میرا ملک چھوڑ دیجئے اور میری حدودِ حکومت سے نکل جایئے۔

ابن حنفیہ نے اس تحریر کا یہ جواب دیا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن علی مرتضیٰؓ کی جانب سے عبد الملک کو سلام پہنچے !

میں اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، حمد کرتا ہوں ، اما بعد

''تم کو خلافت کے بارے میں میرے خیالات معلوم ہیں۔ اس معاملہ میں کسی کو بیوقوف بنا کر دھوکہ نہیں دیتا۔ خدا کی قسم اگر ساری اُمت اسلامیہ میری خلافت پر متفق ہوجائے اور صرف اہلِ زرقاء باقی رہ جائیں تو بھی میں اس سے جنگ نہ کروں گا، اور نہ انہیں چھوڑ کر علیحدہ ہوں گا تا آنکہ وہ سب متفق ہوجائیں۔ مدینہ کے پُرآشوب حالات کی وجہ سے

مکہ چلا آیا تھا اور ابن زبیرؓ کے جوار میں ٹھہرا تھا۔ لیکن انہوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی، مجھ سے بیعت لینی چاہی۔ میں نے انکار کیا کہ جب تک تمہارے اور ان کے اختلافات میں عام مسلمانوں کا کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک میں بیعت نہ کروں گا۔ وہ جو فیصلہ کریں گے، میں بھی ان کے ساتھ ہوں گا۔ ان حالات اور کشمکش میں تم نے مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ میں نے قبول کر لی اور تمہارے ملک کے ایک گوشہ میں اُتر گیا۔ خدا کی قسم مجھ میں مخالفت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میرے تمام آدمی میرے ساتھ تھے، میں نے دیکھا کہ یہ مقام ارزاں زندگی کا ہے، اس لئے خیال کیا کہ اچھا ہے تمہارے جوار میں قیام کر کے تمہارے تعلقات سے فائدہ اُٹھاؤں۔ لیکن اب تم وہ لکھتے ہو جو تم کو نہ لکھنا چاہئے۔ اس لئے ہم انشاء اللہ لوٹ جائیں گے"۔[1]

یہ جواب بھیج کر محمد بن حنفیہ نے اپنے سات ہزار ساتھیوں کے سامنے یہ تقریر کی:

"خدا جملہ امور کا والی اور حاکم ہے، وہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ جو باتیں ہونے والی ہیں، اس کا وقوع قریب ہے۔ تم لوگوں نے امر (خلافت) میں اس کے پیش آنے سے قبل جلدی کی۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ ہم لوگوں کی پشت میں وہ جان نثار پنہاں ہیں، جو آلِ محمد کی حمایت میں لڑیں گے۔ آلِ محمد کا حق اہلِ شرک پر مخفی نہ رہے گا، دیر میں سہی مگر پورا ہوگا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، جس طرح یہ امر (خلافت) شروع میں تم میں تھا، ایک دن پھر تم میں لوٹ کر آئے گا۔ اس خدا کا شکر ہے جس نے تمہارے خون کو بچایا اور تمہارے دین کی حفاظت کی۔ تم میں سے جو شخص امن و حفاظت کے ساتھ اپنے شہر اور اپنے مقام پر واپس جانا چاہتا ہو، وہ جا سکتا ہے۔ اس اجازت پر ابن حنفیہ کے بیشتر ساتھی چلے گئے۔ سات ہزار میں سے صرف نوسو باقی رہ گئے۔ ان کو لے کر وہ مکہ واپس ہوئے"۔[2]

ایلہ سے واپسی کے بعد ابن حنفیہ کے حالات کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حج کا زمانہ تھا۔ اس لئے ابن حنفیہ عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کر اور قربانی کے جانوروں کو لے کر سیدھے مکہ پہنچے۔ لیکن جب حرم میں داخل ہونا چاہا تو ابن زبیرؓ کے سواروں نے روکا۔ ابن حنفیہ نے ابن زبیرؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ مکہ سے جاتے وقت بھی لڑنے کے ارادہ سے نہیں نکلا تھا اور اب واپسی کے بعد بھی

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۸۔ ۷۸　[2] ایضاً ۸۰

اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اس لئے ہمارا راستہ چھوڑ دو کہ ہم بیت اللہ جا کر مناسک حج ادا کرلیں۔ انہیں پورا کرنے کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن ابن زبیرؓ نے بیت اللہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی اور ابن حنفیہ سواری کے جانوروں کو یوں ہی لئے ہوئے مدینہ چلے گئے[1]۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مکہ پہنچ کر منیٰ کی گھاٹی میں ٹھہرے۔ دوہی دن کے بعد ابن زبیرؓ نے کہلا بھیجا کہ یہاں سے ہٹ جاؤ۔ ہمارے قریب نہ ٹھہرو۔ یہ پیام سن کر ابن حنفیہ نے کہا "جب تک خدا ہمارے لئے کوئی راہ نہ پیدا کردے اس وقت تک ہم چارو ناچار صبر کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے اب تک تلوار اٹھانے کا ارادہ نہیں کیا، اگر تلوار اٹھا لیتا تو خواہ تنہا ہی کیوں نہ ہوتا اور ان کے ساتھ پوری جماعت نہ ہوتی تو وہ میرے ساتھ اس طرح نہیں کھل سکتے تھے، لیکن میں تلوار اٹھانا نہیں چاہتا۔ ابن زبیرؓ ہمسایہ آزادی سے باز آنے والے نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ طائف چلے گئے۔ ان کے یہاں آنے کے چند مہینوں بعد حجاج نے ۷۲ھ میں ابن زبیر کا خاتمہ کردیا[2]۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابن زبیرؓ کے حصار کے زمانہ میں ابن حنفیہ مکہ ہی میں تھے۔ چنانچہ حجاج نے ان کے پاس عبدالملک کی بیعت کے لئے کہلا بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا کہ

"تم کو میرے مکہ کے قیام، طائف اور شام کے سفر کے حالات معلوم ہیں۔ تمام زحمتیں میں نے صرف اس لئے اٹھائی تھیں کہ میں اس وقت کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب تک ان میں سے کسی ایک پر سب کا اتفاق نہ ہوجائے۔ مجھ میں مخالفت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ خلافت کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہیں تو میں نے اس وقت تک ان معاملات سے الگ رہنے کے لئے، جب تک کسی پر اجماع نہ ہوجائے۔ خدا کے اس شہر میں جس کی حرمت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ہے اور جس میں طیور تک کے لئے امان حاصل ہے، پناہ لی ہے۔ ابن زبیرؓ نے میرے ساتھ بدسلوکی کی، اس لئے شام چلا گیا، لیکن وہاں عبدالملک نے بھی میرا قرب پسند نہ کیا، اس لئے پھر مکہ چلا آیا۔ اب اگر ابن زبیرؓ قتل ہوجائیں گے اور عبدالملک پر مسلمانوں کا اتفاق ہوجائے گا تو میں تمہارے ہاتھوں پر بیعت کرلوں گا"۔

لیکن حجاج نے ذرا توقف بھی گوارہ نہ کیا اور بیعت کے لئے برابر مصر رہا۔ لیکن محمد بن حنفیہ کسی نہ کسی طرح ٹالتے رہے تا آنکہ ابن زبیر قتل ہوگئے[3]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۰ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۱ [3] ایضاً

عبدالملک کی بیعت اور دورِ سکون :

ابن زبیرؓ کے قتل ہو جانے کے بعد عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ محمد بن حنفیہ میں مخالفت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ اب وہ تمہارے پاس آکر بیعت کرلیں گے۔ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ محمد بن حنفیہ خود بھی شروع سے یہی کہتے چلے آرہے تھے کہ جس کسی ایک شخص پر مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے گا تو میں بھی اس کو تسلیم کرلوں گا۔ چنانچہ عبدالملک پر اتفاقِ عام کے بعد جب عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی بیعت کرلی تو محمد بن حنفیہ سے بھی کہا کہ اب کوئی اختلافی مسئلہ باقی نہ رہا، اس لئے تم بھی بیعت کرلو۔ ان کا پہلے سے یہی خیال تھا۔ اس لئے آمادہ ہو گئے اور حجاج کے ہاتھ پر بیعت کر کے عبدالملک کو حسب ذیل خط لکھا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن علی مرتضٰی کی جانب سے، خدا کے بندے عبدالملک کو ، امابعد

''اس وقت جب تک اُمت میں خلیفہ کے بارے میں اختلاف تھا میں لوگوں سے کنارہ کش رہا۔ اب جب کہ خلافت تم کو مل گئی ہے اور مسلمانوں نے تمہاری بیعت کرلی ہے تو میں بھی اس جماعت میں شامل ہوں، اور بھلائی میں جس میں وہ سب داخل ہوئے۔ میں بھی داخل ہوتا ہوں۔ میں نے حجاج کے ہاتھوں پر تمہاری بیعت کرلی ہے اور اب یہ تحریری بیعت تم کو بھیجتا ہوں۔ کیوں کہ تم پر مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے''۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کو امان اور ایفائے عہد کا یقین دلاؤ۔ فریب میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ اور اگر اب بھی تم کو اس میں تامل یا انکار ہے تو خدا کی زمین وسیع ہے''۔

عبدالملک کو یہ خط ملا تو اس نے اپنے مشیروں قبیصہ بن ذویب اور روح بن زنباع جذامی سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا، ابن حنفیہ پر آج بھی آپ کو کوئی قابو حاصل نہیں ہے۔ وہ جس وقت چاہیں جنگ وفساد برپا کر سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب کہ انہوں نے آپ کی خلافت تسلیم کر کے بیعت کرلی ہے۔ میری رائے میں آپ فوراً ان کو جان بخشی وامان کا عہد و پیمان لکھ دیجئے، اور ان کے ساتھیوں کے لئے بھی وعدہ کر لیجئے۔ ان کے مشورہ پر عبدالملک نے یہ جواب لکھا :

''آپ میرے نزدیک لائق ستائش، مجھ کو زیادہ محبوب اور ابن زبیرؓ سے زیادہ میرے قریب عزیز ہیں۔ اس لئے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ اور آپ

کے تمام ساتھیوں کو کسی ایسے طرز عمل سے جسے آپ ناپسند کرتے ہیں پریشان نہ کیا جائے گا آپ اپنے شہر واپس جائیے اور جہاں دل چاہے اطمینان کے ساتھ رہئے۔ میں جب تک زندہ ہوں رہوں گا عزیز داری کا پورالحاظ رکھوں گا اور آپ کی مدد سے کبھی دستکش نہ ہوں گا''۔

اس خط کے ساتھ ہی حجاج کے نام علیحدہ ان کے ساتھ حسن جوار اور ان کے اعزاز و احترام ملحوظ رکھنے کا حکم بھیجا۔ اس خوش آئند مصالحت کے بعد ابن حنفیہ مدینہ واپس گئے اور اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے کا موقع ملا[1]۔

شام کا سفر اور عبدالملک کا حسن سلوک:

چند برسوں کے بعد ابن حنفیہ نے عبدالملک کو خط لکھ کر اس کے پاس جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ چنانچہ انہوں نے ۷۸ھ میں شام کا سفر کیا۔ عبدالملک نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور ان کے شایان شان ان کی پذیرائی اور بزرگداشت کی۔ اپنے محل کے قریب ہی ٹھہرایا۔ ان کے اور ان کے جملہ ہمراہیوں کی میزبانی کے لئے شاہی خزانہ کھول دیا۔ ایک مہینہ سے کچھ زیادہ ابن حنفیہ دمشق میں رہے۔ اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً عبدالملک سے ملتے رہے۔ دربار کے داخلہ میں شاہی خاندان والوں کے بعد ان کا نمبر تھا۔

ایک دن تنہائی میں عبدالملک کے سامنے اپنے قرض کا تذکرہ کیا۔ عبدالملک نے اسے ادا کرنے کا وعدہ کیا اور ان سے ان کی ضروریات پوچھیں۔ انہوں نے قرض کی ادائے گی اور بعض اور ضروریات کے ساتھ اپنی اولاد اپنے خواص اور اپنے غلاموں کے وظائف مقرر کئے جانے کی خواہش کی۔

عبدالملک نے غلاموں کے وظائف کے علاوہ ان کی جملہ ضرورتیں اور خواہشیں پوری کردیں، پھر ان کے اصرار پر غلاموں کے وظائف بھی مقرر کردیئے۔ لیکن ان کی مقدار کم رکھی، اس پر ابن حنفیہ کا اصرار اتنا بڑھا کہ عبدالملک کو ان وظائف کی مقدار بھی پوری کرنی پڑی۔ ان ضروریات کے پورا ہونے کے بعد ابن حنفیہ مدینہ واپس ہوئے[2]۔ اور تادم آخر ان کے اور عبدالملک کے تعلقات نہایت خوش گوار رہے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵، ص ۸۲ [2] ابن سعد۔ جلد ۵، ص ۸۰۔۸۲

وفات: محمد بن حنفیہ کے سنہ وفات اور جائے وفات کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن صحیح تر روایت یہ ہے کہ ۸۱ھ میں انہوں نے مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے[1]۔

گذشتہ حالات پر تبصرہ :

اوپر جو حالات لکھے گئے ہیں، ان کی حیثیت محض سوانح ہے۔ جن میں واقعات کو صرف واقعات کی حیثیت سے لکھ دیا گیا ہے اور ان پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ان میں بہت سے واقعات و مسائل نقد و نظر کے محتاج ہیں، ورنہ محض اوپر کے واقعات کے آئینہ میں ابن حنفیہ کی تصویر حیات داغدار نظر آتی ہے۔ اس لئے آئندہ سطور میں مذکورہ بالا واقعات پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے۔

حضرت امام حسینؓ کے حقیقی وارث اور جانشین امام زین العابدین تھے، لیکن اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد وہ دنیا سے ایسے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے کہ خلافت اور امامت کے جھگڑوں سے کنارہ کش ہو کر گوشہ عزلت کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ شیعان علیؓ نے انہیں بہت میدان میں لانا چاہا، لیکن وہ ایسے دل شکستہ تھے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ ان سے مایوس ہونے کے بعد شیعانِ علی نے ابن حنفیہ کو اس بارِ امانت کا حامل بنا دیا۔ اس لئے خلافت، وامامت اور اہلِ بیت وغیرہ اہل بیت کو سوالات اور اس سے متفرع عقائد و خیالات اور مسائل کا تعلق ابن حنفیہ کی ذات سے ہو گیا اور اس سلسلہ میں بعض افعال ابن حنفیہ سے ایسے سرزد ہو گئے اور بہت سے ایسے عقائد و خیالات ان کی جانب غلط منسوب ہو گئے، جو بظاہر ان کی ذات سے فروتر ہیں۔ انہی واقعات پر تنقید مقصود ہے۔

شیعی تحریک اور اہلِ بیت وغیرہ مسائل کی بنیاد تمام تر پروپیگنڈے پر ہے۔ اس جماعت نے اپنی تحریک اور اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سے ایسے عقائد و خیالات بزرگانِ اہلِ بیت کی جانب منسوب کر دیئے ہیں، جن کی وجہ سے وہ حرصِ خلافت کا مجسم پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض خیالات تو ایسے گمراہ کن ہیں کہ اگر وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں ظاہر کئے جاتے یا ان کو معلوم ہو جاتے تو وہ ان کے اختراع کرنے والوں کو اپنے اتباع کی جماعت سے خارج کر دیتے۔

---

[1] یہاں شیعت سے مراد اثنا عشری نہیں ہے، کیونکہ اس دور میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر ان کا سلسلہ امامت امام زین العابدین سے چلتا ہے۔ امام حسینؓ کے بعد زین العابدین ان کے بعد ان کے فرزند امام باقر اور جعفر صادق وغیرہ۔ اثنا عشری جماعت کے آئمہ زین العابدین کی نسل سے پورے ہوتے ہیں۔ بلکہ اس عہد کی وہ سیاسی جماعت مراد ہے جو غیر فاطمی خلفاء کے مقابلہ میں ان کی پشت و پناہ تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ''خلافت اسلامیہ'' نے جب دنیاوی حکومت کا قالب اختیار کرلیا، اس وقت اہلِ بیت کرام میں حصول خلافت کا جذبہ ضرور ہوگیا تھا۔ جو بڑی حد تک درست تھا۔ اس لئے کہ ''اسلامی حکومت، اسی وقت تک نیابت الٰہی اور خلافت نبوی ﷺ ہے، جب تک وہ جمہوری ہے اور اسی وقت تک وہ جمہوری ہے، جب تک وہ خلافت ہے''۔

شخصی حکومت کا قالب اختیار کر لینے کے بعد اس کی حیثیت مذہبی باقی نہیں رہتی۔ اس وقت اگر اس حکومت کے بانی کے ورثہ کے دلوں میں اس کے حصول کا جذبہ پیدا ہو یا کوئی جماعت ان کی حمایت کے لئے کھڑی ہوجائے، تو یہ دونوں امور قابلِ اعتراض نہیں کہے جاسکتے۔ لیکن اس سلسلہ میں مدعیانِ محبت اہل بیت نے عجیب گمراہ کن عقائد اختراع کر کے ان بزرگوں کی جانب منسوب کردیئے ہیں، جس سے ان کا دامن بالکل پاک ہے۔

محمد بن حنفیہ اس موحد اعظم کی نسل میں تھے، جس نے اپنے متعلق غلط عقیدہ رکھنے والوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ اس لئے ان کا دامن فاسد عقائد سے آلودہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کے کانوں میں جب اس قبیل کے خیالات پڑتے تھے تو وہ اس کی پوری تردید کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ مختار کے متبعین کہتے ہیں کہ ان کے (ابن حنفیہ) کے پاس قرآن کے علاوہ علم (سینہ) کا کچھ حصہ ہے۔ یہ روایت سن کر انہوں نے مخصوص تقریر کی کہ ''خدا کی قسم اس کتاب کے علاوہ جو دو لوحوں کے درمیان ہے (قرآن پاک) رسول اللہ ﷺ سے وراثت میں ہم کو اور کوئی علم نہیں ملا'' [1]۔

ان کے بہت سے عقیدت مند انہیں مہدی کہہ کر سلام کرتے تھے کہ ''السلام علیک یا مہدی'' یہ جواب دیتے، میں اس معنی میں بے شک مہدی ہوں کہ میں لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی ہدایت کرتا ہوں۔ لیکن میرا نام نبی اللہ کے نام پر اور میری کنیت بنی اللہ کی کنیت پر ہے۔ اس لئے جب تم لوگ سلام کیا کرو تو مہدی کے بجائے ''السلام علیک یا محمد اور السلام علیک یا ابا القاسم'' کہا کرو [2]۔

عام لوگوں نے قریش کے دو خانوادوں بنی اُمیہ اور بنی ہاشم کا رُتبہ ایک دنیاوی وجاہت کی بناء پر اور دوسرے کا مذہبی سیادت کی بناء پر پرستش کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ابن حنفیہ اس کو سخت ناپسند کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے قریش کے دو گھرانوں کو خدا کے علاوہ اس کا ایک مثیل ٹھہرالیا گیا ہے۔ ہم لوگ (اہلِ بیت) اور بنی اُمیہ کو [3]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۷　[2] ایضاً۔ ص ۶۸۔ ۶۹　[3] ایضاً۔ ص ۶۸

بعض فرقے حضرت علی مرتضیٰ کو الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن ابن حنفیہ انہیں بندگی ہی کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی انسان کی نجات اور اس کے جنتی ہونے کی یقینی شہادت نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ اپنے باپ علی مرتضیٰؓ کے متعلق بھی جنہوں نے مجھے پیدا کیا ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا[1]۔

مختار ثقفی کی سرپرستی کے اسباب :

غرض ان کا عقیدہ صحیح عقائد اسلامی کے خلاف نہ تھا۔ مختار ثقفی کے دام تزویر میں پھنس جانا ضرور بظاہر نظر کھٹکتا ہے۔ لیکن یہ فطرت انسانی کا تقاضہ تھا۔

امیر معاویہؓ نے زندگی بھر اہل بیت کے حقوق اور ان کے مراتب کا خیال رکھا۔ ان کے بعد یزید سے لے کر عبدالملک کے زمانہ تک ان بزرگوں کے ساتھ اُموی خلفاء کا جو طرز عمل رہا وہ بالکل عیاں ہے۔ امام حسینؓ اور نبوت کے سارے کنبہ کو جس بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا وہ اُموی حکومت کے دامن کا ایسا داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

ان حالات میں نہ صرف ابن حنفیہ بلکہ سارے بنی ہاشم کے دل اُمویوں کی طرف سے پھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ابن زبیرؓ کا خطرہ علیحدہ ان کے سروں پر مسلط تھا۔ ان حالات میں مختار خونِ حسینؓ کے انتقام کی دعوت لے کر اُٹھا اور قاتلین حسینؓ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا اور بنی اُمیہ اور ابن زبیرؓ دونوں کے مقابلہ میں ابن حنفیہ کا پشت پناہ بنا۔ ایسی حالت میں اگر ابن حنفیہ فطرت انسانی کے مطابق یا کسی مصلحت کی بناء پر اس سے متاثر ہو گئے تو ایک حد تک معذور تھے۔ پھر بھی انہوں نے کبھی اس پر اعتماد نہیں کیا اور اس کو آلۂ کار سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔

اُوپر گزر چکا ہے کہ جب مختار نے ابن حنفیہ سے عراق جانے کی اجازت چاہی تھی تو انہوں نے اجازت دے دی لیکن چونکہ اس پر اعتماد نہ تھا اس لئے اپنے ایک آدمی عبداللہ ابن کامل ہمدانی کو اس کے ساتھ کر دیا اور اس کو ہدایت کر دی کہ یہ شخص لائق اعتماد نہیں ہے۔ اس سے بچتے رہنا[2]۔ یا جب عروہ بن زبیرؓ کی جانب سے ابن حنفیہ کے پاس پیام لے کر آ گئے تو انہوں نے اس سے کہا کہ میں نے نہ اس کو اپنا داعی بنایا تھا، نہ مددگار[3]۔ یا جب بعض اہل عراق کو مختار کے بیانات پر شبہ ہوا اور وہ ابن حنفیہ کے پاس اس کی تصدیق کے لئے گئے تو انہوں نے کہا کہ "اسے ہم پسند کرتے ہیں کہ اللہ نے جس بندے کے ذریعہ سے چاہا ہماری مدد کی[4]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۶۸ [2] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۷۱ [3] ایضاً۔ ص ۷۸ [4] ایضاً۔ ص ۷۲

البتہ تم لوگ کذابین سے ڈرتے رہو اور ان سے اپنی جان اور اپنے دین کی حفاظت کرو۔

لیکن ابن حنفیہ پرخاندانی عصبیت اور حصولِ خلافت کی فطری خواہش ضرور تھی اور اس کا باعث بھی بنی اُمیہ کی غیر محتاط روش اور ان کا جابرانہ طرزِ عمل تھا۔ ابن حنفیہ زبیرؓ اور عبدالملک کے اختلافات اور ابن حنفیہ ابن زبیرؓ کے جبر نے اس جذبہ کو اور زیادہ قوی کر دیا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی انہوں نے کوئی عملی کوشش نہیں کی، بلکہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میں خلافت ضرور چاہتا ہوں مگر اس صورت میں کہ کسی ایک مسلمان کو بھی اس سے اختلاف نہ ہو۔ یہ جذبہ بنی اُمیہ کے مقابلہ میں کسی طرح ناروا نہیں کہا جا سکتا۔

ابن حنفیہ کی پیرو ایک جماعت :

اگرچہ ابن حنفیہ فرقہ اثنا عشری کے امام نہیں ہیں۔ ان کے تمام آئمہ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی اولاد سے ہیں۔ لیکن شیعوں کی ایک جماعت حضرت حسینؓ کے بعد انہی کو امام تسلیم کرتی ہے، اس جماعت کا نام کیسانیہ ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ ابن حنفیہ نے وفات نہیں پائی۔ بلکہ اپنے چالیس اصحاب کے ساتھ کوہ رضوی میں چلے گئے تھے اور اب تک وہاں موجود ہیں۔ ایک شیر اور ایک چیتا ان کی پاسبانی کرتا ہے اور ان کی سیرابی کے لئے ایک شہد اور پانی کا چشمہ رواں ہے۔ خدا انہیں اس گوشہ میں روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ ایک دن وہ اس دنیا میں آئیں گے اور اس کو عدل و انصاف سے معمور کر دیں گے۔ ابن حنفیہ کے بعد ان کے صاحبزادے عبداللہ ان کے جانشین ہوئے تھے[1]۔

فضل و کمال : ابن حنفیہ علی مرتضیٰؓ جیسے مجمع العلم باپ کے فرزند تھے۔ اس لئے علم کی دولت ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ بڑے صاحب علم تھے[2]۔ ابن حبان ان کو ان کے خاندان کے فاضل ترین افراد میں شمار کرتے ہیں[3]۔ لیکن اس کی تفصیل کتابوں میں مذکور نہیں۔

حدیث : حدیث میں انہوں نے اپنے والد بزرگوار اور حضرت عثمان غنیؓ، عمار بن یاسرؓ، معاویہ بن ابی سفیان، ابو ہریرہ اور ابن عباسؓ سے فیض اُٹھایا تھا۔ بعض محدثین کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰؓ کی مستند ترین روایات انہی سے مروی ہیں[4]۔

۱؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۶۷ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۵
۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۴

ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی خاصہ تھا۔ آپ کے چار صاحبزادے، ابراہیم، حسن، عبداللہ اور عون۔ بھتیجے محمد بن عمر بن علی، بھائی کے پوتے محمد بن علی بن حسن۔ بھانجے عبدابن محمد بن عقیل اور بیرونی اشخاص میں عطاء بن ابی رباح، منہال بن عمرو، محمد بن قیس بن مخرمہ، منذر بن یعلی، محمد بن بشیر ہمدانی، سالم بن ابی الجعد اور عمرو بن دینار آپ کے فیض یافتگان میں تھے[1]۔

کلمات طیبات : آپ کے مختصر کلمات طیبات نہایت پُر حقیقت اور سبق آموز ہیں۔ فرماتے تھے، ''جس کا نفس اس کی نگاہ میں معزز ہوا، اس کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی''۔۔۔۔۔ ''جو شخص ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، نہیں نباہ سکتا وہ عقل مند نہیں ہے'' ۔۔۔۔۔''خدا نے جنت کو تمہارے نفس کی قیمت قرار دیا ہے، اس لئے اس کو دوسری چیز کے بدلہ میں فروخت نہ کرو''۔۔۔۔۔''جو چیز لوجہ اللہ نہیں کی جاتی وہ فنا ہو جاتی ہے''[2]۔

عبادت وریاضت : علم کے ساتھ وہ بڑے عابد وزاہد تھے۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ علم اور عبادت دونوں میں انتہائی درجہ پر تھے[3]۔

ماں کی خدمت : ماں کے بڑے خدمت گزار تھے۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے بالوں میں خضاب لگاتے تھے، کنگھی کرتے تھے، چوٹی گوندھتے تھے۔ ایک مرتبہ گھر سے نکلے، ہاتھوں میں مہندی کا اثر تھا، کسی نے پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا، ماں کے بالوں میں خضاب لگا رہا تھا[4]۔

قوت وشجاعت : اسد اللہ الغالب کے خلف الصدق تھے۔ اس لئے علم کے ساتھ قوت وشجاعت بھی ورثہ میں ملی تھی۔ اتنے قوی اور طاقتور تھے کہ زرہ کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر چیر ڈالتے تھے۔

حضرت علیؓ کی ایک زرہ آپ کے جسم سے زیادہ لمبی تھی، آپ نے بقدر زیادتی نشان لگا کر ان کو دیا کہ اس نشان سے کم کر دو۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے زرہ کا دامن پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے بڑھا ہوا حصہ کھینچ کر دو ٹکڑے کر دیئے۔ ابن زبیرؓ جسمانی طاقت میں ان کے حریف تھے۔ ان کے سامنے جب اس واقعہ کا تذکرہ کیا جاتا تھا تو وہ غصہ سے کانپنے لگتے۔

ایک مرتبہ قیصر رُوم نے اپنے یہاں کے دو پہلوان امیر معاویہؓ کے پاس قوت آزمائی کے لئے بھیجے۔ ان میں سے ایک کو قیس نے زیر کیا، دوسرے کے مقابلہ کے لئے امیر معاویہ نے ابن حنفیہ کو بلایا۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۴ ۲ مختصر صفوہ الصفوۃ۔ ص ۱۳۲ ۳ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۸۹ ۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۸

انہوں نے مقابلہ کی یہ صورت پیش کی کہ رُومی پہلوان بیٹھ کر اپنے ہاتھ کو ان کے ہاتھ میں دے۔ دونوں زور کریں، یا وہ دونوں کھینچ کر انہیں بٹھا دے یا یہ بیٹھ کر زور کریں۔ دونوں پہلوانوں نے پہلی صورت پسند کی۔ چنانچہ دونوں میں مقابلہ ہوا، رُومی نے ہر چند زور لگایا لیکن ان کو نہ بٹھا سکا اور انہوں نے کھینچ کو اس کو کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد یہ خود بیٹھے رُومی نے کھڑا کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر ناکام رہا، مگر انہوں نے اس کو کھینچ کر بٹھا دیا[1]۔

اس طاقت کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے والد بزرگوار کے دست راست اور پشت و پناہ رہے۔ ہر میدان میں ان کے دوش بدوش داد شجاعت دیتے تھے۔ جمل اور صفین کے معرکوں میں علوی علم انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے سوال کیا کیا بات ہے کہ تمہارے والد خطرات کے موقع پر تم ہی کو آگے بڑھاتے تھے، اور حسنؓ و حسینؓ کو علیحدہ رکھتے تھے۔ جواب دیا، وہ دونوں ان کی آنکھ کے بجائے تھے اور میں ان کا دست و بازو تھا۔ اس لئے وہ ہاتھ سے آنکھوں کی حفاظت کرتے تھے[2]۔

حلیہ ولباس : میانہ قد تھا۔ آخر عمر میں بال سفید ہو گئے تھے۔ بالوں میں مہندی کا خضاب کرتے تھے۔ خز کا لباس پہنتے تھے۔ سیاہ عمامہ باندھتے تھے۔ ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے[3]۔

اولاد و ازواج : آپ نے متعدد شادیاں کیں اور ان سے بہت سی اولادیں ہوئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے: ۱۔ ابوہاشم ۲۔ عبداللہ ۳۔ حمزہ ۴۔ علی ۵۔ جعفر اکبر۔ یہ چاروں ایک اُم ولد کے بطن سے تھے۔ ۶۔ حسن جنہوں نے سب سے پہلے رجاء کا عقیدہ ایجاد کیا۔ یہ عبدالملک کی پوتی جمال کے بطن سے تھے۔ ۷۔ ابراہیم یہ مسرعہ بنت عباد کے بطن سے تھے۔ ۸۔ قاسم ۹۔ عبدالرحمٰن۔ یہ دونوں برہ بنت عبد الرحمٰن بن حارث مطلبی کے بطن سے تھے۔ ۱۰۔ جعفر اصغر ۱۱۔ عون ۱۲۔ عبداللہ الاصغر یہ تینوں جعفر بن ابی طالب کی پوتی اُم کلثوم کے بطن سے تھے۔ عبداللہ اور رقیہ یہ دونوں اُم ولد سے تھے[4]۔

(۶۳) محمد بن سیرینؒ

نام ونسب : محمد نام ہے۔ ابوبکر کنیت۔ والد کا نام سیرین تھا۔ سیرین جرجرایا (عراق) کے باشندے تھے اور ٹھٹھیرے کا کام کرتے تھے۔ عین التمر میں ان کی دوکان تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عین التمر کے معرکہ میں اور مجمیوں کے ساتھ سیرین بھی گرفتار ہوئے اور کسی مجاہد کے

---

[1] یہ تمام واقعات ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۸۴۹ سے ماخوذ ہیں [2] ایضاً [3] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۸۴-۸۵
[4] ایضاً۔ ص ۶۷

حصہ میں پڑے۔ بعد میں وہ انس بن مالکؓ کی غلامی میں تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید وہ ان ہی کے حصہ میں پڑے ہوں گے یا انہوں نے کسی مجاہد سے خریدا ہوگا۔ بہر حال وہ انسؓ بن مالک کی غلامی میں تھے۔ سیرین بڑے صناع تھے۔ کافی کماتے تھے۔ اس لئے انسؓ نے بیس[۲۰] یا چالیس ہزار لے کر انہیں کچھ عرصہ کے بعد آزاد کر دیا[۱]۔

ان کی بیوی صفیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لونڈی تھیں، اور ایسی لونڈی تھیں جن کی ذات آزاد عورتوں کے لئے قابلِ رشک ہے۔ ان کے نکاح میں تین اُمہات المومنین نے ان کو سنوارا تھا اور اٹھارہ بدری صحابہ شریک نکاح تھے، اور ان کے لئے دعائے خیر کی تھی[۲]۔

پیدائش: ان دونوں کی شخصیت سے مل کر محمد بن سیرین کی ذات وجود میں آئی۔ وہ ۳۳ھ میں تولد ہوئے[۳]۔

فضل و کمال: حضرت انس بن مالکؓ کی ذات وہ تھی، جن کے معمولی تربیت یافتہ علم و عمل کے وارث ہوئے۔ ابن سیرین نے انہی کے دامن علم میں تربیت پائی تھی۔ اور مدتوں ان کے ساتھ رہے تھے[۴]۔ انس بن مالکؓ کے علاوہ اکابر صحابہ میں انہوں نے ابو ہریرہؓ کی زیادہ صحبت اُٹھائی تھی اور ان کے اصحاب میں ان کا شمار تھا۔ تابعین میں وہ مدتوں سرتاجِ تابعین حضرت حسن بصری کی صحبت میں رہے[۵]۔

ان بزرگوں کے فیض صحبت نے ابن سیرین کو پیکر علم و عمل بنا دیا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں۔ كان ثقة مامونا عاليا رفيعا اماما كثير العلم ورعا حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ كان فقيها اماما عزيز العلم ثقة ثبتا علامة التفسير راسا في الورع۔

تفسیر: انہیں جملہ علوم میں یکساں کمال حاصل تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور تعبیر رویا وغیرہ فنون میں امام تھے[۶]۔

حدیث: ابن سیرین حضرت انسؓ کے تربیت یافتہ، ابو ہریرہؓ کے شاگرد اور حسن بصری کے ہم جلیس تھے۔ جن میں سے ہر ایک حدیث کا رکن اعظم تھا۔ ان تینوں بزرگوں کے علاوہ انہوں نے اس فن شریف میں صحابہ میں زید بن ثابتؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، حسن بن علیؓ،

۱؎ ابن خلکان۔ جلد ۲۔ ص ۲۵۳ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۰ ۳؎ ایضاً ۴؎ تہذیب و تذکرۃ الحفاظ ابن سعد وغیرہ ۵؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۲۱۵ ۶؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۱ ۷؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۰ ۸؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۷ ۹؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۲

جندب بن عبداللہ بجلیؓ ، رافع بن خدیجؓ ، سلیمان بن عامرؓ سمرہ بن جندبؓ ،عثمان بن ابی العاصؓ ، عمران بن حصینؓ ،کعب بن عجرہؓ ،معاویہؓ ،ابو درداء ابو سعید خدریؓ ،ابو قتادہ انصاریؓ ،ابو بکر ثقفیؓ ، اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ ۔اور غیر صحابہ علماء میں عکرمہ ،شریح ،حمید بن عبدالرحمٰن اجمیری ،عبداللہ ابن شفیق ،عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ ،قیس بن عباد ،مسلم بن یسار ،یونس بن جبیر ،عمرو بن وہب ،یحیٰ بن ابی اسحٰق حضرمی ،خالد الحذا وغیرہ ایک بڑی جماعت سے روایتیں کی ہیں[1]۔

ان بزرگوں کے فیض نے ان کو علم حدیث کا دریا بنا دیا تھا۔ابن سعد ،حافظ ذہبی ،امام نووی ابن حجر انہیں امام الحدیث لکھتے ہیں۔

احتیاط: اس وسعتِ علم کے باوجود وہ بڑے محتاط تھے۔اور سماع اور روایت دونوں میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔معمولی درجہ کے اشخاص سے تحصیل علم اور اخذ حدیث خلافِ احتیاط سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ علم دین ہے۔اس لئے اس کو حاصل کرنے سے پہلے اس شخص کو خوب اچھی طرح سے پرکھ لو ،جس سے اس کو حاصل کرنا ہے[2]۔

روایت میں اتنے محتاط تھے کہ احادیث کو بالفاظہا روایت کرتے تھے۔تنہا معنی بیان کرنا کافی نہ سمجھتے تھے[3]۔حدیث اس احتیاط سے بیان کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز صاف کر رہے ہیں ،یا کسی چیز کا خوف ہے[3]۔انتہائی احتیاط کی بناء پر حدیثوں کا قلم بند کرنا پسند نہ تھا۔فرماتے تھے کہ کتاب سے بچو۔تمہارے اگلے لوگ کتابوں ہی سے سرگرداں اور گمراہ ہوئے ہیں۔اگر میں کسی چیز کو کتاب بناتا تو رسول اللہ ﷺ کے خطوط کو بناتا ۔لیکن حدیثوں کو حفظ کرنے کے لئے اس شرط پر ان کا قلم بند کرنا جائز سمجھتے تھے کہ حفظ کرنے کے بعد وہ مٹا دی جائیں[4]۔

روایت اور کتابتِ حدیث کے سلسلہ میں ایک باریک نکتہ ارشاد فرماتے تھے کہ اگر کسی بات کرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی باتیں مواخذہ کے لئے قلم بند کی جاتی ہیں تو وہ گفتگو کم کرے گا[5]۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ جب معمولی باتوں میں باتیں کرنے والے مواخذہ کے خوف سے احتیاط کرنے لگتے ہیں تو حدیثوں کی کتابت میں تو بدرجۂ اولیٰ احتیاط کرنی چاہئے کہ اس کی بھول چوک میں زیادہ مواخذہ ہے اور کتابت کی بھول چوک کو دوام حاصل ہو جاتا ہے[6]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ۔جلد ۹ ۔ص ۲۴۲　[2] ابن سعد ۔جلد ۷ ۔ق اول ۔ص ۱۴۹　[3] ایضاً　[4] ایضاً ۔ص ۱۴۲
[5] ایضاً ۔ص ۱۴۲　[6] ایضاً ۔۱۴۳

ان کی مرویات کا پایہ :

اس احتیاط کی بناء پر ارباب فن کے نزدیک وہ بڑے صادق القول اور ان کی روایات نہایت معتبر مانی جاتی تھیں۔ ہشام بن حسام کہتے تھے کہ میں نے انسانوں میں سب سے زیادہ سچا ابن سیرین کو پایا۔ بڑے بڑے آئمہ حدیث شائقین علم کو ان کا دامن پکڑنے کی ہدایت کرتے تھے۔ شعیب بن حجاب کا بیان ہے کہ شعبی ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ ابن سیرین کا دامن پکڑو۔
(تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۸)

تلامذہ : حدیث میں ان کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ بعضوں کے نام یہ ہیں: امام شعبی، ثابت، خالد الحذاء، داؤد بن ابی ہند، ابن عون، جریر بن حازم، ایوب، عاصم الاحول قتادہ، سلیمان التیمی۔ مالک بن دینار، امام اوزاعی، قرہ بن خالد، ہشام بن حسان اور ابو ہلال راسبی وغیرہ [۱]۔

فقہ : فقہ میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ وہ بالاتفاق اپنے عہد کے اکابر فقہاء میں تھے۔ ابن سعد، حافظ ذہبی، امام نووی اور ابن حجر وغیرہ تمام آئمہ فقہ میں ان کی امامت کے معترف ہیں [۲]۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ ابن سیرین فقیہ، فاضل حافظ اور متقن تھے [۳]۔

مہارت قضاء اور اس سے گریز :

فقہی کمال کی بناء پر انہیں قضاء میں بڑی مہارت تھی۔ عثمان البتی کا بیان ہے کہ اس علاقہ میں ابن سیرین سے زیادہ قضاء کا عالم نہ تھا [۴]۔ ان کی مہارت قضاء کی وجہ سے ان کے سامنے عہدہ قضاء پیش کیا گیا۔ یہ اس کے خوف سے شام بھاگ گئے، پھر عرصہ بعد وہاں سے مدینہ واپس آئے [۵]۔

فتاویٰ میں احتیاط :

مسائل اور فتاویٰ کے جواب میں اتنے محتاط تھے کہ جواب دیتے وقت شدتِ احتیاط یا خوف سے گھبرا جاتے اور ان کی حالت بدل جاتی۔ اشعث کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب ابن سیرین کے پاس بیٹھتے تھے تو وہ باتیں بھی کرتے تھے، ہنستے بھی تھے، حالات بھی پوچھتے تھے، لیکن جہاں ان سے فقہ کا کوئی مسئلہ یا حرام وحلال کے متعلق کچھ پوچھا جاتا تو ان کا رنگ متغیر ہو جاتا اور یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ ہنس بول رہے تھے [۶]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۲۱۴ ۲؎ ایضاً ۳؎ دیکھو کتب مذکور حالات ابن سیرین ۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۲۱۶ ۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۳ ۶؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۹
۷؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲

ابن عون کا بیان ہے کہ میں نے ایک مسئلہ میں ابن سیرین کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا [۱]۔

معاصر علماء کا اعتراف :

اس عہد کے بڑے بڑے علماء اور ارباب کمال انہیں ان کے زمانہ کا ممتاز فاضل سمجھتے تھے۔ ابن عون کہتے تھے کہ ساری دنیا میں تین آدمیوں کا مثل نہیں مل سکتا۔ عراق میں ابن سیرین کا۔ حجاز میں قاسم بن محمد کا۔ اور شام میں رجاء بن حیوۃ کا اور پھر ابن سیرین ان تینوں میں فائق تھے [۲]۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ محمد بن سیرین بصرہ کے سب سے بڑے متورع، فقیہ، فاضل، حافظ، متقن اور معتبر خواب تھے [۳]۔

زہد وورع : ان کی ذات جامع العلم والعمل تھی۔ ان میں جس درجہ کا علم تھا، اس درجہ کا عمل بھی تھا۔ وہ اپنے عہد کے بڑے عابد متورع بزرگ تھے۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ کثیر العلم اور متورع تھے [۴]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ راس المتورعین تھے [۵]۔ خطیب کا بیان ہے کہ وہ متورع فقہاء میں تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ میں نے کسی کو ورع میں ان سے بڑا فقیہ اور فقہ میں ان سے زیادہ متورع نہیں دیکھا [۶]۔ فرماتے تھے کہ ورع نہایت آسان شے ہے۔ کسی نے پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا، جس چیز میں شک معلوم ہو اس کو چھوڑ دو [۷]۔

خشیت الٰہی اور رقت قلب :

طبعاً نہایت خندہ جبیں اور خوش مزاج تھے۔ لیکن ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز تھا [۸]۔ یونس کا بیان ہے کہ ابن سیرین ہنس مکھ اور پُر مذاق آدمی تھے، لیکن گداز قلب اور خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جلوت میں ان کے لب ہنستے تھے، لیکن خلوت میں ان کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں [۹]۔ ہشام بن حسان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن سیرین کے ساتھ مقیم تھے [۱۰]۔ دن میں انہیں ہنستا دیکھتے تھے اور رات کی تاریکی میں ان کے گریہ کی آواز سنتے تھے اور موت کے ذکر سے ان پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ زہیر الاقطع کا بیان ہے کہ ابن سیرین جب موت کا ذکر کرتے تھے تو ان کا ہر عضو بدن جیسے مر جاتا تھا۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲　۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۲۱۶　۳؎ ایضاً　۴؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۰　۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۷　۶؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۸۳　۷؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲　۸؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۹　۹؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۸　۱۰؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۴

صحت عقیدہ : عقائد میں وہ سلف صالحین کے سادہ اور بے آمیز عقیدہ کے پابند تھے۔ اس میں عقلی موشگافیوں اور جدتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ قدر کا مسئلہ ان کے زمانہ میں چھڑ چکا تھا۔ ابن سیرین کو اس سے سخت نفرت تھی، اس کو وہ سننا بھی گوارہ نہ کرتے تھے[1]۔ ابن عون کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور ان سے قدر کے متعلق کچھ باتیں کیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں یہ آیت تلاوت کی :

" ان اللہ یامر با لعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون " ۔

" اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابت مندوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور ناشائستہ باتوں اور زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے۔ تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اس کو یاد رکھو"۔

یہ آیت سنا کر انہوں نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں اور باتیں کرنے والے شخص سے کہا تم میرے پاس سے چلے جاؤ، یا میں خود اُٹھ جاتا ہوں۔ یہ نفرت دیکھ کر وہ شخص چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ابن سیرین نے کہا کہ میرا دل میرے اختیار میں نہیں ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے دل میں ایسا خیال نہ پھونک دے، جس کے دُور کرنے پر مجھ کو قدرت نہ ہو۔ اس لئے میرے لئے یہی مناسب تھا کہ میں اس کی باتیں نہ سنوں[2]۔

اسی طریقہ سے ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک اعرابی آیا اور مذہب کے متعلق کچھ باتیں پوچھنے لگا۔ آپ اس کے جوابات دیتے رہے۔ کسی نے اس شخص سے کہا کہ ذرا قدر کے متعلق دریافت کرو، دیکھو کیا کہتے ہیں۔ اس نے پوچھا، ابوبکر قدر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا تم سے یہ کن لوگوں نے کہا ہے۔ پھر چند ساعت خاموش رہ کر فرمایا، کسی کے اُوپر شیطان کا بس نہیں ہے۔ جو شخص خود اس کی اطاعت کر لیتا ہے، اس کو وہ ہلاک کر دیتا ہے[3]۔

عبادت : ان کا سب سے محبوب مشغلہ عبادت تھا اور وہ بڑی سخت عبادتیں کرتے تھے۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ علم اور عبادت دونوں میں انتہائی کمال پر تھے[4]۔

روزانہ شب کو سات ورد پڑھتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی باقی رہ جاتا تھا، تو اسے دن میں پورا کرتے تھے۔ تنہائی میں تسبیح کا شغل رہتا تھا[5]۔ سوتے وقت نفس کو ذکر الٰہی کی طرف متوجہ

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۷　　۲؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۳　　۳؎ ایضاً
۴؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۹　　۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۵

کر لیتے تھے۔اس طرح گویا ساری رات عبادت میں بسر ہوتی تھی۔ایک دن درمیان دے کر ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور اس میں اس قدر سختی برتتے تھے کہ اگر روزہ کا دن یوم شک میں پڑتا، یعنی شعبان اور رمضان کا فیصلہ ہوسکتا تو شک سے روزہ نہ چھوڑتے۔

علامہ ابن سیرین کے گھر کے احاطہ میں ایک مسجد تھی۔جس میں بچہ کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ زکوٰۃ کے باب میں اتنا اہتمام تھا کہ بغیر اس کو نکالے ہوئے عید کی نماز کے لئے گھر سے نہ نکلتے تھے۔ابن عون کا بیان ہے کہ ہم کو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہو کہ عید کے دن ابن سیرین کے پاس گئے ہوں اور انہوں نے ہم کو خبیص (ایک قسم کا کھانا) یا فالودہ نہ کھلایا ہو۔وہ بغیر زکوٰۃ ادا کئے ہوئے عید کے لئے گھر سے نہ نکلتے تھے۔پہلے زکوٰۃ نکال کر جامع مسجد بھجوا دیتے تھے۔اس کے بعد عید کی نماز کے لئے نکلتے تھے[1]۔

احترامِ شعائر اللہ: شعائر اللہ کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔چنانچہ تلاوت قرآن کے درمیان باتیں کرنا پسند نہ کرتے تھے[2]۔مسجد کو اپنے کپڑے سے صاف کرتے تھے[3]۔

محرمات سے اجتناب:

یہ ایک پہلو یعنی اوامر کی پابندی کا حال تھا۔نواہی میں وہ اس سے بھی زیادہ متشدد تھے۔ مشتبہات تک سے اس قدر بچتے تھے کہ اس کے لئے بڑے سے بڑا نقصان گوارا کر لیتے تھے۔بکار ابن محمد اپنے باپ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ ابن سیرین نے جوجرایا کے پرگنہ میں ایک قطعہ زمین خریدی اور اس کی مالگذاری وصول،اس میں انگوروں کی کافی مقدار تھی۔کچھ لوگوں نے افشردہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ابن سیرین نے منع کیا اور کہا انہیں یوں ہی بیچو۔لوگوں نے کہا،اس طرح ان کی نکاسی نہیں ہوسکتی۔فرمایا تو انہیں خشک کر کے منقے بنالو۔لوگوں نے کہا،ان انگوروں سے منقے نہیں بن سکتے۔جب نکاسی کی کوئی صورت بھی نہ نکلی تو اس کا افشردہ نکالنے کے مقابلہ میں ان کو ضائع کر دینا بہتر سمجھا۔اور تمام انگور پانی میں پھینک دیئے[4]۔

شدتِ احتیاط میں مالی نقصان:

تجارت ایک ایسا شغل ہے،جس میں زیادہ احتیاط برتنا خسارہ میں پڑنا ہے۔ابن سیرین کا شغل تجارت تھا۔وہ احتیاط کے سلسلہ میں خندہ پیشانی کے ساتھ نقصان اٹھاتے تھے،لیکن مشتبہ اشیاء کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ایک مرتبہ انہوں نے بیع کے طور پر غلہ خریدا۔اس میں اسی ہزار کا فائدہ ہوا،

---

[1] ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۱۴۱ [2] ایضاً ص ۱۴۷ [3] ایضاً [4] ایضاً

لیکن ان کے دل میں شک پیدا ہوا کہ اس منافع میں سود کا شائبہ ہے۔ اس لئے پوری رقم چھوڑ دی۔ حالانکہ اس میں مطلق ربوا نہ تھا[1]۔

بعض مرتبہ اس احتیاط کی وجہ سے انہیں قید تک کی سزا اٹھانی پڑی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے چالیس ہزار کا غلہ خریدا۔ بعد میں انہیں اس کے متعلق کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں، جنہیں وہ مکروہ سمجھتے تھے[2]۔ اس لئے غلہ چھوڑ دیا یا خیرات کر دیا اور اس کی قیمت باقی رہ گئی، جس کے بدلہ میں انہیں قید ہونا پڑا[3]۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ چالیس ہزار کا روغن زیتون خریدا تھا۔ اس کے پیپوں میں چوہا نکلا۔ معلوم ہوا کہ یہ چوہا کولہو میں پڑ گیا تھا۔ یہ معلوم کر کے انہوں نے کل تیل پھینکوا دیا۔ لیکن اتنی بڑی رقم نہ ادا کر سکے اور اس کی سزا میں قید کی مشقت اٹھانی پڑی[4]۔

ایک روایت یہ ہے کہ عبداللہ بن عثمان بن ابی العاص ثقفی کی لڑکی نے ام محمد کے ہاتھ ایک لونڈی بیچی تھی۔ اس نے شکایت کی ام محمد اس کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس لئے لونڈی کو واپس کر لیا۔ لیکن قیمت خرچ ہو چکی تھی۔ اس لئے سزا کاٹنی پڑی[5]۔

جو سودا بیچتے تھے، اسے گاہک کو اچھی طرح دکھا کر، خریداری پر لوگوں کو گواہ بناتے تھے۔ میمون بن مہران کا بیان ہے کہ میں کچھ کپڑے خریدنے کے لئے کوفہ گیا۔ اور محمد بن سیرین کی دکان پر پہنچا۔ جب میں بھاؤ کر کے کوئی کپڑا خریدتا تھا وہ مجھ سے تین مرتبہ پوچھتے تھے کہ تم اس کی خریداری پر راضی ہو۔ اس کے بعد بھی تشفی نہ ہوتی تھی اور دو آدمیوں کو بلا کر گواہ بناتے تھے۔ ان مراحل کے بعد کہتے اب سامان لے جاؤ۔ حجاجی درہم سے سودا نہیں بیچتے تھے۔ یہ احتیاط دیکھ کر میں اپنی ضروریات کا کل سامان انہی کے یہاں سے خریدتا تھا۔ یہاں تک کہ کپڑا لپٹنے کا سامان بھی انہی کے یہاں سے لیتا تھا[6]۔

اس زمانہ میں چونکہ وزن کرنے کے پیمانوں کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اس لئے جب کسی سے مال قرض لیتے تھے تو رائج پیمانوں اور اوزان کے علاوہ کسی اور چیز سے تول کر مال لیتے تھے اور جس چیز سے تولتے اس کو مہر کر کے محفوظ کر دیتے تھے۔ پھر جب مال واپس کرنے لگتے تھے تو اسی مہر کردہ شے سے تول کر واپس کرتے اور فرماتے کہ وزن گھٹتا بڑھتا رہتا ہے[7]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲ ۲ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۲ ۳ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲ ۴ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۲ ۵ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۲
۶ ایضاً۔ ص ۱۴۶ ۷ ایضاً

تجارت کے سلسلہ میں اکثر ان کے پاس کھوٹے سکے آجاتے ۔ یہ احتیاط کی بناء پر سب کو بے کار کر دیتے ۔ ابن عون کا بیان ہے کہ جب ابن سیرین کے پاس کھوٹا سکہ آجاتا تو وہ اس سے کوئی چیز نہ خریدتے ۔ چنانچہ ان کی وفات کے وقت اس قسم کے بیکار سکے پانچ سو کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے[۱]۔

کسبِ حلال کی تلقین :

دوسروں کو بھی کسب حلال کی تلقین کرتے تھے ۔ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی جانب سے حلال روزی تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے ۔ اسی کو تلاش کیا کرو ۔ اگر تم حرام کے ذریعہ اس کو حاصل کرو گے تو بھی زیادہ نہ ملے گی ۔ جو تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے[۲]۔ دوسروں کو حرام مال سے بچانے کے لئے یہاں تک کرتے کہ اگر آپ سے کوئی ناجائز مال حاصل کرنا چاہتا تو محض اس شخص کو مال حرام سے بچانے تک کی قسم کھا لیتے ۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ پر دو درہم کا دعویٰ کیا ۔ آپ نے انکار کیا ۔ مدعی نے کہا قسم کھاؤ ۔ ابن سیرین تیار ہو گئے ۔ لوگوں نے کہا ، دو درہم کے لئے قسم کھاتے ہیں ۔ جواب دیا ، میں جان بوجھ کر اس شخص کو حرام نہیں کھلا سکتا[۳]۔

امراء وسلاطین کے ہدایا سے اعتراض :

غالباً اسی احتیاط کی بناء پر وہ امراء وسلاطین کے ہدایا نہ قبول کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز جیسے بزرگ نے ان کے اور حسن بصری کے پاس کچھ بھیجا ۔ حسن بصری نے قبول کر لیا ۔ لیکن انہوں نے قبول نہ کیا[۴]۔

خیانت سے احتراز :

خیانت سے اس قدر بچتے تھے کہ ان جائز فوائد کو بھی جن میں خیانت کا کوئی خفیف پہلو بھی تصور کیا جا سکتا تھا ۔ محض احتیاط کی وجہ سے چھوڑ دیتے تھے ۔ ان کے قید کے زمانہ میں اتفاق سے جیل کا محافظ ان کا مرتبہ شناس تھا ۔ اس نے ان سے کہا کہ آپ رات کو گھر چلے جایا کیجئے اور صبح ہوتے ہی پھر لوٹ آیا کیجئے ۔ فرمایا ، میں سلطانی خیانت میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا[۵]۔

۱۔ ابن سعد ۔ جلد ۷ ۔ ق اول ۔ ص ۱۴۷　　۲۔ ایضاً　　۳۔ تہذیب الاسماء ۔ جلد اول ۔ ق اول ۔ ص ۸۴
۴۔ ابن سعد ۔ جلد ۷ ۔ ق اول ۔ ص ۱۴۷　　۵۔ تہذیب الاسماء ۔ جلد اول ۔ ص ۸۷

شہرت سے نفرت : شہرت سے بہت گھبراتے تھے اور اس سے بچنے کے لئے وہ عام مجلسوں میں نہیں شریک ہوتے تھے۔ فرماتے کہ "میں صرف شہرت کے خوف سے تمہاری مجلسوں میں نہیں آتا"[۱]۔ وہ ہر ایسے امتیاز سے جس سے لوگوں کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوتی بچتے تھے۔ اکثر نماز میں اپنے کم درجہ کے لوگوں کو امامت کے لئے بڑھا دیتے۔ ابن عون کا بیان ہے کہ ابن زبیرؓ کے خروج کے زمانہ میں میں بھی ابن سیرین کے ساتھ نکلا، نماز کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے نماز پڑھانے کا حکم دیا، میں نے اس کی تعمیل تو کی لیکن نماز پڑھانے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ نماز اسی شخص کو پڑھانا چاہئے، جس کو قرآن زیادہ یاد ہو۔ فرمایا مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھوں اور لوگ یہ کہیں کہ محمد لوگوں کی امامت کرتے ہیں[۲]۔

ماں کی اطاعت : ماں کے بڑے مطیع اور خدمت گزار تھے۔ ان کی بہن کا بیان ہے کہ ان کی ماں حجازی تھیں۔ اس لئے ان کو رنگین اور نفیس کپڑوں کا بڑا شوق تھا۔ ابن سیرین اس شوق کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ جب ان کے لئے کپڑا خریدتے تھے تو محض کپڑے کی لطافت اور نرمی کو دیکھتے، اس کی مضبوطی کا مطلق خیال نہ کرتے تھے۔ عید کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے ماں کے کپڑے رنگتے۔ میں نے ان کو کبھی ماں کے مقابلہ میں آواز بلند کرتے نہیں سُنا۔ جب ماں سے باتیں کرتے تو اس آہستگی کے ساتھ، جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہے ہیں۔ ابن عون کا بیان ہے کہ ابن سیرین جس وقت اپنی ماں کے سامنے ہوتے تھے تو ان کی آواز اتنی پست ہوتی تھی کہ ناواقف آدمی انہیں بیمار سمجھتا تھا[۳]۔

عجز اور فروتنی : اپنے کو نہایت حقیر سمجھتے تھے۔ اپنی ذات کے لئے کسی قسم کا امتیاز پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ کسی کو اپنے ساتھ چلنے نہ دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص ساتھ چلنا چاہتا تو فرماتے، اگر تم بلا ضرورت چل رہے ہو تو لوٹ جاؤ۔ فرماتے تھے کہ اگر گناہوں میں بُو ہوتی تو کوئی شخص بُو کی شدت سے میرے قریب نہیں آسکتا تھا[۴]۔

بے باکی اور بے خوفی :

لیکن اس فروتنی اور تواضع کے ساتھ بڑے بے باک اور بے خوف تھے۔ بڑے سے بڑے خطرہ کو وہ دھیان میں نہ لاتے تھے۔ ابو قلابہ کہا کرتے تھے کہ محمد کے برابر کون طاقت رکھتا ہے، وہ نیزے کی نوک پر چڑھ جاتے تھے[۵]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۱۳۵ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً۔ ص ۱۴۴ ۴۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۱۵۰
۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۴

صاف دلی: بڑے صاف دل تھے۔ کبھی کسی پر رشک وحسد نہ کرتے تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بھلے بُرے کسی پر حسد نہیں کیا[1]۔

اجمالی رائے: غرض وہ اخلاقی اور مذہبی محاسن کا ایک مکمل ترین نمونہ تھے۔ ابوعوانہ کا بیان ہے کہ ابن سیرین کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا[2]۔

صحابہ اور تابعین پر ابن سیرینؒ کا اثر:

ان کے محاسن کا بڑے بڑے صحابہ اور تابعین پر اتنا اثر تھا کہ وہ ان سے جنازہ کی نماز پڑھانا باعث برکت سمجھتے تھے۔ انس بن مالکؓ نے مرض الموت میں وصیت کی تھی کہ ابن سیرین انہیں غسل میت دیں اور ان کی جنازہ کی نماز پڑھائیں۔ اتفاق سے انس بن مالکؓ کی وفات کے زمانہ میں وہ قید تھے۔ اس لئے حاکم شہر سے حصول اجازت کے بعد وہ لائے گئے اور غسل، تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے بعد پھر قید خانہ واپس کئے گئے[3]۔

علامہ ابن عون کا بیان ہے کہ حسن بصری کی روپوشی کے زمانہ میں ان کی ایک لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ میں نے جا کر ان کو اطلاع دی۔ مجھے خیال تھا کہ وہ مجھ ہی کو نماز جنازہ پڑھانے کا حکم دیں گے۔ لیکن انہوں نے ضروری ہدایت دینے کے بعد ابن سیرین سے نماز جنازہ پڑھانے کا حکم دیا[4]۔

وصیت و وفات: ۱۱۰ھ میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ آخر عمر میں چالیس ہزار کے مقروض ہو گئے تھے۔ اس کی بڑی فکر تھی۔ آپ کے صاحبزادے نے ادائیگی کی ذمہ داری اپنے اُوپر لی۔ اس سعادت مندی پر ان کے لئے دعائے خیر کی۔ پھر وصیت فرمائی کہ تم لوگ خدا کا خوف کرتے رہنا۔ آپس میں صلح و مسالمت سے رہنا۔ اگر مومن ہونے کا دعویٰ ہے تو خدا اور رسول کی اطاعت کرنا۔ خدا نے تمہارے لئے ایک دین منتخب کیا ہے۔ اسی پر مرنا۔ اس کا دعویٰ نہ کرنا کہ تم دین میں انصار کے بھائی اور موالی ہو۔ اور عفاف، زنا اور جھوٹ سے زیادہ بہتر اور پائدار ہیں۔ ان وصایا کے بعد جمعہ کے دن انتقال فرمایا۔ اس وقت اسّی سے اُوپر عمر تھی[5]۔

حلیہ اور لباس: بالوں میں کتم اور حنا کا خضاب کرتے تھے۔ مونچھیں بہت ہلکی کترواتے تھے۔ لباس اچھا پہنتے تھے۔

اولاد: آپ کے تیس اولادیں ہوئیں۔ لیکن عبداللہ کے علاوہ کوئی زندہ نہ رہی۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۳ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۸ [3] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۳ [4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۸ [5] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۴۹۔ ۱۵۰

(۶۴) محمد بن عجلانؒ

نام و نسب: محمد نام ہے۔ ابوعبداللہ کنیت۔ باپ کا نام عجلان تھا۔ فاطمہ بنت ولید بن ربیعہ قرشی کے غلام تھے۔

فضل و کمال: علم اور تقویٰ کے اعتبار سے ممتاز تابعی تھے[1]۔ امام نووی لکھتے ہیں، کان اماما فقیہا عابدا ان کی ہرادا علم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابن مبارک کہتے تھے کہ ابن عجلان سے زیادہ کوئی شخص اہل علم سے مشابہ نہ تھا۔ میں ان کو علماء میں یاقوت سے تشبیہ دیتا تھا[2]۔

حدیث شریف: حدیث کے وہ ممتاز حافظ تھے۔ حافظ ذہبی انہیں امام اور قدوہ لکھتے ہیں[3]۔

صحابہ میں انس بن مالکؓ اور ابوالطفیلؓ سے اور تابعین میں عکرمہ، نافع، سعید مقبری، سلیمان بن ابی حازم اشجعی، ابراہیم بن عبداللہ، رجاء بن حیوۃ، عامر بن عبداللہ بن زبیر اعرج، ابی الزناد، زید بن اسلم، عبید بن مقسم، بکر بن الاشج، علی بن یحییٰ، محمد بن یحییٰ بن حبان اور ابواسحٰق سبیعی وغیرہ سے استفادۂ حدیث کیا تھا[4]۔

عبید اللہ بن عمر، منصور بن معتمر، مالک بن انس، لیث، سفیان ثوری، ابن عیینہ، حیوۃ ابن شریح، شعبہ، قطان اور عبداللہ بن ادریس وغیرہ جیسے اکابر آپ کے خوشہ چینوں میں تھے۔

فقہ و فتاویٰ: فقہ و فتاویٰ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی ان کو مفتی اور فقیہ لکھتے ہیں[5]۔ مسجد نبوی میں افتا کی خدمت انجام دیتے تھے[6]۔

حلقۂ درس: اسی میں ان کا حلقۂ درس تھا۔ جس میں بڑے بڑے تابعین شریک ہوتے تھے[7]۔

زہد و ورع: زہد و ورع ان کا مخصوص طغریٰ کمال تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عالم عامل ربانی اور کبیر القدر تھے[8]۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ عابد مرتاض تھے[9]۔ اپنے مذہبی کمالات کی وجہ سے مدینہ کے حسن بصری شمار کئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک معاملہ میں جعفر بن سلیمان نے ان کو کوڑے لگوانے کا ارادہ کیا۔ اہل مدینہ نے اس سے کہا اگر حسن بصری سے اس قسم کا فعل سرزد ہو جاتا تو کیا تم ان کو مارتے ہو۔ جعفر نے کہا نہیں، لوگوں نے کہا تو وہ مدینہ کے حسن بصری ہیں[10]۔

وفات: ۱۴۸ھ میں وفات پائی[11]۔

---

۱ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۸۷ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۹۴ ۳ ایضاً۔ ص ۱۴۸
۴ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۴۱ ۵ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۸ ۶ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۸۷ ۷ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۹ ۸ ایضاً۔ ۱۴۸ ۹ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۴۲ بحوالہ ابن سعد ۱۰ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۴۹ ۱۱ ایضاً

(۶۵) محمدؒ بن علیؓ بن حسینؓ الملقب بہ باقر

نام ونسب: محمد نام ہے۔ ابوجعفر کنیت۔ باقر لقب، حضرت امام زین العابدین کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کی ماں ام محمد حضرت امام حسن ؓ کی صاحبزادی تھیں۔ اس لئے آپ کی ذات گویا ریاض نبوی کے پھولوں کا دو آتشہ عطر تھی۔

پیدائش: صفر ۵۷ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ان کے جد بزرگوار حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے وقت ان کی عمر تین سال کی تھی [1]۔

فضل وکمال: باقر اس معدن کے گوہر شب چراغ تھے۔ جس کے فیض سے ساری دنیا میں علم و عمل کی روشنی پھیلی، پھر حضرت امام زین العابدین جیسے مجمع البحرین باپ کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ ان موروثی اثرات کے علاوہ خود آپ میں فطرۃً تحصیل علم کا ذوق تھا۔ ان اسباب نے مل کر آپ کو اس عہد کا ممتاز ترین عالم بنادیا تھا۔ وہ اپنے وفور علم کی وجہ سے باقر کے لقب سے ملقب ہو گئے تھے۔ "بقر" کے معنی عربی میں پھاڑنے کے ہیں اسی سے البقر العلم ہے۔ یعنی وہ علم کو پھاڑ کر اس طرح جڑ اور اندرونی اسرار سے واقف ہو گئے تھے [2]۔

بعض علماء ان کا علم ان کے والد بزرگوار سے بھی زیادہ وسیع سمجھتے تھے۔ محمد بن منکدر کا بیان ہے کہ میری نظر میں کوئی ایسا صاحب علم نہ تھا۔ جسے علی ابن حسینؓ پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے صاحبزادے محمد کو دیکھا [3]۔ وہ اپنے عہد میں اپنے خاندان بھر کے سردار تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں، "کان سید بنی ھاشم فی زمانہ"۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ جلیل القدر تابعی اور امام بارع تھے۔ ان کی جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ان کا شمار مدینہ کے فقہا اور ائمہ میں تھا [4]۔

حدیث: حدیث ان کے گھر کی دولت تھی۔ اس لئے وہ اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ علامہ ابن سعید لکھتے ہیں، "کان ثقة کثیر الحدیث والعلم"۔

اس گنج گراں مایہ کو انہوں نے اپنے والد محترم زین العابدین، اپنے نانا حضرت امام حسنؓ اور اپنے دادا حضرت علیؓ۔ اپنے چچیرے دادا محمد بن حنفیہ اور اپنے جد امجد کے چچیرے بھائی عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس، اپنی دادی حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ وغیرہ کے مخزن سے بالواسطہ حاصل کیا تھا۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۰ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۱ و تہذیب الاسماء نووی۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۷ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۰ [4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۱

یعنی ان بزرگوں سے ان کی روایات مرسل ہیں۔ اپنے گھر کے باہر، انس بن مالکؓ، سعید بن مسیب، عبداللہ بن رافع، حرملہ، عطاء بن یسار، یزید بن ہرمز اور ابومرہ وغیرہ سے مستفید ہوئے تھے[1]۔

تلامذہ: اس عہد کے بڑے بڑے آئمہ امام اوزاعی، اعمش، ابن جریج، امام زہری، عمرو بن دینار اور ابو اسحٰق، سبیعی وغیرہ اکابر تابعین اور تبع تابعین کی بڑی جماعت آپ کے خرمنِ کمال کی خوشہ چین تھی[2]۔

فقہ: فقہ میں آپ کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ ابن برقی آپ کو فقیہ و فاضل کہتے ہیں۔ امام نسائی فقہائے تابعین میں[3]، امام نووی مدینہ کے فقہا اور آئمہ میں شمار کرتے ہیں[4]۔

زہد و عبادت: آپ نے ان بزرگوں کے دامن میں پرورش پائی تھی جن کا مشغلہ ہی عبادت تھا[5] اور ایسے ماحول کی نشوونما ہوئی تھی جو ہر وقت خدا کے ذکر اور اس کی تسبیح و تحمید سے گونجا کرتا تھا۔ اس لئے عبادت کی وہی رُوح آپ کے رگ و پے میں سرایت کرگئی تھی۔ عبادت و ریاضت آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ شبانہ یوم میں ڈیڑھ سو رکعتیں نماز پڑھتے[6]۔ سجدوں کی کثرت سے پیشانی پر نشان سجدہ تاباں تھا۔ لیکن زیادہ گہرا نہ تھا[7]۔

شیخین کے ساتھ عقیدت:

اپنے اسلاف کرام اور بزرگان عظام کی طرح شیخین کے ساتھ قلبی عقیدت رکھتے تھے۔ جابر کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ محمد بن علی سے پوچھا کہ آپ کے اہل بیت میں کوئی ابوبکرؓ و عمرؓ کو گالیاں بھی دیتا تھا، فرمایا نہیں۔ میں انہیں دوست رکھتا ہوں اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں[8]۔

حضرت سالم بن ابی حفصہ کا بیان ہے کہ میں نے امام باقر اور ان کے صاحبزادے جعفر صادق سے ابوبکرؓ و عمرؓ کے بارے میں پوچھا، انہوں نے فرمایا، سالم میں انہیں دوست رکھتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے تبری کرتا ہوں۔ یہ دونوں امام ہدی تھے۔ میں نے اپنے اہل بیت میں سے ہر شخص کو ان کے ساتھ تولا ہی کرتے پایا[9]۔

صحتِ عقیدہ: بعض جماعتوں نے بہت سے ایسے غلط عقائد ان بزرگوں کی طرف منسوب کردیئے ہیں، جن سے ان کا دامن بالکل پاک تھا۔ وہ امور دین میں خالص اور بے آمیز اسلامی

۱۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۷ ۲۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۸ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۰ ۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۱ ۷۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۶ ۸۔ ایضاً۔ ص ۲۳۶ ۹۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۱

عقائد کے علاوہ کوئی جدید عقیدہ نہ رکھتے تھے۔ جابر روایت کرتے ہیں کہ میں نے محمد بن علی سے پوچھا کہ کیا اہلِ بیت کرام میں سے کسی کا یہ خیال تھا کہ کوئی گناہ شرک ہے؟ فرمایا نہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا، ان میں کوئی رجعت کا قائل تھا؟ فرمایا نہیں[۱]۔

وفات: مقام حمیہ میں انتقال فرمایا۔ لاش مدینہ لاکر جنت البقیع میں دفن کی گئی[۲]۔ سنہ وفات کے بارے میں بیانات مختلف ہیں۔ بعض ۱۱۴ھ، بعض ۱۱۷ھ اور بعض ۱۱۸ھ بتاتے ہیں[۳]۔ عمر کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اٹھاون سال کے تھے۔ دوسری یہ کہ وہ ۷۳ سال کے تھے۔ لیکن دوسری روایت قطعاً غلط ہے۔ پہلی اقرب الصحۃ ہے۔ اس لئے کہ ان کی پیدائش بالاتفاق ۵۷ھ ہوئی۔ اس حساب سے آپ کی عمر پہلے سن وفات کے مطابق اکسٹھ سال سے زیادہ ہوگی۔

اولاد: امام باقر کی کئی اولادیں تھیں۔ جعفر، عبداللہ۔ یہ دونوں حضرت ابوبکر صدیق کی پوتی اُم فروہ کے بطن سے تھے۔ ابراہیم، یہ اُم حکیم بنت اسید کے بطن سے تھے۔ علی اور زینب، یہ دونوں اُم ولد سے تھے۔ اُم سلمہ، یہ بھی اُم ولد سے تھیں۔ ان میں جعفر الملقب بہ صادق سب میں نامور ہیں اور آپ کے جانشین تھے[۴]۔

لباس: امام باقر نہایت خوش لباس تھے۔ خز جو ایک بیش قیمت کپڑا ہے اور سادہ اور رنگین دونوں طرح کا لباس استعمال کرتے تھے۔ ابریشم کے بوٹے دار کپڑے بھی پہنتے تھے اور وسمہ اور کتم کا خضاب لگاتے تھے[۵]۔

(۶۶) محمد بن کعبؒ

نام ونسب: محمد نام ہے۔ ابوحمزہ کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے: محمد بن کعب بن حبان بن سلیم بن اسد قرظی ان کے والد کعب بنی قریظہ کے یہودی اور انصار کے قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ غزوہ قریظہ میں گرفتار ہوئے۔ لیکن بہت کم سن تھے، اس لئے چھوڑ دیئے گئے۔

فضل وکمال: محمد بن کعب بڑے فاضل اور بلند مرتبہ تابعی تھے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ علم وفقہ میں مدینہ کے فاضل ترین علماء میں تھے[۶]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے اور آئمہ تابعین میں تھے[۷]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۶　۲۔ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۰　۳۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۸
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۲۳۵　۵۔ ایضاً۔ ص ۲۳۶　۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۲۱
۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۹۰

قرآن : ان کو قرآن اور حدیث دونوں میں یکساں کمال حاصل تھا۔ عجلی ان کو ثقہ رجل صالح اور عالمِ قرآن لکھتے ہیں[۱]۔ عون بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے تاویلِ قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا[۲]۔ حافظ ذہبی مفسر قرآن لکھتے ہیں[۳]۔

حدیث : حدیث کے ممتاز حافظ تھے۔ علامہ ابن سعد ثقہ عالم اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں[۴]۔

حدیث میں انہوں نے مغیرہ بن شعبہؓ، معاویہؓ بن کعب بن عجرہ۔ ابو ہریرہؓ، زید بن ارقم، ابن عباسؓ، ابن عمرو بن العاص، عبداللہ بن یزید خطمی، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، براء بن عازب، جابرؓ اور انس بن مالکؓ سے استفادہ کیا۔

ان سے فیض اُٹھانے والوں میں ان کے بھائی عثمان، حکم بن عیینہ، یزید بن ابی زیاد، ابن عجلان، موسیٰ بن عبیدہ، ابو معشر، ابو جعفر خطمی، یزید بن الہاد، ولید بن کثیر، محمد بن المنکدر، عاصم ابن کلب، ایوب بن موسیٰ، ابن ابی الموال، ابی المقدام اور ہشام بن زیاد وغیرہ لائقِ ذکر ہیں[۵]۔

فقہ : فقہ میں مدینہ کے ممتاز فقہاء میں شمار تھا۔ ''کان من افاضل اہل المدینۃ علماء وفقہا''[۶]۔

زہد و ورع : زہد و ورع کی دولت سے بھی بہرہ مند تھے، ابن سعد ان کو علماء متورعین میں۔ حافظ ذہبی زاہد اور ابن عماد حنبلی علم صلاح اور ورع سے متصف لکھتے ہیں[۷]۔

وفات : ۱۸۸ھ میں وفات پائی[۸]۔

(۷۷) محمد بن مسلم المعروف ابن شہاب زہریؒ

نام و نسب : محمد نام ہے، ابو بکر کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن شہاب ابن حارث بن زہرہ بن کلاب بن قرشی۔ زہری کے والد کا نام مسلم تھا، لیکن وہ اپنے دادا شہاب بن حارث کی نسبت سے ابن شہاب مشہور ہوئے۔ ان کے پردادا عبداللہ بن شہاب آغاز اسلام میں دوسرے عمائد قریش کی طرح آنحضرت ﷺ کے سخت دشمن تھے اور بدر و اُحد کے مشہور معرکوں میں مشرکین کے ساتھ استیصال کے لئے نکلے تھے اور شرکائے اُحد کے ان پُر جوش مشرکین میں تھے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دینے یا خود لڑ کر مر جانے کا عہد کیا تھا[۹]۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۲۱ ۲ ایضاً ۳ دول الاسلام ذہبی۔ جلد اول۔ ص ۶۵
۴ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۲۱ بحوالہ ابن سعد ۵ ایضاً ۶ دول الاسلام۔ جلد اول۔ ص ۵۶
۷ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۶ ۸ ایضاً ۹ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۱

اسی دشمن اسلام کی نسل میں محمد بن مسلم پیدا ہوئے۔ جن کی دینی خدمات کو اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ان چند آئمۂ اسلام میں سے ایک ہیں، جن کی ذات سے اسلام کے مذہبی علوم میں زندگی پیدا ہوئی اور اس کی روشنی سے ساری دنیائے اسلام منور ہوئی۔

حصولِ علم کی استعداد :

علمی کمالات کے اعتبار سے ابن شہاب کا کوئی معاصر ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ حصول علم کی استعداد ان میں فطری تھی۔ ذہانت، ذکاوت اور قوت حافظہ بے نظیر پائی تھی۔ ذہین ایسے تھے کہ کسی مسئلہ کو دوبارہ سمجھنے کی ضرورت نہ پیش آتی تھی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک مرتبہ جو بات سُن لی وہ ہمیشہ کے لئے لوح دل پر نقش ہوگئی اور دوبارہ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی[1]۔ ان کی قوتِ حافظہ کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ اسی دن میں پورا کلام اللہ حفظ کرلیا تھا[2]۔ ساری عمر میں صرف ایک مرتبہ ایک حدیث میں کچھ شبہ پیدا ہوا تھا، لیکن پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جس طریقہ سے ان کو یاد تھی ویسی ہی تھی[3]۔

ذوق وطلب : اس ذہن اور حافظہ کے ساتھ ان کے ذوق اور طلب جستجو کا بھی یہی حال تھا۔ علم و فن کا کوئی خرمن ایسا نہ تھا، جس سے انہوں نے خوشہ چینی نہ کی ہو۔ آٹھ سال تک امام مدینہ سعید بن مسیب کی خدمت میں رہے تھے۔ اس عہد کا مدینہ وہ تھا، جس کی گلی گلی علم وفن کا مرکز تھی۔ یہاں کے تمام زن ومرد اور بوڑھے بچے ایک علمی درس گاہ تھے۔ ابن شہاب گھر گھر آ کر سب سے استفادہ کرتے تھے۔ ابوالزناد کا بیان ہے کہ ہم لوگ زہری کے ساتھ علماء کے گھروں کا چکر لگاتے تھے۔ زہری کے ساتھ تختیاں اور بیاضیں ہوتی تھیں۔ وہ جو کچھ سنتے جاتے تھے، اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے[4]۔

علمی مجلسوں میں وہ سب سے پہلے جاتے اور بلا امتیاز بوڑھوں اور بچوں سب سے استفادہ کرتے تھے۔ ان مجلسوں سے نکلنے کے بعد وہ مدینہ کی گلیوں کا طواف کرتے اور تمام بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں تک سے استفادہ کرتے۔

سعد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ زہری علم میں آپ لوگوں پر کیسے فائق ہوگئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ علمی مجالس میں سب سے پہلے آتے تھے۔ یہاں سے اُٹھ کر وہ انصار کے گھروں پر جاتے اور کوئی جوان نوخیز، ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتیں باقی نہ رہتیں، جس سے وہ فائدہ نہ حاصل کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں تک کے پاس چلے جاتے تھے[5]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۷ [3] ایضاً۔ ص ۹۸
[4] ایضاً۔ ۹۶ [5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۹

جہاں کسی فاضلہ خاتون کا پتہ چلتا، فوراً اس کے پاس پہنچتے۔ ان کا خود بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاسم بن محمد نے مجھ سے کہا کہ تم میں علم کی بڑی حرص ہے، اس لئے میں تم کو علم کے ظرف کا پتہ بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور بتایئے۔ قاسم نے کہا، عبدالرحمٰن کی لڑکی کے پاس جاؤ۔ انہوں نے اُم المومنین حضرت عائشہ ؓ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔ چنانچہ ان کے پاس گیا۔ واقعی وہ علم کا بحر بیکراں تھیں[۱]۔

ہمہ گیری: ان کا ذوق ہمہ گیر تھا۔ کسی خاص علم و فن کی تخصیص نہ تھی، بلکہ وہ ہر علم یکساں ذوق سے حاصل کرتے تھے، اور جو کچھ سنتے تھے سب کچھ لکھ لیتے تھے، ابوالزناد کا بیان ہے کہ ہم لوگ صرف حلال وحرام کے مسائل قلمبند کرتے تھے اور زہری جو کچھ سنتے تھے سب کچھ لکھ لیتے تھے، جب آگے چل کر ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ سب سے بڑے عالم ہیں[۲]۔

جامعیت: ان کے ذوق کی اس ہمہ گیری کی وجہ سے انہیں جملہ علوم وفنون میں یکساں دستگاہ حاصل تھی، جس فن پر وہ گفتگو کرتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ یہی ان کا خاص فن ہے۔ لیث کا بیان ہے کہ میں نے زہری سے زیادہ جامع شخصیت نہیں دیکھی۔ جب وہ ترغیب پر گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ وہ اسی کے بڑے عالم ہیں۔ جب عرب اور انساب عرب پر روشنی ڈالتے تو معلوم ہوتا کہ یہی ان کا خاص فن ہے[۳]۔ معمر کا بیان ہے کہ جن جن فنون میں ان کو درک تھا۔ ان میں وہ اپنا مثل نہ رکھتے تھے[۴]۔

قرآن: قرآن کے وہ بڑے حافظ تھے اور اس کے متعلقات پر ان کی نظر اتنی وسیع تھی کہ کلام اللہ ان کا خاص موضوع معلوم ہوتا تھا۔ نافع نے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے حبر الامۃ کے تربیت یافتہ تھے، ان سے قرآن کا دورہ کیا تھا[۵]۔

حدیث: اگرچہ ان کو جملہ فنون میں یکساں کمال حاصل تھا۔ لیکن ان کا خاص فن حدیث وسنت تھا۔ اس کا انہیں جتنا ذوق تھا، اور جس مشقت سے انہوں نے صدہا خرمنوں سے ایک ایک دانہ چن کر علم کا انبار لگایا تھا، اس کے حالات اُوپر گزر چکے ہیں۔ انہوں نے اس عہد کے تمام آئمہ اور اکابر علماء کا علم اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ ابن مدینی کا بیان ہے کہ حجاز میں ثقات کا سارا علم زہری اور عمرو بن دینار کے درمیان تقسیم تھا۔ ان کی احادیث کی تعداد دو ہزار دو سو تک پہنچی[۶]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۹ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸ ۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۶

۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ۴۴۹ ۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۹ ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸

سنن رسول اور سنن صحابہ :

انہیں سنن رسول اور سنن صحابہ کے ساتھ بڑا ذوق تھا۔ اور مدینہ کے جملہ سنن انہوں نے قلمبند کر لئے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ وہ تحصیل علم میں زہری کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم کو سنن لکھ لینا چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے تمام سنن لکھ لئے۔ سنن رسول کے قلمبند کرنے کے بعد انہوں نے کہا اب صحابہ کے سنن لکھنا چاہئے لیکن سنن صحابہ ہم لوگوں نے نہیں لکھے اور انہوں نے لکھ لئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کامیاب رہے اور میں نے موقع ضائع کر دیا[1]۔

مدینہ کے سنن رسول اور سنن صحابہ انہی کی ذات سے محفوظ رہے تھے۔ امام شافعی فرماتے تھے کہ اگر زہری نہ ہوتے تو مدینہ کے سنن ضائع ہو جاتے[2]۔ وہ بالاتفاق اپنے زمانہ کے سنن کے سب سے بڑے عالم تھے۔ عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ اب ابن شہاب سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا[3]۔

علم حاضر: انہوں نے حافظہ ایسا پایا تھا کہ جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سب محفوظ تھا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے سینہ میں جو علم ودیعت کیا وہ نہیں بھولا[4]۔ پھر حفظ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ سینکڑوں حدیثیں سنا جاتے تھے اور جب پھر انہیں دہرانے کی ضرورت ہوتی تھی تو ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے کسی لڑکے کے واسطے ان سے حدیثیں لکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے چار سو حدیثیں قلمبند کرا دیں، ایک مہینہ کے بعد ہشام نے امتحاناً کہا کہ وہ مجموعہ گم ہو گیا، انہوں نے پھر لکھوا دیا، بعد میں دونوں مجموعوں میں مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف کا فرق نہ تھا[5]۔ علاوہ ان احادیث سنن کے جو ان کے سینہ ہی میں رہ گئیں، ان کی مرویات کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے[6]۔ غرض حدیث میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب اور ثناء وصفت اور ان کے حفظ کے کمالات شمار سے باہر ہیں[7]۔

مرویات کا پایہ: حفظ حدیث میں روایت کی کثرت سے زیادہ ان کی کیفیت اور نوعیت معیار کمال ہے۔ اس اعتبار سے زہری کی روایات کا جو پایہ تھا، اس کا اندازہ ان رایوں سے ہوگا۔ عمرو بن دینار جو خود بہت بڑے محدث تھے، فرماتے تھے کہ میں نے زہری سے زیادہ حدیث میں کسی کو نص نہیں دیکھا[8]۔

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۹۱ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد۔ اول۔ ص ۹۷
۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۷ ۶۔ ایضاً۔ ص ۹۶
۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۹۱ ۸۔ تہذیب التہذیب جلد ۹۔ ص ۴۴۸

امام احمد بن حنبل اور اسحق بن راہویہ کی رائے ہے کہ زہری کی وہ روایات اصح ہیں جو انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہیں[1]۔

شیوخ : چونکہ زہری نے ہر خرمن سے گوشہ چینی کی تھی۔ اس لئے ان کے شیوخ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ جن میں بہت سی فاضلہ خواتین بھی ہیں[2]۔ ان کے عہد کے صحابہ اور اکابر تابعین میں کوئی ایسا شخص نہ تھا۔ جس سے انہوں نے استفادہ نہ کیا ہو۔ صحابہ میں عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن جعفر، ربیعہ بن عبادؓ، مسور بن مخرمہؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن یزیدؓ، شعیبؓ، ابو جمیلہ عبدالرحمٰن بن ازہرؓ، محمود بن ربیعؓ، عبداللہ بن ثعلبہؓ، عبداللہ بن عامرؓ بن ربیعہؓ، ابو امامہؓ، سعد بن سہل اور ابو الطفیلؓ وغیرہ۔ اکابر تابعین میں سعید بن مسیب، مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء اور ان کے علاوہ تابعین کی ایک بڑی جماعت نے فیض اٹھایا تھا، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

تلامذہ : ابن شہاب کی ذات مرجع انام تھی۔ اس لئے ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ ان میں سے بعض ممتاز تلامذۂ حدیث کے نام یہ ہیں :

عطاء بن ابی رباح، عمرؒ بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، یحییٰ بن سعید انصاری، ایوب سختیانی، عبداللہ بن مسلم زہری، امام اوزاعی، ابن جریج، محمد بن علی بن حسینؒ، محمد بن منکدر، منصور بن معتمر، موسیٰ بن عقبہ، ہشام بن عروہ، امام مالک، معمر الزبیدی، ابن ابی ذیب لیث، اسحق بن یحییٰ کلبی اور بکر بن وائل وغیرہ[3]۔

فقہ : فقہ میں بھی بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ مدینہ کے ساتوں مشہور فقہا کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا[4]۔ ان کے علاوہ اس عہد کے تمام اکابر فقہاء کے علم کے وہ وارث تھے۔ جعفر بن ربیعہ کا بیان ہے کہ میں نے عراک بن مالک سے پوچھا کہ مدینہ میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ انھوں نے کہا سعید بن مسیب، عروہ اور عبداللہ بن عبداللہ۔ یہ نام گنانے کے بعد کہا میرے نزدیک زہری ان سب سے بڑے عالم تھے، اس لئے کہ انھوں نے ان سب کا علم اپنے علم میں شامل کر لیا تھا[5]۔

فتاویٰ : اس فقہی کمال کی وجہ سے وہ مدینہ کی مجلس افتاء کے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمد بن نوح نے فقہی ترتیب سے ان کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا[6]۔

۱؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۹۱　۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۶ و تہذیب الاسماء۔ ص ۹۱
۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۶ و تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۹۱　۴؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۱　۵؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۴۸　۶؎ اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۶

مغازی : مغازی کے وہ امام تھے۔ان سے پہلے کسی نے مغازی کی طرف توجہ نہ کی تھی۔تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مغازی پر مستقل کتاب لکھی۔امام سہیلی کے بیان کے مطابق یہ اس فن کی سب سے پہلی کتاب تھی۔

ان کی ذات سے مغازی اور سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا۔ان کے تلامذہ میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح، عبدالرحمن بن عبدالعزیز، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحٰق نے اس فن میں بڑا کمال پیدا کیا۔خصوصاً آخر الذکر دونوں تلامذہ نے بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی۔

علماء میں ابن شہاب کا درجہ :

امام زہری کا علمی مرتبہ اس عہد کے تمام علماء اور ارباب کمال میں مسلم تھا۔ایوب سختیانی کہتے تھے کہ میں نے زہری سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔کسی نے پوچھا حسن بصری کو بھی نہیں۔انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں نے زہری سے بڑا کسی کو نہیں پایا[۱]۔

مکحول سے جنہوں نے تحصیل علم کے سلسلہ میں ساری دنیا چھان ماری تھی اور دنیائے اسلام کے تمام بڑے بڑے علماء سے ملے تھے، کسی نے پوچھا تم سب سے بڑے کس عالم سے ملے؟ انہوں نے جواب دیا، ابن شہاب سے۔امام مالک فرماتے تھے کہ دنیا میں زہری کا کوئی مثل نہ تھا۔ سعد بن ابراہیم یہاں تک مبالغہ کرتے تھے کہ میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد زہری کے اتنا علم کسی میں نہ تھا[۲]۔

اشاعت علم : خدا نے زہری کو جس فیاضی کے ساتھ علم کی دولت عطا کی تھی، اسی فیاضی کے ساتھ انہوں نے اس کو تقسیم کیا اور اس کی اشاعت میں سعی بلیغ کی[۳]۔فرمایا کرتے تھے، نہ کسی نے تحصیل علم میں میری جیسی مشقت اٹھائی اور نہ اس کی اشاعت میں۔ان کے تلامذہ کی فہرست سے ان کے علمی خدمات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے[۴]۔

علمی انہماک : ان کی پوری زندگی علم میں ڈوبی ہوئی تھی۔اس کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ علمی انہماک میں وہ دنیا و مافیہا حتیٰ کی بیوی تک سے بے خبر ہو جاتے تھے۔جب گھر آتے تو کتابوں کے ڈھیر میں گم ہو جاتے تھے۔ان کی بیوی نے ایک دن تنگ آ کر کہا، خدا کی قسم یہ کتابیں میرے لئے تین سوکنوں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں[۵]۔

۱۔ تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ص ۹۱ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول ص ۹۷ ۳۔ تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ص ۹۲
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول۔ص ۹۷ ۵۔ ابن خلکان۔جلد اول۔ص ۴۵۱

عہدۂ قضاء اور خلفاء سے تعلقات :

حضرت عبدالملک، عمرؒ بن عبدالعزیز اور ہشام وغیرہ جو چھ خلفاء زہری کے زمانہ میں تھے، ان سب سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ اس کا آغاز عبدالملک سے ہوا۔ عبدالملک خود بڑا صاحب علم اور جوہر شناس تھا۔ اگر وہ خلیفہ ہو کر برباد نہ ہو گیا ہوتا تو عہد تابعین کا نہایت جلیل القدر عالم ہوتا۔ امام شعبی اس کے علمی کمالات کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے، میں جن لوگوں سے ملا عبدالملک کے سوا اپنے کو سب سے افضل پایا۔ عبدالملک کے سامنے جب میں کوئی حدیث بیان کرتا یا شعر پڑھتا تو وہ اس میں اضافہ کر دیتا[1]۔

امام زہری سب سے اول ۸۰ھ میں عبدالملک کے پاس دمشق گئے۔ وہ ان کے علمی کمالات بہت متاثر ہوا۔ زہری مقروض تھے، ان کا کل قرض ادا کر دیا۔ قرض کی ادائیگی کے علاوہ اور بھی سلوک کئے اور انہیں دمشق کے عہدۂ قضاء پر ممتاز کیا[2]۔ اس تعلق سے زہری کا دمشق میں مستقل قیام ہو گیا تھا اور وہ عبدالملک ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ اُموی خلفاء میں عبدالملک کے بعد عمرؒ بن عبدالعزیز بڑے صاحب علم اور جوہر شناس تھے[3]۔ وہ زہری کو بہت مانتے تھے۔ بلکہ انہوں نے تمام ممالک محروسہ میں اعلان کروایا تھا کہ سب لوگ ابن شہاب کی اقتداء کیا کریں کہ ان سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں مل سکتا[4]۔

امیر عبدالملک کی وفات کے بعد زہری اس کے لڑکے ہشام کے ساتھ رہنے لگے تھے[5]۔ پھر ہشام کے لڑکے کے اتالیق ہو گئے تھے۔ ہشام پر بھی ان کا بڑا اثر تھا اور وہ انہیں بہت مانتا تھا۔ اس نے ہزاروں روپیہ ان کا قرض ادا کیا۔ ہشام کے ساتھ ان کی درباری گفتگو اور حاضر جوابی کے بعض دلچسپ واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں[6]۔

ایک دن یہ اور ابوالزناد ہشام کے دربار میں تھے۔ ہشام نے ان سے سوال کیا کہ اہلِ مدینہ کے وظیفے کس مہینہ میں تقسیم ہوا کرتے تھے۔ زہری نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس نے ابوالزناد سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا محرم میں۔ یہ جواب سُن کر ہشام نے زہری سے کہا کہ ابوبکر! یہ علم تم کو آج حاصل ہوا، زہری نے برجستہ جواب دیا، امیر المومنین کی مجلس ایسی ہی ہے کہ اس سے علمی استفادہ کیا جائے[7]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۷　۲؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۲　۳؎ ایضاً۔ ص ۴۵۱　۴؎ ایضاً
۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلس اول۔ ص ۹۷　۶؎ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۵۱　۷؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۹

فیاضی : فیاضی اور سیر چشمی زہری کا نمایاں وصف تھا۔ وہ دولت کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ عمرو بن دینار کا بیان ہے کہ میں نے درہم و دینار کو زہری کی نگاہ سے زیادہ کسی کی نگاہ میں بے وقعت نہیں دیکھا۔ وہ اس کو اونٹ کی مینگنی سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بے دریغ روپیہ لٹاتے تھے اور بار بار مقروض ہو جاتے تھے۔ عبدالملک اور ہشام نے بار ہا ان کا قرض ادا کیا، لیکن ان کی غلط بخشیوں نے ان کو ہمیشہ مقروض رکھا۔ ولید بن محمد موقری کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ زہری سے کہا کہ ابوبکر تم میں صرف ایک عیب قرض لینے کا ہے۔ جواب دیا مجھ پر قرض ہی کیا ہے۔ کل چالیس ہزار دینار کا قرض ہے اور میرے پاس چار غلام ہیں، جن سے ہر ایک چالیس ہزار سے زیادہ بہتر ہے اور صرف ایک پوتا میرا وارث ہے۔ میری تو تمنا یہ تھی کہ کسی کو میری وراثت نہ ملتی۔

وفات : ۱۲۴ھ میں یہ آفتاب علم و عمل دنیا سے روپوش ہوا۔

حلیہ : قد پستہ تھا۔ سر پر کاکلیں تھیں۔

(۶۸) محمد بن منکدرؒ

نام و نسب : محمد نام ہے۔ ابو عبداللہ کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : محمد بن منکدر بن عبداللہ بن ہدیر بن عبدالعزیٰ ابن عامر بن حارث بن حارثہ بن سعد بن تیم بن مرہ تیمی قرشی مدنی۔

فضل و کمال : محمد بن منکدر فضل و کمال اور زہد و تقویٰ میں نہایت بلند پایہ مقام رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کی ثقاہت اور علمی و عملی برتری پر سب کا اتفاق ہے اور ان کے نام کے ساتھ امام شیخ الاسلام لکھتے ہیں[1]۔ حافظ ابن حجر آئمہ اعلام میں لکھتے ہیں[2]۔

قرأت : قرآن کے ممتاز قاری تھے۔ امام مالک انہیں سید القراء کہتے تھے[3]۔

حدیث : حدیث کے بڑے نامور حافظ تھے۔ حافظ ذہبی امام وقت کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حدیث میں انہوں نے صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت سے فیض اٹھایا تھا۔ صحابہ کرام میں ابوایوب انصاریؓ، انس بن مالکؓ، جابرؓ، ابوامامہ بن سہلؓ، ربیعہ بن عبداللہ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، ابوقتادہؓ، سفینہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تابعین میں سعید بن مسیب،

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۷۳ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۳ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۹۔ ص ۴۷۳

عبید اللہ بن ابی رافع، عروہ بن زبیر، معاذ بن عبدالرحمٰن تیمی، سعید بن عبدالرحمٰن بن یربوع اور ابوبکر بن سلیمان سے روایتیں کی ہیں[۱]۔

صحابہ میں بعض بزرگوں سے ان کی روایت مرسل ہیں۔ لیکن علماء کے نزدیک ان کی مرسلات دوسروں کی مرفوع روایت سے زیادہ لائق اعتماد ہیں۔ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ وہ صدق کی کان تھے۔ صلحاء ان کے پاس جمع ہوتے تھے۔ میں نے ان کے سوا کسی کو اس کا اہل نہیں دیکھا کہ وہ قال رسول اللہ کہے اور بے چوں وچرا مان لیا جائے[۱]۔ ابراہیم کہتے تھے کہ وہ حفظ اتقان اور زہد کے انتہائی درجہ پر تھے[۲]۔

تلامذہ : جن لوگوں نے ان سے سماع حدیث کیا تھا، ان میں ان کے صاحبزادے یوسف اور منکدر اور بھتیجے ابراہیم اور عبدالرحمٰن اور عام مستفیدین میں عمرو بن دینار، امام زہری، ایوب انس بن عبید، سلمہ بن دینار، جعفر بن محمد صادق، محمد بن واسع، سعد بن ابراہیم، سہیل بن ابی صالح ابن جریج، علی بن زید، موسیٰ بن عقبہ، ہشام بن عروہ اور یحییٰ بن سعید انصاری وغیرہ لائق ذکر ہیں[۳]۔

فقہ : فقہ وفتویٰ میں بھی پورا درک تھا۔ مدینۃ الرسول کے صاحب افتاء تابعین میں ان کا شمار تھا[۴]۔

زہد و ورع : زہد وتقویٰ کا رنگ بہت گہرا تھا۔ اپنے نفس کی اصلاح کے لئے وہ بڑی سخت ریاضتیں کرتے تھے۔ مسلسل چالیس سال تک نفس پر ہر طرح کی سختیاں جھیلیں[۵]۔ امام مالکؒ فرماتے تھے کہ وہ عابد وزاہد ترین لوگوں میں تھے۔ ابن حماد حنبلی لکھتے ہیں کہ ان کا گھر صلحاء اور عباد کا ماویٰ اور مخزن تھا[۶]۔

رقتِ قلب واثر پذیری :

ان کے دل میں اتنا گداز تھا کہ کلام اللہ کی موثر آیات پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ ایک شب کو تہجد میں بہت روئے۔ صبح کو ان کے بھائیوں نے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس آیت پر گریہ طاری ہوا تھا :

" بدا لهم من الله مالم يكونوا يحتسبون "۔

"ان لوگوں کے لئے خدا کی جانب سے ایسی چیز ظاہر ہوگی جس کا وہم وگمان بھی نہ کرتے تھے"۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۷۴ ۲ ایضاً۔ ص ۴۷۵ ۳ ایضاً۔ ص ۴۷۴

۴ اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۶ ۵ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۴ ۶ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۸

حدیثوں سے تاثر کا بھی یہی حال تھا۔ امام مالکؒ کا بیان ہے کہ جب ان سے کوئی حدیث پوچھی جاتی تو وہ رونے لگتے تھے۔[1]

حج کا ذوق : حج کا ذوق وشوق تھا کہ مقروض ہونے کی حالت میں بھی حج کرتے تھے۔ کسی نے اعتراض کیا کہ آپ قرض کا بار ہوتے ہوئے حج کرتے ہیں۔ فرمایا، حج خود ہی قرض کی ادائیگی میں سب سے بڑا معین ومددگار ہے۔ جب حج کو جاتے تھے تو تنہا نہ جاتے، بلکہ عورتوں اور بچوں سب کو ساتھ لے جاتے۔ کسی نے اس کے بارے میں کہا۔ فرمایا ان کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہوں۔[2]

ان کی زندگی کا اثر دوسروں پر :

ان کے دیکھنے سے نفس کی اصلاح ہوتی تھی۔ امام مالکؒ کا بیان ہے کہ جب میں اپنے قلب میں قساوت محسوس کرتا تھا تو جا کر ابن منکدر کو دیکھتا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ چند دنوں تک نفس میری نگاہوں میں مبغوض ہو جاتا تھا۔

بہترین عمل اور بہترین دنیا :

کسی نے ان سے پوچھا۔ آپ کے نزدیک سب سے افضل کون سی شے ہے؟ فرمایا، مسلمانوں کو خوش کرنا۔ پوچھا سب سے پسندیدہ دنیا کون ہے۔ جواب دیا، دوستوں کے ساتھ سلوک کرنا۔[3]

وفات : ۱۳۰ھ میں وفات پائی۔ عالم احتضار میں سخت رقت طاری ہوئی۔ فرمایا، مجھے اس آیت "بدا لهم من الله مالم يكونوا يحتسبون" سے خوف ہے کہ مبادا میرے لئے بھی خدا کی جانب سے ایسی شے ظاہر ہو جو میرے وہم وگمان میں نہ ہو۔[4]

(۶۹) مسروق ابن اجدعؒ

نام ونسب : مسروق نام ہے۔ ابو عائشہ کنیت۔ ان کے والد کا خاندانی نام اجدع اور اسلامی نام عبدالرحمٰن تھا، وہ یمن کے مشہور خاندان ہمدان کے سردار اور عرب کے نامور شہسوار معدیکرب کے عزیز تھے۔ نسب نامہ یہ ہے : مسروق بن اجدع (عبدالرحمٰن) بن مالک بن اُمیہ بن عبداللہ ابن مر بن سلیمان بن معمر بن حارث بن سعد بن عبداللہ بن وداعہ بن عمر بن عامر و بن ناشح ہمدانی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴ [2] شذرات الذہب۔ جلد اول ص ۱۷۸ [3] ایضاً [4] ایضاً

اسلام : مسروق نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا۔ عہد رسالت میں موجود تھے۔ ان کے گھرانے کے اور افراد اسی عہد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ خود ان کے عزیز عمرو بن معدیکرب نے مدینہ جا کر آنحضرت ﷺ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا[1]۔ لیکن مسروق اس عہد میں اس شرف سے محروم رہے۔ ان کے زمانہ اسلام کا صریح تذکرہ نہیں ملتا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد صدیقی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن سعد میں خود ان کی زبانی یہ روایت ملتی ہے کہ میں نے ابوبکر صدیق ؓ کے پیچھے نماز پڑھی[2]۔

عہد فاروقی : عہد فاروقی میں مسروق نمایاں نظر آتے ہیں۔ فاروقی عہد میں ایک مرتبہ وہ یمن کے وفد میں مدینہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے نام ونشان پوچھا۔ انہوں نے بتایا مسروق ابن اجدع۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اجدع شیطان ہے۔ تم مسروق بن عبدالرحمٰن ہو۔ اس وقت سے ان کے والد کا نام بدل گیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے نہیں بلکہ ان کے والد ہی سے نام پوچھ کر اجدع کے بجائے عبدالرحمٰن نام تجویز کیا تھا[3]۔ بہر حال ان دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی میں باپ بیٹے دونوں مدینہ آئے تھے۔

حضرت مسروق یمن کے نامور شہسواروں میں تھے۔ عہد فاروقی میں اپنے تین بھائی عبداللہ، ابوبکر اور منتشر کے ساتھ قادسیہ کے مشہور معرکہ میں شریک ہوئے۔ تینوں بھائی شہید ہوئے۔ مسروق کا لڑتے لڑتے ہاتھ شل ہو گیا، اور سر میں گہرا زخم آیا، جس کا نشان ہمیشہ باقی رہا۔ اس نشان کو وہ بہت محبوب رکھتے تھے، کہ شجاعت وجانبازی کی سند تھا، اور اس کا مٹ جانا ناپسند کرتے تھے[4]۔

حضرت عثمانؓ کی حمایت :

لیکن ان کی یہ شجاعت وشہامت اسلام کی خدمت کے لئے اور غیروں کے مقابلہ میں تھی، مسلمانوں کی خانہ جنگی میں ان کی تلوار نیام میں رہی۔ عثمانیؓ عہد کے ہنگاموں میں انہوں نے کسی جانب سے حصہ نہیں لیا، لیکن بحیثیت خیر خواہ اسلام کے وہ اپنے شہر (کوفہ) والوں کو اہل مدینہ کی اعانت اور حمایت پر آمادہ کرتے تھے[5]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۸۳ [2] ایضاً [3] ایضاً۔ جلد ۲۔ ص ۵۰ [4] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۱۸۵
[5] ایضاً

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب جنگ جمل کی تیاریاں شروع ہوئیں اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور عمار بن یاسرؓ کو حصول مدد کے لئے کوفہ بھیجا تو سب سے پہلے مسروق ان سے ملے اور عمار بن یاسرؓ سے پوچھا، ابوالیقظان تم لوگوں نے عثمان کو کس بات پر شہید کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا، اپنی آبرو ریزی اور مار پر۔

حضرت مسروق نے کہا: "خدا کی قسم تم لوگوں نے جتنی سزا پائی تھی، اس سے زیادہ انتقام لیا، اگر تم لوگوں نے صبر کیا ہوتا تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر تھا"۔[۱]

خانہ جنگی سے احتراز :

جنگ جمل سے خانہ جنگی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ جنگ صفین تک جاری رہا۔ مسروق نے ان میں سے کسی میں حصہ نہیں لیا۔ کوفہ حضرت علیؓ کے حامیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں رہ کر مسروق کے لئے بچنا مشکل تھا، اس لئے وہ اپنے کو بچانے کے لئے کوفہ چھوڑ کر قزوین چلے گئے تھے۔[۲]

حضرت شعبی کا بیان ہے کہ مسروق کسی جنگ میں بھی حضرت علیؓ کے ساتھ نہ تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم نے علیؓ کا ساتھ کیوں نہیں دیا، تو کہتے ہیں تم لوگوں کو خدا کا واسطہ دلا کر پوچھتا ہوں کہ فرض کرو کہ جب ہم لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوں اور فریقین اسلحہ نکال کر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہوں، اس وقت تمہاری آنکھوں کے سامنے آسمان میں کوئی دروازہ کھل جائے اور اس سے فرشتے اتر کر دونوں صفوں کے درمیان آ کر کہیں :

"یایها الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم ولا تقتلوا انفسکم ان الله کان بکم رحیما"۔

"اے دو لوگو جو ایمان لائے ہو تم ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ پر نہ کھاؤ۔ مگر یہ کہ تمہاری رضامندی سے تجارت سے حاصل ہو اور اپنے نفسوں کو ہلاک نہ کرو، اللہ تمہارے حال پر رحیم ہے"۔

تو ان کا یہ کہنا فریقین کے لئے جنگ سے مانع ہوگا یا نہیں؟ لوگ جواب دیتے، ضرور ہوگا۔ اس وقت مسروق کہتے: "خدا کی قسم تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا آسمان کا دروازہ کھول چکا ہے، اور اس کے راستہ سے ایک فرشتہ اتر کر تمہارے نبی ﷺ کی زبان سے یہ حکم سنا چکا ہے، جو صحائف میں موجود ہے، اور اس کو کسی شے نے منسوخ نہیں کیا ہے"۔[۳]

---

[۱] ابن اثیر۔ جلد ۳۔ ص ۲۳۰　[۲] ایضاً　[۳] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۱۔ ۵۲

ایک دوسری روایت میں عامر بیان کرتے ہیں کہ مسروق نے مجھ سے کہا کہ جب مومنین کی دو جماعتیں آپس میں لڑنے کے لئے صف بستہ ہوں، اور اس وقت آسمان سے کوئی فرشتہ نمودار ہوکر ندا دے کہ

"یایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل"۔ الخ

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ"۔

تو تمہارا کیا خیال ہے کیا لوگ جنگ کریں گے یا رک جائیں گے؟ میں نے کہا اگر وہ بے حس اور جامد پتھر نہیں ہیں تو ضرور رک جائیں گے۔ یہ جواب سن کر انہوں نے کہا تو "خدا کا ایک سماوی صفی اس حکم کے ساتھ ایک ارضی صفی پر نازل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ نہ رکے، حالانکہ ایمان بالغیب عینی مشاہدہ کے بعد کے ایمان سے بہتر ہے"۔

ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خود کنارہ کش رہے، بلکہ عام مسلمانوں کو روکنے کے لئے صفین کے میدان تک گئے، اور دونوں صفوں کے درمیان میں کھڑے ہوکر وعظ سنا کر لوگوں کو جنگ سے روکتے تھے[1]۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ وہ خود نہیں شریک ہوئے اور کسی حیثیت سے صفین میں نہیں گئے۔

قضاءت : اُموی دور میں کچھ دنوں قاضی رہے[2]۔

وفات : ۶۳ھ کے وسط میں مرض الموت میں مبتلاء ہوئے۔ زندگی ہمیشہ متوکلانہ تھی۔ دولت دنیا سے کبھی دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ قضاءت کے زمانہ میں بھی کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے[3]۔ اس لئے کفن تک کی کوڑی نہ تھی۔

حضرت شعبی کا بیان ہے کہ مسروق نے مرتے وقت کفن تک کی قیمت نہ چھوڑی اور اس کے لئے قرض کی وصیت کی، مگر یہ ہدایت کردی کہ زراعت پیشہ اور چرواہے سے نہ لیا جائے بلکہ مویشی رکھنے والے یا تجارت پیشہ سے لیا جائے۔ دمِ آخر بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا: "خدایا میں رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کی سنت کے خلاف طریقہ پر نہیں مر رہا ہوں۔ خدا کی قسم میں نے اپنی تلوار کے علاوہ کسی انسان کے پاس کوئی سونا اور چاندی نہیں چھوڑا ہے۔ اسی کے ذریعہ مجھے کفنانا"۔ غالباً اس سے تلوار بیچ کر روپیہ حاصل کرنے کی طرف اشارہ تھا۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۱۔۵۲ [2] ایضاً۔ ص ۵۵ [3] ایضاً

ان وصایا کے بعد سلسلہ وسط میں وفات پائی اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کا روحانی فیض جاری رہا۔ خشک سالی کے مواقع پر خلق اللہ ان کے مزار پر انوار پر جمع ہو کر پانی کے لیے دعا کرتی تھی اور اس کی برکت سے پانی برستا تھا[۱]۔

فضل و کمال: علمی اعتبار سے علمائے تابعین میں تھے۔ انہیں آغاز عمر ہی سے طلب علم کا ذوق تھا۔ شعبی کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ علم کا طلب کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ جیسی شفیق اور فاضلہ ماں مل گئیں تھیں، جو انہیں لڑکے کی جگہ سمجھتی تھیں۔ مسروق کے ساتھ ان کو مادرانہ محبت تھی[۲]۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کو متبنیٰ بنالیا تھا[۳]۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے، اس میں شبہ ہے کہ مسروق پر وہ غیر معمولی شفقت فرماتی تھیں اور انہیں بیٹا کہہ کر پکارتی تھیں، جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو شہد سے ان کی تواضع کرتی تھیں[۴]۔

ایک مرتبہ مسروق چند آدمیوں کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے حکم دیا کہ میرے لڑکے کے لیے شہد گھولو[۵]۔ حضرت عائشہ ؓ کے بعد مسروق نے ابن مسعود ؓ کے خرمن کمال سے خصوصیت کے ساتھ خوشہ چینی کی تھی اور ان کے نہایت ممتاز اصحاب میں تھے۔ ابن مدائنی کا بیان ہے کہ میں عبداللہ ابن مسعود کے اصحاب میں مسروق پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا[۶]۔

مسروق کے ذاتی شوق و جستجو اور ان دونوں بزرگوں کے فیض صحبت نے مسروق کو علماء اعلام میں بنا دیا۔ حافظ ذہبی ان کو فقیہ اور علمائے اعلام میں لکھتے ہیں[۷]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت، توثیق، فضیلت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے[۸]۔ مرہ کہا کرتے تھے کہ کوئی ہمدانی عورت مسروق جیسا فرزند پیدا نہ کر سکی[۹]۔

حدیث و سنت: حدیث و سنت میں مسروق کا علم خاصہ وسیع تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، "کانت له احادیث صالحة" اس فن میں انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اور ابن مسعود ؓ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمر فاروق ؓ، حضرت عثمان غنی ؓ، حضرت علی مرتضیٰ ؓ، معاذ بن جبل ؓ، ابی بن کعب ؓ، زید بن ثابت ؓ، خباب بن ارت ؓ، عبداللہ بن عمر ؓ، ابن عمرو بن العاص ؓ، مغیرہ بن شعبہ ؓ وغیرہ

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۶ ۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۸۸ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۲
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۲ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۲ ۶۔ ایضاً
۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۸۸ ۸۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۲ ۹۔ ایضاً

جیسے اکابر صحابہ سے فیض پایا تھا۔ حدیث کے ساتھ وہ سنت کی تعلیم بھی دیتے تھے[۱]۔

فقہ وفتاویٰ: مسروق کا خاص فن فقہ تھا۔ اس میں وہ امامت واجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ عبداللہ ابن مسعودؓ کے ان اصحاب میں تھے، جن کا شغل ہی درس وافتاء تھا[۲]۔

افتاء میں قاضی شریح ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ شعبی کا بیان ہے کہ مسروق افتاء میں شریح سے فائق تھے، وہ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے[۳]، اور خود ان کے مشورہ سے بالکل بے نیاز تھے[۴]۔

قضاءت: اس فقہی کمال کی بنا پر انہیں قضاءت میں خاص ملکہ تھا اور یہ مشغلہ ان کے پسند خاطر بھی تھا۔ قاضی شریح کا فیصلوں میں ان سے مشورہ لینا، اس سے بڑی سند ہے۔ اوپر گزر چکا ہے، وہ اُموی دور میں کچھ دنوں قاضی بھی رہے۔ انہیں قضاء سے اس قدر ذوق تھا کہ کہا کرتے تھے کہ مجھے کسی قضیہ میں صحیح اور حق کے موافق فیصلہ کرنا ایک سال کے جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ پسند ہے[۵]۔

فضائل اخلاق: علم کے ساتھ مسروق عمل اور فضائل اخلاق کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔

خشیتِ الٰہی: تمام محاسنِ اخلاق کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے۔ مسروق اہلِ علم خوفِ خدا کو سمجھتے تھے اور اس کے مقابلہ میں غرورِ عمل کو جہل تصور کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ انسان کے لئے یہ علم کافی ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے اور جہل یہ ہے کہ اپنے علم پر غرور کرے[۶]۔

عبادت وریاضت:

عابد مرتاض تھے۔ بڑی ریاضت کرتے تھے۔ نمازوں کی کثرت سے دونوں پاؤں ورم کر آتے تھے۔ خاص خاص زمانوں میں ان کی عبادت اور زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ طاعون کی وباء کے زمانے میں وہ عبادت کے لئے گوشہ تنہائی اختیار کر لیتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ طاعون کی وجہ سے ہٹ گئے ہیں، حالانکہ اس کی غرض عبادت ہوتی تھی۔

حضرت ابن سیرین کا بیان ہے کہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ مسروق طاعون سے بھاگتے تھے۔ لیکن محمد کو اس کا یقین نہ آیا۔ انہوں نے کہا، ان کی بیوی سے چل کر پوچھنا چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جا کر ان سے پوچھا۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی طاعون سے نہیں بھاگتے تھے۔ البتہ جس زمانہ میں طاعون کی وباء پھیلتی تو وہ کہتے کہ یہ شغل وذکر کے ایام ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تنہائی میں

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۰ ۲۔ ایضاً۔ ص ۱۱۱ ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۵
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۳ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۵ ۶۔ ایضاً۔ ص ۵۴

عبادت کروں۔ چنانچہ وہ عبادت کرنے کے لئے گوشۂ خلوت اختیار کر لیتے تھے اور اپنے نفس کے اوپر ایسی سختیاں کرتے تھے کہ بسا اوقات میں ان کی حالت دیکھ کر ان کے پیچھے بیٹھ کر روتی تھی[۱]۔ حج کے زمانہ میں جب تک مکہ میں رہتے اس وقت سجدہ ہی میں سوتے تھے[۲]۔

توبہ استغفار : وہ اپنے نفس کا محاسبہ اور گناہوں کو یاد کر کے ان کے لئے استغفار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ انسان کے لئے ایسی مجالس ہونی چاہئیں، جن میں بیٹھ کر وہ اپنے گناہوں کو یاد کر کے خدا سے استغفار کرے[۳]۔

دنیا کی حقیقت : ان کی نگاہ میں دنیا کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ وہ اس کو ایک مزبلہ سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑ کر ایک مزبلہ پر لے گئے اور فرمایا، میں تم کو دنیا دکھاؤں۔ دیکھو یہ دنیا ہے کہ اس کو کھا کر دفنا دیا، پہن کر پرانا اور بوسیدہ کر دیا، سوار ہو کر لاغر کر دیا، اس کے لئے خون بہایا، محارم اللہ کو حلال اور رحم کو قطع کیا[۴]۔

دنیا سے بے تعلقی :

اسی لئے دنیا کی جانب ان کا دل کبھی مائل نہ ہوا اور کسی دنیاوی شے میں ان کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ حضرت سعید بن جبیرؒ ان کے ہم مذاق و ہم مشرب تھے۔ ان میں اور مسروق میں راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ابن جبیر کا بیان ہے کہ مسروق نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا، سعید اب کوئی ایسی شے نہیں، جس کی جانب میلان خاطر باقی ہو بجز اس کے کہ اپنے چہروں کو اسی مٹی میں آلود کریں[۵]۔

دولتِ دنیا سے بے نیازی :

اس دل شکستگی کی وجہ سے وہ دولتِ دنیا سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ قبول نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خالد بن اسید نے ان کے پاس تیس ہزار کی رقم بھیجی۔ انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے اعزہ نے بہت سمجھایا کہ لے لیجئے، اس کو صدقہ کیجئے گا۔ عزیزوں کے ساتھ سلوک کیجئے گا اور اس قبیل کے دوسرے کاموں میں لائیے گا۔ مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہ کیا[۶]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۳ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۳ ۳۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۵۴
۴۔ ایضاً۔ ص ۵۵ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۳۶ ۶۔ ایضاً۔ ص ۵۳

توکل وقناعت :

اس بے نیازی کی وجہ سے کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔لیکن توکل کادامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ایک مرتبہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔بیوی نے کہا عائشہ کے باپ آج تمہارے بال بچوں کے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔یہ سن کر مسروق مسکرائے اور کہا خدا کی قسم وہ ضرور ان کے لئے رزق کا انتظام کرے گا[1]۔

انفاق فی سبیل اللہ :

اس قناعت اور توکل کے باوجود بڑے فیاض اور سیر چشم تھے۔جب انہیں کوئی رقم ہاتھ آجاتی تھی تو اس کو خدا کی راہ میں صرف کر دیتے تھے۔اپنی لڑکی کی شادی سائب بن اقرع کے ساتھ کی،اور ان سے مہر کے علاوہ دس ہزار اپنے لئے حاصل کئے۔یہ کل رقم مجاہدین فی سبیل اللہ،مساکین اور مکاتب،غلاموں کی آزادی کے لئے مخصوص کردی تھی[2]۔

احتیاط : اتنے محتاط تھے کہ ادنی ادنی باتوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔جب کشتی پر سوار ہونے لگتے تو طہارت کے خیال سے ایک اینٹ ساتھ لے لیتے۔جس پر سجدہ کرتے۔جس کا کوئی کام ان سے نکلتا تھا،اس سے ہدیہ تک قبول نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی معاملہ میں ایک شخص کی سفارش کی،اس نے شکریہ میں ایک لونڈی لاکر پیش کی۔یہ اسے دیکھ کر سخت برہم ہوئے اور کہا اگر مجھے پہلے تمہارے اس خیال کا علم ہوتا،تو میں کبھی تمہاری سفارش نہ کرتا۔جتنی سفارش کر چکا،وہ کر چکا۔اب جتنی ضرورت اور باقی رہ گئی ہے،اس کے بارے میں میں کچھ نہ کہوں گا۔میں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے سنا ہے کہ جو شخص کسی کا حق دلانے یا ظلم کے انسداد کے لئے کسی کی سفارش کرے اور اس کے معاوضہ میں اس کو ہدیہ دیا جائے اور سفارش کرنے والا قبول کرلے تو وہ ہدیہ اس پر حرام ہے[3]۔

(۷۰) مسعر بن کدامؒ

نام ونسب : مسعر نام ہے۔ابوسلمہ کنیت۔نسب نامہ یہ ہے : مسعر بن کدام بن ظہیر بن عبیداللہ بن حارث ابن عبداللہ بن عمرو بن عبدمناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ قرشی عامری۔

۱؎ ابن سعد۔جلد ۶۔ص ۵۳　　۲؎ ایضاً۔ص ۵۳　　۳؎ ایضاً

فضل وکمال: مسعر علمی اور مذہبی دونوں کمالات کے اعتبار سے ممتاز ترین تابعین میں تھے۔ یعلی بن مرہ کا بیان ہے کہ مسعر کی ذات علم اور ورع کی جامع تھی[1]۔

عراق میں ان کے پایہ کے علماء کم تھے۔ ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ عراقیوں میں مسعر اور ایوب سے افضل ہمارے یہاں کوئی نہیں آیا[2]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت پر سب کا اتفاق ہے[3]۔

حدیث: حدیث کے وہ اکابر حفاظ میں تھے[4]۔ امام ذہبی انہیں حافظ اور علمائے اعلام میں لکھتے ہیں۔ ان کے حافظہ میں ایک ہزار حدیثیں محفوظ تھیں[5]۔

حدیث میں انہوں نے عمرو بن سعید نخعی، ابو اسحٰق سبیعی، عطاء، سعید بن ابراہیم، ثابت ابن عبید اللہ انصاری، عبد الملک بن نمیر، ہلال بن خباب، حبیب بن ابی ثابت، علقمہ بن مرثد، قتادہ، عثمٰن بن عبد الرحمٰن، بن مقدام بن شریح اور اعمش وغیرہ ایک کثیر جماعت سے استفادہ کیا تھا[6]۔

ان کی مرویات کا پایہ:

ان کی مرویات کی صحت کے لئے یہ کافی ہے کہ شعبہ کے پایہ کے محدث انہیں مصحف کہتے تھے[7]۔ ان کی ذات ہی احادیث کی جانچ کے لئے معیار تھی۔ چنانچہ میزان ان کا لقب ہو گیا تھا[8]۔

کم ایسے محدثین نکلیں گے، جس کی مرویات پر کسی نہ کسی حیثیت سے تنقید نہ کی گئی ہو۔ لیکن مسعر کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی[9]۔

آئمہ حدیث شک اور اختلاف کے موقع پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سفیان ثوری کا بیان ہے کہ جب ہم لوگوں میں (حدیث کی) کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو مسعر سے پوچھتے تھے[7]۔ ابراہیم سعد کہتے تھے کہ جب سفیان اور شعبہ میں کسی کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو میزان مسعر کے پاس جاتے تھے[10]۔

---

1 تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰ 2 تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۴ 3 تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۹ 4 تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۶۹ 5 ایضاً 6 تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۳ وتہذیب الاسماء 7 تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰ 8 تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۱۴ 9 ایضاً 10 تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۸۹

احتیاط : اس محدثانہ کمال کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑے محتاط تھے۔ اس ذمہ داری سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ فرماتے تھے کہ "کاش میرے سر پر شیشوں کا بار ہوتیں کہ گر کر چور چور ہوجاتیں"۔ ان کی احتیاط شک کے درجہ تک پہنچ گئی تھی[۱]۔

ابو نعیم کا بیان ہے کہ مسعر اپنی احادیث میں بڑے شکی تھے، لیکن وہ کوئی غلطی نہ کرتے تھے اعمش کہا کرتے تھے کہ مسعر کا شیطان ان کو کمزور کر کے شک دلاتا رہتا تھا[۲]۔

ان کے اس شک نے ان کی احادیث کا درجہ اتنا بلند کر دیا تھا کہ محدثین ان کے شک کو یقین کا درجہ دیتے تھے۔ اعمش سے بعض لوگوں نے کہا کہ مسعر اپنی حدیثوں میں شک کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ان کا شک اوروں کے یقین کے برابر ہے[۳]۔

فقہ : فقہ میں اگرچہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہ تھی، تاہم کوفہ کی صاحب افتا جماعت میں تھے۔

حلقہ درس : مسجد میں حلقہ درس تھا۔ عبادت کے معمولات کے بعد روزانہ مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور شائقینِ حدیث ارد گرد حلقہ باندھ کر استفادہ کرتے تھے[۴]۔

زہد و عبادت :

ان کی ماں بڑی عابدہ تھیں۔ ان کے فیضِ تربیت کا مسعر پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ ان کی ماں بھی مسجد میں نماز پڑھتی تھیں۔ اکثر دونوں ماں بیٹے ایک ساتھ مسجد میں جاتے۔

مسعر نمدہ لئے ہوتے تھے۔ مسجد پہنچ کر ماں کے لئے نمدہ بچھا دیتے۔ جس پر کھڑے ہو کو وہ نماز پڑھتیں۔ مسعر علیحٰدہ مسجد کے اگلے حصہ میں نماز میں مشغول ہوجاتے۔ نماز تمام کرنے کے بعد ایک مقام پر بیٹھ جاتے اور شائقینِ حدیث آ کر جمع ہوجاتے۔ مسعر انہیں حدیثیں سناتے۔ اس درمیان میں ان کی ماں عبادت سے فارغ ہوتیں۔

مسعر درس سے فارغ ہونے کے بعد ماں کا نمدہ اُٹھاتے اور ان کے ساتھ گھر واپس آتے[۵]۔ ان کے صرف دو ٹھکانے تھے[۶]۔ گھر یا مسجد۔ کثرتِ عبادت سے پیشانی پر اُونٹ کے گھٹے کی طرح موٹا گھٹا پڑ گیا تھا[۷]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰ — ۲ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۴ — ۳ تذکرۃ الحفاظ، جلد اول۔ ص ۱۶۹

۲ اعلام الموقعین۔ ص ۲۸ — ۳ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۳ — ۴ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۳

۵ ایضاً۔ ص ۲۵۴ — ۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰ — ۷ ایضاً

روزانہ نصف قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے محمد کا بیان ہے کہ والد آدھا قرآن ختم کیے بغیر نہ سوتے تھے[1]۔ وہ کسی درجہ پر پہنچ کر رُکے نہیں اور ان کے روحانی مدارج ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔

ابن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے مسعر کو خیر میں ہر روز ترقی کرتے دیکھا[2]۔ معن کا بیان ہے کہ ہم نے ہر دن پہلے دن سے افضل پایا۔ وہ عبادت و ریاضت اور فضائل اخلاق کے اس درجہ پر پہنچ گئے کہ لوگ ان کے جنتی ہونے میں کوئی شک نہ کرتے تھے۔ حسن بن عمارہ کہا کرتے تھے کہ اگر مسعر کے جیسے آدمی بھی جنت میں داخل نہ ہوں تب تو جنتیوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی[3]۔

ابن مبارک یا کسی اور اسی درجہ کے کسی بزرگ نے ان کے فضائل سے متاثر ہو کر ان کی شان میں یہ اشعار کہے تھے[4]۔

من کان ملتمسا جلیسا صالحا	فلیات حلقة مسعر بن کدام
جس شخص کو اچھے جلیس کی تلاش ہو	اس کو مسعر بن کدام کے حلقہ میں آجانا چاہیے
فیها السکینة والوقار واهلها	اهل العفاف وعلیه الاقوام
اس میں سکینہ ہے اور وقار ہے اور اس کے ارکان	پاکباز اور اونچے درجے کے ہیں

دولت دنیا سے بے نیازی :

دنیا اور اس کے شان و شکوہ سے بالکل بے نیاز تھے۔ چنانچہ حکومت کے عہدوں کو وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ ابو جعفر عباسی آپ کا عزیز تھا۔ اس نے ان کو کسی مقام کا والی بنانا چاہا۔ انہوں نے کہا میرے گھر والے تو مجھے دو درہم سودا لانے کے لائق بھی نہیں سمجھتے، اور کہتے ہیں ہم تمہارا دو درہم کا سودا کرنا بھی نہیں پسند کرتے، اور تم مجھے والی بنانا چاہتے ہو۔ خدا تم کو صلاحیت دے۔ ہماری قرابت داری ہے، اس لئے ہمارا حق ہے کہ ہم بھی کچھ کہہ سکیں۔ ان کے اس عذر پر ابو جعفر نے ان کو اس خدمت سے معاف کر دیا[5]۔

خوش اخلاقی : نہایت خوش اخلاق تھے۔ دوسروں کے جذبات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ جب بھی انہیں کوئی ایسی حدیث سناتا جس سے وہ خود اس شخص سے زیادہ واقف ہوتے، وہ محض اس کی دل شکنی اور احترامِ حدیث کے خیال سے انجان بن کر نہایت خاموشی سے سنتے تھے[6]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۵۲ھ یا ۱۵۵ھ میں کوفہ میں وفات پائی[7]۔

---

۱ تذکرة الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰　۲ ایضاً۔　۳ ایضاً۔ ص ۱۶۹　۴ ایضاً۔ ص ۱۷۱
۵ تذکرة الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰　۶ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۳　۷ ایضاً

(۷) مسلم بن یسارؒ

نام ونسب: مسلم نام ہے۔ابوعبداللہ کنیت۔مشہور صحابی حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ تمیمی کے غلام تھے۔
فضل وکمال: حضرت طلحہؓ عشرہ مبشرہ میں ہیں۔ان کی ذات علم وعمل کا مجمع البحرین تھی۔ان کی غلامی کے فیض اور مدینۃ الرسول کے قیام سے مسلم کا دامن علم وعمل کی دولت سے معمور ہوگیا تھا[۱]۔
علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، "کان مسلم ثقة فاضلا عابدا ورعا" مسلم ثقہ فاضل، عبادت گذار اور ورع تھے۔ابن عون کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں مسلم پر کسی کو فضیلت نہیں دی جاتی تھی[۲]۔
حدیث: مدینہ کے قیام کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ جیسے اکابر اُمت اور ابی الاشعث صنعانی، حمران بن ابن ابان وغیرہ سے حدیث میں استفادہ کا موقع ملا تھا[۳]۔
حضرت ثابت البنانی، یعلی بن حکیم، محمد بن سیرین، ایوب سختیانی، ابونضرہ، بن قتادہ، صالح ابوالخلیل، محمد بن واسع، عمرو بن دینار اور آبا بن ابی عیاش جیسے علما ان کے زمرۂ تلامذہ میں تھے[۴]۔
فقہ: فقہ میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ان کا شمار بصرہ کے ان پانچ فقہاء میں تھا جو اپنے زمانہ کے امام سمجھے جاتے تھے[۵]۔
فضائل اخلاق: ان کے علم سے زیادہ ان کا عمل تھا۔ابن سعد ان کو عابد اور متورع لکھتے ہیں[۶]۔
ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ بصرہ کے عبادت گذار بزرگوں میں تھے[۷]۔
شرطِ ایمان: آپ کے نزدیک ایمان باللہ کے لئے ضروری تھا کہ اس کی تمام ناپسندیدہ چیزوں کو ترک کردیا جائے۔چنانچہ فرماتے تھے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ کا ایمان کس کام آسکتا ہے، اگر وہ خدا کی ناپسندیدہ باتوں کو نہیں چھوڑتا[۸]۔
نماز میں ذوق واستغراق:

ان کی نماز بڑے کیف اور استغراق کی ہوتی تھی۔جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو نور القا ہو رہا ہے۔ابن عون کا بیان ہے کہ جب وہ نماز میں ہوتے تھے تو بے جان لکڑی معلوم ہوتے تھے۔بدن اور کپڑے میں ذرا حرکت نہ ہوتی تھی۔نماز کی حالت میں

---

۱ ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۱۳۷ ۲ تہذیب التہذیب۔جلد ۱۰۔ص ۱۴۰ ۳ ایضاً ۴ ایضاً
۵ تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ق اول۔ص ۹۳ ۶ ابن سعد۔جلد ۶۔ق اول۔ص ۱۷۳
۷ تہذیب التہذیب۔جلد ۱۰۔ص ۱۴۱ ۸ ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۱۳۶

کیسے ہی خطرہ کی اور گھبرا دینے والی صورت پیش آ جاتی، ان پر اس کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے پہلو ہی میں آگ لگی اور لگ کر بجھ گئی لیکن ان کو مطلق خبر نہ ہوئی [۱]۔

مرض کے علاوہ جب کہ انسان بالکل مجبور ہو جاتا ہے اور کسی حالت میں خدا کے حضور میں بیٹھ کر تضرع پسند نہ تھا [۲]۔ ایک مرتبہ کسی نے کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا۔ فرمایا، میں اسے پسند نہیں کرتا کہ خدا مجھے مرض کے علاوہ اپنی نماز میں بیٹھا ہوا دیکھے۔ دعوت الی الصلوٰۃ کا اتنا لحاظ تھا کہ دُور سے کانوں میں اذان کی آواز آ جاتی تو اسی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے۔ ایک مرتبہ کسی مسجد سے واپس جا رہے تھے کہ کچھ دُور جا کر اذان کی آواز سنی، اسے سُن کر پھر لوٹ گئے۔ مؤذن نے پوچھا آپ لوٹ کیوں آئے۔ فرمایا تم نے لوٹا دیا [۳]۔

مسجد کی خدمت ان کا خاص مشغلہ تھا۔ مسجدوں میں چراغ جلایا کرتے۔ اس مشغلہ کی وجہ سے مسلم المصبح یعنی چراغ جلانے والے مسلم، ان کا لقب ہو گیا تھا [۴]۔

پابندی سنت میں اہتمام :

سنت کی پابندی میں بڑا اہتمام تھا۔ معمولی معمولی سنتیں بھی نہ چھوٹنے پاتی تھیں۔ محض سنت کے خیال سے جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جوتا اُتارنا میرے لئے آسان ہے، لیکن محض پابندیٔ سنت کے خیال سے جوتوں میں نماز پڑھتا ہوں۔ آنحضرت خرمے سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اس لئے ان کا افطار بھی خرمے ہی سے ہوتا تھا [۵]۔

کتاب اللہ کا احترام :

کتاب اللہ کا اتنا احترام ملحوظ رہتا تھا کہ جس ہاتھ سے قرآن پکڑتے تھے اس کو محلِ نجاست سے مَس نہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں داہنے ہاتھ سے شرمگاہ مس کرنا برا سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے قرآن پکڑنا پڑتا ہے [۶]۔

ریا، جہل اور شیطان کا آلہ ہے :

ریا اور دکھاوے کو جہل اور شیطان کا آلہ سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ تم لوگ نمائش سے بچو، کیونکہ وہ عالم کی جہالت کی ساعت ہے۔ اسی کے ذریعہ سے شیطان لغزش پیدا کرتا ہے [۷]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۵ ۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۶ ۳۔ ایضاً ۴۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۴۰
۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۶ ۶۔ ایضاً ۷۔ ایضاً

حلم ومتانت : نہایت متین اور حلیم الطبع تھے۔ اشتعال کے موقع پر بھی زبان سے کوئی ناروا کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ غیظ وغضب کے موقع پر جو سب سے زیادہ لغت لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا، وہ یہ تھا کہ "اب مجھ سے قطع تعلق کر لو"۔ جب وہ الفاظ کہہ دیتے تو لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے بعد غصہ کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ گیا ہے[1]۔

فتنہ اشعث کے ابتلاء پر تاسف :

اس متانت طبع کا نتیجہ یہ تھا کہ شور وشر اور جنگ وجدال کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن محمد بن اشعث کی شورش میں جس میں متعدد اکابر تابعی مبتلا ہو گئے تھے، ان دامن میں محفوظ نہ رہ سکا اور اس میں وہ شریک ہو گئے تھے۔ گو اس میں بھی انہوں نے تلوار نہیں اٹھائی لیکن محض شرکت پر سخت متاسف تھے۔

ابوقلابہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مکہ کے سفر میں میرا اور مسلم کا ساتھ ہوا۔ انہوں نے اشعث کے فتنہ کا ذکر کر کے کہا، الحمد للہ میں نے اس فتنہ میں نہ کوئی تیر پھینکا، نہ نیزہ مارا اور نہ تلوار چلائی۔ میں نے کہا، لیکن یہ بتائیے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا، جنہوں نے آپ کو صف میں کھڑا دیکھ کر کہا کہ مسلم بن یسار اس جنگ میں ہیں اور وہ ناحق کسی معاملہ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال کر کے وہ لڑے اور مارے گئے؟ یہ سن کر وہ بے تحاشہ رونے لگے[2]۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ندامت ہوئی کہ میں نے ایسا کیوں کہا[3]۔

وفات : عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد خلافت ۱۰۰ھ یا ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

(۷۲) مطرف بن عبداللہؒ

نام ونسب : مطرف نام ہے۔ ابوعبداللہ کنیت ہے۔ نسب نامہ یہ ہے : مطرف بن عبداللہ بن الشخیر بن عوف بن کعب بن وفدان بن الحریش بن کعب بن ربیعہ بن عامر صعصعہ۔

پیدائش : مطرف عہد نبوی میں پیدا ہو گئے تھے[4]۔ لیکن صغرسنی یا بعد مسافت کی وجہ سے شرف زیارت سے محروم رہے۔

ذوق : مطرف کو تحصیل علم کا بڑا ذوق وشوق تھا۔ اس کے فضل کو وہ عبادت کے فضل سے زیادہ پسند کرتے تھے[5]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۶ ۲؎ ایضاً۔ ص ۱۳۷ ۳؎ ایضاً
۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۷۳ ۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۳

فضل وکمال : اس ذوق نے ان کو علمی کمالات، زہد وورع اور تہذیب اخلاق جملہ فضائل و کمالات کا پیکر بنادیا تھا۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات فضل وورع، روایہ اور عقل وادب سب جمع تھے[۱]۔

حدیث : ان کے زمانہ میں صحابہ کی بڑی تعداد موجود تھی اور انہوں نے ان کے فیوض وبرکات سے پورا استفادہ کیا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابوذرؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مغفل، عثمان بن ابی العاصؓ، عمران بن حصینؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ اور حضرت عائشہؓ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان سے فیض پانے والوں میں ان کے بھائی ابوالعلاء یزید، بھتیجے عبداللہ بن ہانی اور حسن بصری حمید بن بلال، ابونصرہ، غیلان بن جریر، سعید بن ابی ہند، محمد بن واسع، ابوالتیاح، ثابت البنانی، عبدالکریم بن رشید، سعید الحریری اور ابوسلمہ، سعید بن یزید وغیرہ لائق ذکر ہیں[۳]۔

فقہ : فقہ میں پورا ادراک حاصل تھا۔ بصرہ کے مفتیوں میں تھے[۴]۔

زہد وورع : ان کے علم کے مقابلہ میں ان کے علم اور زہد وورع کا پلہ بھاری تھا۔ علامہ ابن سعدؒ انہیں متورعین میں لکھتے ہیں[۵]۔ عجلی لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں اور رجل صالح تھے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ بصرہ کے عابد وزاہد تابعین میں تھے[۶]۔

شورو فتن سے اجتناب :

اس زہد وورع کی وجہ سے وہ شورو انقلاب و ہنگامہ آرائی سے بہت گھبراتے تھے اور اس کو ابتلاء سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ فتنہ رہبری اور رہنمائی کے لئے نہیں بلکہ مومن کو اس کے نفس سے لڑا دینے کے لئے اٹھتا ہے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے انقلاب وحوادث ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنا دامن ان سے بچائے رکھا۔ عموماً فتنہ کے زمانہ میں وہ کسی طرف نکل جاتے تھے اور اگر نہ نکل سکتے تھے تو چھپ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتے اور جمعہ اور جماعت کے لئے نہ نکلتے تھے۔ عقبہ کا بیان ہے کہ میں نے مطرف کے بھائی یزید بن عبداللہ سے پوچھا کہ جب فتنہ موجزن ہوتا تھا تو مطرف کیا کرتے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ گھر کے اندرونی حصہ میں گوشہ گیر ہوجاتے تھے اور جب تک فتنہ کے شعلے ٹھنڈے نہ ہوجاتے، اس وقت تک وہ ان لوگوں کے ساتھ جمعہ جماعت میں بھی شریک نہ ہوتے تھے[۷]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۳ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۵ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۷۳

۴۔ اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۷ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۳

۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۷۳ ۷۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ۱۰۳

دوسروں کو بھی فتنہ میں پڑنے سے روکتے تھے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ جب فتنہ کا زمانہ ہوتا تو مطرف لوگوں کو اس میں مبتلا ہونے سے روکتے اور خود کہیں بھاگ جاتے۔ حسن بصری بھی لوگوں کو روکتے تھے لیکن کہیں ہٹتے نہ تھے۔ اس لئے مطرف ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ حسن بصری اس شخص کی طرح ہیں جو دوسروں کو سیلاب سے ڈراتا ہے، لیکن خود اس کے دھارے پر کھڑا رہتا ہے۔[1]

انتہائی احتیاط کی بنا پر وہ ان ہنگاموں کے حالات تک نہ پوچھتے۔ ابن زبیرؓ اور بنی اُمیہ کا ہنگامہ انہی کے زمانہ میں ہوا۔ یہ لوگوں سے اس کے حالات بھی نہ پوچھتے اور چونکہ لوگ ان کے خیالات سے واقف تھے، اس لئے وہ بھی ان کے سامنے تذکرہ نہ کرتے تھے۔[2]

حضرت عبدالرحمٰن بن اشعث کے انقلابات میں جو حجاج اور عبدالملک کے خلاف اُٹھا تھا، بڑے بڑے تابعین شریک ہو گئے تھے۔ لوگوں نے مطرف پر بھی شرکت کے لئے زور ڈالا۔ انہوں نے ان سے سوال کیا کہ "تم لوگ جس چیز میں شرکت کی دعوت دیتے ہو کیا وہ جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ بڑھ جائے گا"؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا "تو میں ہلاکت میں پڑنے اور فضیلت حاصل کرنے کے درمیان جوا نہیں کھیلتا"۔[3] یعنی مشتبہ جنگ میں نہیں پڑ سکتا۔ انہیں امن و عافیت کی زندگی طبعاً پسند تھی۔ فرماتے تھے کہ مجھے عافیت کی زندگی پر شکر ادا کرنا ابتلاء اور آزمائش پر صبر کرنے سے زیادہ پسند ہے۔[4]

نفس ایک ہے: عقائد میں نہایت سخت تھے اور اس کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا۔ ایک مرتبہ چند حروری (خارجی) آپ کے پاس آئے اور اپنے عقائد قبول کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر میرے دو نفس ہوتے تو ایک نفس سے تمہارے عقائد مان لیتا اور دوسرے کو محفوظ رکھتا، جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہی ہدایت ہو تو دوسرے نفس سے بھی تمہاری پیروی کر لیتا اور اگر ضلالت ہوتا تو اگر ایک نفس ہلاک ہو جاتا تو کم از کم دوسرا تو محفوظ رہتا۔ لیکن نفس ایک ہی ہے، اس لئے اس کو میں دھوکے کی جگہ نہیں لگا سکتا۔[5]

دنیا عالم اسباب ہے:

اگرچہ آپ بڑے زہد و متورع تھے، لیکن اندھے اعتماد اور توکل کے قائل نہ تھے۔ بلکہ دنیا کو عالم اسباب مانتے تھے۔ فرماتے تھے کہ "یہ جائز نہیں ہے کہ ایک شخص ایک بلند مقام سے اپنے کو نیچے

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۳　　۲۔ ایضاً　　۳۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۴
۴۔ ایضاً۔ ۱۰۵　　۵۔ ایضاً ۱۰۴

گرادے اور کہے خدا نے میری قسمت مقدر کردی ہے۔ بلکہ انسان کو چاہئے کہ وہ بچتا رہے اور کوشش کرے، اگر اس احتیاط اور کوشش کے باوجود اسے نقصان پہنچ جائے یا مصیبت پیش آجائے تو پھر اسے تقدیر الٰہی سمجھنا چاہئے۔ تقدیر خداوندی کے علاوہ کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی"[1]۔ اسی لئے وہ طاعون کے زمانہ میں وباء زدہ حلقہ سے ہٹ جاتے تھے[2]۔

عقل بہترین عطیۂ قدرت ہے :

آپ کے بعض اقوال نہایت حکیمانہ ہیں۔ فرماتے تھے کہ انسان کو قدرت کی جانب سے عقل سے بہتر کوئی شے نہیں عطا کی گئی۔ لوگوں کی عقلیں ان کے زمانہ کے مطابق ہوتی ہیں[3]۔ اپنا کھانا اس شخص کو نہ کھلاؤ جسے اس کی خواہش نہیں ہے[4]۔ یعنی بے محل کسی شے کو ضائع نہ کرو۔

دنیاوی شان وشکوہ :

وہ دنیاوی نعمتوں سے متمتع ہونے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ خدا نے ان کو دولتِ دنیا سے وافر حصہ دیا تھا اور وہ بڑی شان اور وقار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ مطرف سردار اور بلند مرتبہ تھے۔ بہترین کپڑے پہنتے تھے۔ سلاطین کے درباروں میں آمدورفت رکھتے تھے[5]۔ لیکن اس ظاہری شان وشوکت سے ان کی اخلاقی حیثیت پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ غیلان بن جریر کا بیان ہے کہ مطرف برانس (ایک قسم کی ٹوپی) اور مطارف (ایک قیمتی چادر) پہنتے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ سلاطین کے پاس آتے جاتے تھے، لیکن اس زندگی کے باوجود جب تم ان کے پاس جاتے تو آنکھوں کے پاس جاتے[6]۔

وفات : باختلاف روایت ۸۷ھ یا ۹۵ھ میں احتباس بول کے مرض میں مبتلا ہوئے اور بیمار ہوتے ہی حالت بگڑ گئی۔ اپنے صاحبزادے کو بلا کر آیاتِ وصیت پڑھ کر سنائیں۔ صاحبزادے جاکر طبیب کو لے آئے۔ طبیب کو دیکھ کر پوچھا، یہ کیا ہے؟ صاحبزادے نے کہا طبیب۔ طبیب سے مخاطب ہو کر فرمایا، "میں سختی سے منع کرتا ہوں کہ مجھے جھاڑ پھونک نہ کرنا، اور نہ گنڈا تعویذ لٹکانا"، اور اپنے صاحبزادوں کو قبر کی تیاری کا حکم دیا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ قبر تیار ہونے کے بعد فرمایا، مجھے قبر کے پاس لے چلو۔ چنانچہ اپنی آخری آرام گاہ کے پاس جاکر اس میں دعا کی۔ دعا کے بعد گھر واپس آکر انتقال کیا[7]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۴ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً۔ ۱۰۵ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۶
[6] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۵ [7] ایضاً۔ ص ۱۰۶ و تذکرۃ الحفاظ

(۷۳) مکحول الدمشقیؒ

نام ونسب : مکحول نام ہے۔ ابوعبداللہ یا ابوایوب کنیت۔ ان کے نسب اور وطن کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔

حضرت ابن سعد کابلی لکھتے ہیں[۱]۔ ابن حجر نے کئی روایتیں نقل کی ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجمی النسل تھے اور ان کے والد کا نام سہراب تھا۔ بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ مصری تھے اور بعض سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ہذلی یعنی عرب تھے[۲]۔

لیکن آخری دو روایتیں اس معنی میں قطعاً غلط ہیں کہ نسلاً ہذلی یا مصری تھے۔ نسلاً وہ بلاشک وشبہ عجمی تھے۔ ہذلی اور مصری اس لئے مشہور ہیں کہ وہ کچھ دنوں ایک ہذلی کی غلامی میں رہے تھے اور ایک عرصہ تک مصر میں قیام رہا تھا۔

اس باب میں امام نووی کا بیان زیادہ قرین قیاس اور صحیح ہے۔ انہوں نے ان کو عجمی النسل اور کابلی الموطن لکھا ہے۔ چنانچہ ان کی روایات کے مطابق ان نسب نامہ یہ ہے مکحول بن زید یا ابن ابی مسلم بن شاذل بن سند شروان بن یروک بن یغوث بن کسری کابلی دمشقی[۳]۔

اس بیان سے مختلف روایتوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے کہ وہ نسلاً عجمی، وطناً کابلی اور اقامۃً دمشقی تھے۔

ان کی ابتدائی تاریخ یہ ہے کہ وہ شروع میں عمرو بن سعید بن العاص کے غلام تھے۔ پھر انہوں نے ان کو ایک ہذلی شخص کو دے دیا تھا۔ اس دوسری غلامی کی وجہ سے ان کی غلامی کے انتساب میں دو بیانات ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عمرو بن سعید کے غلام تھے اور دوسرا یہ کہ ہذلی کے غلام تھے اور دونوں صحیح ہیں۔

ان کی غلامی کی ابتداء عمرو بن سعید سے ہوئی۔ جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ میں عمرو بن سعید کا غلام تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک ہذلی کو دے دیا[۴]۔ عقلی قیاس بھی یہی ہے۔ کیونکہ عمرو کے والد سعید نے عہدِ عثمانی میں کابل کے بعض سرحدی علاقوں کو فتح کیا تھا[۵]۔ قیاس یہ ہے کہ انہی معرکوں میں وہ سعید کے غلام تھے[۶]۔ پھر وراثۃً ان کے لڑکے کو ملے ہوں گے۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۶۱　۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۹۰　۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۱۳
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۶۱　۵۔ فتوح البلدان بلاذری۔ ص ۳۳۲　۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۵

تحصیلِ علم کے دنیائے اسلام کا سفر :

مسلمانوں کی غلام نوازی اور ان کے فیضِ تربیت سے ان کے غلامی کی پستی سے نکال کر کمال کے جن مدارج پر پہنچے، مکحول اس کی ایک روشن مثال تھی۔ ان کا آغاز غلامی سے ہوا اور آخر میں وہ شام کی مسندِ علم پر فائز ہوئے۔ ان کو تحصیلِ علم کا فطری ذوق تھا[1]۔ چنانچہ وہ غلامی ہی کے زمانہ سے تحصیلِ علم میں مشغول ہوئے، پھر غلامی سے آزادی کے بعد انہوں نے ساری دنیائے اسلام کے تمام علمی مرکزوں کا سفر کر کے تحصیلِ علم کی۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں آزاد ہوا، اس وقت مصر کا سارا علم میں نے سمیٹ لیا اور اس وقت تک میں نے وہاں سے باہر قدم نہیں نکالا جب تک اپنے خیال کے مطابق وہاں کا سارا علم نہ سن لیا[2]۔

مصر کے علمی مخزن کو کھنگالنے کے بعد مدینہ آئے، پھر یہاں سے عراق آگئے۔ ان دونوں مقاموں کے تمام علمی سرچشموں سے سیراب ہونے کے بعد شام کا سفر کیا اور یہاں کے علماء اربابِ کمال سے استفادہ کیا۔ غرض انہوں نے علم کی تلاش و جستجو میں دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان مارا۔ وہ خود بیان کرتے تھے کہ میں نے علم کی تلاش میں تمام روئے زمین کا چکر لگایا[3]۔

فضل وکمال : ان کے اس ذوق وشوق، اس تلاش وجستجو اور اس مشقت نے انہیں علم کے اس ذروۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ جہاں ان کے کم معاصر پہنچ سکے تھے۔ امام زہری کہتے تھے کہ علما صرف تین ہیں، ان میں ایک نام مکحول کا لیتے تھے[4]۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ وہ فقیہ اور عالم تھے۔ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن عمار کہتے ہیں کہ وہ اہلِ شام کے امام تھے[5]۔ انہیں حدیث اور فقہ دونوں میں درجۂ امامت حاصل تھا[6]۔

حدیث : انہوں نے حجاز، عراق، مصر اور شام تمام علمی مرکزوں میں جا کر سماعِ حدیث کیا تھا۔ پھر حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو کچھ بھی حاصل کیا سب سینہ میں محفوظ تھا[7]۔ اس لئے وہ اپنے عہد کے بہت بڑے حافظِ حدیث تھے۔ حافظ ذہبی انہیں تیسرے طبقے کے کبار حفاظ میں لکھتے ہیں۔

شیوخ : انہوں نے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی تھی۔ اس لئے ان کے شیوخ کی فہرست نہایت طویل ہے۔ کوئی ملک ان سے خالی نہیں تھا۔ ان میں صحابہ کی بھی خاصی تعداد تھی[8]۔ صحابہ میں انہوں نے

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۵ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۲۔ ق ۲۔ ص ۱۶۰ ۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۵
۴؎ ایضاً ۵؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۱۴ ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۵۱
۷؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۵ ۸؎ ایضاً

انس بن مالک ؓ، ابو ہند داری ؓ، واثلہ بن اسقع، ابوامامہ ؓ، عبدالرحمٰن بن غنم ؓ، ابو جندل ؓ بن سہیل وغیرہ سے براہ راست سماع کیا تھا[۱]۔ اور ابی بن کعب، ثابان ؓ، عبادہ بن ثابت، ابو ہریرہ ؓ، ابو ثعلبہ خشنی ؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے مرسل روایات کی ہیں[۲]۔ ممتاز تابعین میں سعید بن مسیب، مسروق، جبیر بن نضیر، کریب، ابو مسلم، ابوادریس خولانی، عروہ بن زبیر، عبداللہ بن محریز، عیینہ بن ابی سفیان درداد کاتب، مغیرہ کثیر بن مرہ اور ام الدرداء وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[۳]۔

تلامذہ : ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع تھا۔ ان میں سے بعض ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں : امام زہری، حمید الطویل، محمد بن عجلان، محمد بن اسحٰق، عبداللہ بن علاء، سالم بن عبداللہ، محاربی موسیٰ بن یسار، امام اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز، علاء بن حارث، ثور بن یزید، ایوب بن موسیٰ، محمد بن راشد مکحول، محمد بن ولید زبیدی، برد بن سنان، عبداللہ بن عوف، یحییٰ بن سعید انصاری، اسامہ بن زید لیثی، بحیر بن سعد، صفوان بن عمرو اور ثابت بن ثوبان وغیرہ[۴]۔

فقہ و فتاویٰ : حفظ حدیث کے ساتھ وہ فقہ کے بھی امام و مجتہد تھے۔ ابو حاتم کہتے تھے کہ میں نے شام میں مکحول سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا[۵]۔ سعید بن عبدالعزیز انہیں امام الزہری سے بڑا فقیہ مانتے تھے۔ انہیں افتاء میں خاص مہارت اور بصیرت حاصل تھی[۶]۔ سعید بن عبدالعزیز کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ افتاء میں بصیرت کسی کو حاصل نہ تھی[۷]۔

احتیاط : لیکن وہ فتویٰ دینے میں بڑے محتاط تھے۔ اگر اپنی رائے سے وہ کسی مسئلے کا جواب دیتے تھے تو صاف کہہ دیتے تھے یہ میری رائے ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی[۸]۔

تصانیف : ان کے فقہی کمال کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ تالیف و تصنیف کا آغاز بھی نہ ہوا تھا، انہوں نے فقہ میں دو مستقل کتابیں تالیف کی تھیں۔

۱۔ کتاب السنن اور ۲۔ کتاب المسائل[۹]۔

انفاق فی سبیل اللہ :

علمی کمالات کے ساتھ وہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے۔ انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ان کا نمایاں وصف تھا[۱۰]۔ انہیں جو کچھ ملتا ہے سب خدا کی راہ میں صرف کر دیتے تھے۔

۱؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۱۳ ۲؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۹۰ ۳؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۱۳
۴؎ ایضاً ۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۵ ۶؎ ایضاً۔ ص ۹۵ ۷؎ ایضاً۔ ص ۹۶ ۸؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ۲۹۱
۹؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۴۶ ۱۰؎ فہرست ابن ندیم۔ ص ۳۱۸ طبع مصر

سعید بن عبدالعزیز کا بیان ہے کہ مکحول کا وظیفہ مقرر تھا۔ اس کو دشمنانِ خدا کے لئے جہاد میں صرف کرتے تھے[۱]۔ ایک مرتبہ ان کو دس ہزار اشرفیوں کی خطیر رقم ملی۔ اس کو بھی انہوں نے اسی راہ میں صرف کیا اور ایک مجاہد کو ایک گھوڑے کی قیمت پچاس اشرفیاں دیتے تھے[۲]۔

ایک شبہ کا ازالہ : مکحول کے متعلق عام شہرت تھی کہ وہ قدری تھے اور اس کی تائید میں بعض روایات بھی ملتی ہیں۔ لیکن یہ روایات صحیحہ ان کا دامن اس عقیدۂ فاسد سے پاک تھا۔

امام اوزاعی کا جوان کے تلامذہ میں تھے، بیان ہے کہ جہاں تک سنا گیا ہے تابعین میں دو شخص حسن بصری اور مکحول کے خیالات قدری تھے۔ لیکن میں نے ان کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ شہرت غلط ہے[۳]۔ ان کے دوسرے تلمیذ سعید بن عبدالعزیز بھی اس عقیدہ سے ان کی برأت کی شہادت دیتے تھے[۴]۔

وفات : ابن سعد کی روایات کے مطابق ۱۱۳ھ یا ۱۱۸ھ میں وفات پائی[۵]۔

(۷۴) منصور بن زاذان واسطیؒ

نام ونسب : منصور نام ہے۔ ابوالمغیرہ کنیت۔ قبیلہ کی غلامی میں تھے۔ اس نسبت سے ثقفی کہلاتے تھے[۶]۔

فضل وکمال : حضرت حسن بصریؒ کے خاص ساتھیوں میں تھے۔ ان کے فیض صحبت نے منصور کو علم وعمل کا جامع بنادیا تھا اور وہ واسطہ کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علماء اسلام میں تھے۔ ثقہ، حجت، عبادت گذار اور کبیر الشان تھے[۷]۔

حدیث : حدیث میں انہوں نے انس بن مالک، ابوالعالیہ، رفیع، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، محمد بن سیرین، میمون بن ابی شبیب، معاویہ بن قرہ، حمید بن ہلال، قتادہ، عمرو بن دینار، حکم بن عتیبہ، عبدالرحمٰن بن قاسم اور محمد بن ولید بن مسلم عنبری سے فیض اُٹھایا تھا۔

مسلم بن سعید واسطی حبیب بن شہید، جریر بن حازم، خلف بن خلفہ، ہشیم اور ابوحمزہ سکری ان کے تلامذہ میں تھے[۸]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۶۱ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۶ ۳۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ۲۹۱
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۹۶ ۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۶۱ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۶
۷۔ ایضاً ۸۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۳۰۶

عبادت وریاضت : زہد وعبادت ان کے صحیفۂ کمال کے زیادہ روشن ابواب ہیں۔ وہ بڑے عابد وزاہد تابعی تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ متقشفین اور متجردین میں تھے [۱]۔ ابن عماد حنبلی ان کو بصرہ کا زاہد اور شیخ لکھتے ہیں [۲]۔

ان کا سارا وقت عبادت وریاضت میں گزرتا تھا۔ طلوع آفتاب سے لے کر عصر تک نماز اور عصر سے مغرب تک تسبیح وتہلیل میں مشغول رہتے تھے [۳]۔

قرآن کی تلاوت سے خاص شغف تھا۔ بہت تیز قرآن پڑھتے تھے۔ صبح سے دوپہر تک ایک قرآن ختم کر دیتے تھے [۴]۔ نوافل میں قرآن کا بڑا حصہ پڑھ ڈالتے تھے۔ ہشام بن حسان کا بیان ہے کہ میں نے مغرب اور عشاء کے درمیان منصور کے پہلو میں نماز پڑھی۔ دوسری رکعت میں وہ سورۂ نحل تک پڑھ گئے [۵]۔

رمضان میں عبادت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ روزانہ قرآن ختم کرتے تھے۔ نماز میں اس شدت کا گریہ طاری ہوتا کہ آنسو پوچھتے پوچھتے عمامہ تر ہو جاتا۔ بارگاہ ایزدی میں جبین سائی سے بڑا ذوق تھا۔ فرض نماز سے پہلے گیارہ سجدے کرتے تھے۔ عمر بھر دو راتوں کے سوا ایک مرتبہ ماں کے اور دوسری مرتبہ لڑکے انتقال کے موقع پر آرام سے رات بھر بستر استراحت پر نہ سوئے [۶]۔

انہوں نے عبادت وریاضت کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہشیم کا بیان ہے کہ وہ اپنی عبادت کرتے تھے کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ موت کا فرشتہ دروازہ پر آ گیا ہے تو جتنی عبادت وہ کرتے تھے اس میں زیادتی ممکن نہ تھی [۷]۔

ایک زرّین مقولہ : فرماتے کہ رنج وغم بھلائیوں میں اضافہ کرتے ہیں اور اِترانا اور فخر کرنا برائیوں میں [۸]۔

وفات : اپنے محاسن اخلاق کی وجہ سے وہ مذہب وملت کے آدمیوں میں اتنے مقبول تھے کہ آپ کے جنازہ میں ہر مذہب کے آدمی شریک تھے۔ یہود ونصاریٰ دونوں علیحدہ علیحدہ جنازہ میں ساتھ تھے اور خلق اللہ کا ہجوم تھا [۹]۔

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۳۰۷　　۲۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۰۱
۳۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۶۰　　۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۶
۵۔ حلیۃ الاولیاء ابونعیم۔ جلد ۳۔ ص ۵۸۔　　۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۶　　۷۔ ایضاً۔ ص ۱۲۷
۸۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۶۰　　۹۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۷

(۷۵) میمون بن مہران رحؒ

نام ونسب: میمون نام ہے۔ ابوایوب کنیت اور والد کا نام مہران تھا۔ مہران بن نصر بن معاویہ کے مکاتب غلام تھے۔

پیدائش: ۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کوفہ کی ایک ازدی عورت کے غلام تھے۔ اس لئے ان کی ابتدائی زندگی غلامی میں بسر ہوئی تھی۔ آخر میں انہوں نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔

جزیرہ کا قیام: آزادی کے بعد عرصہ تک کوفہ ہی میں رہے۔ لیکن ۸۰ھ میں جب عبدالرحمٰن بن اشعث کے ہنگامہ کی وجہ سے کوفہ میں شورش بپا ہوئی تو میمون کوفہ چھوڑ کر جزیرہ چلے گئے اور یہیں بود وباش اختیار کر لی۔

بیت المال کی نگرانی کا منصب:

حضرت محمد بن مروان کی ولایتِ خراسان کے زمانہ میں بیت المال کی نگرانی کا منصب سپرد ہوا۔

عہدۂ خراج: بیت المال کی نگرانی کے سلسلہ میں انہیں مالیات کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ اس لئے عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کو جزیرہ کے خراج کا عامل بنا دیا تھا اور ان کے لڑکے عمر کو دفتر کا محافظ مقرر کیا۔ میمون طبعاً حکومت کے عہدوں اور خصوصاً مالیات کے ذمہ داریوں کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن اس کا انکار نہ کر سکے، مگر چند ہی دنوں کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر استعفیٰ پیش کر دیا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے قبول نہ کیا، اور کہا اس عہدے میں سوائے اس کے اور کیا ہے کہ جائز طریقہ سے روپیہ وصول کیا جائے اور جائز مصرف میں صرف کیا جائے۔ اس میں استعفیٰ کی کیا وجہ ہے؟ عمرؒ بن عبدالعزیز کے لکھنے پر استعفیٰ واپس لے لیا اور ان کی زندگی بھر اس عہدے پر رہے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن ملک کے زمانہ میں بھی چند دنوں تک یہ خدمت انجام دیتے رہے، لیکن کہ کام طبعاً پسند نہ تھا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعد جب خلافت کے تمام شعبے پھر دنیاوی حکومت کے رنگ پر آ گئے تو میمون بددل ہو کر مستعفی ہو گئے اور گزشتہ زمانہ پر بہت متاسف تھے، اور فرماتے تھے کہ مجھے یہ گوارا تھا کہ میں اندھا ہو گیا ہوتا، لیکن عمرؒ بن عبدالعزیز وغیرہ کا دیا ہوا عہدہ قبول نہ کیا ہوتا[1]۔

---

[1] یہ تمام حالات ابن سعد، جلد ۷، ق ۲، ص ۱۷۷، ۱۷۸ سے ماخوذ ہیں۔

فضل وکمال : فضل وکمال کے لحاظ سے ممتاز تابعین اور جزیرہ کے بڑے علماء میں تھے۔حافظ ذہبی انہیں امام قدوہ اور عالم جزیرہ لکھتے ہیں[1]۔ان کے دور کے علما میں ان کا علمی مرتبہ مسلم تھا۔ابوالملیح کہتے تھے کہ میں نے میمون سے افضل کسی کو نہیں پایا[2]۔سلمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ اس عہد کے چار اشخاص بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ان میں ایک میمون بن مہران تھے[3]۔

حدیث : حدیث کے حافظ تھے۔علامہ ابن سعد لکھتے ہیں :

صحابہ میں انہوں نے ابوہریرہؓ ،ابن عباسؓ ،ابن زبیرؓ ،سعید بن جبیرؓ ،حضرت عائشہ صدیقہؓ اور اُم الدرداء سے تابعین میں نافع مولی بن عمر، مقسم مولی ابن عباس، یزید بن عاصم اور سعید بن جبیر وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[4]۔

تلامذہ : حمید الطویل ،ایوب ،جعفر بن برقان ،جعفر ابن ابی وحشیہ ،حبیب بن شہید ،علی بن حکم البنانی حکم بن عتیبہ ،ابوفروہ ، یزید بن سنان ، حجاج بن تمیم ،سالم بن ابی المہاجر اور ابوالملیح وغیرہ ان کے خوشہ چینوں میں تھے[5]۔

فقہ : فقہ میں وہ تمام علمائے جزیرہ میں ممتاز تھے۔علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ فقہ وفتاویٰ میں تمام اہلِ جزیرہ پر فائق تھے[6]۔ان کے تفقہ کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز جیسے صاحب نظر عہدہ خراج کے زمانہ میں جزیرہ کے قضاء کی خدمت بھی ان کے سپرد کی تھی[7]۔

فضائل اخلاق : اس علم کے ساتھ فضائلِ اخلاق سے بھی آراستہ تھے[8]۔

منہیات سے اجتناب :

نواہی سے بچنے میں زیادہ اہتمام تھا۔ان کے لڑکے کا بیان ہے کہ والد (اعتدال سے) زیادہ روزہ نماز نہیں کرتے تھے،لیکن خدا کی معصیت میں مبتلا ہونا بہت ناپسند کرتے تھے[9]۔

عبادت : اگرچہ معمولاً وہ فرائض وسنن کے علاوہ عبادت نہ کرتے تھے،لیکن کبھی کبھی ہزار ہزار رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے۔ایک مرتبہ سترہ دن میں سترہ ہزار رکعتیں پڑھیں[10]۔

انکسار وتواضع : اتنے خاکسار اور متواضع تھے کہ کسی بڑائی اور امتیاز کا انتساب اپنی جانب پسند نہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ کسی نے ان سے کہا ،ابوایوب جب تک خدا آپ کو زندہ رکھے گا ،اس وقت تک

---

1. تذکرۃ الحفاظ ۔جلد اول ۔ص ۸۶
2. ایضاً
3. تہذیب التہذیب ۔جلد ۱۰۔ص ۳۹۱
4. ابن سعد ۔جلد ۷۔ق ۲۔ص ۱۷۷
5. تہذیب التہذیب ۔جلد ۱۰۔ص ۳۹۰
6. ایضاً
7. ابن سعد ۔جلد ۷۔ق ۲۔ص ۱۷۸
8. تذکرۃ الحفاظ ۔جلد اول ۔ص ۸۶
9. تہذیب التہذیب ۔جلد ۱۰۔ص ۳۹۱
10. تذکرۃ الحفاظ ۔جلد اول ۔ص ۸۷

لوگ بھلائی میں رہیں گے۔ انہوں نے جواب دیا، "ایسی باتوں کا تذکرہ نہ کرو، لوگ اس وقت بھلائی میں رہیں گے جب تک وہ اپنے سے ڈرتے رہیں گے"[1]۔

حضرت علیؓ پر حضرت عثمانؓ کی فضیلت کا ایک دل نشین استدلال :

پہلے وہ حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت کے قائل تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ایک استدلال پر حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے قائل ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ عمرؓ بن عبدالعزیز نے پوچھا تم دو آدمیوں میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ اس شخص کو جس نے صرف مال میں عجلت کی یا اس شخص کو جس نے خونریزی میں عجلت کی۔ اس دلیل کے بعد انہوں نے اپنے سابق خیال سے رجوع کر لیا۔ حضرت عثمانؓ پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں بیت المال میں بے جا تصرف ہوئے اور حضرت علیؓ کے دور میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا[2]۔

وفات : ۱۱۷ھ میں وفات پائی[3]۔

(۷۶) نافع بن جبیرؒ

نام و نسب : نافع نام ہے۔ ابو محمد کنیت۔ قریش کے مشہور سردار مطعم بن عدی کے جنہوں نے تبلیغ اسلام کے ابتدائی دور میں جبکہ آنحضرت ﷺ پر ہر طرف سے مشرکین کا زغہ تھا، بڑی حمایت کی تھی، پوتے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے : نافع بن جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف بن قصیٰ۔ ماں کا نام اُم قتال تھا۔ ننھیالی شجرہ یہ ہے : اُم قتال بنت نافع بن ضریب بن نوفل۔

فضل و کمال : علمی اعتبار سے نافع اکابر تابعین میں تھے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ امام اور فاضل تھے۔ ان کی توثیق و جلالت پر سب کا اتفاق ہے[4]۔ ابن خراش کہتے ہیں کہ وہ ثقہ مشہور آئمہ میں سے تھے۔

حدیث : اگرچہ حدیث میں ان کا کوئی بلند پایہ نہ تھا، لیکن انہوں نے زمانہ ایسا پایا تھا۔ جب مدینہ کی گلی گلی سمعت و حدثنا کے ترانوں سے گونج رہی تھی، اور علم کے ساتھ ادنیٰ ذوق رکھنے والے بھی اس سے محروم نہ تھے اس لئے نافع بن جبیر کا دامن بھی اس دولت سے خالی نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۷ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۳۹۱ [3] ایضاً
[4] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۲۲

والد جبیر بن مطعمؓ، حضرت عباس بن مطلبؓ، زبیر بن عوامؓ، علی بن ابی طالبؓ، عثمان بن ابی العاصؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، رافع بن خدیجؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوہریرہؓ، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور اُم سلمہؓ وغیرہ جیسے اکابر ملت سے فیض اُٹھایا تھا۔ ان کے فیض سے نافع کا دامن علم اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ شائقین حدیث ان کے کمالاتِ علمی استفادہ کرتے تھے۔

ان سے روایت کرنے والوں میں عروہ بن زبیر، سعید بن ابراہیم، امام زہری، عقبہ، عمرو بن دینار اور عتیبہ بن مسلم وغیرہ لائق ذکر ہیں [1]۔

فقہ : فقہ میں بھی انہیں درک تھا۔ وہ مدینہ کے صاحب افتاء علماء میں تھے اور ان کے فتاویٰ معتبر سمجھے جاتے تھے [2]۔

فصاحت وبلاغت :

قریش کی فصاحت وبلاغت مشہور ہے۔ یہ خاندانی وصف ان کے حصہ میں وافر آیا تھا۔ وہ بڑے فصیح وبلیغ تھے اور بڑی کڑک دار آواز سے بولتا تھے [3]۔

فضائل واخلاق : فضائل اخلاق وعمل کی دولت سے بہرہ ور تھے۔ ابن حبان ان کو خیار ناس میں لکھتے ہیں [4]۔

پاپیادہ حج : آرام کے وسائل رکھتے ہوئے راہِ خدا میں تکلیف اُٹھانا بڑی عبادت ہے۔ نافع محض حصولِ اجر کے پاپیادہ حج کیا کرتے تھے۔ عمران بن موسیٰ کا بیان ہے کہ نافع پاپیادہ حج کرتے تھے اور ان کی سواری ان کے پیچھے ہوتی تھی [5]۔

دبدبہ وشکوہ : ان کے خاندان میں پشتہا پشت سے سرداری چلی آتی تھی۔ اس لئے ان کے مزاج میں اس کی بُو باقی تھی۔ نہایت بھاری اور بلند لہجہ میں باتیں کرتے تھے۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں خود پرستی وتمکنت تھی، لیکن ان کی ظاہری شوکت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، وہ خود اس کی تردید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ میں تکبر ہے۔ انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم میں گدھے پر سوار ہوا ہوں، شملہ پہنا ہے، بکریوں کا دودھ دوہا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے یہ کام کئے، اس میں تکبر کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ (پھر میں متکبر کیسے ہو سکتا ہوں) [6]۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۰۵ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۳
۵ ایضاً ۶ ایضاً

اصلاحِ نفس : ان کے واقعات زندگی سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ عمداً ایسے کام کیا کرتے تھے جو پندار کے خلاف ہوتے تھے۔ جعفر بن نجیر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نافع بن جبیر علاء بن حرقی کے حلقۂ درس میں جو حرقہ کے غلام تھے، شریک ہوئے۔ علماء کے درس تمام کرنے کے بعد نافع نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا، آپ لوگ جانتے ہیں، میں آپ لوگوں کے پاس کیوں آکر بیٹھا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا، درس سننے کے لئے، نافع نے کہا نہیں، بلکہ اس لئے کہ آپ کے پاس بیٹھنے سے خدا کے پاس تواضع کا اظہار ہو۔

اسی طریقہ سے ایک مرتبہ ایک بہت معمولی شخص کو امامت کے لئے بڑھایا۔ نماز ختم ہونے کے بعد اس سے پوچھا جانتے ہو، میں نے تم کو کیوں آگے بڑھایا تھا؟ اس نے کہا نماز پڑھانے کے لئے۔ کہا نہیں، بلکہ اس لئے کہ تمہارے پیچھے نماز پڑھنے سے خدا کے حضور میں تواضع ظاہر ہو۔[1]

وفات : سلیمان بن عبدالملک کے آخر عہدِ خلافت ۹۳ھ میں وفات پائی۔[2]

اولاد : وفات کے بعد محمد، ابوبکر اور علی کئی لڑکے یادگار چھوڑے۔

حلیہ ولباس : بالوں میں سیاہ خضاب کرتے تھے۔ دانتوں میں سونے کے تار کسے ہوئے تھے۔ لباس عموماً سپید اور قیمتی پہنتے تھے۔ خز جو ایک بیش قیمت کپڑا ہے، زیادہ استعمال کرتے تھے۔[3]

(۷۷) نافع بن کاؤسؒ

نام ونسب : نافع نام ہے۔ ابوعبداللہ کنیت۔ والد کا نام طاؤس یا ہرمز تھا۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ عجمی النسل تھے۔ لیکن بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب تھے، جو صحیح نہیں ہے۔ ان کے عجمی ہونے پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے۔ وطن بعض خراسان، بعض دیلم، بعض جبال طالقان اور بعض کابل بتاتے ہیں۔ اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا کہ نافع کس طرح ابن عمر کے پاس پہنچے۔ قیاس یہ ہے کہ کسی جنگ میں گرفتار ہو کر ان کے حصہ میں آئے ہوں گے یا ابن عمرؓ نے ان کو خریدا ہوگا۔

مسلمانوں کی غلام نوازی کے طفیل میں ان کے غلام کمالات کے جن مدارج پر پہنچے نافع بھی اس کی روشن ترین مثال تھے۔ مسلمانوں کے موالی کی علمی تاریخ میں نافع نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اس دور میں کوئی غلام ان کے رتبہ کا نہ تھا۔ ابن عباسؓ کے غلام عکرمہ بھی بڑے صاحبِ علم تھے۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۵ ص ۱۵۳ ۲ ایضاً ۳ ایضاً۔ ص ۱۵۲

لیکن ان کو بھی اہلِ مدینہ میں یہ درجہ حاصل نہ تھا۔ نافع ان سے زیادہ بلند مرتبت سمجھے جاتے تھے[۱]۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں غلاموں کی حقیقی تاریخ نافع ہی سے شروع ہوتی ہے۔

تعلیم : خوش قسمتی سے نافع کو آغاز ہی سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صاحب کمال بزرگ کی تربیت میسر آگئی تھی، انہی کے دامن میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ نافع نے کامل تیس سال تک ابن عمرؓ کی خدمت کی[۲]۔

ان میں تحصیل علم کی فطری صلاحیت واستعداد تھی۔ شفیق آقا کی صحبت اور تربیت نے ان کے جوہر کو چمکا کر اقلیم کا تاج دار بنا دیا۔ ان کی علمی جلالت پر تمام علماء اور ارباب سیر کا اتفاق ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ جلیل القدر تابعی تھے۔ ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[۳]۔ خلیلی کا بیان ہے کہ نافع مدینہ کے آئمہ تابعین میں اور امام فی العلم تھے، خود ابن عمرؓ کو اپنے اس نامور غلام کی ذات پر فخر تھا۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے نافع کے ذریعہ سے ہم پر احسان کیا ہے[۴]۔

حدیث : عبداللہ بن عمرؓ حدیث کا بحرِ بے کراں تھے۔ نافع اس بحر سے سیراب ہوتے تھے۔ انہوں نے ان کی احادیث کا بڑا حصہ محفوظ کر لیا تھا۔ حافظ حدیث بنانے کے لئے تنہا ابن عمرؓ کی روایت کافی ہیں۔ نافع کی علمی تشنگی نے اس بحرِ بے کراں کے علاوہ دوسرے سرچشموں سے بھی اپنی پیاس بجھائی تھی۔ چنانچہ ابن عمرؓ کے علاوہ صحابہ میں ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، ابولبابہ بن منذرؓ، رافع ابن خدیجؓ، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، اُم سلمہؓ اور ربیع بنت مسعودؓ سے اور تابعین میں اپنے آقا زادوں عبداللہ، عبیداللہ، سالم اور زید اور قاسم بن محمد بن ابی بکر، منبہ بن وہب عدی، عبداللہ بن محمد بن ابی بکر، عبدالرحمن بن حسین اور سعید بن ابی ہند وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[۵]۔

ان بزرگوں کے فیض نے ان کو جماعت تابعین میں نہایت ممتاز حافظِ حدیث بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے[۶]۔ حافظ ذہبی ان کو امام العلم لکھتے ہیں اور ان کا شمار حفاظ کے طبقۂ اول میں کرتے ہیں[۷]۔

کیفیت کے اعتبار سے نافع کی روایت طلائے خالص کا حکم رکھتی ہیں[۸]۔ خلیلی کا بیان ہے کہ نافع پر تمام ارباب فن کا اتفاق ہے[۹]۔ وہ صحیح الروایہ ہیں۔ بعض لوگ انہیں سالم پر بھی جن سے

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۲ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۰
۳ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۳۴ ۴ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۴ ۵ ایضاً۔ ص ۴۱۳
۶ ابن خلکان۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۱ ۷ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۲ ۸ طبقات ابن سعد تذکرہ نافع
۹ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۷

انہوں نے سماع کیا تھا، ترجیح دیتے تھے۔ بعض ان کے ہم پایہ سمجھتے تھے۔ ان کی تمام روایات غلطیوں سے پاک ہیں[1]۔

خصوصاً ابن عمرؓ سے ان کی روایات میں کسی شک وشبہ کا احتمال ہی نہیں تھا۔ امام مالک فرماتے تھے کہ جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں[2]۔ محدثین کے نزدیک مالک عن نافع ابن عمرؓ کا سلسلۂ روایت سلسلۃ الذہب سے تعبیر کیا جاتا ہے[3]۔

تلامذہ: حدیث میں نافع کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ جس میں بڑے بڑے تابعی اور تبع تابعی آئمہ تھے۔ بعض ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔ ابو اسحٰق سبیعی، حکیم بن عیینہ، محمد بن عجلان، بکر بن عبداللہ بن اشج، یحییٰ انصاری، امام زہری، صالح بن کیسان، ایوب سختیانی، عبیداللہ بن عمر، حمید الطویل، میمون بن مہران، موسیٰ بن عقبہ، ابن عون، اعمش، ابن جریج، اوزاعی، لیث، یونس ابن عبید، ابن ابی ذیب، ابن ابی لیلیٰ، ضحاک بن عثمان اور امام مالک وغیرہ[4]۔

امام مالکؒ ان کے خاص تلامذہ میں تھے۔ انہوں نے زیادہ فیض ان ہی سے پایا تھا۔ بچپن سے نافع کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ میں بچپن میں جب بہت کم سن تھا، نافع کی خدمت میں جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا۔ نافع اُتر کر مجھ سے حدیثیں بیان کرتے تھے[5]۔ نافع کی زندگی بھر امام مالک کے استفادہ کا سلسلہ قائم رہا۔ جب تک نافع زندہ رہے، امام مالک برابر ان کے حلقہ درس میں جاتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے کہ ان مسائل میں ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے[6]۔

فقہ: اپنے آقائے نامدار کے فیض سے فقہ میں بھی کامل تھے۔ حافظ ابن حجر ان کو نافع الفقیہ لکھتے ہیں[7]۔ صحابہ کے بعد مدینہ کی صاحب علم وافتاء جماعت کے رکن رکین تھے[8]۔ لیکن اپنے آقازادہ سالم بن عبداللہ کی زندگی بھر جو مدینہ کے فقہائے سبعہ میں تھے اور نافع کے استاد تھے، پاس ادب سے فتویٰ نہیں دیا[9]۔

عمرؓ بن عبدالعزیز اور نافع:

حضرت عمر بن عبدالعزیز ان کے علم کے اتنے قائل تھے کہ انہیں مصر کے مسلمانوں کو سنت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا[10]۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۴ [2] ایضا [3] ایضا [4] ابن خلکان۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۱
[5] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۲ [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۸ [7] ابن سعد۔ جلد ۴۔ ترجمہ امام مالک
[8] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۱۱ [9] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۸ [10] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۵۴

حضرت ابن عمرؓ کی محبت :

ان کے کمالات کی وجہ سے عبداللہ بن عمرؓ کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ بعض شائقین نے نافع کی غلامی کے زمانہ میں ان کی بڑی قیمت پیش کی، لیکن ابن عمرؓ علیحدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ عبداللہ بن جعفر نے بارہ ہزار کی خطیر رقم پیش کی۔ ابن عامر نے تیس ہزار قیمت لگائی۔ لیکن ابن عمرؓ نے سب کو نامنظور کردیا اور اسی وقت یہ کہہ کر کہ "مجھے خوف ہے کہ ابن عامر کے روپے مجھے فریفتہ کرلیں گے نافع کو آزاد کردیا[۱]۔

وفات : ۱۱۷ھ میں وفات پائی[۲]۔

(۷۸) وہب بن منبہؒ

نام ونسب : وہب نام ہے۔ ابوعبداللہ کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے : وہب بن منبہ بن کامل بن شیخ اس ذی کناز یمنی صنعانی۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہب عجمی النسل تھے۔ ان کے والد منبہ کسریٰ کے زمانہ میں جب اس نے سیف بن ذی یزن حمیری کی قیادت میں حبشہ پر مہم بھیجی تھی، یمن آئے اور پھر یہیں آباد ہوگئے، اور عہدِ نبوی میں مشرف باسلام ہوئے۔

پیدائش : ۳۴ھ میں پیدا ہوئے[۳]۔

فضل وکمال :

اسلامی علوم میں وہب کا کوئی خاص درجہ نہ تھا، لیکن مذاہب کے صحیفوں کے عالم تھے۔ تاہم ان سے وہ بے گانہ بھی نہ تھے اور تابعین میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ وہ جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے[۴]۔

حدیث : حدیث میں متعدد صحابہ سے فیض طلب ہوئے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ، جابر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ابوسعید خدریؓ، انس بن مالکؓ اور نعمان بن بشیرؓ سے ان کی روایات ملتی ہیں[۵]۔

ان کے صاحبزادے عبداللہ وعبدالرحمٰن اور بھتیجے عبدالصمد اور عقیل اور عام لوگوں میں عمرو بن دینار، سماک بن فضل اور اسرائیل وغیرہ نے ان سے سماع حدیث کیا تھا[۶]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۸ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۴۹
۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۶۷ ۶ ایضاً

فقہ: ان کے تفقہ کے سلسلہ میں صرف اس قدر معلوم ہے کہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے زمانہ میں صنعاء کے عہدۂ قضا پر تھے[۱]۔

غیر مذہب کے صحیفوں کا علم:

وہب دوسرے مذاہب کے صحیفوں کے بڑے نامور عالم تھے اور اس میں ان کی جماعت میں کوئی مقابل نہ تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ گزشتہ کتابوں کے علم و معرفت میں مشہور ہیں[۲]۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے اور اپنے زمانہ میں کعب احبار کی نظیر کے مانے جاتے تھے[۳]۔

مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بانوے الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ جن میں بعض ایسی تھیں جن کے متعلق لوگوں کو کم واقفیت تھی۔ داؤد بن قیس صنعانی کا بیان ہے کہ میں نے وہب سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ میں نے بانوے آسمانی کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں سے بہتر کینسون میں اور لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اور بائیس کتابوں کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ ان تمام کتابوں میں یہ مضمون مشترک ہے کہ جو انسان مشیت کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے وہ کافر ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمیں کتابیں ایسی پڑھیں تھیں، جو تمیں نبیوں پر اتری تھیں[۴]۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ دونوں صحیح ہیں۔

تمیں کتابیں ایسی نہ رہی ہوں گی، جن کی حیثیت مستقل مصاحف کی ہوگی اور بقیہ مستقل کتابیں رہی ہوں گی۔ اس قدر مسلم ہے کہ وہ کتب ماضیہ کے سب سے بڑے عالم تھے اور قدیم صحیفوں کے مشہور اور نامور علما، کعب احبار اور عبداللہ بن سلام دونوں کا مجموعی علم ان کی تنہا ذات میں جمع تھا[۵]۔

تاریخ: وہب مورخ بھی تھے، اور سلاطین حمیر کے حالات میں انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی[۶]۔

فضائل اخلاق: فطرۃً نہایت صالح تھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے اس کو اور زیادہ حلیم اور عبادت گزار بنا دیا تھا۔ وہ عابد شب زندہ دار تھے۔ ساری ساری رات عبادت کرتے تھے۔ کامل بیس سال تک انہوں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے[۷]۔ طبیعت میں نرمی اس قدر تھی کہ کسی ذی روح کے لئے زبان سے گالی یا درشت کلمہ نہ نکلا[۸]۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۹　۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۴۹　۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۹
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۶　۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۹　۶۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۵۰
۷۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۶　۸۔ ایضاً

غیر معتبر روایات : لیکن کعب احبار کی طرح ان کے ذریعہ بھی مسلمانوں میں غیر معتبر اسرائیلیات کی اشاعت ہوئی۔

وفات : ہشام بن عبدالملک کے عہد ۱۱۰ھ میں صنعاء میں وفات پائی[1]۔

(۷۹) ہرم بن حیان عبدیؒ

نام ونسب : ہرم نام ہے۔ والد کا نام حیان تھا۔ عبدی کی نسبت غیر معلوم ہے لیکن ان کے حالات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ''عبدیت'' کا حقیقی مظہر تھے، چونکہ طبقات ورجال کی کتابیں زیادہ تر علمی اغراض کے لئے لکھی گئی ہیں اور ان کے لکھنے والے محدثین ہیں اس لئے ان میں عموماً انہی لوگوں کے حالات ملتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے علم سے تھا اور بزرگوں کے حالات جو اس مکتب کے تربیت یافتہ نہ تھے، یا جن کی روحانیت کے نور نے ان کی علمی روشنی کو مدہم کر دیا تھا۔ بہت کم ملتے ہیں، ابن حیان بھی اسی مقدس زمرہ میں تھے اس لئے ان کے حالات ابن سعد کے علاوہ کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ **کان له فضل وعبادة ۔**

علمی حیثیت : اگر چہ ابن حیان ظاہری علوم سے بیگانہ تھے لیکن ان کا شمار صاحب فضل تابعین میں ہے۔ ان کے ہم مشرب حضرت خواجہ حسن بصری نے ان سے روایت کی ہے لیکن وہ کسی اور ہی مکتب کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے انہوں نے علم کی قبا نہیں پہنی اور نہ اس زمرہ میں ان کا شمار ہوا۔ روحانی کمالات ان کا اصل رنگ زہد وعبادت اور فنائی اللہ تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : **کان له فضل وعبادة ۔**

ایک سبق آموز مثال :

ان کے رنگ طبع کے اعتبار سے ان کو دنیاوی امور سے کوئی مناسبت نہ تھی لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کوئی عہدہ یا کوئی خدمت ان کے متعلق تھی، لیکن اس سے ان کو کیا نسبت ہو سکتی تھی دنیاوی عہدوں کے اوصاف ولوازم سے ان کے پاس اگر کوئی چیز ہو سکتی تھی تو دیانت تھی۔ جس کا ثبوت انہوں نے ایک سبق آموز شکل میں دیا۔ عہدہ ملنے کے بعد انہوں نے اپنے اعزہ واحباب کی یورش کے خیال سے غالباً گزرگاہ پر یا کسی اور شکل سے اس طرح آگ جلوا دی کہ وہ ان کے اور باہر آنے والوں کے درمیان حائل ہو جائے چنانچہ کچھ لوگ آئے اور دور سے سلام کر کے

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۳۹۶

کھڑے ہو گئے ہرم نے ان کے ساتھ ظاہری اخلاق صرف کیا۔ اور خوش آمدید کہہ کر بلایا، انہوں نے کہا آئیں کسی طرح ہمارے اور آپ کے درمیان تو آگ حائل ہے۔ آپ نے یہ سبق آموز جواب دیا کہ تم لوگ خود دوتو اتنی آگ کو عبور نہیں کر سکتے اور مجھ کو اس سے زیادہ آتش سوزاں میں جھونکنا چاہتے ہو یہ جواب سن کر وہ لوٹ گئے۔

عمل کی اہمیت :

علم کو وہ زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، اصل شے عمل کو سمجھتے تھے اور بے علم علماء سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور انہیں فاسق کہتے تھے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ فاسق علماء سے بچتے رہو۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت متعجب ہوئے کہ عالم فاسق کیسے ہو سکتا ہے انہوں نے ابن حیان سے پوچھ بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم امیر المومنین اس میں میری نیت نیک تھی، بسا اوقات امام کہتا تو علمی باتیں ہے لیکن عمل فاسق کا کرتا ہے اس لئے لوگ شبہ میں پڑ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

خواجہ اویس قرنی کی باتیں :

حضرت اویس قرنی ان کے ہم مشرب وہم مذاق تھے۔ اس لئے ان دونوں کی ملاقاتیں نہایت پر کیف ہوتی تھیں۔ ابن حیان ان کی ایک ملاقات کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں بصرہ سے آرہا تھا کہ فرات کے کنارہ اویس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا میرے بھائی کیا حال ہیں، کیسا مزاج ہے۔

اویس کیا حال ہے، کیسا مزاج ہے، انہوں نے کہا میرے بھائی کیسے ہو؟ اس ابتدائی آداب ملاقات کے بعد میں نے ان سے فرمائش کی کہ کوئی حدیث سنایئے۔ جواب دیا میں اپنے اوپر یہ دروازہ کھول کر محدث قصہ گو اور مفتی بننا پسند نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر روئے۔ میں نے کہا کچھ قرآن ہی سنایئے۔ آپ نے یہ آیتیں تلاوت کیں :

"حٰمٓ والکتاب المبین انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین ......

هو العزيز الرحيم"۔

"حٰمٓ یہ کتاب جو واضح ہے ہم نے اس کو مبارک رات میں اُتارا کہ لوگوں کو ڈرانے والے تھے"۔

هو العزيز الرحيم تک سنا کہ بے ہوش ہو گئے، ہوش آنے کے بعد فرمایا، مجھے عزلت اور تنہائی زیادہ پسند ہے۔

وصیت وفات : اس رنگ کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے اور آپ کے سامان میں زرہ اور گھوڑا رہتے تھے، اسی سلسلہ میں کسی مہم کے لئے نکلے اور انتقال کر گئے غالباً دوران علالت میں یا کسی اور موقع پر کسی نے عرض کیا کہ کچھ وصیت فرمائیے فرمایا کیا وصیت کروں بس صرف یہ وصیت ہے کہ میری زرہ بیچ کر میرا قرض ادا کرنا۔ اگر زرہ کافی نہ ہو تو گھوڑی بھی بیچ ڈالنا۔ اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو غلام بھی فروخت کر دینا۔ سورہ نحل کی ان آخری آیات کو ہمیشہ نظر رکھنا۔

"ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة"۔ (الآیة)

"خدا کے راستہ پر حکمت اور عظمتِ حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ"۔

تجہیز و تکفین کے بعد آسمان نے قبر پر ابر رحمت کے موتی برسائے[1]۔

(۸۰) ہشام بن عروہؒ

نام ونسب : ہشام نام، ابوعبداللہ کنیت، مشہور صحابی حضرت زبیر بن عوام کے پوتے تھے ان کے والد عروہ بھی بڑے جلیل القدر تابعی اور مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک تھے ان کے حالات اُوپر گزر چکے ہیں۔

اکابر صحابہ میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مجھے اور میرے بھائی محمد کو ابن عمرؓ کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے گود میں بٹھا کر ہمارا بوسہ لیا[2]۔ غالباً اسی یا کسی اور ملاقات میں ابن عمرؓ نے ان کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر انہیں دعا دی[3]۔

فضل وکمال : ہشام ایک جلیل القدر تابعی کے لڑکے اور ایک جلیل القدر صحابی کے پوتے تھے اس لئے علم کی دولت گویا انہیں وراثۃً ملی تھی ان کا شمار ان کے عہد کے علمائے تابعین میں تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق، جلالت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے[4]۔

حدیث : حدیث کے ممتاز حافظ تھے علامہ ابن سعد ان کو ثقہ، ثبت، کثیر الحدیث اور حجت اور حافظ ذہبی امام، حافظ اور حجت لکھتے ہیں[5]۔ ائمہ فن ان کی وسعت علم کے اتنے معترف تھے کہ ابو حاتم رازی ان کو امام حدیث اور وہیب، حسن بصری اور ابن سیرین کا درجہ دیتے تھے[6]۔

۱؎ یہ تمام حالات ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۹۱۔ ۹۷ سے ماخوذ ہیں۔ ۲؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۱۴۔ ص ۳۸۔

۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۸۔ ۴؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۳۸۔

۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۶۷۔ ۶؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۹۔

شیوخ : صحابہ میں انہوں نے صرف اپنے چچا عبداللہ بن زبیر" اور دوسرے علماء میں عبداللہ بن عروہ، عباد بن خزیمہ، عوف بن حارث بن طفیل، ابی سلمہ بن عبدالرحمن ابن منکدر وہب بن کیسان، صالح السمان، عبداللہ بن ابی بکر، عبدالرحمن بن سعد اور محمد بن ابراہیم وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[۱]۔

تلامذہ : ان کے تلامذہ میں یحییٰ بن سعید انصاری، ایوب سختیانی، مالک بن انس، عبیداللہ بن عمر ابن جریج، سفیان ثوری، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید بن القطان اور وکیع ابن جراح لائق ذکر ہیں[۲]۔

فقہ : ان کے والد عروہ مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سے تھے۔ ان کے تفقہ سے ان کو وافر حصہ ملا تھا۔ حافظ ذہبی ان کو فقیہ لکھتے تھے[۳]۔

زہد وورع :

علم کے ساتھ عمل و اخلاق سے بھی آراستہ تھے۔ ابن حبان ان کو فاضل اور ورع لکھتے ہیں[۴]۔

تہذیب لسان :

نہایت مہذب اور شائستہ تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کوئی بے جا کلمہ نہ نکلتا تھا۔ منذر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے ہشام کی زبان سے ایک مرتبہ کے سوا کبھی کوئی برا کلمہ نہیں سنا[۵]۔

فیاضی : نہایت فیاض اور سیر چشم تھے۔ ان کی فیاضی اعتدال سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک لاکھ کے مقروض ہو گئے تھے۔

بغداد کا سفر : اس کی ادائیگی کی فکر میں وہ خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی کے پاس بغداد گئے۔ اس نے بڑا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے اپنی غرض پیش کی۔ اس نے پوچھا کتنا قرض ہے۔ فرمایا ایک لاکھ۔ منصور نے کہا، آپ اس فضل و کمال کے باوجود اتنا بڑا قرض لیتے ہیں، جس کی ادائیگی آپ کے امکان میں نہیں۔ انہوں نے کہا خاندان کے بہت لڑکے جوان ہو گئے تھے، مجھے خوف تھا کہ ان اگر ان کی شادیاں نہ کی گئیں تو وہ بے خانماں ہو جائیں گے۔ اس لئے میں نے خدا اور امیر المومنین کے اعتماد پر ان کا گھر بسا کر ان کا ٹھکانا کر دیا اور ان کی جانب سے ولیمہ کیا۔ یہ سارا قرض اسی کا ہے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۸　[۲] ایضاً　[۳] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۹
[۴] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۹۱　[۵] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۴۔ ص ۱۳۸

ابوجعفر منصور نے حیرت کے لہجہ میں دو مرتبہ ایک لاکھ ایک لاکھ کہا! اور دس ہزار روپیہ دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا، امیر المومنین جو کچھ دے رہے ہیں جو خوش دلی سے دے رہے ہیں (یا جبر سے)۔ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ فرماتے تھے کہ جو شخص خوش دلی سے عطیہ دیتا ہے تو اس میں دینے والے اور لینے والے دونوں کو برکت ہوتی ہے۔ منصور نے کہا میں نے خوش دلی سے دیا ہے[۱]۔

وفات: بغداد ہی میں ۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ اتفاق سے اسی دن عباسیوں کے ایک بڑے جلیل القدر اور نامور غلام کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے دونوں کے جنازے ایک ساتھ اٹھائے گئے، لیکن منصور نے ہشام کے رتبہ کی وجہ سے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ ہارون کی ماں خیزران ان کے قبرستان میں دفن کیے گئے[۲]۔

(۸۱) یحییٰ بن سعیدؒ

نام ونسب: یحییٰ نام ہے۔ ابوسعید کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن سعید بن قیس بن عمرو بن سہل ابن ثعلبہ بن حارث بن زید ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار انصاری مدنی۔

فضل وکمال: یحییٰ علمی اعتبار سے اپنے دور کے ممتاز ترین تابعین میں تھے۔ ان کی علمی جلالت پر تمام آئمہ کا اتفاق ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق، جلالت اور امامت پر سب کا اجماع ہے۔ حافظ ذہبی ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں[۳]۔

حدیث: اگرچہ یحییٰ بن سعید اس دور کے بزرگ ہیں[۴]۔ جب کہ عہدِ صحابہ کی بہار آخر ہو چکی تھی پھر جو باقیات صالحیات رہ گئے تھے، یحییٰ نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا تھا[۵]۔ چنانچہ صحابہ اور کبار تابعین میں انہوں نے انس بن مالکؓ، سائب بن زید، عبداللہ بن عامر ربیعہ، ابوامامہ ابن سہل بن حنیف، سعید بن مسیب، قاسم بن محمد، عمرو بن سلمہ بن عبدالرحمٰن، عمرو بن زبیر، سلیمان ابن یسار وغیرہ سے انہوں نے سماعِ حدیث کیا تھا[۶]۔

ان بزرگوں کے فیض نے یحییٰ کو بڑا حافظ بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، "کان ثقہ کثیر الحدیث حجۃ ثبتا"۔ ابن مبارک انہیں اکابر حفاظ حدیث میں شمار کرتے تھے۔ ابی حاتم

---

[۱] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۴۔ ص ۳۹ [۲] ایضاً۔ ص ۴۱ و ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۲۔ ص ۶۷
[۳] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ص ۱۵۴ [۴] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۲
[۵] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳ [۶] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۲۲۱ بحوالہ ابن سعد

انہیں امام زہریؒ کے برابر سمجھتے تھے۔ مدینہ کے دو شخص ایسے تھے، جن کی ذات سے مدینۃ الرسول کا علم محفوظ رہا۔ ایک زہری دوسرے یحییٰ بن سعید۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو بہت سے سنن ضائع ہو جاتے۔ کبار تابعین کے بعد مدینہ میں چار حاملین علم تھے۔ ان میں ایک یحییٰ بن سعید ہیں۔ سفیان ثوری کا بیان ہے کہ اہل مدینہ انہیں زہری سے بھی زیادہ مرتبہ سمجھتے تھے[1]۔

حضرت یحییٰ القطان کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید کو اس حیثیت سے زہری پر تفوق حاصل ہے کہ زہری کے بارے میں لوگوں کا اختلاف موجود ہے لیکن ان کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا[2]۔ ابن مدینی کے بیان کے مطابق ان کی مرویات کی تعداد تین سو ہے[3]۔ اور یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ انہوں نے ان کی تین ہزار حدیثیں حفظ کی تھیں[4]۔

تلامذہ : ان کے خوشہ چینوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان میں سے بعض نامور تلامذہ یہ ہے،
ہشام بن عروہ، حمید الطویل، یزید بن عبداللہ بن اسامہ، ابن جریج، اوزاعی، مالک بن انس، دونوں سفیان، حماد، لیث، ابن مبارک، شعبہ، یحییٰ بن سعید القطان اور یحییٰ بن سعید اُموی وغیرہ[5]۔

فقہ : فقہ میں بھی وہ امتیازی پایہ رکھتے تھے۔ ایوب سختیانی کہتے تھے کہ میں نے یحییٰ سے بڑا فقیہ مدینہ میں نہیں چھوڑا[6]۔ ان کے تفقہ کی ایک سند یہ بھی ہے کہ وہ مدینۃ الرسول کے جو مخزن فقہا تھا، قاضی تھے[7]۔ مروان کے زمانہ میں حج کے موقع پر منادی کی جاتی تھی کہ حجاج کو یحییٰ بن سعید کے علاوہ کوئی دوسرا فتویٰ نہ دے[8]۔

عہدۂ قضاء : ابتدا میں مدینہ کے قاضی تھے۔ پھر دولت عباسیہ کے قیام کے بعد ابو جعفر منصور عباسی نے انہیں بلا کر قاضی القضاۃ کے جلیل القدر منصب پر ممتاز کیا[9]۔

ایک روایت ہے کہ وہ ہاشمیہ میں اس عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ دوسری یہ کہ بغداد میں[10]۔ مدینہ کے قیام کے زمانہ میں ان کی مالی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت مقروض ہو گئے تھے۔ عین اسی زمانہ میں منصور نے عہدۂ قضاء کے لئے طلب کیا۔ اس عہدہ پر تقرر کے دو مہینے کے اندر ان کی حالت درست ہو گئی اور کل قرض ادا ہو گیا[11]۔

۱۔ بحوالہ ابن سعد　۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۳　۳۔ ایضاً　۴۔ ایضاً۔ ص ۱۲۵
۵۔ تہذیب ۱۱۔ ۲۲۱۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳　۶۔ ایضاً۔ ص ۱۲۴　۷۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۲
۸۔ ایضاً۔ ص ۱۲۴　۹۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲　۱۰۔ تہذیب ۱۱۔ ۲۲۱۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳
۱۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۳

بعض زرّیں اصول :

حضرت یحییٰ بن سعید بعض نہایت زرّیں اصول ارشاد فرماتے تھے۔ جو آج بھی مذہبی مسائل میں ادنیٰ اختلاف پر ایک دوسرے کو ہدف ملامت بنانے والوں کے لئے سبق کا کام دے سکتے ہیں، فرماتے تھے کہ "اہل علم وسعت ہیں، مفتیوں میں مسائل میں ہمیشہ سے باہم اختلاف ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک شخص ایک شے کو حرام کہتا اور دوسرا حلال۔ لیکن اس اختلاف سے کوئی ایک دوسرے پر عیب نہیں لگاتا"[1]۔

وفات : ۱۴۳ھ میں ہاشمیہ میں وفات پائی[2]۔

(۸۲) یحییٰ بن یعمر رح

نام ونسب : یحییٰ نام ہے۔ ابو سلیمان کنیت۔ نسبی تعلق قبیلہ لیث سے تھا۔

فضل وکمال : قرآن، حدیث، فقہ، زبان اور ادب جملہ علوم کے جامع تھے۔

قرآن : قرآن کے ممتاز عالم تھے۔ علامہ ابن سعد انہیں علمائے قرآن لکھتے ہیں[3]۔

حدیث: حافظ حدیث بھی تھے۔ حافظ ذہبی نے حفاظ تابعین کے دوسرے طبقہ میں ان کے حالات لکھے ہیں۔ صحابہ میں انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عمار بن یاسرؓ، ابوذر غفاریؓ، ابوہریرہؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابوسعید خدریؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، سلیمان بن صردؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسے اکابر سے روایتیں کی ہیں[4]۔

یحییٰ بن عقیل، سلیمان تیمی، عبداللہ بن بریدہ، قتادہ، عکرمہ، عطاء خراسانی، رکین بن ربیع، عبداللہ بن کلیب سدوسی، ازرق بن قیس اور اسحٰق بن سوید وغیرہ ان کے زمرہ تلامذہ میں تھے[5]۔

فقہ : فقہ میں بھی انہیں پورا ادراک تھا۔ حافظ ذہبی انہیں فقیہ علماء میں لکھتے ہیں[6]۔ ان کے تفقہ کی ایک سند یہ ہے کہ مرو کے قاضی تھے[7]۔

زبان وادب :

ان مذہبی علوم کے علاوہ زبان وادب میں بھی انہیں مہارت تھی۔ نحو اور عربی زبان کے فاضل تھے[8]۔ نحو انہوں نے اس کے موجد اول ابوالاسود دوئلی سے حاصل کی تھی[9]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۲ ۲؎ ایضاً ۳؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۱۰۱
۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۳۰۵ ۵؎ ایضاً ۶؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۵
۷؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ق ۲۔ ص ۱۰۱ ۸؎ ایضاً ۹؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۳۰۵

فصاحت و بلاغت :

زبان پر عبور کے ساتھ وہ بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ ان کا شمار ممتاز فصحاء میں تھا[1]۔

قضاءت میں سہولت :

یحییٰ خراسان کے پایہ تخت مرو کے قاضی تھے۔ مرو میں باقاعدہ دارالقضاء تھا۔ لیکن حاجت مندوں کی آسانی کے لئے وہ چلتے پھرتے، راستے گلی میں تنازعوں کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ یحییٰ بن موسیٰ بن یسار کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن یعمر کو بازاروں اور گلیوں میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ بسا اوقات وہ سواری پر چلتے ہوئے، اس حالت میں اگر دو فریق آجاتے تو سواری روک کر کھڑے کھڑے فیصلہ دے دیتے[2]۔

ایک اہم کارنامہ :

ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ جو ابدالآباد قائم رہے گا قرآن کو منقوط کرنا ہے۔ ابتداء میں قرآنِ پاک نقطوں سے خالی تھا۔ سب سے اول یحییٰ نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے نقطے لگائے[3]۔

اہلِ بیت نبوی سے عقیدت :

اہلِ بیت نبوی کے ساتھ ان کو نہایت گہری عقیدت تھی، اور وہ ان کو بلا تفریق سب پر فضیلت دیتے تھے۔ لیکن کسی کی تنقیص نہ کرتے۔

ایک مرتبہ حجاج نے ان سے کہا تمہارا خیال ہے کہ حسنؓ و حسینؓ رسول اللہ ﷺ کی ذریت میں تھے؟ یا تو تم اس خیال سے باز آؤ یا اس کا ثبوت پیش کرو۔ انہوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کر کے "ومن ذریة داؤد و سلیمان و زکریا و یحییٰ و عیسیٰ" کہا عیسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے درمیان اس سے کہیں کم تعلق ہے، جتنا حسنؓ و حسینؓ اور محمد کے درمیان ہے۔ اس جواب میں یہ نکتہ ہے کہ جب عیسیٰؑ بعد زمانی کے باوجود صرف مادری تعلق سے ابراہیمؑ کی ذریت ہو سکتے ہیں تو حسنؓ و حسینؓ کے جو خاص نواسے ہیں رسول اللہ کی ذریت میں کیا شبہ۔ یہ جواب سن کر حجاج مطمئن ہو گیا[4]۔

وفات : باختلاف روایت ۱۱۹ھ یا ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔

---

[1] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۷۶ [2] ابن سعد۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ۱۰۱

[3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۶۵ [4] شذرات الذہب جلد اول ص ۱۷۶

(۸۳) یزید بن ابی حبیبؒ

نام ونسب : یزید نام ہے۔ ابورجا کنیت۔ قریش کی شاخ بنی عامر بن لوئی کے غلام تھے، ان کے والد ابوحبیب (اسود) نوبی تھے، ان کے وطن دنقلہ تھا۔

پیدائش : یزید ۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور مصر میں ان کی نشوونما ہوئی[۱]۔

فضل وکمال : فضل وکمال کے لحاظ سے مصر کے آئمہ تابعین میں تھے، حافظ ذہبی انہیں امام الکبیر لکھتے ہیں[۲]۔ مصر میں ان ہی کی ذات سے دینی علوم کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جن کی ذات سے مصر میں علم ظاہر ہوا۔ اور حلال حرام کے مسائل کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے اہل مصر کا علم محض ترغیب اور ملاحم وفتن تک محدود تھا[۳]۔

حدیث : وہ مصر کے ممتاز حفاظ حدیث میں تھے۔ علامہ ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث اور حافظ ذہبی حجۃ اور حافظ حدیث لکھتے ہیں۔

حدیث میں انہوں نے عبداللہ بن حارث بن جزوز بیدی، ابوالطفیل، اسلم بن یزید، ابی عمران، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، خیر بن نعیم حضرمی، سوید بن قیس، عبدالرحمٰن بن شماسہ مہری، عبدالعزیز ابن ابی الصعبہ، عطاء بن ابی رباح، عراک بن مالک اور امام زہری وغیرہ سے استفادہ کیا تھا۔

ان سے فیض یاب ہونے والوں میں سلیمان التیمی، محمد بن اسحٰق، زید بن ابیسہ، عمرو بن الحارث، عبدالحمید بن جعفر، ابن لہیعہ اور لیث بن سعد لائق ذکر ہیں[۵]۔

فقہ : فقہ میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی، حافظ ذہبی ان کو فقیہ لکھتے ہیں[۶]۔ عمر بن عبدالعزیز نے مصر میں تین آدمیوں کو افتاء کے منصب پر ممتاز کیا تھا۔ ان میں سے ایک یزید بھی تھے[۷]۔ انہی کی وجہ سے مصر میں فقہ کا مذاق پیدا ہوا۔

علمائے معاصرین کی رائے :

ان کے کمالات کے متعلق ان کے عہد کے علماء کی یہ رائے تھی۔ لیث بن سعد کہتے تھے کہ یزید ہمارے عالم اور ہمارے سردار ہیں۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ لیث ان کے اور

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۶　۲۔ ایضاً　۳۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۰۲
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۶　۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۳۱۸
۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۵　۷۔ ایضاً۔ ۱۱۶

عبیداللہ بن جعفر کے متعلق کہتے تھے کہ یہ دونوں ملک کے جوہر ہیں۔ عمرو بن حارث سے کسی نے سوال کیا کہ یزید افضل ہیں یا عبداللہ بن جعفر انہوں نے جواب دیا اگر وہ دونوں ترازو میں تولے جائیں تو کسی کا پلہ بھاری نہ ہوگا[۱]۔

احتیاط : محتاط تابعین کی طرح وہ بھی اس قدر احتیاط کرتے تھے کہ جب ان کے پاس سائلین کی کثرت ہوگئی تو انہوں نے خانہ نشینی اختیار کی[۲]۔

علم کی عظمت : علم کا بڑا وقار قائم رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی امیر کے آستانہ پر جانا گوارا نہیں تھا۔ جس کو ضرورت ہوتی اس کو خود یہاں بلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیز نے آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ میرے پاس آیئے میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم خود میرے پاس آؤ میرے پاس آنا تمہارے لئے زینت اور میرا تمہارے پاس جانا تمہارے لئے عیب دار ہے[۳]۔

صاف گوئی : امراء کو مطلق خاطر میں نہ لاتے۔ ان کے منہ پر ان کی برائیاں بیان کرتے۔ ایک مرتبہ آپ بیمار پڑے۔ حوثرہ بن سہیل امیر مصر آپ کی عیادت کے لئے آیا اور پوچھا جس کپڑے میں مچھر کا خون لگا ہو۔ اس میں نماز پڑھنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ سوال سن کر آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس سے گفتگو بند کر دی۔ یہ دیکھ کر حوثرہ اٹھ گیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا روزانہ خلق اللہ کا خون کرتے ہو اور مجھ سے مچھر کے خون کے متعلق پوچھتے ہو[۴]۔

وفات : مروان کے عہد حکومت ۱۱۸ھ میں وفات پائی[۵]۔

بعض خاص اوصاف :

عقل و دانش اور حلم اور تحمل کے زیور سے آراستہ تھے۔ کان حلیماً عاقلاً۔

(۸۴) یونس بن عبیدؒ

نام و نسب : یونس نام، ابو عبیداللہ کنیت، بنی عبد قیس کے غلام تھے۔

فضل و کمال : یونس اگرچہ غلام تھے۔ لیکن حسن بصری کے خاص اصحاب میں تھے۔ ان کے فیض صحبت و ہم نشینی نے ان کو دولت علم و عمل سے مالا مال کر دیا تھا۔ حافظ ذہبی ان کو امام حجۃ اور قدوہ

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۵۔۱۱۶　۲؎ ایضاً　۳؎ ایضاً　۴؎ ایضاً

۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۰۲

لکھتے ہیں[1]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے اور وہ جلیل القدر تابعی تھے[2]۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ علم وفضل، حفظ واتقان، پابندی سنت اور اہل بدعت سے بغض، تقشف، تفقہ فی الدین اور کثرت حفظ میں اپنے زمانہ کے سادات میں تھے[3]۔

حدیث : حدیث میں اپنے عہد کے ممتاز حفاظ میں تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : **کان ثقفہ کثیر الحدیث** ۔

صحابہ میں انہوں نے انس بن مالک کو دیکھا تھا لیکن ان سے فیضیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے زیادہ تر حضرت حسن بصری سے استفادہ کیا[4]۔ ان کے بعد محمد بن سیرین، ثابت البنانی، عبدالرحمن بن ابی بکرہ، حکیم بن عرج، نافع مولی ابن عمر، حمید بن بلال، عطاء بن ابی رباح وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا[5]۔

حدیث میں اپنے اکثر معاصرین پر فائق تھے۔ سعید بن عامر کا بیان ہے کہ میں نے یونس بن عبید سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ تمام اہل بصرہ کی یہی رائے ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ سلیمان تیمی سے بھی بلند مرتبہ ہے۔ تیمی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے تھے[6]۔

اس کمال کے ساتھ وہ حدیث میں بڑے محتاط تھے۔ حدیث بیان کرنے کے بعد ہمیشہ تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے تھے[7] محض احتیاط کی بنا پر حدیثوں کو قلم بند نہیں کرتے تھے۔

تلامذہ : قابل ذکر تلامذہ کے نام یہ ہیں، ان کے صاحبزادے عبداللہ، شعبہ، ثوری، وہیب حماد، عبداللہ بن عیسیٰ، خزاز اور خارجہ بن مصعب وغیرہ[8]۔

اخلاص فی العلم :

ان کی علمی طلب شہرت اور ناموری کے لئے نہیں، بلکہ خالصۃً للہ تھی۔ ہشام بن حسام کا بیان ہے کہ میں نے یونس بن عبید کے سوا کسی کو ایسا نہیں پایا جس کی غرض علم سے محض وجہ اللہ ہو[9]۔

فضائل اخلاق :

دولت علم کے ساتھ عمل بھی یہی درجہ کا تھا۔ عقائد میں بڑے متشدد اور مذہب میں بڑے متقشف تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ بڑے عامل سنت بدعات سے نفرت کرنے والے اور متقشف تھے۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۰　۲ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۶۸
۳ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۴۵　۴ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ۲۳
۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۴۲　۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۰
۷ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۳　۸ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۴۲　۹ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۹

عقائد کے باب میں اتنے متشدد تھے کہ جدید عقائد و خیالات کو گناہ کبیرہ سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے۔ اپنے صاحبزادے سے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تم کو سود، چوری اور شراب نوشی سے منع کرتا ہوں۔ لیکن تمہارا ان چیزوں میں مبتلا ہو کر خدا سے ملنا، اس کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں کہ عمرو بن عبید اور اس کے ساتھیوں کے ہم خیال ہو کر اس سے ملو[1]۔

مبتدعین کی عیادت کرنا بھی کار ثواب نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ میرا ایک معتزلی پڑوسی بیمار ہے، میں اس کی عیادت کروں۔ فرمایا ثواب کی نیت سے نہیں[2]۔

فرائض کے علاوہ زیادہ روزہ نماز نہ کرتے تھے۔ لیکن خدا کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ سلام بن مطیع کا بیان ہے کہ یونس بہت زیادہ نماز، روزہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن خدا کی قسم جب خدا کے حقوق کا وقت آتا تو وہ اس کی ادائیگی کے لئے بالکل تیار رہتے تھے[3]۔ جہاد کو افضل العبادات سمجھتے تھے۔ اس کے چھوٹ جانے کا انتہائی قلق ہوتا تھا۔ ان کو کسی سبب سے جہاد کا موقع نہ ملا تھا، اس کا تادم آخر قلق رہا۔ اسحٰق بن ابراہیم کا بیان ہے کہ یونس مرض الموت میں اپنے پیروں کی طرف دیکھ کر روتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ فرمایا کہ وہ خدا کی راہ میں غبار آلود نہیں ہوئے[4]۔ زبان پر اکثر کلمۂ استغفار جاری رہتا تھا۔ عبدالملک ابن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ استغفار کرنے والا نہیں دیکھا[5]۔

دیانت: ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ ریشمی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور تجارتی دیانت میں اس قدر مبالغہ کرتے تھے کہ ان کے ساتھ تجارت کرنا مشکل تھا۔ ان کی تجارتی دیانت کے بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔

ایک مرتبہ ایک خاص مقام پر ریشم کا نرخ بہت چڑھ گیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے ایک دوسرے مقام کے ریشم فروش سے تیس ہزار کا ریشم خریدا۔ بعد میں انہیں خیال آیا تو اس بیچنے والے سے پوچھا کہ تم کو فلاں مقام پر مال کے نرخ چڑھنے کی خبر تھی۔ اس نے کہا، اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنا مال کیوں فروخت کرتا۔ یہ جواب سن کر روپیہ لے کر مال واپس کر دیا[6]۔

ایک مرتبہ ایک عورت ان کے پاس خز کی چادر فروخت کرنے کے لئے لائی۔ انہوں نے اسے دیکھ کر قیمت پوچھی۔ اس نے کہا، ساٹھ درہم۔ انہوں نے اپنے ہمسایہ تاجر کو چادر دکھا کر پوچھا،

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۴۴ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً۔ ص ۴۴۳ ۴۔ ایضاً۔ ص ۴۴۴
۵۔ ایضاً۔ ص ۴۴۳ ۶۔ ایضاً۔ ص ۴۴۴

تمہاری نظر میں اس کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا، ایک سو بیس تک ہو سکتی ہے۔ قیمت لگوانے کے بعد عورت سے کہا، اپنے گھر والوں سے پوچھ آؤ، وہ ایک سو پچیس تک بیچنے کی اجازت دیتے ہیں[1]۔

ایک مرتبہ ایک عورت ریشم کا ایک جبہ بیچنے کے لئے لائی۔ انہوں نے قیمت دریافت کی۔ اس نے پانچ سو بتائی۔ ان کی نگاہ میں وہ اس سے بہت زیادہ قیمت کا تھا۔ اس لئے انہوں نے دو ہزار تک اس کی قیمت لگائی[2]۔

اس احتیاط کے باوجود انہیں اس بارے میں پورا اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ابن شوذب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ یونس اور ابن عون حلال و حرام پر باتیں کر رہے تھے۔ دونوں نے کہا کہ "ہمارے مال میں ایک درہم بھی حلال کا نہیں ہے"[3]۔

وفات : ۱۳۹ھ میں وفات پائی۔ عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے سلیمان اور عبداللہ بن علی اور پرپوتے جعفر اور محمد نے جنازہ اٹھایا اور ان کی زبان پر تھا کہ "خدا کی قسم یہ عزت و شرف ہے"[4]۔

(۸۵) ابو ادریس خولانیؒ

نام و نسب : عائذ نام ہے۔ ابو ادریس کنیت۔ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے : عائذ ابن عبداللہ بن عمرو۔ بعض روایات میں نام عبداللہ اور نسب نامہ اس طرح ہے، عبداللہ بن ادریس بن عائذ بن عبداللہ بن غیلان خولانی۔

پیدائش : غزوۂ حنین کے سال ۸ھ یعنی عہدِ رسالت میں پیدا ہوئے[5]۔

فضل و کمال : صاحب علم و عمل تابعین میں تھے۔ شام کے ممتاز علماء میں شمار تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، ابو ادریس خولانی عالم اھل الشام۔۔۔۔۔۔ الفقیہ احد من جمع بین العلم العمل مشہور صحابی حضرت ابودرداء کے بعد جو شام میں مقیم تھے۔ ابو ادریس ہی ان کے جانشین ہوئے تھے[6]۔

حدیث : حدیث میں انہوں نے حضرت عمرؓ، ابودرداءؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوذر غفاریؓ، بلالؓ، ثوبانؓ، حذیفہ بن یمانؓ، عبادہ بن صامتؓ، عوف بن مالکؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ وغیرہ سے روایتیں کی ہیں۔ حافظ ذہبی نے اکابر حفاظ کے زمرہ میں ان کے حالات لکھے ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۴۴ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق ۲۔ ص ۲۴
[5] ایضاً [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۸

ان سے روایت کرنے والوں میں امام زہری، ربیعہ بن یزید، بسر بن عبید اللہ، عبید اللہ بن ربیعہ بن یزید، قاسم بن محمد، ولید بن عبدالرحمٰن، یونس بن میسرہ، ابوعون انصاری، یونس بن سیف، مکحول شہر بن حوشب اور سلمہ بن دینار وغیرہ لائق ذکر ہیں[1]۔

فقہ : شام کے مشہور فقہاء میں تھے۔ امام زہری ان کو شام کے فقیہ علماء میں شمار کرتے تھے[2]۔ طبری نے ان کا ذکر شام کے ان علماء کے ساتھ کیا ہے، جو فقیہ اور حلال وحرام کے عالم تھے[3]۔

وعظ گوئی اور قضاءت :

ان کے فقہی کمال کی سند یہ ہے کہ عبدالملک کے زمانہ میں وہ دارالخلافہ دمشق کے قاضی تھے اور قضاءت کے ساتھ وعظ و پندکی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ پھر عبدالملک نے وعظ کی خدمت ان سے الگ کر لی۔ ان کی قضاءت کے مقابلہ میں وعظ گوئی کا شغل زیادہ مرغوب تھا۔ اس لئے اس سے علیحدگی کے بعد کہتے تھے، ''میری مرغوب چیز سے مجھے معزول کر دیا گیا اور جس چیز سے میں ڈرتا ہوں اسے رہنے دیا گیا''[4]۔

علماء کا اعتراف : ان کے ہمعصروں کے کمالات کے اتنے معترف تھے کہ مکحول جو شام کے سب سے بڑے عالم تھے، کہتے تھے کہ میں نے ادریس سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ ابوزرعہ دمشقی ان کو جبیر بن نفیر عالم شام پر ترجیح دیتے تھے[5]۔

وفات : ۸۰ھ میں وفات پائی[6]۔

(۸۶) ابواسحٰق سبیعی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب : عمرو نام ہے۔ ابواسحٰق کنیت۔ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے : عمرو بن عبداللہ بن علی بن احمد بن ذی یحمد بن سبیع بن صعب بن معاویہ بن کثیر بن مالک بن جشم بن حاشد بن جشم بن خیران بن نوف بن ہمدان ہمدانی کوفی۔

ہمدان میں ان کا ممتاز خاندان تھا۔ اسلامی عہد میں یہ خاندان کوفہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ابواسحٰق کے دادا مدینہ آئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے خاندانی اعزاز کا لحاظ کر کے پندرہ ہزار پانچ سو، اور ان کا سو سو، ان کے اہل وعیال کو وظیفہ مقرر کیا[7]۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۸۵　　۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۹
۳ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۸۷　　۴ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۹
۵ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۸۵　　۶ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۴۹　　۷ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۱۹

پیدائش : ابو اسحٰق غالباً کوفہ ہی میں عثمانی عہد کے آخر میں جب کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں تین سال باقی تھے، پیدا ہوئے[1]۔

اُموی دور : اُموی دور میں بھی ابو اسحٰق کا خاندانی اعزاز قائم رہا۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں یہ اور ان کے والد تین سو وظیفہ پاتے تھے[2]۔

فضل وکمال : مرکز کوفہ میں ابو اسحٰق کی نشو ونما ہوئی تھی۔ ان میں تحصیلِ علم کی فطری استعداد و صلاحیت تھی۔ اس لئے علمائے کوفہ کے فیض سے پورا فائدہ اٹھایا اور ان کا شمار علماء کے اکابر علماء میں ہو گیا[3]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق، جلالت اور ثناء پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے۔ ان کے مناقب بہت ہیں[4]۔ ابن ناصر الدین ان کو آئمہ اسلام اور بڑے حفاظ حدیث میں لکھتے ہیں[5]۔

قرآن : قرآن کے وہ نہایت مشہور قاری تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب ان کو عمراء القاری کہتے تھے۔ اس فن کی تعلیم انہوں نے اس فن کے مشہور علماء، ابو عبدالرحمٰن اور اسود بن یزید سے حاصل کی تھی[6]۔

حدیث : حدیث کے اکابر حفاظ میں تھے۔ حافظ ذہبی ان کو علم کا ظرف اور علمائے اسلام میں لکھتے ہیں[7]۔ صحابہ میں انہوں نے ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ، معاویہؓ، عمرو بن یزید الخطمیؓ، نعمان بن بشیرؓ، عمرو بن الحارثؓ، عمرو بن الحریثؓ، زید بن ارقمؓ، براء بن عازبؓ، سلیمان بن صردؓ، حارثہ بن وہبؓ، عدی بن حاتم، جابر بن سمرہؓ، رافع بن خدیجؓ، عروہ بارقیؓ، ابو جحیفہؓ، خالد بن عرفطہؓ، جریر بن عبداللہ بجلیؓ، اشعث بن قیسؓ، مسور بن مخرمہؓ اور تابعین میں ایک کثیر جماعت سے سماع حدیث کیا تھا[8]۔ ابن مدینی نے ان کے شیوخ کی تعداد باختلاف روایت تین یا چار سو لکھی ہے۔ ان میں از تیس (۳۸) صحابہ تھے[9]۔

ابو حاتم روایات کی کثرت اور رجال کے علم میں ان کو امام زہری کا ہم پایہ سمجھتے تھے[10]۔ ابو داؤد طیالسی کا بیان ہے کہ ہم نے چار آدمیوں کے پاس حدیث کا ذخیرہ پایا۔ ان چار میں ایک ابو اسحٰق ہیں۔ ان کی احادیث کی تعداد دو ہزار تک بیان کی جاتی ہے[11]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۱۹ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲ ۳۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۷۱
۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲ ۵۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۴۷ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۱
۷۔ ایضاً ۸۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۶ ۹۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۳
۱۰۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۶۵ ۱۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲

تلامذہ : شیوخ کے تناسب سے ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع تھا اور اس میں بڑے بڑے تابعین اور تبع تابعین تھے۔ بعض قابلِ ذکر نام یہ ہیں۔ سلیمان التیمی، اعمش، قتادہ، اسمٰعیل بن ابی خالد، شریک بن عبداللہ، عمارہ بن زریق، منصور بن معتمر، سفیان ثوری، مسعر، مالک بن مغول، سفیان بن عیینہ، زہیر بن معاویہ، زائدہ، حسن بن صالح اور ابوبکرہ بن عیاس وغیرہ[1]۔

زہد وعبادت : اس علم کے ساتھ عمل بھی اسی درجہ کا تھا، بڑے عابد وزاہد تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، " کان صواما قواما متقبلا " تین دن میں ایک مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے۔ روزے بھی بکثرت رکھتے تھے[2]۔

آخر عمر میں جب قویٰ ضعیف اور عبادتِ شاقہ کے متحمل نہ رہ گئے تھے، اس وقت ان معمولات میں فرق آگیا تھا۔ لیکن پھر بھی مہینہ میں تین دن اور ہر جمعہ دوشنبہ کو اور اشہر حرم میں پابندی سے روزہ رکھتے تھے اور ایک رکعت میں پوری سورۂ بقرہ ختم کرتے تھے[3]۔

جہاد فی سبیل اللہ :

جہاد فی سبیل اللہ کا بھی ولولہ تھا۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں روم کی فوج کشی میں شریک ہوئے تھے[4]۔

وفات : ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت کم وبیش سو سال کے قریب عمر تھی[5]۔

(۸۷) ابو بردہؒ بن ابی موسیٰ اشعریؓ

نام ونسب : عامر نام ہے۔ ابو بردہ کنیت۔ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے صاحبزادے ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے : عامر بن عبداللہ بن موسیٰ بن قیس بن سلیم بن حضار بن حرب بن عامر بن عذر بن وائل بن ناجیہ بن جماہر اشعری۔

تعلیم : ان کے والد حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بڑے پایہ کے صحابی تھے۔ انہوں نے ان کو حصولِ تعلیم کے لئے مشہور صحابی عبداللہ بن سلام کے پاس جو مدینہ میں اہلِ کتاب کے بہت بڑے عالم تھے، بھیج دیا تھا۔ اس واقعہ کو ابو بردہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ کو تحصیلِ علم کے لئے عبداللہ بن سلام کے پاس بھیجا۔

۱؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۷۱   ۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲
۳؎ ایضاً   ۴؎ ایضاً۔ ص ۱۰۱   ۵؎ ایضاً۔ ۱۰۳

جب میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا، بھتیجے تم لوگ ایک تجارتی مقام پر رہتے ہو۔ اس لئے اس کا لحاظ رکھنا کہ جب کسی پر تمہارا کچھ مال واجب ہو تو وہ اگر تم کو گھاس کا ایک گٹھا بھی دے تو اس کو قبول نہ کرنا کہ وہ ربا ہوگا[۱]۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب میں مدینہ میں گیا اور عبداللہ بن سلام سے ملا تو انہوں نے کہا، چلو جس گھر میں رسول اللہ ﷺ نے داخل ہو کر نماز پڑھی ہے، تم بھی اس میں چل کر نماز پڑھو تم کو کھجور اور ستو کھلاؤں گا[۲]۔ پھر فرمایا بھتیجے تم ایسے مقام پر رہتے ہو جہاں سود عام ہے[۳]۔ تم میں ایسے لوگ ہیں کہ جب وہ کسی کو قرض دیتے ہیں اور اس کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو مقروض خورد ونوش کے سامان کی ایک گٹھری اور چارہ کا ایک گٹھا اپنے ساتھ لاتا ہے یہ ربا ہے[۴]۔

فضل وکمال: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن سلامؓ کی تعلیم وتربیت اور دوسرے بزرگوں کے فیض صحبت نے ابوبردہ کا دامن علم نہایت وسیع کر دیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں، "ابو بردہ بن ابی موسیٰ الاشعری الفقیہ احد الائمۃ الاثبات"[۵]۔ امام نووی لکھتے ہیں۔ ان کی توثیق وجلالت پر سب کا اتفاق ہے[۶]۔

حدیث: حدیث کے وہ ممتاز حفاظ میں تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، "کان ثقۃ کثیر الحدیث"۔ اس فن میں انہوں نے ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت علیؓ، حذیفہ بن یمانؓ، عبداللہ بن سلام، اعز المزنی مغیرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، اسود بن یزید النخعی اور عروہ بن زبیرؓ وغیرہ سے استفادہ کیا تھا[۷]۔

تلامذہ: ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے لڑکے سعید اور بلال، پوتے یزید اور عام لوگوں میں امام شعبی، ثابت البنانی، حمید بن بلال، عبدالملک بن نمیر، قتادہ، ابواسحٰق سبیعی وغیرہ لائق ذکر ہیں[۸]۔

فقہ: فقہ میں بھی وہ امتیازی پایہ رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی ان کو فقیہ اور امام لکھتے ہیں[۹]۔

عہدہ قضاء: اس تفقہ کی بنا پر وہ قاضی شریح کے بعد کوفہ کی مسند قضا پر بیٹھے تھے[۱۰]۔ ان کے بعد ان کے لڑکے بلال ان کے جانشین ہوئے[۱۱]۔

۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۷　۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۳　۳؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۱۷۹
۴؎ ایضاً۔ بحوالہ ابن سعد　۵؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۳　۶؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۱۸۹
۷؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ص ۱۸　۸؎ ایضاً۔　۹؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۳
۱۰؎ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۳۶　۱۱؎ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۷

فضائل اخلاق :

فضائل اخلاق کا مجسم پیکر تھے۔ان کی ذات میں تمام اخلاقی محاسن جمع تھے۔یزید بن کہلب جس زمانہ میں خراسان کا والی ہوا اس وقت اس کو ایک جامع اوصاف شخص کی ضرورت ہوئی۔ اس نے لوگوں سے کہا مجھے کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو خصائل حسنہ میں پورا ہو۔لوگوں نے ابو بردہ کا نام لیا۔ یزید انہیں بلا کر ان سے ملا۔تجربہ میں انہیں بہترین شخص پایا۔ان کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔انہیں پرکھنے کے بعد ان سے کہا میں تم کو فلاں فلاں عہدہ پر مامور کرتا ہوں۔انہوں نے اس کے قبول کرنے سے معذرت چاہی۔یزید نہ مانا،اس وقت انہوں نے معذرت میں یہ مذہبی دلیل پیش کی کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ جس شخص نے کوئی ایسا عہدہ قبول کرلیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہے کہ وہ اس کا اہل نہیں ہے تو اس کو چاہئے کہ دوزخ کو اپنا مستقر بنانے کے لئے تیار رہے [1]۔

وفات : ۱۰۴ھ میں وفات پائی [2]۔

(۸۸) ابو بکرؒ بن عبد الرحمٰنؒ

نام ونسب : محمد نام،ابو بکر کنیت۔ان کی کنیت نے اتنی شہرت حاصل کی کہ نام کی جگہ لے لی۔چنانچہ بعضوں کے نزدیک ان کا نام ہی ابو بکر ہے۔نسب نامہ یہ ہے : ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام بن مغیرہ بن عبد اللہ بن مخزوم مخزومی۔ماں کا نام فاختہ تھا۔نانہالی شجرہ یہ ہے:فاختہ بنت عتبہ بن سہیل بن عمرو بن عبد شمس بن عبدود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوئی [3]۔

ولادت : ابو بکر،حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے [4]۔

فضل وکمال :

حضرت ابو بکر مدینۃ الرسول میں پیدا ہوئے تھے جو علماء کا مخزن تھا۔ان میں تحصیل علم کا بڑا ذوق وشوق تھا اس لئے بڑی محنت سے تحصیل علم کی اور مدینہ کے نامور علماء میں شمار ہوا۔علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : " کان ثقة فقیھا کثیر الحدیث عالما عاقلا عالیا سخیا " ۔ابن خراش انہیں ائمہ علماء میں شمار کرتے تھے [5]۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول۔ص ۸۳		۲؎ ابن سعد۔جلد ۵۔ص ۱۸۷		۳؎ ابن سعد۔جلد ۹۔ص ۱۵۳
۴؎ ایضاً		۵؎ تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ص ۱۹۵

حدیث : حدیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں : **کان ثقة حجة فقیها اماما کثیر الروایة**۔ صحابہ میں اپنے والد عبدالرحمٰن، ابوہریرہؓ، عمار بن یاسرؓ، ابومسعودؓ بدری، عبدالرحمٰن بن مطیعؓ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام سلمہؓ سے روایتیں لی ہیں[1]۔

ان سے روایت کرنے والے میں ان کے لڑکے عبدالملک عمرو، عبداللہ اور سلمہ بھتیجے قاسم بن محمد اور عام لوگوں میں امام زہری، عمر بن عبدالعزیز اور حکم بن عتبہ وغیرہ لائق ذکر ہیں[2]۔

فقہ : فقہ میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا وہ مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک تھے۔ ابوالزناد کہتے تھے کہ مدینہ کے ان فقہاء و علماء جس کی رائے پر مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا۔ چھ آدمی تھے ان میں ایک ابوبکر عبدالرحمٰن تھے[3]۔

زہد و عبادت :

زہد و تقویٰ کا رنگ نہایت گہرا تھا۔ مدینہ کے عابد ترین بزرگوں میں تھے۔ زہد و عبادت اور نمازوں کی کثرت کی وجہ سے "راہب قریش" ان کو لقب ہو گیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ صالح، عبادت گزار اور خدا پرست تھے[4]۔ کئی کئی دن کا مسلسل روزہ رکھتے تھے ان کے بھائی عمرو بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ وہ روزے پر روزے رکھتے تھے اور درمیان میں افطار نہ کرتے تھے[5]۔

امانت : امانت ان کا خاص وصف تھا۔ انہیں امانت میں اس قدر اہتمام تھا کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس کوئی شے امانت رکھتا ہے اور اس کا کچھ حصہ ضائع ہو جاتا تو خواہ امانت رکھنے والا معاف ہی کیوں نہ کر دیتا مگر پوری امانت واپس کرتے[6]۔

حضرت عثمان بن محمد کا بیان ہے کہ عروہ نے ابوبکر کے پاس کچھ مال امانت رکھوا دیا وہ مال یا اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔ عروہ نے کہلا بھیجا کہ تم پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے تمہاری حیثیت تو امین کی تھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ مجھے معلوم ہے کہ مجھ پر تاوان نہیں ہے لیکن میں یہ پسند نہیں کرتا کہ قریش میں تمہاری زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ میری امانت ضائع ہو گئی[7]۔ غرض عروہ کے کہنے کے باوجود نہ مانے اور اپنی املاک بیچ کر پوری امانت واپس کی[8]۔

فیاضی : نہایت فیاض اور سیر چشم تھے[9]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۵ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ص ۳۰ [3] اعلام الموقعین۔ جلد اول۔ ص ۲۲
[4] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ص ۳۱ [5] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۲ [6] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۶
[7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ص ۳۱ [8] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۳ [9] ایضاً

بنی اُمیہ میں منزلت :

اُموی خلفاء ان کی اتنی منزلت کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے اہلِ مدینہ کو امویوں کی جانب سے امن حاصل ہو گیا تھا۔ عبدالملک خصوصیت کے ساتھ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بنی اُمیہ کے ساتھ اہل مدینہ کی روش کی بناء پر میں ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہوں لیکن ابو بکر بن عبدالرحمٰن کا خیال آجاتا ہے تو شرم آنے لگتی ہے اور ارادہ ترک کر دیتا ہوں۔ عبدالملک اپنے بعد ہونے والے خلفاء ولید اور سلیمان کو بھی ابو بکر کی تعظیم و تکریم کی وصیت کرتا گیا تھا [1]۔

وفات : ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر غسل خانہ گئے وہاں گر پڑے، فوراً زبان سے نکلا، "میں نے آج شروع دن میں خدا کی قسم کوئی نئی بات نہیں کی تھی"۔ اسی دن غروبِ آفتاب سے پہلے انتقال کر گئے۔ یہ ۹۴ھ کا واقعہ ہے [2]۔

(۸۹) ابو رجاء عطاردیؒ

نام و نسب : ابو رجاء اور ان کے والد کے نام کے بارے مختلف بیانات ہیں۔ ایک بیان یہ ہے کہ ان کا عمران اور والد کا نام ملحان ہے، دوسرا یہ ہے کہ والد کا نام تیم ہے، تیسرا یہ ہے کہ ان کا نام عطارد اور والد کا نام پرویز ہے۔ ان تینوں بیانات میں اکثر اربابِ سیر کے نزدیک پہلا زیادہ صحیح ہے۔ حافظ ذہبی اور ابن حجر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابو رجاء کنیت ہے اور اسی سے وہ زیادہ مشہور ہیں۔ نسبی تعلق قبیلہ تیم سے تھا [3]۔

اسلام : ابو رجاء نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا تھا۔ لیکن اس وقت بالکل نوخیز تھے۔ عہدِ نبوی میں عرصہ تک ان کا قبیلہ اسلام سے بھاگتا رہا، لیکن پھر آخر میں اسے اسلام کا طوقِ غلامی گردن میں ڈالنا پڑا۔ ان واقعات کو خود رجاء کی زبان سے سنو۔

ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں میں اپنے چشمے "سند" پر اُونٹوں کی چرائی پر تھا کہ اطلاع ملی کہ عرب میں ایک شخص مبعوث ہوا ہے، جو لوگ اس کی اطاعت نہیں کرتے وہ ان کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ خبر سن کر ہم لوا اپنے اہل و عیال کو لے کر بنی سعد کا میدان عبور کر کے بھاگ گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس شخص سے بچنے کی سبیل " لا الٰہ الا اللہ محمد اعبدہ ورسولہ " کی شہادت ہے۔ جو شخص اس کا اقرار کر لیتا ہے اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۵۴ [2] ایضاً [3] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۱

کر کے ہم لوگ لوٹ آئے اور اسلام میں داخل ہو گئے[1]۔ یہ فتح مکہ کا زمانہ تھا[2]۔ اگرچہ ابورجاء عہدِ رسالت ﷺ میں مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن آنحضرت ﷺ کے دیدار اور لقاء کے شرف سے محروم رہے۔

فضل و کمال :

ابورجاء کے زمانہ میں بہت سے اصحاب موجود تھے۔ اس لئے انہیں حصول کمال کا پورا موقع ملا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں : من کبار علماء التابعین ...... کان ثقۃ ثبتاً عالماً عاملاً[3]۔

قرآن : قرآن کے ممتاز عالم تھے۔ اس کی تعلیم انہوں نے ابوموسیٰ اشعریؓ اور مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حاصل کی تھی[4]۔ ان کی تعلیم نے انہیں قرآن کا عالم بنا دیا[5]۔

حدیث : حدیث میں حضرت عمرؓ، عمران بن حسینؓ، ابن عباسؓ، سمرہ بن جندبؓ اور اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ سے ان کی روایات ملتی ہیں۔ ان سے روایات کرنے والوں میں ایوب، جریر بن حازم عوف الاعرابی، عمران القصیر، مہدی بن میمون، ابوالاشہب، حماد بن نجیح، سعید بن ابی ربیعہ، ابوعثمان اور حسن بن ذکوان وغیرہ لائق ذکر ہیں[6]۔

زہد و عبادت :

زہد و عبادت میں بھی ممتاز تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے عبادت گزار، نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والے شیخ تھے[7]۔ رمضان میں تراویح میں تین قرآن ختم کرتے تھے[8]۔

امامت : اپنے علمی مذہبی کمالات کی وجہ سے اپنے قبیلہ کے امام تھے اور چالیس سال تک یہ خدمت انجام دی[9]۔

وفات : ان کے زمانۂ وفات کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں بعضوں کے نزدیک ۱۰۵ھ میں، بعضوں کے نزدیک ۱۰۷ھ میں، بعضوں کے نزدیک ۱۰۸ھ میں اور بعضوں کے نزدیک ۱۰۹ھ میں وفات پائی[10]۔ اس کم و بیش ایک سو بیس سال کی عمر تھی۔ ان کے وفات پر فرزدق شاعر نے یہ شعر کہا ؎

الم تر ان الناس مات کبیر

وقد عاش قبل البحث بعث محمد

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۰۱ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۷ ۳۔ ایضاً۔ ۴۔ ایضاً
۵۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ص ۱۰۱ ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۸۔ ص ۱۴۰ ۷۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۷
۸۔ ایضاً ۹۔ ایضاً۔ ص ۱۰۱ ۱۰۔ یہ تمام اقوال ابن سعد، الحفاظ اور تہذیب میں ہیں۔ دیکھو کتب تذکرہ حوالہ بالا

(۹۰) ابوالزنادؒ

نام ونسب : عبداللہ نام ہے۔ والد کا نام ذکوان تھا۔ ابوعبدالرحمٰن کنیت۔ ابوالزناد لقب۔ لقب ہی سے وہ مشہور ہیں۔ نسباً ہمدانی تھے۔ ابوالزناد قریش کی غلامی میں تھے لیکن غلامی کی نسبت میں اختلاف ہے۔ بعض رملہ بنت ربیعہ کا اور حضرت عثمانؓ کی اولاد کا نام بتاتے ہیں۔

فضل وکمال :

اگرچہ ابوالزناد غلام تھے لیکن اقلیم علم کے تاجدار تھے۔ اکابر تابعین کے بعد جو بزرگوار علم کے مسند نشین ہوئے ان میں ایک نام ابوالزناد کا بھی ہے۔ ان کو جملہ علوم میں یکساں دستگاہ حاصل تھی۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی ثناء صفت، ان کے وفور علم، ان کے فضل اور مختلف علوم میں ان کی مہارت، توثیق اور ان کی جلالت پر سب کا اتفاق ہے[1]۔

حدیث : حدیث میں انہوں نے انس بن مالکؓ، عائشہ بنت سعد، ابوامامہ بن سہل بن حنیف، سعید بن مسیبؒ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ، آبان بن عثمانؓ، خارجہ بنت زید بن ثابتؓ، عبید بن حسینؒ، عروہ بن زبیرؒ، علی بن حسینؒ، عمرو بن عثمانؓ، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ اور محمد بن حمزہ اسلمی وغیرہ سے فیض اٹھایا تھا[2]۔

ان بزرگوں کے فیض نے ان کو حدیث کا بڑا جلیل القدر حافظ بنا دیا تھا۔ امام حدیث سفیان ثوری ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے تھے[3]۔ علامہ ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں[4]۔

تلامذہ : ان کے لڑکے عبدالرحمٰن اور القاسم، صالح بن کیسان، ابی ملکیہ، اعمش عبیداللہ ابن عمرو بن عجلان، ہشام بن عروہ، شعیب بن ابی حمزہ، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ، سعید بن ابی ہلال، زائدہ بن قدامہ اور سفیان وغیرہ ان کے زمرۂ تلامذہ میں تھے[5]۔

فقہ : فقہ میں بھی امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ان کا شمار فقہائے مدینہ میں تھا۔ فقہ میں وہ مشہور فقیہ تابعی ربیعہ رائی کے مقابلے کے سمجھے جاتے تھے۔ امام ابوحنیفہ کو ربیعہ سے مرجع سمجھتے تھے۔ ربیعہ سے پہلے انہی کی ذات مرجوعہ تھی۔ لیکن ربیعہ کی مسند بچھنے کے بعد ان کا حلقۂ درس خالی ہوگیا اور ان کے تمام تلامذہ ربیعہ کی طرف رجوع ہوگئے[6]۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۳ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۳۔ ۲۰۴
[3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ۱۲۱ [4] ایضاً [5] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۳ بحوالہ ابن سعد
[6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۰۳

جامعیت اور حلقۂ درس کی وسعت :

ابوالزناد کی جامعیت کی مناسبت سے ان کا حلقۂ درس بھی نہایت وسیع تھا۔ اس میں مختلف علوم وفنون کے سینکڑوں طلبہ کا ہجوم رہتا ہے۔ عبدربہ بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ابوالزناد کا اس شان سے مسجد نبوی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ ان کے ساتھ طلبہ کا بادشاہوں جیسا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں فرائض کے سائلین بھی ہوتے تھے اور احسان کے بھی۔ شعر کے بھی اور معضلات کے بھی [۱]۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ میں نے ابوالزناد کے پیچھے بہ یک وقت فقہ، شعروشاعری اور مختلف علوم کے تین تین سو طالب علم دیکھے ہیں [۲]۔ مذہبی علوم کے علاوہ زبان ادب وانشا اور فصاحت و بلاغت میں بھی دستگاہ تھی۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : **کان فصیحا بصیرا بالعربیہ** [۳]۔

غیر مذہبی علوم کی جانچ پڑتال ان کے سپرد تھی۔ ایک مرتبہ وہ اسی سلسلہ میں شام گئے تھے [۴]۔

عقل وفرزانگی :

اس علم کے ساتھ انہوں نے دنیاوی عقل وفرزانگی سے بھی وافر حصہ پایا تھا [۵]۔

وفات : باختلاف روایت رمضان ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں دفعۃً انتقال ہوا [۶]۔ وفات کے وقت چھیاسٹھ سال کی عمر تھی [۷]۔

(۹۱) ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ

نام ونسب : عبداللہ نام ہے۔ ابوسلمہ کنیت۔ کنیت نے اتنی شہرت حاصل کی کہ نام کی جگہ لے لی۔ چنانچہ بعضوں کے نزدیک ان کا نام ہی ابوسلمہ تھا۔ مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے فرزند ہیں۔ ماں کا نام تماضر تھا۔ ننھیالی شجرہ یہ ہے : تماضر بنت صبغ بن عمرو بن ثعلبہ بن حارث بن حصین بن ضمضم بن عدی بن جناب بن ہبل کلبی۔

فضل وکمال :

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ وہ عشرہ مبشرہ میں تھے۔ ابوسلمہ نے انہی کی آغوش میں علم وعمل میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے فیض تربیت سے وہ یگانہ عصر بن گئے تھے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۱　۲۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۴　۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۰
۴۔ ایضا　۵۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۴　۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۱
۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۴

بعض علماء ان کو مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار کرتے ہیں لیکن یہ رائے مختلف فیہ ہے مگر اس سلسلہ میں ان کا نام لیا جانا ہی ان کے کمال کی سب سے بڑی سند ہے۔ ان کی علمی جلالت اور امامت پر علماء کا اتفاق ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ابوسلمہ کی امامت ان کے مرتبہ کی بلندی اور ان کی رفیع المنزلی پر سب کا اتفاق ہے[۱]۔

حدیث : حدیث میں انہوں نے اپنے والد حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے علاوہ اکابر صحابہ میں حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابوقتادہؓ، ابودرداءؓ، اسامہ بن زیدؓ، حسان بن ثابت، رافع بن خدیجؓ، ثوبانؓ، نافع بن حارثؓ، عبداللہ بن سلامؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، انس بن مالکؓ، جابرؓ، معاویہؓ، ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور ام سلمہؓ وغیرہ اور بہت سے اکابر تابعین سے استفادہ کیا تھا[۲]۔

ان بزرگوں کے فیض نے ان کو امام حدیث بنا دیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے آئمہ تابعین میں اکثر العلم، ثقہ، اور عالم تھے[۳]۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں : **کان ثقة فقیها کثیر الحدیث**۔

تمام اکابر علماء ان کی کثرت حفظ کے معترف تھے[۴]۔ زہری کا بیان ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ بن قارظ مجھ سے کہتے تھے کہ تمہاری قوم میں دو آدمیوں سے بڑا عالم حدیث میں نہیں دیکھا۔ ایک عروہ بن زبیر، دوسرے ابوسلمہ بن عبدالرحمن[۵]۔ امام زہری کہتے تھے کہ میں نے چار آدمیوں کو علم کا دریا پایا، ان چار میں ایک ابوسلمہ کا نام ہے[۶]۔

تلامذہ : امام شعبی، عبدالرحمن الاعرج، عراک بن مالک، عمرو بن دینار، ابوحازم ابوسلمہ بن دینار، زہری یحییٰ بن سعید انصاری اور یحییٰ بن ابی کثیر وغیرہ آپ کے تلامذہ میں ہیں[۷]۔

فقہ : فقہ میں ابوسعید سلمہ کا پایا اتنا بلند تھا کا علماء ان کو مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار کرتے ہیں۔ علامہ ابن سعد ان کو فقیہ لکھتے ہیں[۸]۔ فقہ میں انہوں نے فقیہ الامت عبداللہ بن عباسؓ سے استفادہ کیا تھا[۹]۔ بعض اوقات فقہی مسائل میں اُستاد کو ان کی رائے پلٹا دیتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابو سلمہ ابن عباسؓ سے تفقہ حاصل کرتے تھے اور مسائل پر ان سے بحث و مناظرہ کرکے ان کو ان کی رائے سے پلٹا دیتے تھے[۱۰]۔

۱۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۴۱　۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۲۔ ۱۱۵　۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۴
۴۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۱۶　۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۱۶　۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۴
۷۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق ۲۔ ص ۲۴۱　۸۔ ایضاً۔ ص ۲۴۰　۹۔ ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۱۶
تذکرۃ الاسماء۔ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۴

عہدہ قضا: امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں سعید بن العاص حاکم مدینہ نے ان کو مدینۃ الرسول کے عہدۂ قضا پر ممتاز کیا، لیکن پھر بعد کے تغیرات میں وہ اس عہدہ پر نہ رہ سکے اور سعید بن العاص کی معزولی کے بعد اس کے جانشین مروان نے ابوسلمہ کو ہٹا دیا[1]۔

وفات: ولید بن عبدالملک کے عہدِ خلافت ۹۴ھ میں وفات پائی۔ ایک روایت یہ ہے، ۱۰۴ھ میں انتقال کے وقت بہتر سال عمر تھی[2]۔

حلیہ: ابوسلمہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ عبداللہ بن ابی یعقوب کا بیان ہے کہ ابوسلمہؓ بڑے صبیح تھے۔ ان کا چہرہ تابانی میں ہرقلی دینار معلوم ہوتا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سپید ہو گئے تھے۔ ان میں کبھی حنا اور کبھی وسمہ کا خضاب لگاتے تھے[3]۔

(۹۲) ابوالعالیہ ریاحیؒ

نام ونسب: رفیع نام ہے۔ ابوالعالیہ کنیت۔ کنیت ہی سے وہ زیادہ مشہور ہیں۔ والدہ کا نام مہران تھا۔ قبیلہ بنی ریاح کی ایک عورت کے غلام تھے۔ اس نسبت سے ریاحی کہلاتے ہیں۔

اسلام: انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا۔ لیکن عہد نبوی میں شرف اسلام سے محروم رہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے دو سال بعد اسلام لائے[4]۔

آزادی: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد عرصہ تک غلامی میں رہے۔ پھر ان کی مالکہ نے انہیں آزاد کر دیا[5]۔

ان کی آزادی کا واقعہ جس کے متعلق خود ان کا بیان یہ ہے کہ میں ایک عورت کا غلام تھا۔ جب اس نے مجھے آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے چچیرے بھائیوں نے روکا، اگر اس کو آزاد کر دو گی تو وہ کوفہ جا کر بالکل مفقودُ الخبر ہو جائے گا۔ لیکن وہ آزاد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس لئے ایک جمعہ کو میرے پاس آئی اور مجھ سے پوچھ کر جامع مسجد کی طرف چلی۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ مسجد پہنچنے کے بعد امام نے ہم کو منبر پر کھڑا کر دیا۔

عورت نے میرا ہاتھ پکڑ کر ان الفاظ میں میری آزادی کا اعلان کیا، "خدایا میں تیرے پاس اس کو (آخرت کے لئے) جمع کرتی ہوں۔ مسجد والو! گواہ رہنا، یہ غلام خدا کے لئے آزاد ہے۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۵۔ ص ۱۱۵ [2] ایضاً۔ ص ۱۱۶ [3] ایضاً۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶ [4] ایضاً

[5] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۲۵

آئندہ حق معرفت کے علاوہ اس پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی، اس کے بعد پھر وہ نہیں دکھائی دی[1]۔

فضل و کمال :

علمی اعتبار سے ممتاز تابعین میں تھے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے۔ ابو القاسم طبری کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے[2]۔

قرآن : ان کا خاص موضوع کتاب اللہ تھا۔ قرآن کی تعلیم انہوں نے مشہور عالم قرآن حضرت ابی بن کعبؓ سے حاصل کی تھی۔ اس کا آغاز غلامی ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔

ان کا خود بیان ہے کہ میں غلام تھا۔ اپنے اہل کی خدمت کرتا تھا اور قرآن اور عربی کی کتاب سیکھتا تھا[3]۔ لیکن باضابطہ تعلیم قبول اسلام کے ساتھ آٹھ سال کے بعد جب کہ وہ بڑی عمر پہنچ گئے تھے، شروع کی تھی[4]۔ اور اس شوق اور محنت سے حاصل کی کہ جماعت تابعین میں قرآن کے سب سے بڑے عالم بن گئے۔

حضرت ابو بکر ابن داؤد کا بیان ہے کہ صحابہ میں ابو العالیہ ریاحی سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا[5]۔ ابن عماد حنبلی ان کو مفسر لکھتے ہیں[6]۔

حدیث : حدیث میں علامہ ابن سعد انہیں کثیر الحدیث لکھتے ہیں[7]۔ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، ابو ایوب انصاریؓ، ابی بن کعبؓ، ثوبانؓ، حذیفہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، رافع بن خدیجؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، ابو بردہؓ، انس بن مالکؓ، ابو ذر غفاریؓ جیسے اکابر صحابہ سے انہوں نے حدیث میں فیض اٹھایا تھا[8]۔

اخذ حدیث میں احتیاط :

حدیث لینے میں وہ بڑے محتاط تھے۔ جب تک اصل راوی کی زبان سے نہ سن لیتے تھے۔ اس وقت تک کسی دوسرے کے بیان پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ ہم لوگ بصرہ میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی روایات سنتے تھے۔ مگر اس وقت تک ان پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ جب تک مدینہ جا کر خود ان کی زبان سے نہ سن لیتے تھے[9]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۱ آزادی کا واقعہ دو روایتوں میں ہے۔ ہم نے دونوں کا خلاصہ لے لیا ہے۔
[2] تہذیب ۱۱۱-۱۱۔ جلد اول۔ ص ۲۵۱ [3] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۲ [4] ایضاً۔ ۸۱
[5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۳ [6] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲ [7] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۵
[8] تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۱۸۳ [9] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۲

تلامذہ : ان سے فیض اٹھانے والوں میں خالد الحذاء ، داؤد بن ابی ہند، محمد بن سیرین، یوسف بن عبداللہ ، ربیع بن انس ، بکر المزنی ، ثابت البنانی ، حمید بن ہلال ، قتادہ اور منصور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں[۱]۔

صحابہ میں منزلت :

اگر چہ ابو العالیہ غلام رہ چکے تھے ، لیکن ان کے علمی کمالات کی بنا پر بڑے بڑے صحابہ ان کی عزت کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اتنی عزت کرتے تھے کہ ابو العالیہ جب ان کے پاس جاتے تو ابن عباس ؓ ان کو اونچے مقام پر بٹھاتے اور معززین قریش ان کے نیچے ہوتے ، اور اس اعزاز سے بٹھانے کے بعد فرماتے ۔ علم اسی طرح شریف کے شرف میں اضافہ کرتا ہے۔ اور ملوک کو تخت پر بٹھاتا ہے[۲]۔

ایک مرتبہ وہ ابن عباس ؓ کی ولایت بصرہ کے زمانہ میں ان کے پاس گئے۔ ابن عباس ؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ یہ عزت افزائی دیکھ کر ایک تیمی سے نہ رہا گیا وہ بول اُٹھا یہ غلام ہیں[۳]۔

عبادت : ابو العالیہ میں اس علم کے ساتھ اسی درجہ کا عمل بھی تھا ، بڑے خوش اوقات اور عبادت گزار تھے۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن کا خاص ذوق تھا۔ ایک زمانہ میں وہ رات بھر نمازیں پڑھتے تھے اور ایک شب میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے لیکن اس عبادت شاقہ پر مداومت نہ کر سکے۔

ان کا بیان ہے کہ ہم چند غلام تھے، ان میں بعض ٹیکس ادا کرتے اور بعض خدمت کرتے تھے۔ ہم سب رات بھر جاگ کر ایک شب میں پورا قرآن ختم کرتے ، لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا تو پھر دو راتوں میں ختم کرنے لگے۔ جب یہ بھی نہ نبھ سکا تو تین راتوں میں ختم کرنے لگے لیکن اتنا بھی نہ ہوسکا اور ایک دوسرے سے شکایت کرنے لگے۔ تو ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے ملے، انہوں نے کہا کہ ایک ہفتہ میں ختم کرلیا کرو، ان کی ہدایت کے بعد ہم لوگ نمازیں پڑھنے کے ساتھ سونے بھی لگے اس وقت وہ بار جاتا رہا[۵]۔

---

۱ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۲۸۴ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۲

۳ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۲ ۴ ایضاً۔ ص ۸۱

رہبانیت سے اجتناب :

لیکن اس عبادت وریاضت کے ساتھ رہبانیت سے اتنا احتراز تھا کہ راہبانہ لباس تک پسند نہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ ابوامیہ الکریم ان سے ملنے کے لئے آئے۔ابوامیہ کے بدن پر صوف کے کپڑے تھے۔ان کو دیکھ کر ابوالعالیہ نے کہا یہ راہبوں کا لباس وطریقہ ہے،مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے جاتے ہیں تو اچھے لباس میں جاتے ہیں[1]۔

عمل خیر کا اظہار نہایت برا سمجھتے تھے،اور ایسے شخص کو ریاکار سمجھتے تھے۔ابومخلد کا بیان ہے کہ ابوالعالیہ کہتے تھے کہ جب تم کسی شخص کو یہ کہتے سنو کہ میں خدا کے لئے دوستی اور خدا کے لئے دشمنی کرتا ہوں تو اس کی تقلید نہ کرو[2]۔

انفاق فی سبیل اللہ :

خدا کی راہ میں خرچ کرنے میں بڑے فیاض تھے۔انہوں نے اپنا کل مال یا اس کا بڑا حصہ خدا کی راہ میں امورِ خیر کے لئے وقف کر دیا تھا۔ابن سعد کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فاوصی ابا لعالیۃ بمالہ کلہ[3]۔دوسری روایت میں ہے کہ ابوالعالیہ نے کہا کہ میں نے سونے اور چاندی میں جو کچھ بھی چھوڑا ہے۔اس کا ایک تہائی خدا کی راہ کے لئے ہے،ایک تہائی اہل بیت رسول اللہ ﷺ کے لئے اور ایک تہائی غریب مسلمانوں کے لئے،البتہ اس میں سے میری بیوی کا حق تم لوگ دینا[4]۔

غلاموں کی آزادی :

غلاموں کو لوجہ اللہ آزاد کرتے تھے،ایک مرتبہ ایک غلام کو آزاد کیا،اس کی آزادی نامے پر یہ الفاظ تھے،ایک مسلمان نے ایک جوان غلام کو بطور سائبہ کے لوجہ اللہ آزاد کیا،نیک کام لینے کے علاوہ اس پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے[5]۔

زکوٰۃ وصدقات :

زکوٰۃ نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے،اور اس کو تقسیم کرنے کے لئے مدینہ پہنچتے تھے۔ابوخلدہ کا بیان ہے کہ ابوالعالیہ اپنے مال کی زکوٰۃ اس کے مصارف میں صرف کرنے کے لئے اہل بیت نبوی ﷺ کے پاس مدینہ بھیجتے تھے[6]۔

---

[1] ابن سعد۔جلد ۷۔ق اول۔ص ۸۳ [2] ایضاً [3] ایضاً۔ص ۸۳ [4] ایضاً [5] ایضاً۔ص ۸۲ [6] ایضاً۔۸۳

خانہ جنگی سے اجتناب :

ابوالعالیہ بڑے بہادر اور جنگ آزما تھے، لیکن ان کی بہادری مسلمانوں کے مقابلہ میں نہ صرف ہوتی تھی۔ ان کے زمانہ میں صفین وغیرہ کی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، جن سے بہت کم مسلمان بچ سکے۔ یہ بھی نبرد آزمائی کے شوق سے نکلے لیکن پھر میدانِ جنگ سے پلٹ آئے۔

ابوخلدہ کا بیان ہے کہ ابوالعالیہ کہتے تھے کہ علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ کے زمانہ میں مَیں جوان تھا۔ جنگ میرے لئے لذیذ کھانوں سے زیادہ مرغوب تھی۔ اس لئے میں بھی پوری تیاری کے ساتھ میدانِ جنگ میں پہنچا اور ایسی عظیم الشان فوجیں دیکھیں، جن کے سرے نظر نہ آتے تھے۔

ان میں سے جب ایک فریق تکبیر و تہلیل کرتا تھا، تو دوسرا بھی کرتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ میں کس فریق کو مومن سمجھوں اور کس کو کافر، اور کس کا ساتھ دوں۔ کسی نے مجھے مجبور تو کیا نہیں ہے یہ سوچنے کے بعد شام بھی نہ ہونے پائی تھی کہ لوٹ آیا[1]۔

مشتبہات سے اجتناب :

مشتبہ چیزوں سے اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان پیشہ وروں اور عہدہ داروں کے یہاں جن کی کمائی میں کچھ بھی مشتبہ مال کا احتمال ہوتا تھا پانی تک نہ پیتے تھے۔ چنانچہ صراف اور عشار (عشر وصول کرنے والے) کے یہاں پانی نہ پیتے تھے۔

ابوخلدہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں ابوالعالیہ کے پاس گیا، وہ کھانا لائے۔ اس میں ترکاری بھی تھی۔ اس کے متعلق انہوں نے کہا یہ وہ ترکاری نہیں ہے۔ جس میں کسی شے کا احتمال ہو، یہ میرے بھائی انس بن مالکؓ نے اپنے باغ سے بھیجی ہے۔ میں نے کہا ترکاری میں کیا ہوتا ہے فرمایا وہ ہمیشہ گندے اور برے مقامات پر اُگتی ہے جہاں پیشاب اور نجس چھینٹے ہوتے ہیں[2]۔

بے تکلفی :

طبعاً نہایت سادہ مزاج اور بے تکلف تھے۔ اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام پسند نہ تھا۔ جہاں جاتے تھے صاحب خانہ سے پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ موجود ہے وہی لانا بازار وغیرہ سے کوئی شے نہ خریدنا[3]۔

وفات : بروایت صحیح ۹۳ھ میں وفات پائی[4]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۸۲　۲ ایضاً　۳ ایضاً　۴ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۰۲

(۹۴) ابو عبدالرحمٰن السلمی رحؒ

نام ونسب: عبداللہ نام ہے۔ ابو عبدالرحمٰن کنیت۔ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ والد کا نام حبیب تھا، نسباً سلمی تھے۔

فضل وکمال: علمی اعتبار سے کوفہ کے قراء اور علماء میں ان کا شمار تھا[1]۔

قرآن: ان کا خاص موضوع کتاب اللہ تھا۔ اس کے قاری بھی تھے۔ اور عالم بھی، قرآت کا فن حضرت علیؓ اور اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ تفسیر القرآن کی تعلیم ان علماء سے حاصل کی تھی، جنہوں نے اس محنت سے قرآن پڑھا تھا کہ دس آیات پڑھنے کے بعد جب تک اس کے متعلق تمام باتیں نہ معلوم کر لیتے آگے نہ بڑھتے تھے[2]۔

قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اس پر عمل بھی کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے ہم لوگ قرآن کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی سیکھتے ہیں، ہمارے بعد ایسے لوگ قرآن کے وارث ہوں گے جو قرآن کو پانی کی طرح پئیں گے، اور ان کے نرخرہ سے نیچے نہ اُترے گا[3]۔

حافظ ذہبی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ، علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی[4]۔

درسِ قرآن:

قرآن کا درس بھی دیتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی معاوضہ لینا پسند نہ کرتے تھے۔ عمرو بن حریث کے لڑکے کو انہوں نے قرآن کی تعلیم دی تھی۔ ان کے پاس سواری کا اونٹ اور اس کی جھول بھیجی۔ انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ہم لوگ کتاب اللہ پر کوئی اُجرت نہیں لیتے[5]۔ کامل چالیس سال تک مسجد میں قرآن کا درس دیا تھا[6]۔

حدیث: حدیث کے بھی حافظ تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں، کان ثقۃ کثیر الحدیث۔ صحابہ میں انہوں نے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، خالد بن ولیدؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابو دردائؓ، ابو ہریرہؓ سے روایتیں کی ہیں۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۶ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰ ۳؎ ایضاً۔ ص ۱۱۹

۴؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۰ ۵؎ ابن سعد۔ جلد ۶ ص [illegible] ۶؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۴

ان سے استفادہ کرنے والوں میں ابراہیم نخعی، علقمہ بن مرثد، سعد بن عبیدہ، اسحٰق سبیعی، سعد بن جبیر، ابوالحصین اسدی، عطاء بن ثابت وغیرہ قابل ذکر ہیں[1]۔

وفات : عبدالملک کے عہد خلافت ۷۳ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ مسجد ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ مرض الموت میں بھی مسجد ہی میں تھے[2]۔ عطاء بن سائب نے جا کر عرض کیا خدا آپ پر رحم کرے، آپ اپنے بستر پر منتقل ہو جاتے تو اچھا تھا[3]۔

فرمایا، ''میں نے ایک شخص سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ بندہ جب تک مسجد میں نماز کے انتظار میں رہتا ہے۔ وہ گویا نماز ہی کی حالت میں رہتا ہے اور ملائکہ اس کے لئے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مسجد ہی میں مروں''[4]۔

(۹۴) ابو عثمان نہدیؒ

نام ونسب : عبدالرحمٰن نام۔ ابو عثمان کنیت، کنیت ہی سے مشہور ہیں، نسب نامہ یہ ہے: عبدالرحمٰن ابن مل بن عمرو بن عدی بن وہب بن ربیعہ بن سعد بن خزیمہ بن کعب بن رفاعہ بن مالک بن نہد ابن زید بن لیث بن سود بن اسلم بن الحاف بن قضاعہ۔

اسلام : ابو عثمان نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا تھا[5]۔ زمانہ جاہلیت میں عام عربوں کی طرح بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ عہد رسالت میں اسلام قبول کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی زیارت سے محروم رہے۔ لیکن صدقات برابر آنحضرت ﷺ کے تحصیلداروں کو ادا کرتے تھے[6]۔

عہد فاروقی : عہد صدیقی میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدینہ آئے اور عراق کی اکثر مہموں قادسیہ، جلولا، تستر، نہاوند، یرموک وغیرہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی[8]۔

فضل وکمال : علمی اعتبار سے کوئی ممتاز شخصیت نہ رکھتے تھے لیکن سلمان فارسیؓ کی صحبت میں بارہ سال رہے تھے[9]۔ ان کے فیض صحبت سے اتنا علم حاصل ہو گیا تھا کہ علماء میں شمار ہوتا تھا[10]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۴ ۲؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۱ ۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۱۸۴
۴؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۱ ۵؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۷۷ ۶؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۰۴
۷؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۷۸ ۸؎ تاریخ خطیب۔ جلد ۱۰۔ ۲۰۴ ۹؎ شذرات الذہب۔ جلد۔ اول۔ ص ۱۱۸
۱۰؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۶

حدیث : حدیث میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، سعدؓ، سعیدؓ، طلحہؓ، سلمان فارسیؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابوذرؓ، ابی بن کعب، اسامہ بن زیدؓ، بلالؓ، حنظلہ کاتبؓ، ابوسعید خدریؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے اکابر صحابہ سے ان کی روایات ملتی ہیں[۱]۔

ثابت البنانی، قتادہؒ، عاصم الاحول، سلیمان التیمی، خالد الحذاء، ایوب سختیانی اور حمید الطویل جیسے ممتاز علماء ان کے فیض یافتہ تھے[۲]۔

عبادت وریاضت :

حضرت ابوعثمان کا امتیازی وصف ان کی عبادت وریاضت اور ان کا زہد وتقویٰ تھا۔ اس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عالم قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ نمازیں اتنی پڑھتے تھے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے[۳]۔

ان کا دامن کسی معصیت سے آلودہ نہیں ہوا۔ ان کے تلمیذ سلیمان التیمی کا بیان ہے کہ جہاں تک میرا خیال ہے ان سے کبھی ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا[۴]۔

ذکرِ خدا : فرماتے تھے میں جانتا ہوں کہ خدا مجھے کس وقت یاد کرتا ہے کسی نے پوچھا کیسے، فرمایا، اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے: "اذکرونی اذکرکم" اس لئے جب میں اس کو یاد کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے یاد کرتا ہوں۔ اور جب ہم اس سے دعا کرتے ہیں تو اس کی قسم وہ قبول کرتا ہے پھر فرماتا ہے[۵]۔

اہلِ بیت نبوی سے عقیدت :

اہل بیت کرام سے اتنی عقیدت تھی کہ کوفہ وطن تھا۔ لیکن جب حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو کوفہ چھوڑ کر بصرہ کی سکونت اختیار کر لی اور فرمایا میں ایسے شہر میں نہیں رہ سکتا جس میں رسول اللہ ﷺ کا نواسہ شہید کیا گیا ہو[۶]۔

وفات : سنہ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بروایت صحیح ۱۰۰ھ یا اس کے لگ بھگ انتقال فرمایا، اس وقت ایک سو تیس سال کی عمر تھی[۷]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۷۸　[۲] ایضاً　[۳] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۶　[۴] ایضاً
[۵] ابن سعد۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۶۹　[۶] ایضاً ص ۷۰　[۷] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۰۵

(۹۵) ابو قلابہ جرمیؒ

نام ونسب : عبداللہ نام ہے۔ ابوقلابہ کنیت۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے :
عبداللہ بن زید بن عمر بن نابل بن مالک۔ بن عبید بن علقمہ بن سعد جرمی بصری۔

فضل وکمال :

علمی اعتبار سے بصرہ کے ممتاز تابعین میں تھے۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں ان کو علمائے اعلام میں لکھتے ہیں[۱]۔ ابن عماد حنبلی امام اور علم وعمل میں راس العلماء لکھتے ہیں[۲]۔

حدیث : حدیث کا ان کو خاص ذوق تھا۔ اور اس کی بڑی جستجو رہتی تھی۔ ایک ایک حدیث کے لئے کئی کئی دن تک ایک مقام پر ٹھہرے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک حدیث کی تحقیق کے لئے تین دن تک مدینہ میں مقیم رہے۔ اس کے علاوہ ان کا وہاں اور کوئی کام نہ تھا[۳]۔ اس ذوق وجستجو نے ان کو ممتاز حافظ حدیث بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں[۴]۔

صحابہ میں ثابت بن ضحاکؓ، سمرہ بن جندبؓ، عمرو بن سلمہ جرمی مالک بن حویرث، انس بن مالک انصاریؓ، انس بن مالک کعبیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، معاویہؓ، ابوہریرہؓ، نعمان بن بشیرؓ، ابو ثعلبہ خشنیؓ وغیرہ سے روایات ملتی ہیں[۵]۔

تلامذہ : ان سے روایت کرنے والوں میں ایوب، خالد الحذاء، ابو رجاء یحییٰ بن ابی کثیر اشعث ابن عبدالرحمٰن جرمی وغیرہ لائق ذکر ہیں[۶]۔

اعتدال فی الروایت :

ان سے سماع حدیث کے بڑے بڑے علماء شائق رہتے تھے۔ مگر یہ احتیاط کی وجہ سے بہت کم بیان کرتے تھے۔ ابو خالد کا بیان ہے کہ ہم لوگ حدیثیں سننے کے لئے ابو قلابہ کے پاس جاتے تھے۔ وہ تین حدیثیں سنانے کے بعد کہتے، بس اب سنا چکا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسے بزرگ ان سے فرمائش کر کے حدیث سنتے تھے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۲ وتہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۲۴ ۲۔ شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۱۲۶
۳۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۴ ۴۔ ایضاً ۵۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۲۵ ۶۔ ایضاً

عمر بن میمون کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابو قلابہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس گئے۔ انہوں نے حدیثیں سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے جواب دیا، امیر المومنین میں زیادہ حدیثیں بیان کرنے اور بالکل سکوت اختیار کرنے دونوں کو برا سمجھتا ہوں[1]۔

فقہ : میں ان کا پایہ بلند تھا۔ ایوب کا بیان ہے کہ خدا کی قسم ابو قلابہ فقہائے ذوی الالباب میں تھے[2]۔

قضاء کا ملکہ : اس فقہی کمال کی وجہ سے انہیں قضاء کا خاص ملکہ تھا۔ ایوب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں ابو قلابہ سے زیادہ فیصلہ کرنے کی استعداد رکھنے والا نہیں دیکھا۔ مسلم بن یسار کہتے تھے کہ اگر ابو قلابہ عجم میں ہوتے تو قاضی القضاء ہوتے[3]۔

عہدہ قضاء سے انکار :

لیکن اس استعداد کے باوجود عہدۂ قضاء سے بہت گھبراتے تھے۔ ایوب کہتے تھے کہ میں نے ان کو قضاء کا جتنا بڑا عالم پایا، اتنا ہی سختی سے اس سے بھاگنے والا اور اس کو برا جاننے والا پایا۔

وہ عہدۂ قضا کے لئے بلائے گئے۔ ان کو اس سے اتنی نفرت تھی کہ اس کے خوف سے شام بھاگ گئے۔ ایک عرصہ کے بعد جب واپس آئے تو میں نے ان سے کہا، اگر آپ قضاء کا عہدہ قبول کر لئے ہوتے اور لوگوں میں انصاف کرتے تو اس میں آپ کو اجر ملتا۔ جواب دیا۔ ایوب مانا ایک شخص تیراک ہے لیکن اگر وہ سمندر میں پڑ جائے تو بتاؤ کتنا تیر سکتا ہے[4]۔

کتب خانہ :

اگرچہ اس زمانہ میں کتب خانوں کا رواج کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن ابو قلابہ کے ذوق علمی نے کتابوں کا متعدد ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ مرض الموت میں اس کے متعلق وصیت کرتے گئے تھے کہ ایوب سختیانی کو دے دی جائیں، اگر وہ زندہ نہ ہوں تو جلا دی جائیں[5]۔

بدعات سے نفرت :

عقائد و اعمال میں سلف صالحین کا نمونہ اور اس بارے میں اتنے سخت تھے کہ مبتدعین کے مقابلہ میں تلوار تک اٹھانا جائز کر دیا۔ ایسے لوگوں سے ملنا اور بحث اور مباحثہ کرنا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ لوگوں کو منع کرتے تھے کہ ہوا پرستوں (مبتدعین) کے پاس نہ بیٹھو اور نہ ان سے مجادلہ کرو۔ مجھے ڈر ہے

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۴ [2] ایضاً۔ ص ۱۳۳ [3] ایضاً [4] ایضاً
[5] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۵

کہ وہ تم کو اپنی گمراہی میں مبتلا اور جس شے کو تم اچھی طرح جانتے ہو اس میں مشکوک نہ کردیں۔ ان کا علاج وہ صرف تلوار سمجھتے تھے۔ ایوب کا بیان ہے کہ ابوقلابہ کہتے تھے کہ ہوس پرست (مبتدعین) گمراہ ہیں۔ میرے نزدیک ان کی جگہ یقینی دوزخ ہے۔ میں نے ان کا پورا تجربہ کیا ہے جو نئی رائے یا قول ظاہر کرتا ہے، وہ بغیر تلوار کے اس سے باز نہیں آتا۔ نفاق کی بہت سی قسمیں ہیں[۱]۔ (ان میں سے ایک یہ بھی ہے)۔ پھر یہ آیتیں :

۱۔　" منهم من عاهد الله "

انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا۔

۲۔　" ومنهم الذين ايوذون النبي "

اور انہی میں وہ لوگ ہیں جو نبی کو اذیت دیتے تھے۔

۳۔　" ومنهم من يلمزك في الصدقات "

اور انہی میں ہیں جو صدقات کی تقسیم میں تم پر الزام لگاتے ہیں۔

تلاوت کر کے فرمایا اگرچہ ان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن شک اور تکذیب پر سب کا اتفاق ہوتا ہے اور یہ مختلف اقوال رکھنے والے سب کے سب تلوار کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کا مستقر دوزخ ہے۔

مبتدعین کو اپنے پاس آنے تک نہ دیتے تھے۔ جب ان کے یہاں کوئی شخص آتا تو بغیر اطمینان کئے آنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ غیلان بن جریر کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کے ساتھ مکہ جانا چاہتا تھا، اس لئے ان کے پاس گیا اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا اگر ضروری نہیں ہو تو اندر آسکتے ہو[۲]۔

ایک گمراہ کن بدعت :

آج کل مذہب کے رنگ میں یہ نیا گمراہ کن مذہب پھیل رہا ہے کہ لوگ حدیث کے مقابلہ میں کتاب اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ابوقلابہ ایسے مذہب پرستوں کو گمراہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ جب تم کسی سے کوئی سنت بیان کرو اور وہ اس کے جواب میں یہ کہے کہ اس کو چھوڑو اور کتاب اللہ کو پیش کرو تو اس کو گمراہ سمجھو[۳]۔

۱۔ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۵　۲۔ ایضاً ۱۳۳　۳۔ ایضاً

عرفان نفس :

اپنی حقیقت پہچاننے والے کو نجات کا اور خود فراموش کو ہلاکت کا مستوجب سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ جس شخص کو دوسرے لوگ خود اس سے زیادہ جانتے ہوں وہ ہلاکت کا اور جو شخص خود اپنے نفس کو دوسروں سے زیادہ پہچانتا ہو وہ نجات پانے کا مستحق ہے[۱]۔ حقیقی دولت مندی اور حقیقی علم خدا کے عطیہ پر قناعت کو حقیقی دولت مندی اور دوسروں کے علم سے استفادہ کرنے والے کو حقیقی عالم سمجھتے تھے۔ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے غنی کون ہے فرمایا جو اس شے پر راضی ہو جو خدا نے اسے دی ہے۔ پھر سائل نے پوچھا کہ بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم سے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے[۲]۔

ابتلاء و آزمائش پر صبر :

صبر و شکر اور تسلیم و رضا میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور آزمائش کے موقع پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ عبدالمومن بن خالد کا بیان ہے کہ آخر عمر میں ابوقلابہ کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں سب اعضا بیکار ہو گئے تھے۔ ان مصائب کے باوجود ان کی زبان پر حمد و شکر کے علاوہ کوئی کلمہ نہ تھا[۳]۔

ان کی ہستی دوسروں کے لئے موجب خیر و برکت تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز شامیوں سے فرماتے تھے کہ جب تک تم میں یہ (ابوقلابہ) موجود ہیں اس وقت تک تم لوگ بھلائی میں رہو گے[۴]۔

وفات : مرض الموت میں عمر بن عبدالعزیز ان کی عیادت کو آئے اور انہیں ثبات و استقلال کی تلقین کی اسی بیماری میں وفات پائی۔ یہ ۱۰۴ھ یا ۱۰۵ھ تھا[۵]۔

(۹۶) ابووائل بن سلمہؒ

نام و نسب : شقیق نام ہے۔ ابووائل کنیت۔ والد کا نام سلمہ تھا۔ نسباً قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تھے شقیق اپنے نام سے زیادہ کنیت سے مشہور ہیں۔

۱؎ ابن سعد، جلد ۷، ق اول۔ ص ۱۳۳　۲؎ ایضاً　۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۸۲
۴؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۲۲۵　۵؎ ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ۱۳۵

عہد رسالت :

ابو وائل عہد رسالت میں موجود تھے، لیکن کم سن تھے۔ عمر بن مروان کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابو وائل سے پوچھا کہ آپ نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں آپ کو دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت میں نوخیز لڑکا تھا[1]۔ لیکن بروایت صحیح وہ تابعی ہیں۔

اسلام : ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں وہ مشرف باسلام ہوئے۔ مغیرہ کا بیان ہے کہ ابو وائل کہتے تھے کہ ہمارے قبیلہ میں نبی ﷺ کا تحصیلدار آیا۔ وہ ہم سے ہر پچاس اونٹنیوں پر ایک اونٹنی لیتا تھا۔ میرے پاس ایک مینڈھا تھا میں نے اس کو لا کر پیش کیا اور کہا اس کا صدقہ لو۔ اس نے کہا اس میں صدقہ نہیں ہے[2]۔

عہدِ صدیقی :

عہدِ صدیقی میں ان کے قبیلہ نے بھی صدقہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ابو وائل بھی اس جماعت میں شامل تھے سلیمان الاعمش کا بیان ہے کہ شفیق مجھ سے کہتے تھے کاش تم ہم کو بزاخہ کے معرکہ میں خالد بن ولید کے مقابلہ میں بھاگتے ہوئے دیکھے ہوتے۔ اس دم میں اونٹ سے گر پڑا تھا اور میری گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی۔ اگر میں اس دن ہلاک ہو گیا ہوتا تو میرے لئے دوزخ یقینی تھی[3]۔ لیکن پر ان کے قبیلہ نے زکوٰۃ ادا کر کے اطاعت قبول کر لی تھی۔

عہد فاروقی میں تلافی مافات :

عہد فاروقی میں انہوں نے اس لغزش کی پوری تلافی کر دی۔ عراق کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ قادسیہ کے مشہور معرکہ میں موجود تھے[4]۔

شام کی مہم میں بھی ان کی شرکت کا پتہ چلتا ہے خود ان کی زبانی یہ روایت ہے کہ میں عمر بن الخطابؓ کے ساتھ شام کے فوج کشی میں شریک ہوا غالباً اس سے مراد سفر شام میں حضرت عمرؓ کی مشایعت ہوگی۔

عمر فاروقی کا برتاؤ :

ان کے خدمات کی بناء پر حضرت عمرؓ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے ان کا بیان ہے کہ عمرؓ نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے چار عطیے دیئے اور کہا ایک نعرہ تکبیر دنیا و مافیہا سے بہتر ہے[5]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۷۔ ق اول۔ ص ۱۳۵ [2] ایضاً [3] عہد صدیقی میں بنی اسد پر فوج کشی کا معرکہ

[4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۳ [5] ایضاً۔ ص ۶۳

جنگ صفین :

عہد مرتضوی میں حضرت علیؓ کی حمایت میں جنگ صفین میں نکلے لیکن بعد میں اس شرکت پر متاسف تھے۔ اعمش کا بیان ہے کہ کسی نے ابو وائل سے پوچھا کہ آپ نے جنگ صفین میں شرکت کی تھی؟ فرمایا ہاں شریک ہوا تھا، لیکن دونوں صفیں نہایت بُری تھیں [۱]۔

حجاج اور ابو وائل :

اُموی عہد میں ابو وائل کی بڑی عزت و وقعت تھی۔ حجاج خصوصیت کے ساتھ بہت مہربان تھا۔ اس نے آپ کے سامنے بعض بڑے عہدے پیش کئے لیکن آپ نے قبول کرنے سے انکار کیا [۲]۔

خود آپ کا بیان ہے کہ حجاج جب (کوفہ) آیا تو مجھے بلا بھیجا میں اس کی طلبی پر گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا آپ کا نام کیا ہے۔ میں نے کہا تم کو معلوم ہی ہوگا ورنہ مجھے بلاتے کیسے، پوچھا آپ کو کتنا قرآن یاد ہے۔ میں نے کہا اتنا کہ اگر میں اس کی پابندی کروں تو وہ میرے لئے کافی ہو [۳]۔

ان سوالات کے بعد اس نے کہا میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ کو بعض عہدے دینا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا کون سا عہدہ۔ اس نے کہا سلسلہ [۴] (بیڑی)۔ میں نے کہا یہ عہدہ ان لوگوں کے لئے موزوں ہے جو ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکیں۔ اگر آپ مجھ سے مدد لینا چاہتے ہیں تو ایسے عقل خوردہ سے مدد لیں جس کا بُرے مددگاروں سے سابقہ ہوگا۔ اس لئے اگر آپ مجھے اس عہدہ سے معاف رکھیں تو میرے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔ اور اگر آپ کو اصرار ہے تو میں اس پُرخطر عہدہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

مگر یہ بھی عرض کردوں کہ ایسی جماعت میں جبکہ میں آپ کا عہدہ دار نہیں ہوں، جب راتوں کو آپ کو یاد کرتا ہوں تو نیند اُڑ جاتی ہے تو جب عہدہ دار رہوں گا تو کیا حال ہوگا۔ لوگ آپ سے اس قدر خائف ہیں کہ اس سے پیشتر کسی امیر سے اتنا خائف نہ ہوئے ہوں گے۔

میری ان باتوں کو اس نے پسند کیا اور کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص خون ریزی میں مجھ سے زیادہ جری اور بے باک بھی نہیں ہے۔ میں ایسے ایسے کام کر گزرا، جس کے پاس جاتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے۔ میری اس سختی کی وجہ سے میری مشکلات آسان ہوگئیں۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۴　　۲ ایضاً　　۳ ایضاً　　۴ سزا دینے کا ایک عہد

خدا آپ پر رحم کرے اب آپ جائیے۔ اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا موزوں شخص مل گیا تو آپ کو زحمت نہ دوں گا ورنہ پھر آپ کو اس میں ڈالنا پڑے گا۔ غرض کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ابووائل واپس آئے اور پھر کبھی حجاج کے پاس نہ گئے [1]۔

تحصیل زکوٰۃ کا عہدہ:

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُموی دور میں وہ تحصیل زکوٰۃ کے عہدہ پر تھے۔ مہاجر ابوالحسن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں ابو بردہ اور شقیق کے پاس جو بیت المال میں تھے زکوٰۃ لے کر گیا، انہوں نے اس کو داخل کرلیا۔ اسی روایت کے ایک راوی سعد لکھتے ہیں کہ میں دوبارہ زکوٰۃ لے کر گیا تو تنہا ابووائل تھے۔ انہوں نے کہا اس کو واپس لے جاؤ، اور اس کے مصارف میں اس کو صرف کردو۔ میں نے کہا مؤلفۃ القلوب کا حصہ کیا کروں؟ انہوں نے کہا "اسے دوسرے لوگوں کو دے دو" [2]۔

فضل وکمال:

علمی اعتبار سے ابووائل کوفہ کے ممتاز علما میں تھے۔ حافظ ذہبی ان کو کوفہ کا شیخ اور عالم لکھتے ہیں [3]۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت پر سب اتفاق ہے [4]۔

قرآن: قرآن کے حافظ تھے، ذ اور ذکی ایسے تھے کہ دو مہینہ میں پورے قرآن کی تعلیم حاصل کرلی تھی، لیکن تفسیر بیان کرنے میں بڑے محتاط تھے [5]۔

حدیث: حفظ حدیث میں علاؤ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں [6]۔ صحابہ میں انہوں نے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذ بن جبلؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ، حباب بن ارتؓ، کعب بن عجرہؓ، ابو مسعود انصاریؓ، ابوموسیٰؓ، اشعری اور ابو ہریرہؓ وغیرہ جیسے اکابر حفاظ سے روایتیں کی ہیں [7]۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظہ میں زیادہ محفوظ تھیں کوفہ میں ان کی احادیث کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا [8]۔

تلامذہ: بڑے بڑے تابعی ان کے خرمن کمال کے خوشہ چین تھے۔ اکابر تابعین میں شعبی، عاصم اور اعمش۔ اور عام محدثین میں منصور، زبید الیامی، حبیب بن ابی ثابت، عاصم بن بھدلہ، عبدہ بن لبابہ اور عمرو بن مرہ وغیرہ نے ان سے فیض پایا تھا [9]۔

---

[1] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۹ [2] ایضاً۔ ص ۶۵ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۱ [4] تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۴۷ [5] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۱ [6] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۹ [7] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۳۶۱ [8] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۲۴۷ [9] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۳۶۲

علماء میں ابووائل کا درجہ :

اس عہد کے اکابران کو خیار تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ اعمش کا بیان ہے کہ ابراہیم نے مجھ سے ہدایت کی تھی کہ تم شقیق سے استفادہ کیا کرو، عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب اس زمانہ میں جب کہ ان کی بڑی تعداد موجود تھی سب کے سب انہیں اپنی جماعت کے خیار میں شمار کرتے تھے[1]۔

خشیتِ الٰہی :

ان کے دل پر خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ جب ان کے سامنے تذکیر وتخویف ہوتی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے[2]۔

زہد وعبادت :

بصرہ کے عابد تابعین میں شمار تھا۔ عبادت ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ ثقات میں تھے کوفہ میں بود وباش اختیار کرلی تھی، اور یہاں کے عابد وزاہد لوگوں میں تھے[3]۔

آپ کی عبادت کا خاص وقت تاریکی شب تھا۔ سجدہ میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرتے تھے۔ خدایا مجھے معاف کر اور میری مغفرت فرما اگر تو مجھے معافت کردے کہ مسلسل گناہوں کو معاف کردے گا اور اگر عذاب دے گا تو عذاب دینے میں تو ظالم نہ ہوگا[4]۔

جہاد فی سبیل اللہ اور دنیا سے بے تعلقی :

دنیا سے محض برائے نام تعلق تھا۔ رہنے کے لئے ایک معمولی سا چھپر کا جھونپڑا تھا جس میں وہ اور ان کا رفیق جہاد گھوڑا رہتا تھا۔ جب جہاد کے لئے جانے لگتے تو چھپرا کھاڑ دیتے جب واپس آتے تو پھر بنالیتے[5]۔

کسبِ حلال :

کسب حلال کا بڑا خیال تھا۔ مفت کی دولت کے انبار کے مقابلہ میں حلال کے ایک درہم کو زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ فرماتے تھے کہ تجارت کا ایک درہم مجھے اپنے وظیفہ کے دس درہم سے زیادہ پسند ہے[6]۔

---

۱ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۷ ۲ ایضاً۔ ص ۶۸ ۳ تہذیب التہذیب۔ جلد ۳۔ ص ۳۶۳
۴ ابن سعد۔ جلد اول۔ ص ۶۷ ۵ ایضاً۔ ص ۶۸ ۶ ایضاً

ان کی ذات باعثِ برکت تھی :

ان کے ان اخلاقی اور روحانی کمالات کی وجہ سے لوگ ان کو اپنے لئے باعث رحمت و برکت سمجھتے تھے۔ ابراہیم کہتے تھے کہ ہر مقام میں ایک ایسی ہستی ضرور ہوتی ہے جس کے طفیل میں وہ آبادی بلاؤں سے محفوظ رہتی ہے۔ مجھے کو امید ہے کہ شقیق بھی ایسے ہی لوگوں میں ہیں [۱]۔ صحابہ تک ان کے کمالات اخلاقی کے معترف تھے عبداللہ بن مسعود پر ان کا اتنا اثر تھا کہ جب انہیں دیکھتے تو فرماتے کہ یہ 'تائب' ہیں [۲]۔

وفات: ۸۲ھ میں وفات پائی۔ واقدی کے بیان کے مطابق عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں انتقال ہوا۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوا کیونکہ اس اعتبار سے ان کی عمر بہت بڑھ جاتی ہے [۳]۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۳۶۷　　۲؎ ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۶۸

۳؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۵۲

ابوحنیفہ رح الامام

۸۰ھ ـــــــ ۱۵۰ھ

تحریر

استاذ الحدیث

حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ

فاضل دارالعلوم دیوبند ورفیق ندوۃ المصنفین

نوٹ : تابعین کرام ؒ کی اس جلد میں ایک جلیل القدر تابعی حضرت نعمان بن ثابت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شامل نہیں تھے۔ بعض احباب کی توجہ دلانے پر حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ؒ کی اس موضوع پر ایک مختصر تحریر شاملِ کتاب کی جارہی ہے۔ تفصیلی حالات وسوانح کے سلسلہ میں حضرت امام اعظم ؒ کی سیرت پر تحریر کردہ اُردو اور عربی کی ضخیم اور دیگر مستند کتب کی طرف مُراجعت کی جائے۔

ناشر

ابوحنیفۃ الامامؒ

ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ

شجرہ نسب : مورخ ابن خلکان نے امام اعظمؒ کا شجرہ نسب اس طرح نقل کیا ہے : "ابوحنیفۃ النعمان بن ثابت بن زُوطیٰ بن ماہ" اور زوطی کو زاء کے پیش اور طاء کے زبر اور آخر میں یا مقصورہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے پوتے نے جو شجرہ نسب اپنے دادا کا خود بیان کیا ہے، وہ اس طرح ہے: اسمٰعیل بن حماد بن النعمان بن ثابت بن النعمان بن المرزبان۔

علامہ شبلی کا خیال یہ ہے کہ جب زوطی اسلام لائے ہوں گے تو ان کا نام نعمان رکھ دیا گیا ہوگا اس لئے جب اسمٰعیل نے اپنا شجرہ نسب بیان کیا تو اپنے دادا کے اسلامی نام ہی کا ذکر کیا ہے۔

صحیح روایات کی بناء پر یہ طے شدہ ہے کہ امام صاحب کے والد ماجد کی ولادت اسلام ہی پر ہوئی ہے۔ خطیب بغدادی نے جو کچھ اس کے خلاف لکھا ہے وہ محض بے اصل اور ان کے مشہور تعصب پر مبنی ہے۔ غالباً اسی خیال کی تائید کے لئے انہوں نے حسب ذیل روایت بھی نقل کی ہے۔

"کان ابوحنیفۃ اسمہ عتیک بن زوطرۃ فسمی نفسہ النعمان واباہ ثابتاً"

"ابوحنیفہ کا نام عتیک اور ان کے والد کا زوطرہ تھا۔ پھر انہوں نے اپنا نام نعمان اور اپنے والد کا ثابت بدل دیا تھا"۔

اس کا راوی "الساجی" مختلف فیہ ہونے کے علاوہ مشہور متعصب ہے تاہم اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو غالباً ثابت کو زوطرۃ ان کے والد زوطی کی مناسبت سے کہا گیا ہوگا۔

ہمارے نزدیک نام ونسب کے فیصلہ کے لئے سب سے زیادہ معتبر شہادت خود اہل خاندان ہی کی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا یہاں اسمٰعیل کے بیان کے خلاف جو بیانات بھی ہیں وہ سب مرجوح یا قابل توجیہ ہوں گے۔ اسمٰعیل یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے پردادا ثابت زمانۂ طفولیت میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ آپؓ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا برکت فرمائی تھی اور ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ دعا ہمارے حق میں ضرور قبول ہوئی ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ ثابت کے والد

نعمان وہی ہیں جو حضرت علیؓ کی خدمت میں ہدیہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ کے خاندان کو حضرت علیؓ سے ہمیشہ خاص تعلق رہا ہے اور اسی بناء پر انہوں نے ثابت اور ان کی اولاد کے لئے خصوصیت سے دعا فرمائی ہوگی۔ اسمٰعیل یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم فارسی النسل ہیں۔ ہمارے باپ دادے سب آزاد لوگ تھے اس کے بعد قسم کھا کر کہتے ہیں۔

"واللہ ماوقع علینا رق قط"

"خدا کی قسم ہے غلامی کی ذلت میں ہم کبھی مبتلا نہیں ہوئے"۔

اُن کے اس تاکیدی بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے متعلق پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بنی تیم اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسمٰعیل امام اعظمؒ کے پوتے ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو اپنے دادا کے حالات کی بھی پوری تحقیق نہ ہوگی۔ اسلامی عہد میں رقیّہ کی غلط فہمی پیدا ہوجانا وہ بھی عجم کے نسب میں کچھ بعید نہیں ہے اور واقعہ کی حقیقت منکشف ہوجانے کے بعد غلط فہمیوں کے اسباب بیان کرنے کی مفت درد سری اُٹھانا بھی غیر ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس افواہ کو شہرت دینے میں بہت بڑا دخل اس خلش کو بھی ہے جو امام اعظمؒ سے رقابت کے سلسلے میں بعض علماء کو پیدا ہوگئی تھی۔ علامہ کوثری نے مشکل الآثار کی ایک روایت کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کو مولیٰ حلیف کے معنی میں کہا گیا تھا۔ اگر بالفرض تاریخ سے صحیح طور پر آپ کا اولادِ موالی ہونا ثابت ہوجاتا تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اتنا بڑا عیب بھی نہ تھا، جس کی مدافعت کرنا ہمارے لئے ضروری ہوتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عصبیت کی آنکھ جب خشم آلودہ ہوجاتی ہے تو وہ کوئی ہنر اپنے حریف میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

مولد و مدفن : آپ کی پیدائش کوفہ میں اور وفات بغداد میں ہوئی ہے۔ علمی پایہ کے لحاظ سے کوفہ ہمیشہ ممتاز شہر رہا ہے۔ علامہ کوثری نے نصب الرایہ کے مقدمہ میں اس کی مختصر تاریخ لکھی ہے، ہم اس کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں۔

کوفہ ایک اسلامی شہر ہے جو عہدِ فاروقی کے ۱۷ھ میں بحکمِ امیر المؤمنین تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے ارد گرد فصحاءِ عرب بسائے گئے اور ان کے تعلیمی نظم و نسق کے لئے سرکاری طور پر حضرت ابن مسعودؓ کو بھیجا گیا۔ ان کی علمی منزلت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ کوفہ کو یہ لکھا تھا کہ ابن مسعودؓ کی مجھے یہاں خود بھی ضرورت تھی، لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم سمجھ کر تمہاری تعلیم کے لئے ان کو بھیج رہا ہوں۔ انہوں نے یہاں بیٹھ کر عہدِ عثمانؓ کے آخری دور تک لوگو قرآن پاک اور دین کے مسائل کی

تعلیم دی۔ ان کی تعلیمی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض محدثین کے بیان کے مطابق اس نو آباد شہر میں چار ہزار علماء و محدثین پیدا ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں داخل ہوئے تو علم کی یہ شان دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھے، "اللہ تعالیٰ ابن مسعودؓ کا بھلا کرے، انہوں نے تو اس بستی کو علم سے بھر دیا"۔ کوفہ بحالتِ موجودہ ہی کیا کم تھا کہ اس مدینۃ العلم کی آمد نے اسے اور چار چاند لگا دیئے۔ ایک سعید بن جبیر تنہا یہاں ابن عباسؓ کے علوم کا ایسا نسخہ موجود تھے کہ جب کوفہ والے ان کے پاس کوئی فتویٰ پوچھنے جاتے تو وہ فرماتے کیا تمہارے یہاں سعید بن جبیر موجود نہ تھے یعنی ان کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

شعبیؒ کے علم کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عمرؓ جب ان کو مغازی پر بحث کرتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے، میں ان غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں مگر ان کی یادداشت تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔

ابراہیم نخعیؒ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ اہلِ نقد کے نزدیک ان کے سب مراسیل صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ابو سعید خدریؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے۔ ابو عمران نے ان کو اپنے زمانے کے تمام علماء سے افضل کہا ہے۔ ۹۵ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو ابو عمران نے ایک شخص سے کہا آج تم نے سب سے زیادہ فقیہ شخص کو دفن کر دیا۔ اس نے کہا، کیا حسن بصریؒ سے بھی زیادہ۔ انہوں نے کہا، ایک حسن بصریؒ سے نہیں بلکہ تمام اہلِ بصرہ، اہلِ کوفہ، اہلِ شام اور اہلِ حجاز سے بھی۔

شعبی کہا کرتے تھے کہ ابراہیم فقہ کے گہوارہ میں تو پیدا ہی ہوئے تھے، اس کے بعد وہ ہمارے پاس آئے اور ہماری وہ حدیثیں جو بے غبار تھیں، اپنی فقہ میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

مسروق جو کبار تابعین میں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ کا خلاصہ میں نے ان چھ اشخاص میں دیکھا۔ علیؓ، عبداللہ بن مسعود، عمر، زید بن ثابت، ابو الدرداء اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم پھر نظر ڈالی تو ان سب کے علم کا خلاصہ پہلے دو شخصوں میں پایا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جو زبانِ رسالت سے اعلم بالحلال والحرام کا تمغہ حاصل کر چکے تھے، اپنے خاص شاگرد عمرو بن میمون کو حکم دیا تھا کہ تحصیلِ علم کے لئے تم حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں کوفہ جاؤ۔

کوفہ کی علمی قدرومنزلت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مصر میں آنے والے صحابہ کی تعداد محمد بن ربیع جیزی اور سیوطی تین سو سے زیادہ پیش نہیں کر سکے۔۔۔۔۔ اس کے بالمقابل صرف ایک کوفہ میں پندرہ سو ۱۵۰۰ صحابہ کا قیام لکھ رہے ہیں جن میں ستر صحابہ بدری تھے۔ عراق کے بقیہ شہروں میں بسنے والے صحابہ کا ابھی ذکر نہیں ہے۔ (اور یہ تعداد بھی کم ہے ورنہ جو مقام مرکزی چھاؤنی بنا دیا گیا ہو معلوم نہیں کہ وہاں کتنے اور صحابہ کا گذر ہوا ہوگا)۔

رامہرمزی اپنی کتاب "الفاصل" میں قابوس سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا، یہ کیا بات ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس جایا کرتے ہیں؟ یہ ابن مسعودؓ کے شاگرد تھے۔ فرمایا، اے جانِ پدر بات یہ ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کو خود ان کے پاس مسائل دریافت کرنے کے لئے آتا دیکھتا ہوں۔ شُریح جو یہاں کے قاضی تھے، ان کے حق میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد ہے، "شریح اٹھو اور فیصلہ کرو کیونکہ تم عرب میں سب سے بڑھ کر قاضی ہو"۔ ان کے علاوہ تینتیس ۳۳ اشخاص یہاں اور بھی ایسے موجود تھے جو صحابہ کی موجودگی میں اربابِ فتویٰ سمجھے جاتے تھے۔

اس دور کے بعد دوسرا دور ان حضرات کے تلامذہ کا شروع ہوتا ہے۔ ان کا عدد بھی ہزاروں سے متجاوز تھا۔ امام ابو بکر جصاص لکھتے ہیں کہ دیر جماجم میں حجاج سے جنگ کرنے کے لئے ایک عبدالرحمن بن الاشعث کے ساتھ جو جماعت نکلی تھی، اس میں چار ہزار کی تعداد صرف قراء تابعین کی تھی۔

رامہرمزی انس بن سیرین سے نقل کرتے ہیں۔ جب میں کوفہ پہنچا تو اس وقت تو وہاں چار ہزار حدیث کے طلبہ اور چار سو فقہاء موجود تھے۔ نیز عفان بن مسلم [1] سے ناقل ہیں کہ جب ہم کوفہ پہنچے تو ہم نے وہاں صرف چار ماہ اقامت کی۔

حدیث کا وہاں یہ چرچا تھا کہ اگر ہم ایک لاکھ حدیثیں لکھنا چاہتے تو لکھ لیتے۔ مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثوں پر ہی اکتفا کیا اور صرف وہ حدیثیں جمع کیں جو جمہور کے نزدیک مسلم تھیں۔ انتہیٰ اسی لئے مسلم آئمہ وحفاظ کو بھی طلبِ حدیث کے لئے کوفہ کا سفر کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ اگر آج بھی آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے۔ جن کی

---

[1] یہ عفان بن مسلم، امام احمدؒ اور بخاریؒ وغیرہ کے شیخ ہیں۔ علی بن مدینی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر حدیث کے ایک حرف میں ان کو ذرا شبہ پڑ جاتا تو اسے سرے سے ترک کر دیا کرتے تھے۔ (تقریب) اب اندازہ فرمائیے کہ جب اس سخت شرط کے ساتھ پچاس ہزار حدیثوں کا ذخیرہ ان کو کوفہ میں مل سکتا ہے تو حدیث کے لحاظ سے کوفہ کا مرتبہ کیا ہوگا۔

روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ حتیٰ کہ خود امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں شمار نہیں کرسکتا کہ حدیث حاصل کرنے لئے کتنی بار کوفہ گیا ہوں[1]۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کو اگر مہبطِ وحی ہونے کا فخر حاصل تھا تو کوفہ کو ہزاروں صحابہ کے مرجع و مسکن ہونے کا بجا فخر حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کو دیگر بلادِ اسلامیہ کے ساتھ اہلِ کوفہ کا تعامل بھی بڑی اہمیت سے نقل کرنا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ امام ترمذی نے فقہ کا کوئی باب کم چھوڑا ہے جہاں اعتناء کے ساتھ اہل کوفہ کا مذہب نقل نہ کیا ہو۔

یہ ہے امام ابوحنیفہؒ کا مولد اور ان کا علمی گہوارہ، جس کے آغوش میں رہ کر ان کی علمی پرورش ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو فقہ اس سرزمین میں مدون کی گئی ہو وہ سرِ مو بھی کتاب و سنت سے تجاوز کرسکتی ہے۔

حلیہ و اخلاق : خطیب بغدادی ابونعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ خوش رو، خوش لباس، خوشبو پسند کرنے والے، خوش مجلس، نہایت کریم النفس، اور اپنے رفقاء کے بڑے ہمدرد تھے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قد میانہ تھا۔ نہ بہت کوتاہ، نہ دراز، گفتگو نہایت شیریں، آواز بڑی دلکش اور بڑے قادر الکلام تھے۔ عمر، امام اعظمؒ کے پوتے فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کسی قدر دراز قد تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی۔ اچھا لباس پہنتے۔ عام طور پر اچھی حالت میں رہتے۔ خوشبو کا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہو جاتا تھا[2]۔

آپ ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ قیس بن الربیع بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب مشائخ اور محدثین سے ایک رقم لے کر ان کے لئے بغداد سے سامان خریدتے اور کوفہ لا کر اُسے فروخت کر دیتے اور سال بہ سال اس کا نفع اپنے پاس جمع رکھتے اور اس نفع سے محدثین کے خورد و نوش لباس وغیرہ کی ضروریات مہیا کرتے، اس سے جو بچ رہتا وہ اُن کے حوالے کر دیتے اور کہتے کہ اسے اپنی دیگر ضروریات میں صرف کو لو اور خدا کا شکر ادا کرو۔ میرے شکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ میں نے یہ مال اپنے پاس سے تم کو نہیں دیا، یہ تمہارے ہی مال کا نفع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ اس نے اس کا ذریعہ مجھے بنا دیا ہے۔

حضرت حسن بن زیاد کہتے ہیں۔ اہل مجلس میں سے ایک شخص پر امام صاحب نے خستہ لباس دیکھا۔ اس سے کہا بیٹھ جاؤ۔ جب محفل برخاست ہوگئی اور یہ تنہا رہ گیا تو فرمایا، مصلّیٰ اُٹھا کر جو اس کے نیچے

---

[1] مقدمہ فتح الباری۔ جلد ۲۔ ص ۱۹۴ [2] خطیب۔ جلد ۱۳۔ ص ۳۳۰۔ ۳۳۱

تم کو ملے وہ لے لو۔ اس نے جا نماز اُٹھائی تو نیچے ہزار درہم تھے۔ آپ نے فرمایا، یہ لے لو۔ وہ بولا میں خود صاحب وسعت ہوں، مجھے ضرورت نہیں ہے۔ فرمایا، تو پھر اپنا حال ایسا بناؤ کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے بھائی کو غم نہ ہو۔ یہ حدیث تم کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر اپنے نعمت و کرم کے آثار دیکھنا پسند کرتا ہے۔

حضرت جعفر بن عون بیان کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے ایک ریشمین کپڑا آپ سے مانگا۔ آپ نے ایک کپڑا اس کے لئے نکالا تو وہ بولی، میں بڑھیا عورت ہوں اور یہ معاملہ امانت کا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ کو جتنے میں پڑا ہے اسی قیمت میں میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے۔ فرمایا چار درہم دیدے۔ اس نے کہا بڑھیا کا مذاق نہ بنایئے اور ٹھیک ٹھیک قیمت بتا دیجئے۔ آپ نے فرمایا، میں نے دو کپڑے خریدے تھے اور ایک ہی کپڑے سے چار درہم کم میری پوری قیمت وصول ہو گئی تھی، اب یہ کپڑا مجھے چار ہی درہم میں پڑ رہا ہے۔[1]

حضرت ابن مبارک نے سفیان ثوریؒ سے پوچھا، ابو حنیفہؒ غیبت کرنے سے بہت دور رہتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے دشمن کی غیبت بھی نہیں کرتے۔ سفیان ثوری نے جواب دیا۔ ابو حنیفہ اس سے بالاتر ہیں کہ اپنی نیکیوں پر اپنے دشمن کو مسلط کریں۔ (کہ وہ قیامت کے دن اپنی غیبت کے بدلہ میں ان کی نیکیاں لے لے)۔[2]

اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں۔ مفصل تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان چند واقعات میں امام صاحب کی صرف ہمدردی اور مساوات قابلِ غور نہیں ہے۔ دنیا میں سخی اور کریم اور بھی گزرے ہیں، دیکھنا تو یہ ہے کہ یہاں آپ نے صرف ہمدردی نہیں کی، بلکہ بے منت ہمدردی کرنے کے اصول بھی بتلا دیئے۔ ہمدردی کا اقتضا محتاج کی حاجت روائی کرنا پھر اس کو سبک روح رکھنا اور ایسے طریقے نکال لینا، جن سے اپنے نفس اور محتاج کو ندامت کا خطرہ بھی نہ گزر سکے۔ ہر وقت اس کی حاجت رفع ہو جائے اور آئندہ کے لئے اس کو سوال کی عادت بد بھی نہ پڑنے پائے۔ یہ ایک قیمتی سبق ہے جو ان چند واقعات سے ہم کو ملتا ہے۔

طبقۂ امام اعظمؒ: ابن خلکان لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے چار صحابہؓ کو پایا ہے۔ انس بن مالکؓ، عبداللہ بن ابی اوفیؓ کو کوفہ میں سہل بن سعد الساعدیؓ کو مدینہ منورہ میں اور ابوالطفیل عامر بن واثلہؓ کو مکہ معظمہ میں۔ حافظ ذہبی خود امام صاحبؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالک صحابیؓ کو

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳ ص ۳۶۱۔ ۱۲ [2] ...ایضاً ص

بار ہا دیکھا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ ان کے ساتھ اور بہت سے دیگر حفاظ حدیث نے انسؓ کی رویت تسلیم کی ہے۔ خلاف جو کچھ ہے، وہ روایت کے ثبوت وعدم ثبوت میں ہے۔ ہمارے نزدیک ایک ایسے شخص کے متعلق جو صحابہ ہی کے عہد میں پیدا ہوا ہو رویت تو در کنار روایت کا دعویٰ بھی بعید نہیں، بلکہ بہت ہی قرین قیاس تھا لیکن کیا کیا جائے جن پر امام صاحب کا اولا دِ احرار ہونا بھی شاق ہو ان پر آپ کا طبقۂ تابعین میں شمار ہونا کیوں شاق نہ ہوتا۔ اس لئے یہ بھی ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ متوسط قول یہ ہے کہ رویت سے تو انکار نہ کیا جائے اور روایت کا قطعی طور پر دعویٰ نہ کیا جائے۔ اس کے سوا، جو کچھ ہے وہ افراط وتفریط کا میدان ہے۔

تحصیلِ علم:

حضرت زفر بن ہذیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے سنا ہے کہ مجھے علم کلام کا پہلے اتنا شوق تھا کہ میں اس علم میں شہرۂ آفاق ہو گیا تھا۔ حماد بن ابی سلیمان[1] کا حلقۂ درس میرے قریب تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میرے پاس ایک عورت آئی اور اس نے مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص کی بی بی باندی ہے وہ سنت کے موافق اسے طلاق دینا چاہتا ہے، کتنی طلاقیں دے؟ میری کچھ میں کچھ نہ آیا کیا جواب دوں۔ میں نے کہا حماد سے پوچھ اور واپس آ کر مجھے بھی بتا۔ وہ حماد کے پاس گئی۔ انہوں نے فرمایا،

جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو جماع کرنے سے پہلے اُسے صرف ایک طلاق دینا چاہئے۔ جب دو حیض اور گزر جائیں تو پھر اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ اس نے واپس آ کر مجھ سے ان کا جواب نقل کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ علمِ کلام بھلا کس کام کی چیز اور اپنے جوتے اُٹھا کر حماد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ مسائل بیان کرتے، میں اُن کو سنتا اور یاد رکھتا۔ جب دوسرے دن وہ تشریف لاتے پھر ان کا اعادہ فرماتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ میں نے اُن مسائل کو صحیح ضبط کیا ہے

---

[1] حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں تھے۔ تاریخ اصبہان میں ابوالشیخ ذکر کرتے ہیں کہ ایک دن نخعی نے ان کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لئے بازار بھیجا۔ زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی۔ ادھر ان کے والد کہیں گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ یہ صورت دیکھ کر انہوں نے ان کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر ہاتھ سے پھینک دی۔ جب ابراہیم نخعیؒ کی وفات ہوگئی تو حدیث کے طالب ان کے والد (مسلم بن یزید) کے دروازے پر آئے اور دستک دی۔ یہ چراغ لے کر باہر نکلے تو انہوں نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ کے فرزند حماد کی ضرورت ہے۔ یہ خفیف ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا بیٹا! جس باہر جاؤ۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے۔۔۔۔۔ ابن عدی نے "الکامل" میں نقل کیا ہے کہ حماد فرماتے تھے میں قتادہ، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں۔ جب ابراہیم سے دریافت کیا گیا کہ آپ سے مسائل کا حل کس سے دریافت کیا کریں تو انہوں نے حماد ہی کا نام لیا تھا۔ (تاریخ بغدادی)

اوران کے دوسرے شاگردوں نے غلطیاں کی ہیں۔اس لئے انہوں نے فرمایا کہ میرے سامنے صدر مقام پر ابوحنیفہؒ کے سوااور کوئی شخص نہ بیٹھے۔دس سال مسلسل بلکہ ان کی وفات تک میں ان کے ساتھ رہا۔حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد کسی سفر میں باہر تشریف لے گئے تھے۔جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ اس اثناء میں آپ کو زیادہ کس کی یاد رہی۔میرا خیال تھا کہ وہ یہی فرمائیں گے ،تیری۔لیکن انہوں نے ابوحنیفہؒ کا نام لیااور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابوحنیفہؒ سے ایک لحہ کے لئے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔

روایت مذکورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی عمر کا ابتدائی حصہ علم کلام میں صرف ہوا ہے اور زمانہ تلمذ سے آپ کی کنیت ابوحنیفہؒ تھی۔یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ یہ کنیت امام صاحب نے خود اختیار کی تھی یا دوسروں نے آپ کی یہ کنیت مقرر کی تھی۔اسی روایت سے امام صاحب کے صحت ذوق ،سلامتی فطرت اور قوت حفظ کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔آپ کے صرف درس حدیث کے صدر نشین نہ ہونے سے یہ خیال قائم کرلینا کہ آپ کا حفظ کمزور تھا بہت سطحی نظر ہے۔

ماخذ علم : خطیب بغدادی روایت کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین ابوجعفر نے امام صاحبؒ سے پوچھا، آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے؟ فرمایا،عمر بن الخطاب ،علی بن ابی طالب،عبداللہ بن مسعوداور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اوران کے شاگردوں کا۔فرمایا،تو آپ نے بہت صحیح اور پختہ علم حاصل کیا۔یہ ہستیاں بہت مبارک اور بڑی مقدس ہستیاں تھیں۔حضرت عمرؓ کی شان تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ مرے بعد اگر کوئی شخص نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔حضرت علیؓ تو وہ ہیں جن کو آپ نے اپنے دست مبارک سے قاضی بنا کر بھیجا تھا۔رہ گئے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی امت میں ضرب المثل ہو چکی ہے۔اب سوچئے کہ جو علم اتنے جامع اور مضبوط ماخذ سے حاصل کیا گیا ہوگا وہ کتنا عمیق اور کتنا مستحکم ہوسکتا ہے۔نفسیاتی طریق پر بھی مسائل حنفیہ کا مرجع یہی اصحاب ہونے چاہئیں۔

کوفہ جو امام اعظمؒ کا مسکن تھا،حضرت عمرؓ ہی کا بسایا ہوا اور آباد کیا ہوا تھا۔پھر جو صحابی اہل کوفہ کی تعلیم وتربیت کے لئے سرکاری طور پر مقرر کئے گئے وہ ابن مسعودؓ ہی تھے۔حضرت علیؓ کا تو کوفہ دار الخلافہ ہی رہ چکا تھا۔اس لئے اہل کوفہ کے لئے ان اصحاب میں علمی کشش کے علاوہ ایک فطری کشش بھی موجود تھی۔کسی مجتہد کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس کے استفادہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر جزئی میں ایک مقلد کی طرح اتباع کرتا ہوگا ،انتہائی درجہ کی ناواقفیت ہے بلکہ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ

ان کے زیرِ تربیت رہ کر اس کا جو علمی مذاق اور اندازِ طبیعت قائم ہو چکا تھا، وہ ان حضرات ہی سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے اصولِ استنباط، اصولِ فکر، مصالح و مضار پر غور و خوض کا زاویہ نظر سب اُن ہی سے متحد تھا۔ اس لئے دونوں کے مجتہدات اور مسائل میں ایک قسم کی یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہو جانا بھی ضروری امر تھا۔

اصول وعقائد: یحییٰ بن ضریس کہتے ہیں، میں سفیانؒ کے پاس حاضر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کو امام صاحب پر کیا اعتراض ہے؟ انہوں نے فرمایا، اعتراض کیا ہوتا، میں نے تو خود انہیں یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سب سے پہلے قرآن کو لیتا ہوں، اگر کوئی مسئلہ اس میں نہیں ملتا تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتا ہوں، اگر کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ دونوں میں نہیں ملتا تو پھر میں آپ کے صحابہ کے اقوال تلاش کرتا ہوں اور ان میں جو زیادہ پسند آتا ہے اُسے اختیار کر لیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ ہاں جب تابعین کا نمبر آتا ہے تو پھر ان کا اتباع کرنا لازم نہیں سمجھتا، جیسا انہوں نے اجتہاد میں کیا میں بھی اجتہاد کر لیتا ہوں[1]۔

حضرت امام ابو یوسف روایت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا، خراسان میں دو قسم کے لوگ سب سے بدتر ہیں، جہمیہ اور مشبہہ۔ ابو یوسف سے دوسری جگہ اس طرح منقول ہے کہ امام صاحب جہم بن صفوان کی مذمت کیا کرتے تھے اور اس کی باتوں پر نکتہ چینی فرماتے تھے۔ عبدالرحمن حمانی کہتے ہیں، میں نے ابوحنیفہؒ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جہم بن صفوان کافر ہے[2]۔

یحییٰ بن نصر کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ شیخین کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے۔ ختنین سے محبت رکھتے تھے۔ تقدیر کے قائل تھے اور اس میں کوئی میخ نہیں نکالتے تھے۔ مسح علی الخفین کرتے تھے اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے اور متقی عالم تھے[3]۔ ابو سلیمان جوز جانی اور معلی بن منصور رازی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں کسی نے قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ ہاں بشر مریسی اور ابن ابوداؤد نے اس مسئلہ میں بحث شروع کی اور انہوں نے ہی امام صاحبؒ کے تلامذہ کو بدنام کیا[4]۔

محدثین کی نظروں میں امام اعظمؒ کی ثقاہت :

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ مالکؒ پر رحمت نازل فرمائے، اپنے وقت کے امام تھے۔ شافعیؒ پر رحمت نازل فرمائے، اپنے وقت کے امام تھے۔ ابوحنیفہؒ پر رحمت نازل فرمائے، اپنے زمانہ کے

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳: ص ۳۶۸ [2] ایضاً ص ۳۶۷ [3] ایضاً ۳۷۷ [4] ایضاً ۳۷۸

امام تھے[۱]۔امام احمدؒ جب کبھی امام ابوحنیفہؒ کے کوڑے کھانے اور قضا قبول نہ کرنے کا واقعہ ذکر فرماتے تو روپڑتے تھے اور امام صاحب کے لئے دعاء رحمت فرماتے[۲]۔

حسن بن علی حلوانی شبابہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کے بارے میں شعبہ اچھا خیال رکھتے تھے۔ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ امام صاحب سے ثوری، ابن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع، عباد، جعفر بن عون جیسے اجلۂ محدثین نے روایت کی ہے، وہ ثقہ ہیں۔ ان کی روایت میں کوئی سقم نہیں۔ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا، اے ابوزکریا (ان کی کنیت ہے)، کیا ابوحنیفہؒ حدیث کے بارے میں سچے شمار ہوتے تھے انہوں نے فرمایا، نہایت سچے اور بالکل صحیح روایت کرنے والے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے دریافت کیا گیا۔ کیا ابوحنیفہ کبھی خلاف واقع بھی حدیث روایت کرتے تھے؟ فرمایا، محدثین، ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے حق میں بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ ان کی شان اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی[۳]۔

خطیب یحییٰ بن معین سے نقل کرتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدیث روایت کرنے کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے برابر یاد رہنی چاہئے۔ اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام صاحب کے متعلق اُن سے دریافت کیا گیا تو دو بار فرمایا ثقہ ہیں۔ ایک مرتبہ یہ کہا کہ حدیث و فقہ میں ثقہ اور سچے ہیں اور خدا کے دین کے بارے بھروسہ کرنے کے قابل ہیں[۴]۔ خارجہ بن مصعب اور ابووہب عابد کہتے ہیں کہ جو شخص مسح علی الخفین کا قائل نہ ہو یا ابوحنیفہؒ پر نکتہ چینی کرے وہ بلاشبہ ناقص العقل ہے[۵]۔ حافظ ابن حجر شافعی نے امام صاحب کے مناقب نقل کرکے یحییٰ بن معین سے اس کے خلاف کوئی نقل پیش نہیں کی اور آخر تذکرہ میں لکھا ہے کہ امام صاحبؒ کے مناقب بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو اور جنت فردوس میں ان کو جگہ دے۔ ذہبی نے مناقب امام پر مستقل ایک تصنیف لکھی ہے۔

فقہ حنفی کا امتیاز : اس عنوان پر علامہ کوثری مصری نے زیلعی کے مقدمہ میں ایک مختصر مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ہم یہاں اس کا انتصار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

فقہ حنفی صرف ایک شخصی رائے نہیں بلکہ چالیس علماء کی جماعت شوریٰ کی ترتیب دادہ ہے۔ امام طحاوی اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کی یہ جماعت شوریٰ چالیس افراد پر مشتمل تھی،

۱۔ جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۳ ۲۔ تاریخ ابن خلکان۔ جلد ۲۔ ۱۶۴ ۳۔ جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۴۹
۴۔ تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳۔ ص ۴۱۹۔ ۴۲۰ ۵۔ ایضاً جلد ۱۳۔ ص ۳۶۴۔ ۳۶۸

جن میں ممتاز ہستیاں یہ تھیں۔ ابو یوسف، زفر بن الہذیل، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السمتی (یہ امام شافعیؒ کے شیوخ میں ہیں) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔ خطیب نے امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں ان اسماء کا اور اضافہ کیا ہے۔ عافیہ ازدی، قاسم بن معن، علی بن مسہر، حبان، مندل۔

اسد بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب کی خدمت میں پہلے ایک مسئلہ کے مختلف مختلف جوابات پیش کئے جاتے پھر جو اس کا سب سے زیادہ تحقیقی جواب ہوتا آپ ارشاد فرماتے۔ اسی طرح ایک ایک مسئلہ تین تین دن زیر بحث رہتا۔ اس کے بعد کہیں وہ لکھا جاتا تھا۔ صیمری بیان فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ امام صاحب کے ساتھ مسائل میں بحث و تحقیق کرتے اگر اس وقت قاضی عافیہ بن یزید موجود نہ ہوتے تو آپ فرماتے ان کے آنے تک ابھی مسئلہ کا فیصلہ ملتوی رکھو، جب وہ تشریف لے آتے اور وہ بھی دوسروں کی رائے سے اتفاق کر لیتے تو امام صاحبؒ فرماتے اب اس کو لکھ لو۔ جب تک مسئلہ تحقیق و تفتیش کے یہ مراحل طے نہ کر لیتا آپ اس کو لکھنے سے منع کرتے۔

یحییٰ بن معین "التاریخ والعلل" میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے ایک دن امام ابو یوسفؒ سے فرمایا، اے یعقوب جو کچھ مجھ سے سنا کرو اسے فوراً ہی نہ لکھ لیا کرو کیونکہ کبھی ایک مسئلہ کے متعلق میری رائے آج کچھ ہوتی ہے اور کل کچھ ہو جاتی ہے۔ اس روایت سے موفق مکی کے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امام صاحب کا مسلک شورائی مسلک ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ پر اپنے مسائل تسلیم کرنے کے متعلق کبھی جبر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی پوری آزادی دی کہ وہ بہت خوشی سے اپنی اپنی رائیں پیش کریں، پھر اس پر خوب جرح و قدح ہو، اس کے بعد اگر سمجھ میں آجائے تو اس کو قبول کر لیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی مجلس شوریٰ نقلی و عقلی ہر دو لحاظ سے بہت مکمل مجلس تھی۔ اس میں اگر حفاظ و محدثین، عربیت و تفسیر کے جاننے والے شامل تھے تو زفر بن ہذیل جیسے میزان عقل پر تولنے والے بھی موجود تھے۔ ان ہی اہل علم و فہم علماء کے تبادلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو اتنا صاف ہو جاتا تھا۔ اس کے مصالح و مضار سب اس طرح سامنے آجاتے تھے کہ زمانہ کی ہر صورت کی اس میں پوری پوری رعایت ہو جاتی تھی۔

خطیب امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے وکیع سے کہا ابو حنیفہ نے اس مسئلہ میں غلطی کی ہے۔ وکیع نے فرمایا، ابو حنیفہ غلطی کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ امام ابو یوسفؒ و زفرؒ جیسے قیاس کے ماہر، یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان و مندل جیسے حفاظ

حدیث اور قاسم بن معن جیسے لغت و عربیت کے جاننے والے، داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و متقی شامل ہوں۔ اگر وہ غلطی کھائیں گے تو کیا یہ لوگ ان کی اصلاح نہ کریں گے۔ دراصل فقہ حنفی کی عام مقبولیت کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا مگر اس کا یہی کمال محدثین کی نظروں میں موجب نقصان بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عام محدثین کا طور فکر بالکل اس سے جداگانہ تھا۔ وہ اس تمام غور و خوض کو رائے کی مداخلت تصور کرتے تھے اور وہ اس میں بڑی حد تک معذور بھی تھے، کیونکہ آئین شریعت کی اس طرح ترتیب و تشکیل کا امت میں یہ پہلا قدم تھا اسے اوپری نظروں سے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر شدہ شدہ دوسرے اماموں کو بھی اسی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی حتیٰ کہ کوئی امام ایسا نہ رہا جس کی فقہ بالآخر اسی مرتب شکل پر نہ آگئی ہو مگر "البادی اظلم" کے قاعدہ کے موافق اصحاب الرائے کا اولین مخاطب صرف حنفیہ رہ گئے [1]۔

یہ مسئلہ بہت اہم اور طویل الذکر ہے کہ فقہ حنفی کے امتیازی اصول کیا کیا ہیں اور کیا ان کو مداخلت رائے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام کا استقصاء اس مختصر تذکرہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر یہاں ہم صرف ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد آپ فقہ حنفی کی گہرائی معلوم کرسکیں گے اور اس کے بعد یہ یقین کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ محدثین کی فقہ حنفی سے برہمی اور حنفیہ کی معذوری دونوں اپنی اپنی جگہ بجا ہیں۔

امام شافعیؒ ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہیں کہ بہت سے محدثین امام صاحب پر طعن کرنا اس لئے جائز سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک آپ نے بہت سی صحیح اخبار آحاد کو ترک کر دیا تھا۔ حالانکہ امام صاحب کا ضابطہ یہ تھا کہ آپ پہلے خبر واحد کا اس باب کی دوسری احادیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے۔ قرآن کریم کے بیان سے بھی ان کو ملاتے۔ اگر وہ قرآن کریم اور ان احادیث کے بیان کے مطابق ہو جاتیں تو ان پر عمل کر لیتے ورنہ انہیں شاذ قرار دیتے اور عمل نہ کرتے [2]۔

انصاف کیجئے کہ ایک آئینی نظر کے لئے آئین سازی کا یہ کتنا صحیح راستہ تھا مگر جن مزاجوں میں معیار صحت صرف اسناد ٹھہر گیا ہو وہ اس کا نام صحیح احادیث کا ترک رکھ لیتے تھے۔ اس کی بہت مشہور مثال حدیث مصراۃ ہے حنفیہ پر اس مسئلہ کی وجہ سے ہمیشہ لے دے کی گئی اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے

---

[1] ربیعہ بن ابی عبدالرحمن جو امام مالکؒ کے استاد ہیں اپنی اسی خدمت کی وجہ سے ربیعۃ الرای کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز بن ابی سلمہ کہتے تھے اے اہل عراق تم تو ربیعۃ الرای کہتے ہو اور خدا کی قسم ہے میں نے ان سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور کثیر الحدیث شخص تھے مگر اس کے باوجود ان کی طرف رائے کی نسبت اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ ان کا لقب ہی ربیعۃ الرائے پڑ گیا تھا۔ [2] الموافقات۔ جلد۔ ص ۴۴

محض اپنی رائے سے اس حدیث کو ترک کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حنفیہ نے تاوان کے وسیع باب میں اس قسم کا تاوان کہیں نہ دیکھا اور اس لئے یہاں بھی اس باب کے عام ضابطہ ہی پر عمل کر لیا تو کچھ بیجا بھی نہیں کیا۔ بقول حافظ ابو عمر دکون ایسا ہے جس نے ہر باب کی ہر حدیث کو من وعن تسلیم کیا ہو اپنے استقراء واجتہاد کے بعد جب ایک حدیث کو مختار و معمول بہ بنا لیا گیا ہے تو اس کی مخالفت حدیث میں سب نے تاویل وتوجیہ جائز قرار دی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حنفیہ نے اکثر مواضع میں اصول کو جزئیات پر قربان نہیں کیا جب کسی بات میں ان کے نزدیک صاحب شریعت سے ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو گیا تو پھر انہوں نے اس کے برخلاف جزئیات کو عموماً قابل تاویل سمجھا ہے۔

مثلاً انسانی حاجت کے لئے بیٹھنے کا ایک آئین یہ ہے کہ قبلہ کو اپنے سامنے یا پشت کی جانب نہ رکھنا چاہئے۔ اس ضابطہ کو حنفیہ نے پہلے منقول اور معقول ہر طریق پر جانچا تو لا، جب ان کے نزدیک ادب واحترام کا یہ آئین ثابت ہو گیا تو حضرت ابن عمرؓ کے صرف ایک جزئی واقعہ کی بنا پر کہ انہوں نے ایک بار آنحضرت ﷺ کو قضاء حاجت کے لئے قبلہ کی جانب پشت کئے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا اس ضابطہ کلیہ کی تاویل نہیں کی بلکہ اس واقعہ ہی کی کوئی توجیہ کر لینا زیادہ مناسب سمجھا۔

دوسری مثال نماز میں بات کرنے کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر احادیث سے نماز میں بات کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہاں کسی استثناء کی طرف ادنیٰ اشارہ نہیں ملتا۔ صرف ایک ذوالیدین کی حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں کسی کو سہواً کسی کو عمداً کچھ بات چیت کرنے کی نوبت آگئی تھی اس کے باوجود ان کی نمازوں کو فاسد نہیں سمجھا گیا۔ دیگر ائمہ نے اس ایک جزئی واقعہ کی وجہ سے اصل قاعدہ ہی کی تخصیص وتوجیہ شروع کر دی ہے۔ حنفیہ نے یہاں بھی قاعدہ میں کوئی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کو بدستور اپنے عموم پر قائم رکھا ہے اور اس ایک واقعہ ہی کی کوئی توجیہ یا تاویل کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جہاں حنفیہ نے قاعدہ کلیہ کے مقابلہ میں جزئیات ہی کی تاویل کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ضابطہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور جزئیات منتشر، اس لئے تاویل کرنے والوں کی صف میں زیادہ پیش پیش حنفیہ ہی نظر آنے لگے اب آپ کو اختیار ہے کہ اس کا نام ترک حدیث رکھ لیجئے یا عمل بالحدیث رکھئے۔ اسی قسم کے امتیازات ہیں جن کی بنا پر ہر دور میں امت کا نصف حصہ اسی فقہ پر عمل پیرا رہا ہے۔ اور اسی اصولی نظر کی وجہ سے حنفی فقہ میں اتنی لچک ہے کہ اتنی دوسری فقہ میں نہیں اگر علماء انسانوں کی ضرورت اور دین حنیف کی سہولت دونوں کو پیش نظر رکھتے تو ان کو حنفی کتاب الحیل پر اتنا غصہ نہ آتا اور نہ وہ حنفیہ کو محض رائے کا مقلد قرار دیتے۔

امام اعظمؒ کا علمی پایہ :

شداد بن حکیم فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ سے بڑھ کر میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا۔ مکی بن ابراہیم نے امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وکیع فرماتے ہیں میں کسی عالم سے نہیں ملا جو ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں لوگ علم فقہ سے بے خبر پڑے ہوئے تھے، ابوحنیفہ نے آکر انہیں بیدار کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں ہم خدا کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے، واقعی بات یہ ہے کہ ابوحنیفہؒ سے بہتر فقہ ہم نے کسی کی نہیں سنی اور اس لئے ان کے اکثر اقوال ہم نے بھی اختیار کر لئے ہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ فتوے میں یحییٰ بن سعید کوفیوں کا قول اختیار کیا کرتے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں جسے علم فقہ میں مہارت حاصل کرنا ہو اسے لازم ہے کہ ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو نہ چھوڑے کیونکہ تمام لوگ فقہ میں ان کے محتاج ہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ فقہ تو بس امام ابوحنیفہ ہی کا ہے۔ جعفر بن ربیع کہتے ہیں کہ پانچ سال ابوحنیفہ کی خدمت میں رہا، ان جیسا خاموش انسان میں نے نہیں دیکھا، ہاں جب ان سے فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو اس وقت کھل جاتے اور دریا کی طرح بہنے لگتے تھے۔ عبداللہ بن داؤد فرماتے ہیں کہ اہل اسلام پر فرض ہے کہ وہ اپنی نمازوں کے بعد امام ابوحنیفہ کے لئے دعا کیا کریں اور ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے امت کے لئے آنحضرت ﷺ کی سنتیں اور مسائل فقہ جمع کر کے رکھ دیئے ہیں۔ روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ میں ابن جریج کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں امام صاحب کی وفات کی خبر پہنچی، انہوں نے فوراً انا للہ کہا اور فرمایا افسوس کیسا عجیب علم جاتا رہا۔ اسی سال ابن جریج کا بھی انتقال ہوا ہے [1]۔

علم فقہ کا انتخاب :

جو شخص امام صاحبؒ کے مناظرات و حالات سے ذرا بھی واقف ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ امام صاحب کو جمیع علوم میں پوری دستگاہ حاصل تھی۔ علم کلام سے آپ کی ابجد شروع ہوئی ہے اور حدیث و تفسیر و فقہ تو آپ کا مشغلہ ہی تھا۔ مورخ ابن خلکان آپ کے متعلق یہ لکھتا ہے "ولم یکن یعاب بشئی سوی قلة العربیة" یعنی آپ پر قلتِ عربیت کے سوا اور کوئی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ اس کے اسباب بھی جو کچھ ہیں وہ تحقیق کے بعد کچھ نہیں رہتے لیکن ہم اس سلسلہ میں

---

[1] تاریخ خطیب مناقب امام

اُن چند اسباب کو ظاہر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جن کی بنا پر امام صاحب نے دیگر علوم کی بجائے علم فقہ کو اپنا دائمی مشغلہ بنالیا تھا۔ اگر چہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ جو شخص حدیث و قرآن نہیں جانتا وہ فقہ سے بھی کوئی مجتہدانہ مذاق نہیں رکھ سکتا۔

ہمارے نزدیک اس موقعہ پر اختیاری اسباب کے ساتھ کچھ قدرتی اسباب بھی ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے فقہ ہی آپ کا سب سے بڑا مشغلہ ہو جانا چاہیے تھا۔ مناقب موفق اور تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد علم فقہ کی مہارت کے لحاظ سے جن پر نظریں پڑتی تھیں وہ حماد بن ابی سلیمان مفتی کوفہ تھے جب تک یہ بقید حیات رہے لوگ ان کی وجہ سے دوسروں سے بے نیاز رہے لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ان کا کوئی دوسرا جانشین ہو، ادھر اُن کے تلامذہ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ان کے محترم استاد کا نام اور ان کا علم کہیں ختم نہ ہو جائے۔ حماد کے ایک فرزند تھے جو اچھے عالم تھے، ان پر اتفاق ہو گیا کہ انہیں اپنے والد کی مسند پر بٹھادیا جائے۔

ابو بکر نہشلی اور ابو بردہ وغیرہ جو ان کے شاگرد تھے اب ان کے پاس آنے جانے لگے۔ لیکن ان حضرات پر شعر و سخن کا ذوق غالب تھا، یہ اس جگہ کو نبھا نہ سکے۔

پھر لوگوں کا خیال ابو بکر نہشلی کی طرف گیا ان سے درخواست کی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابو بردہ کی خدمت میں یہ مسند پیش کی گئی مگر انہوں نے بھی انکار کیا۔ آخر کار لوگوں نے امام صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا، میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ علم فنا ہو جائے۔ اس لئے ان کی درخواست کو منظور کر لیا اور مسند افتاء پر بیٹھ گئے۔

(مناقب موفق جلد اول۔ ص ۱)

واقعہ یہ ہے کہ جب مفتی کوفہ کی مسند پر بیٹھنے کے لئے قدرت نے امام صاحب ہی کو انتخاب کیا ہو تو اس جگہ کوئی دوسرا کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ امام ابو حنیفہ وہی ہیں جن کے سامنے جب منصب قضا پیش کیا گیا تو ہر سختی و ذلت برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر منصب قضا قبول نہ کیا۔ اور یہی ہیں کہ جب ان سے ایک آزاد علمی خدمت کی درخواست کی گئی تو فوراً قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بہر حال اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اتفاقات سماویہ کی بنا پر علم کی جو مسند امام صاحب کے لئے مخصوص ہو چکی تھی وہ علم نبوت ہی کی گہرائیوں میں شناوری کی مسند تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر آپ کا مشغلہ فقہ ہی بن جانا چاہئے تھا۔

حافظ ابن عبدالبرؒ ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے اعمش نے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ اس وقت میرے اور ان کے سوا وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا، اے یعقوب یہ جواب تم نے کس حدیث سے اخذ کیا ہے۔ میں نے کہا اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان فرمائی تھی انہوں نے فرمایا یعقوب یہ حدیث تو مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے سے یاد تھی مگر میں آج تک اس کا یہ مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ اعمشؒ اور امام صاحبؒ کے درمیان بھی پیش آیا ہے۔ عبداللہ بن عمروؒ کہتے ہیں کہ میں اعمشؒ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اور ایک مسئلہ دریافت کیا وہ اس کا جواب نہ دے سکے، دیکھا تو وہاں ابو حنیفہؒ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا، اے نعمانؒ اس کے متعلق تم کچھ بولو۔ انہوں نے فرمایا، اس کا جواب یہ ہے۔ اعمشؒ نے فرمایا کہاں سے کہتے ہو؟ امام صاحب نے فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے ہم سے روایت کی تھی۔ اس پر اعمش نے کہا نحن الصیادلة وانتم الاطباء (تم لوگ اطباء ہو اور ہم تو عطار ہیں) یعنی عطار کے پاس صرف دواؤں کا اسٹاک ہوتا ہے وہ اس کی ترکیب و خواص نہیں جانتا۔ اطباء ان کے اثرات اور ترکیب بھی جانتے ہیں۔[1]

خطیب بغدادی امام ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ان سے اعمش نے پوچھا کہ آپ کے استاد نے عبداللہ کا یہ مسئلہ کیوں ترک کر دیا کہ باندی کے آزاد ہونے سے اس پر طلاق ہو جاتی ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی اسی حدیث کی بناء پر جو آپ نے ان سے بواسطہ ابراہیم واسود کے نقل فرمائی تھی کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں اس پر اعمشؒ نے کہا بے شبہ ابو حنیفہ نہایت مجتہد ارشخص ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ اعمشؒ کو امام صاحب کا یہ استنباط پسند آیا تھا۔[2]

امام ترمذیؒ اپنی جامع میں غسل میت کے مسئلہ کی تحقیق کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ وکذلک قال الفقهاء وهم اعلم بمعاني الحديث۔ فقہاء نے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور حدیث کے مطالب یہی لوگ زیادہ سمجھتے ہیں۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ حدیث وفقہ دو علیحدہ چیزیں نہیں فرق ہے تو یہ کہ محدث کے نزدیک الفاظ حدیث کا حفظ مقدم ہوتا ہے اور فقیہ کے نزدیک ان کے معانی کا فہم مقدم۔

---

۱ جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۰۔ ۱۳۱ ۲ تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳۔ ص ۲۴۱

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ امام صاحب نے شغلِ فقہ صرف اُمت کے نفع کے خاطر اختیار فرمایا تھا

اور بجا اختیار فرمایا تھا۔ الفاظ حدیث تو محفوظ ہو ہی

چکے تھے اب جس خدمت کی ضرورت تھی وہ استخراج واستنباطِ مسائل اور ان کی آئینی تشکیل وترتیب ہی کی تھی۔ محدثین ہزاروں موجود تھے۔ لیکن فقہ کا یہ مقام خالی پڑا ہوا تھا، اس لئے امام صاحب نے اس خالی گوشہ کو پُر کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ امام صاحب فن حدیث وقرآن سے ناآشنا تھے۔ ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ محدثین اگر الفاظ حدیث کے ذمہ دار ہیں تو فقہا، اس کے صحیح استعمال کے جاننے والے ہیں وہ عطار ہیں تو یہ اطبا، فقہ کا تمام تار و پود قرآن وحدیث سے ہی قائم ہے۔

علامہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ کبار ائمہ کی قلت روایت کو ان کی علم حدیث سے بے بضاعتی کی دلیل سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ شریعت کا ماخذ کتاب اور سنت ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی شرعی مسائل کے استنباط وترتیب کا ارادہ کرے گا اس کے لئے کتاب وسنت کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ امام صاحب کی قلت روایت کا مبنیٰ علم سے بے بضاعتی نہ تھی بلکہ درحقیقت روایت وتحمل کے وہ شرائط تھے جن کا معیار آپ نے عام محدثین سے بہت بلند قائم کیا تھا۔ اس لئے آپ کے لئے روایت کا میدان بھی زیادہ وسیع نہیں رہا تھا۔

امام صاحبؒ کے علم حدیث میں ماہر اور مجتہد ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے درمیان آپ کا فقہ ہمیشہ بنظر اعتبار دیکھا گیا ہے۔ ایک طرف جہاں امام احمد امام شافعیؒ کا مسلک نقل کیا گیا ہے، اسی کے پہلو بہ پہلو امام صاحب کا مسلک بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ محدثین کے نزدیک آپ کی فقہ بھی اسی درجہ پر معتبر تھی جیسا کہ دیگر فقہا، محدثین کی خلاصہ یہ کہ ردّ وقبول کے اعتبار سے اس کا زیر بحث رہنا۔ اس کی دلیل ہے کہ آپ کا فقہ بھی دیگر محدثین کی فقہ کی صف میں رہنے کے قابل تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر ایک جماعت اسے قبول کرتی رہی تو دوسری جماعت ترک کرتی رہی [1]۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحیح مراد اور اس میں مسائل کے ماخذ امام صاحب سے زیادہ جاننے والا میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا۔ بعض مرتبہ میں آپ کی رائے چھوڑ کر کسی حدیث کے ظاہر پہلو کو اختیار کر لیتا تو بعد میں مجھے تنبیہ ہوتا کہ حدیث کی صحیح مراد سمجھنے میں امام صاحبؒ کی نظر مجھ سے زیادہ گہری تھی [2]۔

---

[1] مقدمہ۔ ص ۳۱۲ [2] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳۔ ص ۳۴۰

اسرائیل جو مسلم آئمہ حدیث میں ہیں، امام صاحب کی مدح میں بطریق تعجب فرماتے ہیں، نعمان کیا خوب شخص ہیں جو احادیث مسائل فقہیہ سے متعلق ہیں وہ ان کو کیسی محفوظ ہیں اور کس خوبصورتی سے وہ ان سے مسائل فقہ استنباط فرماتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ محدثین میں وکیع اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اشخاص امام اعظمؒ کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں۔

"وکان (وکیع یفتی برأی ابی حنیفة وکان یحفظ حدیثه کله وکان قد سمع من ابی حنیفة حدیثا کثیرا" [1]

"وکیع امام صاحب کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور آپ کی روایت کردہ تمام حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور انہوں نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں"۔

امام صاحبؒ کے اساتذہ محدثین کی جو تعداد علماء نے لکھی ہے وہ ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن چونکہ دیگر محدثین کی طرح خود امام صاحبؒ نے باضابطہ روایت حدیث کے حلقے قائم نہیں کئے اور تدریج فقہ کو ترجیح دی اس لئے بعد کے زمانہ میں آپ کی شانِ محدثیت نظری بن کر رہ گئی۔

محدثین کو امام صاحبؒ سے وجہ نکارت :

تاریخ کا یہ بھی ایک تعجب خیز ورق ہے کہ وہ ایک طرف تو امام صاحب کی تعریف و توصیف میں بکھری جاتی ہے، وہ جلی حروف میں یہ لکھ جاتی ہے کہ آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے ورع و تقویٰ جود و سخا، علم و فضل، خرد و عقل کے تمام کمالات آپ میں جمع تھے، ائمہ میں امام اعظم آپ کا لقب تھا محدثین و علماء کا ایک جم غفیر ہمیشہ آپ کے زمرۂ مقلدین میں شامل رہا اور امت مرحومہ کا نصف سے زیادہ حصہ اب بھی آپ کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے اسی کے ساتھ وہ دوسرے ہی ورق پر دیانت و عقل کا کوئی عیب ایسا اٹھا کر نہیں رکھتی جو آپ کی ذات میں اگا نہیں دیتی۔

خطیب بغدادی نے پورے سو صفحات پر امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے۔ پہلے امام صاحب کے مناقب میں صفحہ کے صفحہ رنگ دیئے ہیں اس کے بعد پورے ۵۴ صفحات پر آپ کی ذات میں وہ وہ نکتہ چینیاں نقل کی ہیں جو دنیا کے پردہ پر کسی بدتر سے بدتر کافر پر بھی نہیں کی جا سکتیں۔ ایک متوسط عقل کا انسان ان متناقض بیانات کو پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسے دو متضاد صفات کا حامل نہیں ہو سکتا یا اس کے مناقب کی یہ تمام داستان فرضی ہے یا عیوب کی یہ طویل فہرست صرف

مخترع حکایات اور صریح بہتان ہے۔ مورخ ابن خلکان نے خطیب کے اس غلط طرز پر حسب ذیل الفاظ میں تنقید کی ہے۔

''وقد ذکر الخطیب فی تاریخه منها شیئا کثیر اثم اعقب ذلک بذکرما کان الالیق ترکه والاضراب عنه فمثل هذا الامام لایشک فی دینه ولا فی ورعه ولا فی حفظه ولم یکن یعاب بشیٔ سوی قلة العربیة''۔ (جلد ۲۔ص ۱۶۵)

یعنی خطیب نے اپنی تاریخ میں آپ کے مناقب کا بہت سا حصہ ذکر کیا ہے اس کے بعد ایسی ناگفتنی باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا مناسب تھا کیونکہ امام اعظمؒ جیسے شخص کے متعلق نہ دیانت میں شبہ کیا جاسکتا ہے نہ حفظ و ورع میں آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلت عربیت کے اور نہیں کی گئی۔

حافظ ابن عبدالبرؒ مالکی کا کلام یہاں نہایت منصفانہ ہے کیونکہ تنقید کا یہ ناشناسانہ صرف ایک امام صاحب کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اور ائمہ تک بھی پھیلتا چلا گیا ہے۔ اگر ذرا نظر کو اور وسیع کیجئے تو پھر صحابہ کا استثناء بھی مشکل نظر آتا ہے۔

غصہ اور مسرت انسانی فطرت ہے۔ ان دونوں حالتوں میں انسان کے الفاظ کا صحیح توازن قائم نہیں رہا کرتا اسی لئے غصہ کے حال میں فیصلہ کرنے کی ممانعت کردی گئی ہے یہ صرف ایک نبی کی شان ہے جس کے منہ سے غضب و رضا کے دونوں حالوں میں جچے تلے الفاظ ہی نکلتے ہیں۔ اب اگر انسانوں کے صرف ان جذباتی پہلوؤں سے تاریخ مرتب کرلی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پھر صحابہ کے الفاظ صحابہ کے متعلق اور ائمہ کے ائمہ کے متعلق بھی ایسے مل سکتے ہیں جن کے بعد امت کا یہ مقدس گروہ بھی زیر تنقید آسکتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام شعبیؒ کا کیسا بصیرت افروز مقولہ نقل کیا ہے۔

'' قال الشعبی حدثنا هم بغضب اصحاب محمد (صلی الله علیه وسلم) فاتخذوه دینا ''[1]۔

''شعبیؒ فرماتے ہیں ہم نے تو لوگوں سے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کے باہمی غصہ کی حکایات نقل کی تھیں انہوں نے انہیں عقائد کی فہرست میں داخل کرلیا ہے''۔

---

[1] الروض الباسم۔ جلد اول۔ ص ۱۲۸

اس کے سوا دوسری مشکل یہ ہے کہ محدثین کے جو مبہم الفاظ آج کتب میں مدون نظر آتے ہیں کہ کسے فرصت ہے کہ ان کے اصل معنی سمجھنے کی کوشش کرے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔

ایک مرتبہ امام صاحبؒ اعمشؒ کی عیادت کے لئے گئے۔ اعمشؒ نے کچھ روکھا پن دکھلایا اور امام صاحب کے متعلق کچھ غصہ کے الفاظ کہے۔ اس اخلاق پر اعمشؒ کا یہ رویہ آپ کو ناگوار گذرا اور گذرنا چاہئے تھا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ اعمش نہ تو رمضان کے روزے رکھتا ہے اور نہ کبھی جنابت سے غسل کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی امام دین پر اس الفاظ کو کتنا ہی چسپاں کیجئے مگر چسپاں نہیں ہو سکتے اگر کہیں ان الفاظ کی تشریح ہمارے سامنے نہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ اس مقولے سے ہمارے خیالات کتنا کچھ پریشان ہو جاتے لیکن جب ان الفاظ کی مراد ہاتھ آگئی تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ائمہ غصہ کے حال میں بھی ایک دوسرے کے متعلق عوام کی طرح بے سروپا کلمات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں فضل بن موسیٰ سے اس کا مطلب دریافت کیا گیا (اس واقعہ میں وہ امام صاحب کے ساتھ ساتھ تھے) تو انہوں نے فرمایا کہ اعمش التقاء ختانین سے غسل کے قائل نہ تھے بلکہ جمہور کے خلاف اسی مسئلہ پر عمل کرتے تھے جس پر کبھی ابتداء اسلام میں عمل کیا گیا تھا یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض صحابہ کا مذہب یہ تھا کہ طلوع فجر کے بعد روشنی پھیلنے تک سحری کھانا درست ہے۔ ان دو مسئلوں کے لحاظ سے امام صاحب کی یہ دونوں باتیں بھی درست تھیں اور اعمش کا عمل بھی اپنے مختار کے مطابق درست تھا[1]۔

اگر اسی طرح امام کے حق میں بہت سے مشہور مقولوں کی مرادیں تلاش کی جائیں تو ہاتھ آسکتی ہیں اور اس کے بعد اصلی بات بھی اتنی قابلِ اعتراض نہیں رہتی جیسا کہ الفاظ کی سطح سے معلوم ہوتی تھی۔ کتب تذکرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے محدثین کی ناراضگی کا بڑا سبب صرف اختلافِ مذاق تھا نہ کہ اختلاف مسائل۔

امام صاحب کے دور تک عام مذاق یہ تھا کہ مسائل کے متعلق بہت ہی محدود پیمانہ پر غور و خوض کیا جاتا تھا، صرف پیش آمدہ واقعات کا شرعی حکم وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ معلوم کر لیا جاتا اس کے بعد مسئلہ کی فرضی صورتوں سے بحث کرنا ایک لایعنی مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ خطیب بغدادی نے یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔

---

[1] دیکھو جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۰

نضر بن محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ قتادہ کوفہ آئے اور ابو بردہ کے گھر اترے، ایک دن باہر نکلے تو لوگوں کی بھیڑ ان کے ارد گرد جمع ہوگئی۔ قتادہ نے قسم کھا کر کہا آج جو شخص بھی حلال و حرام کا کوئی مسئلہ مجھ سے دریافت کرے گا میں اس کا ضرور جواب دوں گا۔ امام ابو حنیفہؒ کھڑے ہو گئے اور سوال کیا اے ابو الخطاب (ان کی کنیت ہے) آپ اس عورت کے متعلق کیا فرماتے ہیں جس کا شوہر چند سال غائب رہا اس نے یہ یقین کر کے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے اپنا دوسرا نکاح کرا لیا۔ اس کے بعد اس کا پہلا شوہر بھی آگیا، اب آپ اس کے مہر کے متعلق فرمایئے کیا فرماتے ہیں: جو بھیڑ ان کو گھیرے کھڑی تھی، اُن سے مخاطب ہو کر کہا اگر اس مسئلہ کے جواب میں یہ کوئی حدیث روایت کریں تو غلط روایت کریں گے اور اگر اپنی رائے سے فتوے دیں گے تو وہ بھی غلط ہوگا۔

حضرت قتادہ بولے کیا خوب! کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا نہیں! انہوں نے کہا پھر جو مسئلہ ابھی تک پیش نہیں آیا اس کا جواب مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو، امام صاحب نے فرمایا کہ ہم حادثہ پیش آنے سے قبل اس کے لئے تیاری کرتے ہیں تاکہ جب پیش آجائے تو اس سے نجات کی راہ معلوم رہے۔

قتادہ ناراض ہو کر بولے خدا کی قسم ہے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ اب میں تم سے بیان نہیں کروں گا۔ ہاں کچھ تفسیر کے متعلق پوچھنا ہو تو پوچھو، اس پر امام صاحب نے ایک تفسیری سوال کیا قتادہ اس پر بھی لاجواب ہوئے اور ناراض ہو گئے۔ آخر کار غصہ ہو کر اندر تشریف لے گئے۔[1]

ابو عمرو نے سلف کے اس مذاق کی شہادت پر بہت سے واقعات لکھے ہیں اور بے شبہ علم و تقویٰ کے اس دور میں مناسب بھی یہی تھا۔ لیکن جب مقدر یہ ہوا کہ علم کا بازار سرد پڑ جائے، ورع و تقویٰ کی جگہ جہل و فریب لے لے ادھر روزمرہ نئے سے نئے واقعات پیش آنے لگیں تو اس سے پہلے کہ جہلا شریعت میں دست اندازی شروع کر دیں یہ بھی مقدر ہو گیا کہ شریعت کی ترتیب و تہذیب ایسے ائمہ کے ہاتھوں ہو جائے جنہوں نے صحابہ و تابعین کے دور میں پرورش پائی ہو، انصاف کیجئے اگر قتادہ کے زمانہ کی یہ احتیاط اسی طرح آئندہ بھی چلی جاتی تو کیا شرعی مسائل اسی ضبط و صحت کے ساتھ جمع ہو جاتے جیسا کہ اب جمع ہوئے۔

درحقیقت یہ امام صاحب کی بڑی انجام بینی اور امت کی بروقت دستگیری تھی کہ آپ نے ان کے سامنے شریعت کو ایک مرتب آئین بنا کر رکھ دیا، اسی لئے عبداللہ بن داؤد فرماتے تھے کہ امت پر

---

[1] تاریخ خطیب۔ جلد ۱۳، ص ۳۴۹

آپ کا یہ حق ہے کہ وہ آپ کے لئے نمازوں کے بعد دعائیں کیا کریں۔ یہ خدمت اپنی جگہ خواہ کتنی ہی ضروری اور بروقت سہی مگر واقعہ یہ ہے کہ تھی محدثین کے مذاق کے خلاف۔ جس دور میں آثار ومرفوعات کو علیحدہ علیحدہ ضبط کرنا بھی عام دستور نہ ہوا اس دور میں صرف ابواب فقہیہ کی اونچی اونچی تعمیریں کھڑا کر دینا کب قابلِ برداشت ہوسکتا تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مسائلِ منصوصہ سے آپ ذرا قدم ادھر اُدھر ہٹائیں گے تو آپ کو اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ ایسے دور میں جہاں خاموشی کے ساتھ عمل کرنے کے علاوہ ایک قدم ادھر اُدھر اٹھانا بھی قابلِ اعتراض نظر آتا ہو، احادیث وآیات کے اشارات، دلالات اور اقتضاء سے ہزاروں مسائل اخذ کر کے ان کو احادیث سے ایک علیحدہ شکل دے دینا کب گوارا کیا جاسکتا تھا۔

آخر جب آپ کا دور گذر گیا تو بعد کے علماء کے سامنے صرف پہلے علماء کی ان ناگواریوں کی نقل باقی رہ گئی۔ پھر اُستادی وشاگردی کے تعلقات نے حقائق کو ایسا پوشیدہ کر دیا کہ جس نے جہم کو کافر کہا تھا اسے خود جہمی اور کافر کہا گیا۔ اس نے کتاب وسنت کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کرنے کی وصیت کی تھی اسی پر کتاب وسنت کی مخالفت کرنے کی تہمت رکھی گئی۔ ہاں اگر خوش قسمتی سے ماحول کے تاثرات سے نکل کر کسی اللہ کے بندہ نے تحقیق کی نظر ڈالی تو بہت جلد اس کی آنکھوں سے یہ حجاب اُٹھ گیا اور اس نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا ورنہ تاریخ ان ہی افواہوں پر چلتی رہی جو اُستادی وشاگردی کے اصطلاک سے علماء کے حلقوں میں گشت لگا رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں اس کے متعلق مختلف خیالات قائم ہو سکتے ہیں اور فیصلہ کی راہ آسانی سے نہیں نکل سکتی، بہت سی زبانیں اس کی موافقت اور بہت سی اس کی مخالفت میں بولی ہیں تو اس کی وفات کے بعد جب کہ اس کی شخصیت بھی سامنے نہیں رہتی فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ اسماء الرجال کے فن میں تاریخ کی اس تاریکی کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ایک معتدل مزاج انسان کے لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل بھی نہیں رہا۔ لیکن تاریخ کی جو نقول اوراق میں درج ہو چکی ہیں اس سے ہر خیال کا انسان اگر مزاجی اعتدال نہیں رکھتا تو اپنے خیال کے موافق فائدہ اُٹھانا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس لئے اسماء الرجال کی پیدا کردہ روشنی تاریخ کی پھیلائی ہوئی تاریکی کو دور کرنے میں بسا اوقات ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ امام صاحب پر جرح کرنے والوں کی صف پر نظر ڈالیں گے تو ان میں زیادہ تر آپ کو وہی افراد نظر آئیں گے جو آپ کے عہد حیات کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا بڑے محدث ہیں

فقاہت سے زیادہ بہرہ ور نہیں۔ صرف سنی ہوئی خبریں ان تک پہنچیں اور وقتی ماحول کی وجہ سے باور کر لی گئیں۔ یوں تو امام صاحب کے تلامذہ کا دائرہ بھی کچھ مختصر نہ تھا ایک ابوالمحاسن شافعی کی تحریر کی بناء پر ان کی جو تعداد نام ونسب کی قید کے ساتھ ثابت ہوتی ہے وہ نوسو آٹھ تک پہنچتی ہے لیکن ان میں اکثر شاگرد بسلسلۂ فقہ تھے۔ کاش آپ کا درسِ حدیث کا حلقہ بھی اسی پیمانہ پر قائم ہو جاتا تو شاید امام کی تاریخ کا نقشہ آج آپ کو کچھ دوسرا نظر آتا۔ چنانچہ جس حنفی نے بھی اس شغل کو قائم رکھا ہے اس کے ساتھ تاریخ زیادہ بے دردی کا سلوک نہیں کر سکی۔

ذیل کے ایک ہی واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ افواہ کیا ہوتی ہے اور جب حقیقت سامنے آجاتی ہے تو پھر اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک ؒ کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی شخص پیدا ہوا ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے؟ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور تین دن لگ کر امام صاحب کے عمدہ عمدہ مسائل انتخاب کئے۔ تیسرے دن اپنے ہاتھ میں کتاب لے کر آیا۔ یہ اپنی مسجد کے امام ومؤذن تھے انہوں نے دریافت کیا یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے ان کے حوالہ کر دی۔

اس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے گذرے جن کے شروع میں میں نے یہ لکھ دیا تھا ''اور نعمان اس کے متعلق یہ فرماتے ہیں''۔ اذان دے کر جب کھڑے کھڑے وہ کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ چکے تو کتاب اُٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لی، اور اقامت کہہ کر نماز پڑھی۔ پھر نکالی اور پڑھنا شروع کی، یہاں تک کہ ختم کر دی۔ پھر مجھ سے پوچھا، اے خراسانی یہ نعمان کون شخص ہیں؟ میں نے عرض کیا ایک شیخ ہیں، ان سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ فرمایا، یہ تو بڑے پایہ کے شیخ ہیں، جاؤ ان سے اور علم سیکھو۔ اب میں نے کہا جی یہ تو وہی ابوحنیفہ ؒ ہیں جن کے پاس جانے سے بھی آپ نے مجھے منع کیا تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحب ؒ کے متعلق انہوں نے سن کیا رکھا تھا اور جب حقیقت سامنے آئی تو بات کیا نکلی اس لئے خارجی شہادات اور واقعات سے آنکھیں بند کر کے صرف کالے کالے حروف سے تاریخ مرتب کرنا کوئی صحیح عمل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انسان میں حسد، تنافس کا بھی ایک کمزور پہلو موجود ہے اس کی بدولت بہت سے تاریخی حقائق پوشیدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سو اتفاق سے یہاں یہ سب باتیں جمع ہو گئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں، میں نے حسن بن عمارہ کو امام ابو حنیفہؒ کے گھوڑے کی رکاب پکڑے ہوئے دیکھا، وہ امام صاحبؒ کی توصیف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لوگ آپ کے متعلق صرف از راہ حسد چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ حافظ ابن ابی داؤدؒ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں یا حاسد یا ان کی شان سے ناواقف میرے نزدیک ان دونوں میں ناواقف شخص پھر غنیمت ہے۔ وکیع کہتے ہیں کہ میں امام صاحبؒ کے پاس آیا دیکھا کہ سر جھکائے کچھ فکر مند بیٹھے ہیں، مجھ سے پوچھا کدھر سے آرہے ہو، میں نے کہا قاضی شریک کے پاس سے۔ آپ نے سر اٹھا کر یہ اشعار پڑھے۔

ان یحسدونی فانی غیر لائمهم

قبلی من الناس اهل الفضل قد حسدوا

فدام لی ولهم ما بی وما بهم

ومات اکثرنا غیظا بما یحسد

اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو کریں میں تو انہیں کچھ ملامت نہیں کروں گا

کیونکہ اہل فضل پر مجھ سے پہلے بھی لوگ حسد کرتے آئے ہیں

میرا ان کا ہمیشہ یہی شیوہ رہے گا

اور ہم میں اکثر لوگ حسد کر کر کے مر گئے ہیں

وکیع کہتے ہیں کہ شاید امام صاحبؒ کو ان کی طرف سے کوئی بات پہنچی ہو گی اس لئے انہوں نے یہ اشعار پڑھے۔ جعفر بن الحسن، ابو عمر کے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ فرمایا بخش دیا۔ میں نے کہا علم و فضل کے طفیل میں، کہا بھئی فتویٰ تو مفتی کے لئے بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ میں نے کہا پھر۔ فرمایا، لوگوں کی ان ناحق نکتہ چینیوں کے طفیل میں جو لوگ مجھ پر کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مجھ میں نہ تھیں۔ (جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۲)

ابو عمر تحریر فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے امام صاحب کے حق میں بڑی زیادتی کی ہے اور حد سے بہت تجاوز کیا ہے آپ پر جو زیادہ سے زیادہ نکتہ چینی کی گئی ہے وہ صرف ان دو باتوں پر، ایک آثار کے مقابلہ میں رائے اور قیاس کا اعتبار کرنا، دوسری ارجاء کی نسبت حالانکہ جس جگہ امام صاحب نے کسی اثر کو ترک کیا ہے کسی نہ کسی موزوں تاویل سے کیا ہے۔ اسکی نوبت بھی ان کو اس لئے آئی ہے کہ

انہوں نے مسائل میں بیشتر اپنے اہلِ بلد کا اعتبار کیا ہے، جیسے ابراہیم نخعی اور ابن مسعود ؓ کے تلامذہ اس سلسلہ میں مسائل کی صورتیں فرض کرنے، پھر اپنی رائے سے ان کے جوابات دینے۔ اس پر اس کو مستحسن سمجھنے میں آپ نے اور آپ کے تلامذہ نے بھی افراط سے کام لیا ہے۔ ان وجوہ سے سلف میں ان سے مخالفت پیدا ہوگئی۔ ورنہ میرے نزدیک اہلِ علم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے کسی حدیث کے اختیار کرنے کے بعد کسی نہ کسی حدیث کا ترک یا تاویل یا دعویٰ نسخ کرنا لازم نہ آیا ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسروں کو ایسا موقعہ کم پیش آیا ہے اور امام صاحب کو زیادہ۔ اس پر ان کے ساتھ حسد اور بہتان کی مصیبت مزید برآں ہے۔

حضرت لیث بن سعد کہتے ہیں کہ امام مالک ؒ کے ستر مسئلے مجھے ایسے معلوم ہیں جو سنت کے خلاف ہیں۔ امام مالک ؒ نے صرف اپنی رائے سے نکالے ہیں اس بارے میں ان سے خط و کتابت بھی کر چکا ہوں۔ ابو عمر کہتے ہیں کہ علماءِ اُمت میں یہ حق تو کسی کو حاصل نہیں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث صحت کو پہنچ جائے تو وہ اس کی سند میں طعن یا اسی درجہ کی حدیث سے دعویٰ نسخ یا اس کے مقابلہ میں اُمت کا اجماع پیش کئے بغیر اس کو ترک کرے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی عدالت ہی ساقط ہو جاتی ہے۔ چہ جائیکہ اس کو دین کا امام مانا جائے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ امام صاحب ؒ سے روایت کرنے والوں اور آپ کو ثقہ کہنے والوں کی تعداد ان سے زیادہ ہے جنہوں نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے۔ پھر جنہوں نے نکتہ چینی کی بھی ہے تو وہ صرف ان ہی دو باتوں پر کی ہے جو ابھی مذکور ہوئیں۔

پھر تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ بزرگی و برتری کا یہ بھی معیار ہے کہ اس کے متعلق لوگ افراط و تفریط کی دو راہوں پر نکل جائیں، جیسا کہ حضرت علی ؓ یہاں بھی ایک جماعت افراط اور دوسری تفریط میں مبتلا نظر آتی ہے[1]۔

آخر میں حافظ ابو عمر[2] بطور قاعدہ تحریر فرماتے ہیں کہ جس شخص کی عدالت صحت کے درجہ کو پہنچ چکی ہو، علم کے ساتھ اس کا مشغلہ ثابت ہو چکا ہو۔ کبائر سے وہ احتراز کرتا ہو، مروت اور ہمدردی اس کا شعار ہو۔ اس کی بھلائیاں زیادہ ہوں اور برائیاں کم تو ایسے شخص کے بارے میں بے سر و پا الزامات ہرگز

---

[1] جامع البیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۴۸، ۱۴۹

[2] اس قاعدہ کی پوری تفصیل کے لئے طبقات الشافعیہ میں احمد بن صالح مصری اور حاکم کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے انہوں نے اس کے ہر گوشہ پر تفصیلی بحث کر دی ہے اور اس مجمل ضابطہ میں جن جن قیود و شرائط کی ضرورت تھی سب ذکر کر دی ہیں۔

قابلِ قبول نہیں[۱] ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے مخلوق نے جب اپنی زبان خالق سے بند نہیں کی تو اب ہمہ وشما سے اس کی توقع فضول ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی "اے پروردگار بنی اسرائیل کی زبان سے میرا پیچھا چھڑا دے"۔ وحی آئی، "جب میں نے مخلوق کی زبان اپنے نفس سے بند نہیں کی تو تم سے کیسے بند کر دوں"[۲]۔

---

۱ جامع بیان العلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۲ ۲ ایضاً۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۱